جلد دوئم
ایک جن زادی کی پراسرار داستان
دینار
شمیم نوید

دینار
(دوئم)

ایک جن زادی کی پراسرار داستان

شمیم نوید

ناشر:
مکتبہ القریش، سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور ۲۔ فون: 7668958
E.mail: al_quraish@hotmail.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں

باہتمام...... محمد علی قریشی

باراول ـــــــ جنوری 2005ء
مطبع ـــــــ نیر اسد پریس
سرورق ـــــــ ذاکر
کمپوزنگ ـــــــ وسیم احمد قریشی
قیمت ـــــــ 250/- روپے

اس طرح رات کے وقت اس لونڈی لیلیٰ کا بدحواس ہو کر بھاگنا میرے لئے انتہائی حیران کن تھا۔ دوسری جانب رونے پیٹنے کی آوازیں توجہ طلب تھیں۔ یہ آوازیں قصر کے اس مرکزی حصے کی طرف سے آ رہی تھیں جہاں خلیفہ ہادی کی سکونت تھی۔ مجھے اس نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ قصر خلافت میں کوئی بڑا واقعہ رونما ہوا ہے۔ آدم زادوں کے قالبوں میں رہ کر عارج اور میرے لئے حقیقت حال جاننا مشکل ہوتا ہے اسی سبب ہم دونوں ایوب اور جمیلہ کے جسموں سے باہر آ گئے۔

دوسرے ہی لمحے میں خلیفہ ہادی کی خواب گاہ میں تھی۔ اس کی خواب گاہ کو مسلح محافظوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ خواب گاہ کا منظر تعجب خیز تھا۔ خلیفہ ہادی اپنے بستر پر مردہ پڑا تھا۔ بستر کے قریب ہی موجود دریچہ کھلا ہوا تھا۔ جو دو خادم رات کے وقت خلیفہ کی خدمت پر مامور تھے' انہیں میں نے فرش پر بے ہوش پڑے دیکھا۔ خواب گاہ کے باہر سے عورتوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خلیفہ ہادی کے محافظ دستے کا نگراں سعد خواب گاہ کے دروازے پر اپنے عملے کے ساتھ موجود تھا۔

''حضور! مجھے شبہ ہے کہ وہ کوئی حبشی لونڈی تھی جسے میں نے دریچے سے کود کر بھاگتے دیکھا تھا۔'' محافظ دستے کا ایک سپاہی دھیمی آواز میں سعد سے مخاطب تھا۔ ''میں نے اسے للکارا بھی مگر وہ رکی نہیں اور آن کی آن میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئی!''

''اے بے وقوف! اگر تو نے کسی کو بھاگتے دیکھا بھی ہے تو اس بات کو بھول جا ورنہ غفلت برتنے کی بنا پر نہ صرف تیری گردن مار دی جائے گی بلکہ بہ حیثیت نگراں میرے دامن تک بھی الزام اور تیرے لہو کے چھینٹے پہنچیں گے۔'' سعد نے اپنے ماتحت سپاہی کو نصیحت کی۔

خوف سے سپاہی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ ہکلایا۔ ''م...... میں...... میں نے کک...... کچھ نہیں دے...... دیکھا حضور...... کچھ نہیں!''

اسی وقت میں نے طبیب خاص اور اس کے معاونین کو آتے دیکھا۔ سعد اور محافظ

دستے کے عملے نے اُن کیلئے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ خلیفہ ہادی کی خواب گاہ میں داخل ہو گئے۔ انہیں سعد ہی نے خلیفہ کی موت کی تصدیق کیلئے بلوایا تھا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔

طبیب خاص نے خلیفہ ہادی کے مردہ جسم کا جائزہ لیا۔ اس عرصے میں طبیب خاص کے معاون دونوں بے ہوش خادموں کو ہوش میں لے آئے۔ محافظ دستے کا نگران سعد یہ دیکھ کر اندر آ گیا۔ اس نے خادموں سے بیہوشی کی وجہ پوچھی۔

"جب ایوب اور جمیلہ ہمیں یہاں چھوڑ کر گئے تھے تو ہم پوری طرح ہوش میں تھے۔" ایک خادم بتانے لگا۔ "بس کچھ ہی دیر کے بعد اچانک ذہن پر غنودگی چھانے لگی۔ میں نے اسے بھی اونگھتے دیکھا۔" خادم نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ "پھر مجھے نہیں معلوم کیا ہوا..... ابھی آنکھ کھلی ہے۔"

دوسرے خادم کا بیان بھی مختلف نہیں تھا۔ سعد نے ان دونوں خادموں کو اپنے سپاہیوں کی تحویل میں دے دیا۔

مجھے یہ سوال بار بار اضطراب میں مبتلا کر رہا تھا کہ خلیفہ ہادی کی خدمت پر مامور دونوں خادم جب بے ہوش تھے تو پھر یہ عقدہ کیسے کھلا' خلیفہ کا انتقال ہو چکا ہے؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی غرض سے مجھے سعد کے ذہن پر توجہ دینی پڑی۔

کسی بھی فرد واحد کیلئے یہ ممکن نہیں کہ وہ شب و روز جاگ کر اپنے فرائض ادا کرتا رہے۔ یہی معاملہ سعد کے ساتھ تھا۔ عموماً رات کے وقت وہ سو جاتا تھا۔ اس کے ماتحت رات کو حفاظتی بندوبست سنبھالتے تھے۔

سعد گہری نیند میں تھا کہ اس کا ایک ماتحت دوڑتا ہوا آیا اور اسے جگا کر خبر دی کہ قصر کے مرکزی حصے سے کسی کو نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ فوری طور پر سعد نے خلیفہ ہادی کی خواب گاہ کا رخ کیا۔ پھر اسی نے خلیفہ کے مردہ پائے جانے کی خبر اس کے لواحقین کو دی' اسی کے ساتھ طبیب خاص کو بلوا لیا۔ اپنے سوال کا جواب مل جانے پر میں نے سعد کے ذہن سے توجہ ہٹا لی۔ اسی لمحے مجھے طبیب خاص کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے۔ سعد کے استفسار پر وہ کہنے لگا۔ "اس میں تو کسی قسم کے شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ امیر المومنین ابو محمد موسیٰ الہادی کا انتقال ہو چکا ہے' لیکن مجھے شبہ ہے کہ ان کی موت طبعی نہیں بلکہ....."

طبیب خاص کچھ کہتے کہتے رک گیا تو سعد بول اٹھا۔ "تو پھر؟..... امیر المومنین کے انتقال کی وجہ کیا ہے؟"

"حتمی طور پر کچھ کہنا تو مشکل ہے مگر..... مگر شاید امیر المومنین کا گلا گھونٹ کر مارا گیا

ہے۔ ان کی گردن دیکھ کر مجھے ایسا ہی لگا۔"

"لیکن کون؟..... امیر المومنین کو کون....." سعد بوکھلا گیا۔ "یہ کیسے ممکن ہے جب کہ محافظ دستے کے سپاہی پوری طرح چوکنا تھے۔"

"مجھے جو شک تھا میں نے اس کا اظہار کر دیا' باقی آپ لوگ جانیں۔" طبیب خاص کہنے لگا۔

میں نے بھی قریب جا کر خلیفہ ہادی کی لاش اور اس کے بستر کا جائزہ لیا تو طبیب خاص کا شک درست معلوم ہوا۔ خواہ کوئی آدم زاد کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو' وہ اپنا گلا دبائے جانے کی صورت میں کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں ضرور مارتا ہے۔ جگہ جگہ سے ہادی کے بستر کو سکڑے سمٹے دیکھ کر یہی پتا چلتا تھا کہ اس نے بھی موت سے بچنے کیلئے جدوجہد کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ بے ہوش خادم' خواب گاہ کا کھلا دریچہ اور ایک حبشی لونڈی کو بھاگتے دیکھا جانا' تمام شواہد اسی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ خلیفہ ہادی کو قتل کیا گیا تھا۔ اسے قتل کرنے والی وہی سیاہ فام لونڈی لیلیٰ ہو سکتی تھی۔ جسے خود میں نے بھی بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔

میرے نزدیک خادموں کی بے ہوشی کا سبب ایک ہی ممکن تھا کہ ان دونوں کے کھانے میں بے ہوش کر دینے والی کوئی دوا ملا دی گئی ہو۔ مطبخ (باورچی خانہ) کے کسی ملازم یا ملازمہ کے ذریعے یہ کام بآسانی ہو سکتا تھا۔ ان دونوں کو رات بھر خلیفہ کی تیمارداری کرنی تھی' وہ اسی لئے اپنی قیام گاہوں سے رات کا کھانا کھا کر ہی چلے ہوں گے۔ خلیفہ کی خواب گاہ میں آنے کے کچھ دیر بعد بے ہوشی کی دوا اثر کرنے لگی ہو گی۔ یہی ان کے بیانات سے ظاہر تھا۔ اس پورے ہنگامے اور المیے کا مرکزی کردار میری نظر میں ملکہ خیزران کی حبشی لونڈی لیلیٰ ہی تھی۔ اس وقت میری سماعت میں ملکہ خیزران کے وہ الفاظ گونج رہے تھے' جب اسے خلیفہ ہادی نے زہر دلوانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ تب ملکہ خیزران نے ہارون سے کہا تھا' ہادی کی یہ جسارت ہم پر قرض ہے اور ہم یہ قرض وقت پر چکائیں گے۔ سو آج قرض چکانے ہی کی رات تھی۔

میرا اندازہ درست تھا یا محض واہمہ' یہ معلوم کرنے کی غرض سے میں حبشی لونڈی لیلیٰ کے پاس پہنچ گئی۔ لیلیٰ کا ذہن پڑھ کر مجھے سب پتا چل گیا' ملکہ خیزران نے اپنی اسی وفادار لونڈی کے ذریعے اپنے نافرمان' خودسر اور ضدی بیٹے خلیفہ ہادی کو مروا دیا تھا۔ ملکہ نے لونڈی کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ اسے خلیفہ کی خواب گاہ میں خادم بے ہوش ملیں گے۔ ایسا ہی ہوا تھا۔

لیلیٰ جاتے ہوئے تو کسی طرح چھپ چھپا کر نکل گئی تھی' مگر واپسی میں محافظ دستے کے ایک سپاہی نے اسے دیکھ کر شور مچا دیا تھا۔ اس کے باوجود لیلیٰ بچ کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ لیلیٰ ہی نے خلیفہ ہادی کا گلا دبایا تھا جو بیماری اور کمزوری کے سبب اپنی حفاظت نہ کر سکا۔

یہ واقعہ ربیع الاول 170 ہجری کی سولھویں تاریخ کا ہے۔ یہ عجیب رات تھی۔ اسی رات کو خلیفہ ہادی کا انتقال ہوا اور ہارون الرشید تخت و تاج کا وارث ٹھہرا۔ وہ خلفائے عباسیہ کا پانچواں تاجدار تھا۔ اسی شب مستقبل کا ایک اور نامور خلیفہ مامون الرشید عالم وجود میں آیا۔ قصر خلافت کا شاید ہی کوئی رہنے والا ایسا ہو جو نہ جاگ اٹھا ہو۔ اراکین حکومت قصر میں آنے لگے تھے۔ خلیفہ ہادی کے انتقال کی خبر قصر خلافت تک محدود نہ رہ سکی تھی۔

اپنے انسانی قالب میں واپس جانے سے پہلے میں نے ہارون الرشید کا ردعمل جاننا ضروری سمجھا۔ میں یہ بھی پتا لگانا چاہتی تھی کہ ہارون بھی کیا اپنی ماں ملکہ خیزران کے قاتلانہ اقدام سے واقف تھا؟

میں جب ہارون کی اقامت گاہ میں داخل ہوئی تو یحیٰ بن خالد کو دیکھا۔ اس نے ہارون کی نشست گاہ میں قدم رکھا ہی تھا۔ ہارون کے خادم خاص مسرور نے یحیٰ سے بیٹھنے کو کہا اور پھر اندر چلا گیا۔

ذرا ہی دیر میں ہارون نشست گاہ کے اندرونی دروازے سے آیا تو چہرے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ابھی جاگا ہے۔

یحیٰ نے اٹھ کر اسے تعظیم دی اور ''امیر المومنین'' کہہ کر خلافت کی مبارکباد دی۔

''تم کب تک ہمیں اسی طرح خلافت کا مژدہ سناتے رہو گے!'' ہارون کے لہجے میں بیزاری جھلک رہی تھی۔ ''دیکھ یحیٰ' یہ مذاق اچھا نہیں ہے اگر برادر بزرگ ہادی کے کان تک یہ خبر پہنچ گئی تو یقیناً ہمارے حق میں بہتر نہ ہوگا۔ یہ فیصلہ آنے والے وقت پر چھوڑ دو کہ......''

''غلام قطع کلامی کی معافی چاہتا ہے حضور!'' یحیٰ بول اٹھا۔ ''وقت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے۔''

''کیسا فیصلہ؟......ہم سمجھے نہیں۔'' ہارون کے لہجے میں حیرت تھی۔

میری توجہ اس وقت ہارون کے ذہن ہی پر تھی۔ اسے کچھ ہی دیر پہلے اٹھایا گیا تھا۔ واقعی وہ اپنے بڑے بھائی ہادی کے انتقال سے واقف نہ تھا۔ پہلی بار یہ خبر اس نے یحیٰ ہی سے سنی۔

ابھی یہ گفتگو تمام نہ ہونے پائی تھی کہ ایک خادمہ نے ہارون کو بیٹے کی پیدائش کا مژدہ

سنایا۔ ہارون نے اس کا نام عبداللہ رکھا اور پھر یہی عبداللہ مامون الرشید کہلایا۔ اس کا نام بھی تاریخ میں محفوظ ہو گیا۔

ہادی کے انتقال سے ہارون کی بے خبری کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ وسیع و عریض قصر خلافت کا مرکزی حصہ اس کی اقامت گاہ سے خاصا دور تھا۔ وہاں تک شور اور رونے پیٹنے کی آوازیں نہیں پہنچ سکی ہوں گی۔ جن افراد کو ہادی کی موت کا علم ہو چکا تھا ان میں سے کم ہی ایسے تھے جو ہارون کو جگا کر یہ اطلاع دینے کی جسارت کرتے۔ انہی کم افراد میں یحیٰ تھا۔

یحیٰ سے تمام احوال سن کر ہارون کہنے لگا۔ ''پھر تو ہمیں چل کر یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنا چاہیے۔''

''بلاشبہ اے امیر المومنین!'' یحیٰ بولا۔ اس بار ہارون نے امیر المومنین کہنے پر اسے نہیں ٹوکا۔

خلیفہ ہادی نے نوجوانی میں موت پائی۔ اس نے اپنے مرنے پر نو اولادیں چھوڑیں۔ ان میں جعفر سمیت سات لڑکے تھے۔ جعفر ہی کو ہادی اپنا ولی عہد بنانا چاہتا تھا۔ سات لڑکوں کے علاوہ دو لڑکیاں تھیں۔

دوسرے روز بعد نماز فجر ہارون نے ہادی کی نماز جنازہ پڑھائی۔ قصر خلافت کے عقبی میدان میں ہادی کی تدفین ہوئی۔

امرائے سلطنت میں ہرثمہ بن ایمن بڑا باعزت و باوقار تصور کیا جاتا تھا۔ اس نے بقیہ امراء کی نمائندگی کرتے ہوئے ہارون الرشید کو دربار عام میں لا کر تخت خلافت پر بٹھا دیا۔ یہ منظر میرے لئے بڑا دل خوش کن تھا۔ اپنے باپ مہدی کے بعد میری نظر میں ہارون ہی خلافت کا اہل تھا' ہادی نہیں۔ ذہین و باحوصلہ ہارون جب خلیفہ بنا تو اس کی عمر 22 برس تھی۔ نوجوانی میں بھی اس کا ذہن تجربے کار بوڑھوں سے کہیں زیادہ تیز تھا۔ خلیفہ بنتے ہی ہارون نے یحیٰ بن خالد کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ یہ وہی یحیٰ بن خالد برمکی تھا جو ہارون کا اتالیق تھا اور جس نے ہارون کی حمایت کے سبب قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔

آدم زادوں کے نزدیک حکومت و اقتدار کی اہمیت کتنی ہے' میں ایک جن زادی ہو کر اس کا اندازہ بخوبی لگا سکتی تھی۔ منصب و جاہ کی خاطر آدم زاد خون کے رشتوں کو بھی پس پشت ڈال دیتے ہیں' مگر دنیا میں خالی ہاتھ آتے اور خالی ہاتھ ہی یہاں سے جاتے ہیں۔ ہادی نے اپنے باپ مہدی کا حکم نہ مانا' نافرمانی کی اور گمان غالب یہ ہے کہ اسی نے باپ کو زہر دلوایا۔ اس گمان کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ ہادی نے اپنی ماں ملکہ خیزران کو بھی چھوٹے بیٹے

ہارون کی حمایت کرنے پر راستے سے ہٹانا چاہا۔ قرائن وشواہد سے ظاہر ہے کہ ہارون پر قاتلانہ حملہ اسی کے ایما پر ہوا جو ناکام رہا۔ کسی کو خبر ہو نہ ہو مجھے معلوم ہے کہ ملکہ خیرزان کے حکم پر ہی اس کی لونڈی لیلیٰ نے ہادی کا گلا دبا کر مار ڈالا۔ گویا ایک آدم زادی نے اپنی ہی کوکھ سے جنم لینے والے کو قتل کرا دیا۔

ہم جنات کے مقابلے میں آدم زادوں کی عمریں بہت تھوڑی ہوتی ہیں مگر تھوڑی سی عمروں ہی میں یہ بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں۔ سو ہارون الرشید بھی اپنی کم عمری کے باوجود بڑا لائق و فائق تھا۔ وہ اسی بنا پر لائق و نالائق اور دوست و دشمن کی تمیز کرنا اچھی طرح جانتا تھا۔ موصل کے عامل عبدالملک بن صالح کو ہارون بھولا نہیں تھا۔ یہ وہی تھا جس کی وجہ سے موصل میں رہنا اس کیلئے مشکل ہو گیا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ بغداد آنا ہارون کیلئے بہتر ہوا، عبدالملک کا سلوک اس کے ساتھ نامناسب تھا۔

خلیفہ مہدی کے زمانے سے عبدالملک اپنے خوشامدی مزاج کے سبب عامل موصل بنا ہوا تھا۔ یحییٰ بن خالد کو عہدہ وزارت دینے کے بعد ہارون نے جو پہلا حکم دیا، وہ عبدالملک بن صالح کی معزولی ہی کے بارے میں تھا۔ ہارون نے عبدالملک کی جگہ اسحاق بن محمد کو موصل کا نیا عامل مقرر کیا۔ تخت خلافت پر متمکن ہونے کے بعد ہارون نے کچھ ہی روز میں انتقامی نقطہ نظر سے عمال کے تقرر و تبدیلی کے احکام صادر کئے۔ ہارون نے اس ضمن میں اپنے وزیر یحییٰ کے مشوروں کو بڑی اہمیت دی۔ یحییٰ کو وسیع تر اختیارات حاصل تھے۔ اس نے کسی ایسے عامل کو عہدے پر نہ رہنے دیا جو ماضی میں ہارون کے خلاف اور ہادی کا ہم نوا تھا۔

ہارون خلیفہ بن گیا تو قصر خلافت کے سکونتی حصے میں سوائے اس کے کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ قصر کا جو مرکزی حصہ حفاظت و نگہبانی کے اعتبار سے خلفاء کیلئے مخصوص تھا ہارون بھی وہیں منتقل ہو گیا۔ ہادی کی بیوہ اور بچے ہارون کے اقامتی حصے میں چلے گئے۔

عارج اور میں حسب سابق خلیفہ وقت کے خادموں میں شامل تھے۔ ہادی کی موت سے ہماری ذمے داریاں بدلی نہیں تھیں۔ ہم نے ایوب اور جمیلہ کے انسانی قالبوں میں پناہ لے رکھی تھی۔

ہارون جب موصل میں تھا تو اس کی ملاقات استاد ابراہیم موصلی سے ہوئی تھی۔ یہ شخص بیک وقت دو فنون میں کمال مہارت رکھتا تھا۔ ایک طرف تو وہ اپنے عہد کا نامور موسیقار تھا، دوسری جانب وہ ایک مشہور و ہر دلعزیز شاعر تھا۔ ہارون نے خلیفہ بننے کے بعد بھی استاد ابراہیم موصلی کو یاد رکھا اور اس کیلئے طلبی کا پروانہ موصل بھیج دیا۔

چند ہی روز بعد استاد ابراہیم موصلی دربار خلافت میں حاضر ہوا اور اس نے اپنی خوبصورت آواز میں ترنم کے ساتھ ہارون کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا۔ اس عربی قصیدے کے دو اشعار یہ تھے (ترجمہ)

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ آفتاب بیمار تھا، جب ہارون تخت نشین ہوا تو اس کی روشنی چمک اٹھی۔ دنیا نے اس کے اقتدار سے خوبی کا لباس پہن لیا کیونکہ ہارون اس کا خلیفہ اور یحییٰ اس کا وزیر ہے۔"

اس قصیدے سے خوش ہو کر ہارون نے استاد ابراہیم موصلی کیلئے دس ہزار درہم ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی فنکار کیلئے دربار خلافت سے وظیفہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس سے فنکاروں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔

ایک ابراہیم تو یہ تھا کہ جسے خلیفہ ہارون الرشید نے عزت بخشی تھی اور دوسرا ابراہیم وہ تھا جو ابراہیم حرانی کہلاتا تھا۔ دیوان الجند (فوج کا محکمہ) کے شعبہ سراغ رسانی کو ابراہیم حرانی کی تلاش تھی۔ مرحوم خلیفہ ہادی کے بچپن کا دوست اور اس کا دست راست، عیار، مفسد اور سازشی ابراہیم حرانی عہدہ وزارت پر فائز تھا۔ ہادی کی دوستی اور چاپلوسی میں وہ اس حد تک آگے بڑھ گیا تھا کہ اس نے ایک غلام سے ہارون پر قاتلانہ حملہ بھی کرایا تھا۔ اس ناکام حملے میں اسے ہادی کی تائید بھی حاصل تھی۔ ہارون سے ابراہیم حرانی کی مخالفت کا علم سبھی کو تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ جس رات خلیفہ ہادی کا انتقال ہوا، وزیر ابراہیم حرانی پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔ دوسرے دن صبح محلہ قرافہ میں اس کا محل نما عالی شان مکان خالی پایا گیا۔ وہ اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ یحییٰ بن خالد اور دیگر اہم اراکین سلطنت کی طرح یقیناً ابراہیم حرانی نے بھی ہادی کے انتقال کی خبر سن لی ہو گی۔

ابراہیم حرانی سے زیادہ اس کے اعمال کا علم کسے ہوتا۔ غالباً اسے اندازہ تھا کہ خلیفہ بنتے ہی اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس نے اسی سبب بغداد سے راہ فرار اختیار کر لی تھی۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ ابراہیم حرانی کہاں گیا ہے؟

جب بھی کوئی نیا حکمراں برسر اقتدار آتا ہے تو اس کے خلاف سازشوں اور بغاوتوں کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے ابراہیم حرانی کی روپوشی نہ صرف وزیر یحییٰ بن خالد بلکہ خلیفہ وقت ہارون الرشید کیلئے بھی باعث تشویش تھی۔ میں نے ایک رات اس سلسلے میں عارج سے بات کی۔ "تو جانتا ہے اے عارج کہ کسی آدم زاد کا پتا لگانا ہم جنات کیلئے کوئی مشکل کام نہیں۔ سابق وزیر ابراہیم حرانی کے جسم کی مخصوص بو کے ذریعے اس تک پہنچا جا سکتا

ہے۔"

"لیکن اے دینار! تجھے اس آدم زاد کو پکڑوا کر کتنی رکعت کا ثواب مل جائے گا؟" عارج بولا۔

"کیا تو واقف نہیں کہ ابراہیم حرانی کتنا بڑا فسادی ہے' وہ جہاں بھی جائے گا یا رہے گا تو ہارون کے خلاف فتنہ و فساد برپا کرے گا۔" میں' عارج کو سمجھانے لگی۔ "کیا معلوم کہ اب تک اندر ہی اندر اس سازشی آدم زاد نے یہ کھیل کھیلنا شروع بھی کر دیا ہو۔"

"اے دینار! سن کہ ہارون کے خلاف اگر کوئی فتنہ اٹھتا ہے یا بغاوت ہوتی ہے تو اسے ختم کرنے کی ذمے داری ہم پر نہیں۔"

"تیرا کہنا درست اے عارج مگر یہ تو سوچ کہ کسی سازش یا بغاوت سے کیا مسلمانوں کی مملکت کو نقصان نہیں پہنچے گا اور کیا اس کے نتیجے میں خلق خدا کا خون ناحق نہیں بہے گا؟" میں نے پرجوش آواز میں کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" عارج نے میرے خیال سے اتفاق کیا' پھر پوچھنے لگا۔ "اب تو ہی بتا کیا ہو؟"

"ہونا کیا ہے' میں آج ہی رات اس فسادی آدم زاد کو تلاش کر لیتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کے بعد؟" عارج نے پوچھا۔

"تلاش کا یہ سہرا میں کسی آدم زاد ہی کے سر باندھ دوں گی۔" میں اطمینان سے بولی۔ "وہ آدم زاد دیوان الجند کے شعبہ سراغ رسانی کا کوئی افسر بھی ہو سکتا ہے۔ اگر اس طرح کسی آدم زاد کو ترقی مل جائے تو اچھا ہے نا! میری کوشش ہو گی کہ وہ افسر ذہین اور اہل ہو۔"

"آدم زادوں پر مہربان اے جن زادی! میں تجھے اس نیکی سے تو نہیں روکتا لیکن اتنا دھیان میں رکھیو کہ آدم زاد بڑے ہی محسن کش ہوتے ہیں۔ ان پر جو احسان کرے یہ اسی کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوتے ہیں۔" عارج کہنے لگا۔

"فکر نہ کر' میں تیری نصیحت گرہ میں باندھ کے رکھوں گی۔ اچھا تو اب میں چلتی ہوں۔ ابراہیم حرانی کے جسم کی مخصوص بو میرے حافظے میں ہے۔ متعدد بار مجھے اس کے قریب جانے کا موقع ملا ہے۔" میں یہ کہتے ہی جمیلہ کے جسم سے باہر آ گئی۔ پھر میں نے جمیلہ پر گہری نیند مسلط کر دی اور عارج کو شوخ لہجے میں مخاطب کیا۔ "دیکھ لے کہ میں تجھ پر کتنا بھروسہ کرتی ہوں' تیرے پاس اس آدم زادی کو تنہا چھوڑے جا رہی ہوں۔"

"میں نے تو تجھ سے بھروسا کرنے کو نہیں کہا' نہ کر بھروسا! میں بھی چلتا ہوں تیرے ساتھ۔" عارج نے کہا۔ "بول چلوں؟"

☆......☆......☆

"بس رہنے دے! تیری پارسائی دیکھ چکی ہوں میں! مغل تاجدار ہمایوں کے عہد کی ایک کنیز دل آرام کو ابھی میں بھولی نہیں ہوں جس پر تو دل و جان سے عاشق ہو گیا تھا۔ اگر میں نے بروقت مداخلت کر کے تجھے شاہم بیگ کے جسم سے......"

"مجھے بھی سب یاد ہے۔" عارج نے میری بات کاٹ دی۔ "پہلے بھی میں تجھے ایک بار بتا چکا ہوں وہ میرا نہیں اس انسانی قالب شاہم بیگ کا قصور تھا جس کا طعنہ تو مجھے دیتی رہتی ہے۔" عارج نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

میں نے عارج کو "خدا حافظ" کہا اور ابراہیم حرانی کے جسم کی مخصوص بو اپنے حافظے میں تازہ کی۔ اس بو کا تعاقب کرتی ہوئی میں بغداد سے نکلی اور کچھ ہی دیر میں موصل کی طرف ہو لی۔ رات کا ابھی ایک پہر گزرے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس آدم زاد ابراہیم حرانی کی تلاش میں مجھے اتنا طویل سفر کرنا پڑے گا۔

میرے لئے یہ امر باعث حیرت ہی تھا کہ میں نے ابراہیم حرانی کو موصل کے نئے عامل اسحاق بن محمد کے عالی شان اور وسیع و عریض مکان میں دیکھا۔ مکان کا وہ گوشہ قدرے الگ تھلگ اور مہمانوں کیلئے مخصوص تھا۔

مجھے اپنی پراسرار قوتیں بروئے کار لا کر یہ جاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ ابراہیم اور اسحاق دونوں پرانے دوست ہیں۔ برے وقت میں ابراہیم کو اسحاق ہی یاد آیا تھا۔ جس وقت میں وہاں پہنچی تو مکان کے اس مخصوص حصے کی نشست گاہ میں دونوں دوست نشے کی خاطر نبید پی رہے تھے۔ اسی عالم میں ابراہیم کہنے لگا۔ "کاش ہمیں دو ایک روز کی مہلت ہی مل جاتی تو آج حالات مختلف ہوتے۔ جو شخص اس وقت خلیفہ بنا ہوا ہے وہ ہمارا محکوم ہوتا۔"

"اے میرے دوست! مجھے تو ایک اور حیرت ناک خبر ملی تھی۔" اسحاق نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "اپنی جان کے خوف سے میں آج تک یہ بات اپنی زبان پر نہیں لایا۔ اس کے باوجود میرا دل گواہی دیتا ہے کہ خبر سچی ہے۔"

"مجھے بھی تو پتا چلے کہ وہ خبر کیا ہے جو تمہیں معلوم ہے اور میں اس کے بارے میں نہیں جانتا۔" ابراہیم پرتجسس آواز میں بولا۔

"میں نے یہ کب کہا کہ تم اس خبر سے لاعلم ہو گے۔" اسحاق کہنے لگا۔ "میں تو محض

اپنے متعلق بتا رہا تھا۔''

''خیر بحث چھوڑو اور وہ خبر بتاؤ جسے تم اب تک زبان پر نہیں لائے۔'' ابراہیم نے اصرار کیا۔

''یہ خبر مجھے بغداد ہی میں مل گئی تھی کہ خلیفہ ہادی بیماری کے سبب نہیں مرے بلکہ انہیں قتل کرایا گیا ہے۔'' اسحاق کی آواز دھیمی ہو گئی۔

''اور کیا تم یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ خلیفہ کو قتل کرانے والا کون ہو سکتا ہے؟'' ابراہیم نے سوال کیا۔ جب اسحاق چپ بیٹھا رہا تو ابراہیم نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ ''قتل وہی کرا سکتا ہے جسے اس سے فائدہ پہنچ سکے۔ اب سمجھے کچھ!''

ابراہیم کا واضح اشارہ ہارون کی طرف تھا' مگر اسحاق مصلحتاً یہ نام زبان پر نہیں لایا اور صرف اتنا کہا۔ ''ہاں سمجھ گیا۔''

''اگر سمجھ ہی گئے ہو تو پھر ڈرتے کیوں ہو! اپنی زبان پر ہارون الرشید کا نام کیوں نہیں لاتے۔''

''آہستہ بولو ابراہیم! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' اسحاق نے اپنے دوست ابراہیم کو تاکید کی۔

''ویسے تم اور میرے دیگر با اختیار دوست اور امراء ساتھ دیں تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ خلیفہ ہادی کا بیٹا جعفر زندہ ہے۔ اس حقیقت کی گواہی دینے والے متعدد بااثر افراد مل جائیں گے کہ خلیفہ مرحوم اپنے بیٹے جعفر کو ولی عہد بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ جن امراء اور اراکین سلطنت نے خلیفہ ہادی کے حکم سے جعفر کے ہاتھ پر ولی عہد کی بیعت کر لی تھی انہی میں ایک میں بھی ہوں۔'' ابراہیم نے انکشاف کیا۔

''لیکن اے ابراہیم' اگر یہ کوشش جس کا تم نے ذکر کیا' کامیاب ہو بھی گئی تو ہمیں کیا ملے گا؟...... خلیفہ تو ہادی کا بیٹا جعفر ہوگا۔''

''ہاں' نام اسی کا ہوگا اور کام' یعنی اقتدار ہمارا۔'' ابراہیم کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

''سوچیں گے اس تجویز پر!'' اسحاق کے ان الفاظ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہارون کے خلاف اس سازش کا حصہ بننے پر آمادہ تھا۔ خود یہ دیکھنے اور جاننے کے بعد کہ ابراہیم حرانی کہاں پناہ لئے ہوئے ہے میں بغداد لوٹ آئی۔ اس فتنہ پرور آدم زاد کے ارادے بہت خطرناک تھے۔ ایسی صورت میں فوری طور پر اس کا زیر دام آنا ضروری ہو گیا تھا۔

جن انتہائی مطلوب افراد کی حکومت کو تلاش تھی ان میں سرفہرست ابراہیم حرانی کا نام تھا۔ ان مطلوب افراد کے بارے میں خلیفہ ہارون کا یہ حکم تھا کہ جہاں اور جس حال میں پائے جائیں انہیں قتل کر دیا جائے۔ ظاہر ہے اس حکم سے عامل موصل اسحاق بن محمد بھی واقف تھا' اس کے باوجود اس نے ابراہیم حرانی کو پناہ دی تھی۔ گویا اس طرح وہ خلیفہ کی نافرمانی کا بھی مرتکب ہوا تھا۔

یہ معاملہ ایسا نہیں تھا کہ جس میں تاخیر کی جاتی۔ دوسرے ہی دن موقع ملتے ہی میں اپنے انسانی قالب سے نکل کر حمزہ کے پاس پہنچ گئی۔ حمزہ دیوان الجند کے شعبہ سراغ رسانی کا نگراں تھا۔ اس کا دفتر بھی دیگر سرکاری محکموں کی طرح قصر خلافت کی حدود میں تھا۔

حمزہ کی عمر تیس برس سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ اس کے چہرے سے ذہانت کا پتا چلتا تھا۔ وہ اپنے عملے سے الگ اندرونی دالان میں اکیلا بیٹھا تھا۔ بغیر طلب کئے کسی کو اس کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی۔

''اے حمزہ!'' میں نے اسی کی آواز میں اسے مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھا۔

''یہ...... یہ تو میری...... میری ہی آواز ہے۔'' حمزہ بڑبڑایا۔

''ہاں میں تیرے ہی باطن کی آواز ہوں۔'' میں نے آزمودہ ''نسخے'' پر عمل کیا' پھر کہا۔ ''اگر امیر المومنین تجھ سے ابراہیم حرانی کی بابت سوال کریں تو نے اب تک اسے گرفتار کیوں نہیں کیا تو تیرا جواب کیا ہوگا؟''

''یہی کہ اس کی تلاش جاری ہے اور ابھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔'' حمزہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''لیکن اسے تو امیر المومنین تیری نااہلی تصور کریں گے۔'' میں بولی۔

''تو پھر...... پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟'' حمزہ کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہونے لگا۔ ''میں نے اسے اس کے تمام عزیز و اقارب میں تلاش کرایا' بغداد میں بھی اور دیگر دوسرے شہروں نجف و کوفہ میں بھی کہ جہاں اس کے رشتے دار رہتے ہیں۔''

''رشتے داروں کے علاوہ کیا تو نے اس کے دوستوں کو بھی ٹٹولا۔ ابراہیم اپنے دوستوں کے پاس بھی تو پناہ لے سکتا ہے۔''

''اس کے صرف ایک دوست اسحاق بن محمد کے سوا سبھی سے تفتیش کی جا چکی ہے۔'' حمزہ نے بتایا۔

''کیوں اسحاق بن محمد کو تفتیش سے مستثنیٰ کیوں قرار دیا گیا؟'' میں نے دریافت کیا۔

”اس کے کئی اسباب تھے۔“ حمزہ کہنے لگا۔ ”پہلا سبب تو یہ کہ امیر المومنین کی نظر میں اسحاق بن محمد شک و شبے سے بالاتر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسحاق کو موصل کا عامل بنا کے نہ بھیجا جاتا۔ دوسرا سبب یہ کہ حکومت کے کسی بھی عامل سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی مطلوب و معتوب شخص کو پناہ دے سکتا ہے۔ اگر ابراہیم حرانی اس غرض سے موصل پہنچتا تو اسحاق اسے گرفتار کر کے بغداد بھیج دیتا۔“

”اسحاق سے اس لئے بھی تو تفتیش نہیں کی گئی کہ بغداد سے موصل کافی فاصلے پر واقع ہے۔“

”ہاں ایک سبب یہ بھی تھا۔“ حمزہ نے اعتراف کیا۔

”ایسی صورت میں کہ ابراہیم حرانی موصل ہی میں ہوا اور اس کی خبر امیر المومنین کو ہو گئی تو تم کیا کرو گے؟“

میرے سوال نے حمزہ کو مضطرب کر دیا۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگا۔

”میرے حق میں یہ کسی طرح بہتر نہ ہو گا۔“

”تو پھر تمہیں آج ہی بلا تاخیر موصل کیلئے روانہ ہو جانا چاہیے تم اپنے عملے کے با اعتماد افراد کو موصل ساتھ لے جاؤ۔ تمہیں اپنے عملے کے ساتھ بس اچانک ہی عامل موصل کے مکان پر چھاپا مارنا ہو گا تم اپنے شعبے کے نگراں ہو اور تمہیں وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ یقیناً تمہیں یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ امیر المومنین کیلئے ابراہیم حرانی کا سر کتنا قیمتی ہے!“ میں نے حمزہ کو ترغیب دی۔

میری ترغیب کا اثر حمزہ پر مثبت ہوا ورنہ مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑتا۔ میں اسے اپنے اثر میں لے کر موصل جانے پر مجبور بھی کر سکتی تھی۔ یہ نوبت نہیں آئی۔ حمزہ اسی روز موصل روانہ ہو گیا۔ مجھے امید بندھ گئی کہ اب ابراہیم حرانی' ہارون الرشید کے خلاف کسی سازش کے تانے بانے نہیں بن سکتا۔ اس سے قبل ہی حمزہ اسے زیر دام لے آئے گا۔

اسی روز رات کو جب میں' عارج کو اپنی کارگزاری سے آگاہ کر چکی تو وہ کہنے لگا۔

”موصل کے ذکر پر یاد آیا اے دینار کہ ان دنوں شہر میں موصل سے ایک بزرگ آیا ہوا ہے شہر بھر میں اس کے کمالات کی بڑی دھوم ہے۔“

”تجھے کس نے اس بزرگ کے بارے میں بتایا؟“ میں نے پوچھا۔

”خادم عبدالرحمٰن کو تو جانتی ہے اس کے کچھ عزیز محلہ کرخ میں رہتے ہیں۔“ عارج نے بتایا۔ ”وہ اپنے عزیزوں سے ملنے گیا تھا تو وہاں اس بزرگ کا نام سنا' وہ بزرگ کچھ عرصہ

سے محلہ کرخ کے ایک مکان میں ٹھہرا ہوا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ بزرگ نے وہ مکان کرائے پر لیا ہے' کچھ کہتے ہیں کہ اس نے مکان خرید لیا ہے اور......“

”کمالات کیا دکھاتا ہے وہ بزرگ؟“ میں نے عارج کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”عبدالرحمٰن نے کچھ بتایا۔“

”کہہ رہا تھا کہ اس نے تو اپنی آنکھوں سے بزرگ کا کوئی کمال نہیں دیکھا مگر سنا ہے' اس کے قبضے میں جنات ہیں ان جنات سے وہ جو چاہتا ہے' کام لیتا ہے مگر مناسب معاوضہ طے کئے بغیر کسی کا کوئی کام نہیں کرتا۔“ عارج نے جواب دیا۔

”مجھے تو یہ کوئی جعلی بزرگ لگتا ہے جو لوگوں کو ٹھگنے کی غرض سے بغداد آیا ہے۔“ میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ ”جو واقعی بزرگ ہوتے ہیں وہ بلا معاوضہ خلق خدا کی خدمت کرتے ہیں۔“

”میں نے تو تجھے اس لئے یہ بات بتائی ہے کہ اس کے قبضے میں جنات بھی ہیں۔“ عارج نے اس طرح کہا جیسے مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو لیکن اس کے لہجے سے غیر سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ اپنی بات عارج نے جاری رکھی۔ ”اے دینار! کہیں وہ تجھے یا مجھے قبضے میں نہ کر لے۔“

”ٹھیک کہتا ہے تو!“ میں دھیرے سے ہنس دی۔ ”ان آدم زادوں کا کیا بھروسا۔“

”چلیں کسی روز اس بزرگ کا دیدار کرنے؟ صرف دو قیراط ہی تو خرچ ہوں گے۔“ عارج بولا۔

”کیا مطلب؟ دو قیراط کس بات کے؟ کیا وہ ملاقاتیوں سے بھی معاوضہ لیتا ہے؟“

”ہاں“ عارج نے جواب دیا۔ ”عبدالرحمٰن یہی بتا رہا تھا اس کے آستانے میں قدم رکھتے ہی آنے والے کو ایک قیراط دینا پڑتا ہے اگر کوئی ایک قیراط نہ دے تو بزرگ کے خادم اسے اندر نہیں جانے دیتے۔“

پھر عارج کے ضد کرنے پر آئندہ روز بعد نماز عشاء اس بزرگ کے آستانے پر جانے کو آمادہ ہو گئی۔ عارج نے کہا تھا کہ وہ خادم عبدالرحمٰن سے اس بزرگ کے مکان کا پتا معلوم کر لے گا۔ میری رائے یہی تھی کہ وہ کوئی جعلی بزرگ ہے اس نے اپنا ”دھندا“ چلانے اور لوگوں کی جیبیں خالی کرانے کے لئے مشہور کیا ہے کہ اس کے قبضے میں جنات ہیں۔“

عموماً عشاء کے بعد تک ہمارے کام نمٹ جاتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر رات کے وقت دوسرے خادم سے کام لیا جاتا تھا۔ ہم اسی لئے رات کا کھانا کھا کر قصر خلافت سے نکل

گئے۔ دانستہ ہم نے اپنے انسانی قالب چھوڑ دیئے تھے۔ میں اس جعلی بزرگ کو سبق سکھانا چاہتی تھی۔ اس کا اظہار میں نے عارج سے بھی کر دیا تھا۔ اس معاملے میں وہ مجھ سے متفق نہیں تھا۔ عارج کا کہنا یہ تھا کہ وہ آدم زاد' جعلی بزرگ ہو یا اصلی ہم اسے بلاوجہ نہ چھیڑیں۔ میری دلیل یہ تھی کہ خلق خدا کو اس آدم زاد کی جعل سازی اور لوٹ مار سے ہمیں بچانا چاہئے۔

عارج کی یہ بات میں نے بہرحال مان لی تھی کہ پوری طرح حالات کا جائزہ لئے بغیر اس بزرگ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی۔ عبدالرحمٰن کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق بعد نماز عشاء اس بزرگ کے آستانے پر بڑی بھیڑ ہوتی تھی جب عارج کے ساتھ میں وہاں پہنچی تو لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ مکان کے صدر دروازے پر دو موٹے تازے آدم زاد کھڑے تھے جو ہر آنے والے سے ایک قیراط وصول کر رہے تھے۔

مکان کے اندر بڑے سے ایک دالان میں چوکی پر گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے ایک آدم زاد بیٹھا تھا۔ اس کا سر اور پیٹ دونوں ہی غیر معمولی طور پر بڑے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں جیسے باہر کو ابلی پڑ رہی تھیں۔ وہ پست قد آدم زاد مجموعی طور پر خاصا مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چوکی پر صرف اتنی جگہ تھی کہ ایک فرد بیٹھ سکے۔ چوکی کے سامنے عورتیں اور مرد بھی بیٹھے تھے۔ باری باری وہ چوکی پر بیٹھے ہوئے مضحکہ خیز آدم زاد کے سامنے جاتے' جو کہنا ہوتا کہتے اور چلے آتے۔ کسی پر وہ بزرگ دم کرتا' کسی پر صرف ہاتھ پھیر دیتا اور کسی کو قریب رکھی صراحی سے ایک گھونٹ پانی پلا دیتا۔ میں نے کوئی ایسا فرد نہیں دیکھا جس سے اس بزرگ نے معاوضہ نہ لیا ہو۔ ابھی تک مجھے اس کا کوئی کمال نظر نہیں آیا تھا۔

معلوم نہیں کیوں اس آدم زاد کو دیکھ کر مجھے بصرہ شہر کا ''حضرت جی'' یاد آنے لگا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ''حضرت جی'' بھی خلق خدا کو لوٹتا تھا۔ متوسط عمر کی ایک آدم زادی اپنی جگہ سے اٹھ کو چوکی کی طرف بڑھی تو میں آگے لپکی۔

عارج شاید میرا ارادہ بھانپ گیا اور بولا۔ ''نہیں اے دینار! ایسا نہ کر!''

میں اس وقت تک آدم زادی کے جسم میں اتر چکی تھی۔ وقتی طور پر مجھے گھٹن محسوس ہوئی۔ اسی سبب میرے انسانی قالب کے قدم کسی قدر ڈگمگائے مگر جلد ہی میں نے خود کو سنبھال لیا اور چوکی پر چڑھ گئی۔ اسی لمحے مجھے بدبو کا بھبکا محسوس ہوا اور میں چونک اٹھی۔

بڑے سر اور بڑے پیٹ والے اس بزرگ نے میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

''اے بزرگ! تو مجھے ایک جن پکڑ کر دے دے۔'' میں نے کہا۔ ''سنا ہے تیرے قبضے میں بہت سے جنات ہیں۔''

''تو نے ٹھیک سنا ہے مگر وہ جنات میرے ہی قابو میں ہیں تیرے یا کسی اور کے قابو میں نہیں آسکتے۔'' بزرگ نرمی سے بولا۔

''کیوں میرے قابو میں نہیں آسکتے؟'' میں دانستہ چیخ اٹھی۔ ''تو نے اگر میری بات نہ مانی تو میں تیری پگڑی اتار لوں گی!''

''یہ عورت شاید پاگل معلوم ہوتی ہے۔'' بزرگ نے بلند آواز میں کہا' پھر حاضرین سے پوچھا۔ ''کوئی اس کے ساتھ ہے؟''

سامنے ہی بیٹھا ہوا ایک باریش بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔ ''حضور! اس کے ساتھ میں ہوں' یہ میری بہن ہے اور اسی طرح بہکی بہکی باتیں کرتی ہے آپ کے پاس میں اسی کا علاج کرانے آیا ہوں۔''

''ہم پاگلوں کا علاج نہیں کرتے۔ اسے یہاں سے لے جاؤ!'' بزرگ کے لہجے میں سختی آ گئی۔

''میں تو نہیں جاتی!'' میں نے یہ کہتے ہوئے اس بزرگ کے سر سے پگڑی کھینچ لی۔

''ارے ارے یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' وہ غصے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پگڑی کے بغیر اس کا بڑا سا گنجا سر مزید نمایاں ہو گیا تھا۔

میرا ارادہ تو وہاں ہنگامہ کرنے کا تھا ہی' سو اس مضحکہ خیز آدم کے کولہے پر لات ماری' وہ چوکی پر گر پڑا' پھر ایک دم اچھل کر میرے سامنے آ گیا۔ اس بار جب وہ بولا تو اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ میں ہی سن سکوں۔

''بہت ہو گیا اے دینار! اب یہاں سے چلی جا اور مزید رنگ میں بھنگ نہ ڈال! میں نے تجھے اس آدم زادی کے جسم میں بھی پہچان لیا ہے۔'' وہ کسی درندے کی طرح غرانے لگا۔ بڑی حد تک اس کی آواز اب غیر انسانی تھی۔

اس کی زبان سے اپنا نام سن کر میں تقریباً اچھل پڑی اور بے اختیار پوچھ بیٹھی۔ ''کون ہے تو؟''

''تو شاید مجھے نہ جانتی ہو' مگر میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں اے سردار اعصم کی بیٹی!'' وہ پھر غیر انسانی آواز میں کہنے لگا۔

''میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک تو مجھے اپنے بارے میں......''

''کیا کرے گی جان کر!'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میرے وجود کی بدبو سے تجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا؟ میں تو تجھے تیری خوشبو سے پہچان گیا۔''

"ہاں اندازہ کرلیا میں نے کہ تو کوئی کافر جن ہے اور...... اور شاید تیرا تعلق میرے ہی قبیلے سے ہے' مگر......"

"تجھے مجھ سے کچھ اور پوچھنا ہو تو آج نصف شب کو آ جائیو۔ میں اس وقت تیرے ہر سوال کا جواب دوں گا اب چلی جا۔" وہ بول اٹھا۔

اس لمحے عارج میرے قریب آ کر بولا۔ "اس کی بات مان لے اے دینار! ہم رات کو بھی آ سکتے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے ضد نہیں کی اور متوسط عمر کی آدم زادی کے جسم سے نکل آئی۔ کچھ تو یہ کہ میں نے جلدی کی کچھ وہ آدم زادی بیمار تھی اس لئے جھٹکا نہ سہہ سکی اور بے ہوش ہو گئی۔ اس کا باریش بھائی "میری بہن" کہتا ہوا آگے بڑھا۔

عارج کے ساتھ میں واپس قصر خلافت پہنچ گئی۔ ہم دونوں ایوب اور جمیلہ کے قالبوں میں اتر گئے۔

محلہ کرخ میں اس کافر جن زاد سے ملنے کے بعد میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ میں اسی وجہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور نیند کو اپنے انسانی پیکر کے ذہن سے جھٹک دیا۔ مجھے دیکھ کر عارج بھی اٹھ بیٹھا اور بولا۔ "کیا ہوا اے دینار! تو مضطرب سی لگتی ہے۔"

"ہاں۔" میں نے اقرار کیا۔ "اے عارج! سوال یہ ہے کہ جب میں اس کافر جن کو نہیں جانتی تو وہ مجھے کیسے جانتا ہے؟"

"تو مجھے ایک بات بتا کہ بابل کے کھنڈرات میں جتنے جنات آباد ہیں کیا ان سب کو جانتی ہے؟" عارج کے سوال کا جواب میں نے انکار میں دیا۔ وہ مزید کہنے لگا۔ "مگر تجھے غالباً سبھی جانتے ہیں' خواہ وہ کافر ہوں یا اہل ایمان! اس کا سبب یہ ہے کہ تو ان کے سردار کی بیٹی ہے۔ اب تیری سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ کافر جن تجھے تیری مخصوص خوشبو سے کس طرح پہچان گیا۔"

"چل تیری یہ بات مان لی میں نے اب میرے اس سوال کا جواب دے کہ جب وہ ایک جن زاد ہے تو حبہ و قیراط اور درہم دینار کی اسے کیا ضرورت پیش آ گئی؟ وہ کیوں آدم زادوں کو لوٹ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آئی اے دینار!" عارج نے کہا۔ "کسی جن زاد کیلئے مال و دولت کی کیا حیثیت! ...... اسے اگر ہماری طرح آدم زادوں کے درمیان رہنے کا شوق بھی ہے تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ غریبوں اور حاجت مندوں کی جیبیں خالی کرائے۔ اب تو یہ

عقدہ نصف شب کو اس سے مل کر کھل سکتا ہے۔ اس نے ہر سوال کا جواب دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

"لیکن یہ نہ بھول اے عارج کہ وہ کافر ہے اور عالم کہتے ہیں' کسی کافر پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔" میں بولی۔

"پھر اس کے جھوٹ سچ کا پتا کیسے چلے گا؟" عارج نے سوال کیا۔

"ہم اس کی نگرانی کریں گے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ کیا سچ ہے' کیا جھوٹ ہے!" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو بلاوجہ کی مصیبت پالنا ہے اے دینار!" عارج کے لہجے میں بیزاری تھی۔ "وہ جو چاہے کرے' ہم اس سے الجھیں ہی کیوں۔"

"واہ یہ بھی تو نے خوب کہی!" میں نے کہا۔ "کوئی بھی ہمارے سامنے خلق خدا کو لوٹتا رہے اور ہم خاموش تماشائی بنے رہیں۔"

دیر تک عارج اور میں نے اس مسئلے پر بحث کی۔ عارج کو میں نے بہرحال قائل کر دیا کہ ہمیں چپ نہیں رہنا چاہئے۔

آدھی رات کو ہم اپنے انسانی قالبوں سے باہر آ کر قصر خلافت سے نکلے۔ محلہ کرخ میں کافر جن زاد کے مکان تک پہنچنے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔ اندھیرے مکان میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مکان خاصا بڑا تھا۔ ہم ایک دالان سے دوسرے اور پھر تیسرے دالان میں داخل ہوئے۔ ایک دالان میں ہمیں دو آدم زاد خادم سوتے نظر آئے۔ انہیں ہم گھر کے دروازے پر لوگوں سے قیراط وصول کرتے دیکھ چکے تھے۔

"یہاں تو وہ کہیں بھی دکھائی ہی نہیں دے رہا۔" عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔

اسی لمحے تاریک دالان کے ایک گوشے سے آشنا غیر انسانی آواز سنائی دی۔ "اپنی حفاظت کے خیال سے میں نے اندھیرے کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ اپنے مضحکہ خیز انسانی قالب میں ظاہر ہو گیا اور کہنے لگا۔ "اے دینار! یہ اچھا ہوا کہ تو جس آدم زادی کے جسم میں اتری وہ پاگل تھی' سو بات بن گئی۔ مجھے تجھ سے پوچھنا یہ ہے کہ تو نے بھلا کیوں میرے ساتھ ایسا کیا؟ ...... آدم زادوں کے سامنے مجھے بے عزت کر کے تجھے آخر کیا مل جاتا؟ ...... یہ کوئی اچھی بات تو نہ ہوئی۔"

"پہلے تو مجھے اپنا نام بتا' باقی باتیں اس کے بعد ہوں گی۔" میں نے پوچھا۔ اس نے اپنا نام سعر بتایا تو میں بولی۔ "اے سعر! میں یہاں تیرے سوالوں کے جواب دینے نہیں آئی

بلکہ مجھے جو تجھ سے پوچھنا ہے وہ بتا۔"

"تو پھر پوچھ! میں جواب دوں گا۔" مسعر کہنے لگا۔

"بول اے مسعر کہ تو آدم زادوں کی اس بستی میں کیوں آیا ہے؟" میں نے پہلا سوال کیا۔

"یہی سوال اگر میں تجھ سے کروں اے سردار اخضم کی بیٹی تو تیرے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟" مسعر نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں یہاں آدم زادوں کی خدمت کرنے آئی ہوں۔" میں نے بلا جھجک جواب دیا۔ "اب تو اپنا مقصد بیان کر۔"

"یہاں آنے سے میرا کوئی ایک مقصد نہیں۔" مسعر بولا۔ "تجھے خبر ہے اے دینار کہ یہ شہر بغداد اہل ایمان کی عظیم مملکت کا دارالحکومت ہے۔ یہ بتانے کی بھی تجھے ضرورت نہیں کہ کفر و ایمان میں ازل سے جنگ جاری ہے۔ میری یہاں آمد کا ایک مقصد یہ ہے کہ میں اہل ایمان کے عقائد کو مختلف حیلے بہانوں سے کمزور کردوں۔ وہ شرک میں مبتلا ہو جائیں اور اللہ کے سوا پتھر کی ان مورتیوں کے آگے بھی سر جھکانے لگیں جو میں چوری چھپے ان میں بانٹتا رہا ہوں۔ روحانی نقصان پہنچانے اور انہیں ان کے عقیدے سے بھٹکانے کے علاوہ میں مختلف کاموں کا معاوضہ وصول کر کے انہیں مالی طور پر بھی نقصان پہنچاتا ہوں۔"

"اگر تجھے اس قبیح اور ظالمانہ فعل سے بہ جبر روک دیا جائے اے مسعر؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اے دینار! یہ تیرے لئے ممکن نہ ہوگا۔" مسعر کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا۔ "تجھے اگر میرے بارے میں مزید حقائق کا علم ہوتا تو یقیناً تو وہ الفاظ نہ کہتی جو کہے۔ تو نہیں جانتی اے دینار کہ تیری طرف کتنا بڑا خطرہ بڑھ رہا ہے۔"

"مجھے یہ کہہ کر تو دھمکانا چاہتا ہے اے مسعر!" میں سخت آواز میں بولی۔

"میں نے تجھے دھمکی نہیں دی بلکہ حقیقت بیان کی ہے۔"

"دیکھ اے مسعر! بات نہ بڑھا۔" عارج نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا۔ "مصلحت سے کام لے اور ہم سے مصالحت کر لے۔ اگر تو نے ہماری بات مان لی تو پھر ہم تیرا پیچھا نہیں کریں گے۔" عارج کا لہجہ مصالحانہ تھا۔

"اے عارج! تو مجھ سے کیا بات منوانا چاہتا ہے؟ یہ معلوم ہو۔" مسعر براہ راست میرے بجائے عارج سے مخاطب ہوا۔

"میں بتاتی ہوں اے مسعر!" میں بول اٹھی۔ "تجھے یہ شہر چھوڑنا پڑے گا۔"

"اور اگر میں تیرا یہ مطالبہ نہ مانوں اے دینار!؟"

"تو تجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ تجھے ہم زبردستی اس شہر سے نکال دیں گے۔" میری آواز غصے کے سبب تیز ہو گئی۔ "ہم چاہیں تو ابھی اے مسعر! تجھے یہاں سے اٹھا کر بابل کے کھنڈرات میں پھینک آئیں۔"

"سن اے دینار!" عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بہتر یہ ہے کہ اتمام حجت کے طور پر ہم اسے کل رات تک کی مہلت دے دیں۔"

"ٹھیک ہے عارج!" میں مان گئی۔ "کل رات بھی یہ بغداد میں نظر آیا اور اس نے اہل ایمان زادوں کو راہ راست سے بھٹکایا تو پھر میں اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گی۔"

"عارج کے ساتھ میں اس مکان سے نکل آئی۔ واپسی میں عارج مجھے سمجھانے لگا۔

"اے دینار! اتنا غصہ نہ کیا کر۔"

"تو نے اس کافر جن زاد کی باتیں نہیں سنیں۔ کس طرح دھمکیاں دے رہا تھا۔"

"مجھے یہ دھمکیاں بلاوجہ معلوم نہیں ہوتیں۔" عارج کہنے لگا۔ "میں نے اسی لئے اس کافر کو کل تک کی مہلت دلوائی ہے کہ تجھ کو اس خطرے سے آگاہ کر سکوں۔ مسعر! کے پس پشت کوئی اور ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ ہم سے مصالحت پر آمادہ ہو جاتا۔"

"اللہ مالک ہے، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے عارج کو تسلی دی۔

دوسرے روز عارج کو ساتھ لئے میں قصر خلافت سے نکل کر کرخ پہنچ گئی۔ ہم دونوں ہی اپنے انسانی قالبوں سے باہر تھے۔

"اس کافر جن زاد نے تو آج رات بھی یہاں میلہ لگا رکھا ہے۔" میں یہ کہتی ہوئی غصے میں تیزی سے آگے بڑھی۔ عارج میرے پیچھے لپکا۔ جیسے ہی میں اس مکان کے صدر دروازے پر پہنچی اور اندر داخل ہونا چاہا کسی نادیدہ قوت نے مجھے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ یہی حال عارج کا ہوا تھا۔ میرے سارے وجود میں بجلیاں سی کوندرہی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وقتی طور پر میں گھبرا گئی تھی۔ جو واقعہ پیش آیا میرے لئے غیر متوقع تھا۔ عارج کی کیفیت مجھ سے کچھ مختلف نظر نہ آئی، زیادہ رنج و افسوس یہ تھا کہ ایک کافر جن زاد مسعر کو ہم نے آج رات تک بغداد چھوڑ دینے کی مہلت دی تھی اور وہ شہر میں موجود تھا، نہ صرف یہ بلکہ ہم نے اس کے مکان میں داخل ہونا چاہا تو ناکام رہے۔

''اے دینار! غم نہ کر اور یہاں سے چل۔'' معاً عارج نے مجھے مخاطب کیا۔

''میں نہیں جاؤں گی یہاں سے!'' میں نے غصے میں کہہ دیا۔ ''آخر وہ کافر جن زاد خود کو سمجھتا کیا ہے۔ میں اسے ضرور مزہ چکھاؤں گی۔''

''میں کب کہتا ہوں کہ تو ایسا نہ کیجیو لیکن اس کیلئے کچھ سوچنا سمجھنا پڑے گا' تو چل تو سہی۔''

عارج کے سمجھانے بجھانے کا یہ اثر ہوا کہ میں وہاں سے چلی آئی۔ وہاں موجود رہنے سے بھی کچھ حاصل نہیں تھا۔ اس کافر جن زاد تک پہنچنے کے بعد ہی تو میں اسے مزہ چکھاتی جونی الحال ممکن نہیں تھا۔ قصر خلافت کی طرف لوٹتے ہوئے عارج نے مجھے ایک اور معقول مشورہ دیا میں نے اس کا مشورہ قبول کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ان حالات میں عالم سوما بہتر طور پر ہماری رہنمائی کر سکے گا۔''

ہم نے اپنی پرواز کا رخ تبدیل کر لیا۔ اب ہم بابل کے کھنڈرات کی طرف اڑتے جا رہے تھے۔

جب عارج کو ساتھ لئے میں کھنڈرات کے اس حصے میں پہنچی جہاں عالم سوما کی سکونت تھی تو وہ ہمیں دیکھ کر حیران ہوا۔

''اے میرے بچو! خیریت سے تو ہو؟'' عالم سوما نے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا۔

''خیریت ہی تو نہیں اے عالم سوما! اے میرے باپ کے دوست!'' میں بول اٹھی۔ پھر عالم سوما کو از اول تا آخر سب کچھ بتا دیا۔ میں نے آخر میں دریافت کیا۔ ''کسی نادیدہ قوت کا ہمیں اٹھا کر دور پھینک دینا سمجھ نہیں آیا۔''

''سن اے دینار! پہلے میں تیری آخری بات کا جواب دیتا ہوں۔'' عالم سوما کہنے لگا۔ ''عمل دو طرح کے ہوتے ہیں رحمانی اور شیطانی۔ ہم اہل ایمان رحمانی مگر کفار شیطانی عمل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اکتیس دن کے بعد تو جو عمل کرتی ہے وہ رحمانی ہے وہ عمل کرنے سے تیرے گرد ایک ایسا نادیدہ حصار قائم ہو گیا ہے کہ کوئی عفریت بھی چاہے تو اس حصار میں داخل ہو کر تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ حصار مختلف اقسام اور نوعیت کے ہوتے ہیں' مخصوص وجود کے بجائے کسی مکان کے گرد بھی حصار کھینچا جا سکتا ہے۔ تم دونوں کو جو واقعہ پیش آیا وہ اسی نوع کا لگتا ہے۔ اس کافر جن زاد مسعر نے تم دونوں سے محفوظ رہنے کیلئے اپنے مکان کے گرد حصار کھینچ دیا ہو گا۔ تم یقیناً اسی نادیدہ حصار سے ٹکرا کر دور جا گرے ہو گے۔ یہ تمہارا محض احساس ہے جیسے تمہیں کسی قوت نے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ اگر میں نے درست

اندازہ لگایا ہے تو تمہیں اپنے وجود میں بجلیاں سی کوندتی لگی ہوں گی۔''

میرے کچھ بولنے سے پہلے عارج نے عالم سوما کے اندازے کی تصدیق کر دی پھر میں نے بھی تائید کر دی۔

عارج کہنے لگا۔ ''اے سوما! مجھے شک ہے کہ مسعر کے پس پشت کوئی اور ہے اپنے اس شک کا اظہار میں نے دینار سے بھی کیا تھا۔''

''تیرا شک درست بھی ہو سکتا ہے عارج!'' عالم سوما بولا۔ ''تم دونوں کا سراغ لگانے کیلئے عفریت دہموش اس کافر جن زاد مسعر کو اپنا آلہ کار بنا سکتا ہے ممکن ہے مسعر نے تمہاری توجہ حاصل کرنے کیلئے ہی یہ شہرت دی ہو کہ اس کے قبضے میں جنات ہیں۔''

''مسعر نے دینار سے یہ بھی کہا تھا کہ تو نہیں جانتی تیری طرف کتنا بڑا خطرہ بڑھ رہا ہے۔'' عارج نے عالم سوما کو بتایا۔

''اس امکان کو بہر حال رد نہیں کیا جا سکتا کہ مسعر کا اشارہ اسی عفریت کی طرف ہو۔'' عالم سوما نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

☆.....☆.....☆

''اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ عفریت ہی پس پردہ رہ کر مسعر کے ذریعے یہ کھیل کھیل رہا ہے تو پھر......'' میں کچھ کہتے کہتے رک کر مزید بولی۔ ''مگر مسعر کو ہمارے ٹھکانے کا علم نہیں۔''

''اے دینار! میں سمجھ رہا ہوں کہ تو کیا کہنا چاہتی ہے۔'' عالم سوما نے کہا۔ ''مسعر کے ذریعے اس عفریت کو اتنا تو پتہ لگ ہی جائے گا کہ تو بغداد ہی میں ہے' تجھے تو معلوم ہی ہے کہ وہ عفریت بھی کچھ عرصے پہلے بغداد آ چکا ہے۔''

''ہمیں بتا کہ ان حالات میں ہم کیا کریں۔'' میں نے سوال کیا۔

''تجھے اور عارج کو اب انتہائی چوکنا اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' عالم سوما نے تاکید کی پھر کہنے لگا۔ ''اگر کافر جن زاد مسعر کے ذریعے تجھے پھانسنے کیلئے یہ جال اس عفریت دہموش نے بچھایا ہے تو اس سے دور رہ یعنی مسعر کو بھول جا۔''

''لیکن وہ کافر جن زاد جس طرح اہل ایمان کے عقائد کو مختلف حیلے بہانوں سے کمزور کر رہا ہے انہیں شرک میں مبتلا کر رہا ہے' لوگوں کو غیر اللہ کے آگے سر جھکانے کی ترغیب دے رہا ہے تو کیا اسے یہ ناپاک کھیل کھیلنے دیا جائے' میرے لہجے میں غیر ارادی طور پر سختی سی آ گی۔

''یقیناً اس کافر جن زاد کو ایسا کرنے کیلئے آزاد نہیں چھوڑا جائے گا۔'' عالم سوما نے یقین دہانی کرائی۔ ''وہ شر نہیں پھیلا سکے گا اور خیر ہی کا بول بالا رہے گا مگر اے دینار! یہ تیرے کرنے کا کام نہیں ہے۔ اسے مجھ پر چھوڑ دے..... اور ہاں مطمئن رہ کہ جب تک تیرے گرد نادیدہ حفاظتی حصار موجود ہے عفریت دہموش تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اول تو یہی ضروری نہیں کہ وہ سراغ لگا لے کہ بغداد شہر میں تم کہاں ہو۔ اگر اسے یہ معلوم بھی ہو گیا کہ تم دونوں کی سکونت قصر خلافت میں ہے تو تمہیں کوئی نقصان پہنچانا اس کے بس میں نہ ہوگا۔ پہلے بھی میں تمہیں دلاسا دے چکا ہوں کہ تمہاری طرف سے غافل نہیں رہوں گا۔''

عالم سوما نے مجھے اور عارج کو پوری طرح مطمئن کر دیا۔ ہم بابل کے کھنڈرات سے

بغداد لوٹ آئے لیکن یہ تشویش اپنی جگہ تھی کہ عفریت دہموش ہماری راہ پر لگ گیا ہے۔ اسی تشویش کے پیش نظر عارج اس رات مجھ سے کہنے لگا۔ ''اے دینار! موجودہ حالات میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم کچھ عرصے کیلئے کسی اور زمانے اور ہی سرزمین پر چلے جائیں۔''

''ابھی ہمارے لئے بغداد میں اس قدر خطرات پیدا نہیں ہوئے کہ ہم یہاں سے فرار ہو جائیں۔'' میں نے عارج کو تسلی دی۔ ''اگر واقعی خطرات بڑھ گئے تو ہمارے پاس فرار کا راستہ موجود ہے تو کیوں گھبراتا ہے عارج!''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہم کچھ دنوں کیلئے اپنا ٹھکانا تبدیل کر دیں۔'' عارج نے ایک اور نئی تجویز پیش کر دی۔

''ٹھکانا تبدیل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں جمیلہ اور ایوب کے انسانی قالبوں کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔'' میں نے وضاحت کی۔

''تو اس میں بھی کیا حرج ہے۔'' عارج نے کہا۔

''اگر چند ہی دن کی بات ہے تو پھر موصل چلتے ہیں۔'' میں نے رائے دی۔ ''وہیں سابق وزیر ابراہیم حرانی کی تلاش میں حمزہ گیا ہے۔ تجھے میں حمزہ کے بارے میں بتا ہی چکی ہوں وہ دیوان الجند (محکمہ فوج) کے شعبہ سراغ رسانی کا سربراہ ہے۔''

''ہاں مجھے یاد ہے تو نے بتایا تھا۔'' عارج بولا۔

''تو پھر کیا کہتا ہے چلیں موصل۔'' میں نے پوچھا۔

''حمزہ پہنچ گیا ہوگا وہاں؟'' عارج نے سوال کیا۔

''کیا خبر۔'' میں نے جواب دیا۔ ''نہیں پہنچا ہوگا تو پہنچ جائے گا اس طرح اس فسادی آدم زاد ابراہیم حرانی کا انجام بھی ہم دیکھ لیں گے۔''

''تو پھر مناسب یہ ہوگا کہ ہم حمزہ کے پاس پہنچیں۔'' عارج نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

میرے اور عارج کے درمیان طے پایا کہ ہم اگلے روز صبح ہوتے ہی جمیلہ اور ایوب کے جسموں کو چھوڑ کر بغداد سے روانہ ہو جائیں گے۔ اس فیصلے کے بعد ہم سکون و اطمینان سے گہری نیند سو گئے۔

دوسرے دن فجر کے وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے عارج کو بھی جگا دیا' وہ نیند میں تھا کہنے لگا۔ ''سونے دو نا ابھی۔''

میں نے اسے ہڑبڑانے کی خاطر دانستہ کہہ دیا۔ ''بوڑھے عفریت سے ملنے نہیں

چلنا۔"

میری توقع کے مطابق وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "کیا...... تو اس عفریت کے بارے میں کیا کہہ رہی تھی اے دینار؟"

"کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔" میں دھیرے سے ہنس دی۔ "عفریت کا ذکر کر کے تیری نیند بھگانا میرا مقصد تھا۔"

"تو کیا تیرے خیال میں اس بوڑھے عفریت سے میں ڈرتا ہوں۔" عارج نے برا سا منہ بنایا۔

بالکل نہیں ڈرتا اسی لئے تو فی الفور اٹھ کر بیٹھ گیا تو اس عفریت سے ملنے ہی کیلئے بغداد سے روانہ ہو رہا ہے۔"

"طنز نہ کیا کر مجھ پر اے دینار...... یہ نہ بھولا کر میں اب نہ سہی تو ایک نہ ایک دن تیرا شوہر بن ہی جاؤں گا۔"

"تو نے پھر وہی شوہر اور بیوی کا قصہ نکال لیا۔"

"یہ قصہ تو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔"

"تو پھر تو قصہ کہتا رہ میں چلتی ہوں۔" میں یہ کہتے ہوئے جمیلہ کے انسانی قالب سے باہر نکل آئی۔

مجبوراً عارج کو بھی ایوب کا جسم چھوڑنا پڑا۔ ان دونوں کے جسموں کو ہم نے بستروں پر لٹا دیا۔ وہ جاگ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔ ہم انہیں وہاں چھوڑ کر قصر خلافت سے نکل آئے۔

حمزہ کے جسم کی مخصوص خوشبو میرے حافظے میں تھی۔ اسی کے ذریعے میں صحرا میں ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں خیمے نصب تھے۔ عارج میرے ساتھ ساتھ تھا مجھے یہ پتا لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ حمزہ کا قافلہ موصل سے صرف ایک منزل کے فاصلے پر ہے۔ قافلہ روانہ ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی حمزہ روانگی کا حکم دے چکا تھا۔ توقع کے مطابق قافلے میں خدام اور خادمائیں بھی موجود تھیں۔ کام کاج کیلئے ان کی موجودگی ضروری تھی۔ عارج اور مجھے کیونکہ حمزہ کے ساتھ رہنا تھا اسی وجہ سے ہم نے انسانی قالبوں میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ دہاب ایک ادھیڑ عمر خادم تھا' وہ اور ایک خادمہ رحیمہ دونوں ہی حمزہ کی خدمت پر مامور تھے۔ حمزہ سے قریب رہنے کی خاطر میں تو رحیمہ کے جسم میں اتر گئی اور عارج نے دہاب کا انسانی قالب اپنا لیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ دو جن زاد بھی اس قافلے میں شامل ہو چکے ہیں۔ جلد ہی

خیمے اکھاڑ کر لپیٹ لئے گئے اور انہیں اونٹوں پر لاد دیا گیا۔ قافلے کا دیگر ساز و سامان بھی انہی اونٹوں پر لدا ہوا تھا۔ اونٹ اور گھوڑے دونوں ہی قافلے میں شامل تھے۔ حمزہ اور اس کے عملے والے گھوڑوں پر سوار تھے۔ خدام' خادمائیں اور دیگر ملازمین کو اونٹوں پر جگہ ملی تھی۔ میں ایک اونٹ پر عارج کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس اونٹ پر کوئی اور سوار نہیں تھا۔

"اے بوڑھے دہاب! تجھے اس طرح ایک نوجوان خادمہ سے لگ کر بیٹھے ہوئے کیا ذرا بھی حیا نہیں آ رہی۔" میں نے دھیمی آواز میں عارج کو چھیڑا۔

"تجھے کس نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا اے رحیمہ کہ تو نوجوان ہے۔ بس جاتی ہوئی بہار کے کچھ آثار ہی تو باقی رہ گئے ہیں۔" عارج نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "یہ بھی تیرا بیان غلط ہے کہ میں تجھ سے لگ کر بیٹھا ہوں حقیقت برعکس ہے۔"

"یعنی میں تجھ سے لگی بیٹھی ہوں۔" میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

راستہ اسی طرح چھیڑ چھاڑ میں کٹ گیا۔ اس وقت دوپہر ہونے والی تھی جب ہم شہر موصل کی حدود میں داخل ہوئے۔ حمزہ کے حکم پر قافلے نے شہر کے بڑے اور مرکزی بازار میں واقع ایک سرائے کا رخ کیا۔ حمزہ اور اس کے عملے نے خود کو سوداگر ظاہر کیا اور سرائے میں قیام کی خاطر اونٹوں پر لدا ہوا اپنا سامان اتارنے لگے۔ حمزہ نے یقیناً راز داری کی غرض سے سرائے میں قیام کو ترجیح دی تھی۔

جب ہم حمزہ کو دوپہر کا کھانا کھلا چکے تو اپنی کوٹھڑی میں آ کر خود بھی کھانا کھایا اور آرام کرنے کو اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔

"کہاں قصر خلافت اور کہاں موصل کی یہ سرائے۔" میں نے عارج کو مخاطب کیا۔

"ان آدم زادوں کو سمجھائے کون! یہ تو اپنی فانی دنیا کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے طویل سانس لیا' پھر چند لمحے توقف کے بعد بولی۔ "میں ذرا حمزہ کے پاس جا کر پتا لگاتی ہوں کہ اس کے ارادے کیا ہیں۔ وہ سابق وزیر ابراہیم حرانی کو کب اور کیسے گرفتار کرنا چاہتا ہے؟"

"تجھے بھی چین نہیں کہ دو گھڑی سکون سے میرے ساتھ گزار لے' جا! تجھے کس نے روکا ہے جو میں روکوں گا۔" عارج منہ بنا کر بولا۔

"میں نے مزید کچھ کہے بغیر خادمہ رحیمہ کا جسم چھوڑ دیا' احتیاطاً میں نے اس پر نیند مسلط کر دی تھی۔

برابر والی کوٹھڑی میں اس وقت حمزہ تنہا نہیں تھا' وہاں اس کے دو ماتحت بھی موجود

تھے۔

''پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ مفرور وزیر ابراہیم حرانی عامل موصل اسحاق بن محمد کے مکان ہی میں پناہ لئے ہوئے ہے ہم اس کے بعد رات کو اچانک چھاپہ مار سکتے ہیں۔'' حمزہ اپنے ماتحتوں سے کہہ رہا تھا۔

''لیکن حضور تصدیق کی کیا صورت ہو۔'' ماتحتوں میں سے ایک نے سوال کیا۔ ''کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے۔''

''اگر میں نے طریقہ کار ہی طے کر لیا ہوتا تو پھر تمہیں مشورے کیلئے بلانے کی کیا ضرورت تھی۔'' حمزہ کے لہجے میں قدرے ناگواری تھی۔

''جس ماتحت نے طریقہ کار کے بارے میں سوال کیا تھا شرمندہ نظر آنے لگا۔ اب حمزہ کی سوالیہ نظریں اپنے دوسرے ماتحت کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ جواباً وہ شپٹا کر کہنے لگا بس...... اس کی ایک...... ایک ہی صورت ہے کہ ہم...... ہم میں سے کوئی امیر المومنین کا قاصد بن کر عامل موصل کے مکان پر پہنچے اور کہے کہ...... ابراہیم حرانی کے نام خلیفہ محترم کا پیغام لے کر آیا ہوں، اگر وہاں......

''اور وہ پیغام؟...... پیغام کہاں سے آئے گا؟'' حمزہ نے دوسرے ماتحت کی بات کاٹ دی۔'' کیا تم نہیں جانتے کہ امیر المومنین کے کسی پیغام کیلئے اس پر دیوان الرسائل (پیغام، احکام اور خلیفہ کے فرامین کا محکمہ) کی مہر ضروری ہے۔ اس کے علاوہ دیوان الخاتم (خلیفہ کی مہر کا محکمہ) کی مہر بھی پیغام پر ہونی چاہئے۔ اس دونوں مہروں کی عدم موجودگی کا مطلب یہی ہوگا کہ پیغام جعلی ہے پھر صرف یہ سن کر اس کے نام امیر المومنین کا کوئی پیغام آیا ہے ابراہیم حرانی خود کو ظاہر نہیں کرے گا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ امیر المومنین اسے نہ تو کوئی معافی نامہ بھیجیں گے، نہ محبت آمیز پیغام ارسال کریں گے۔ ایسی صورت میں وہ ہرگز سامنے نہیں آئے گا کوئی اور تدبیر بیان کرو۔''

ماتحت کے چہرے سے فکر مندی جھلکنے لگی۔ وہ زیر لب کہنے لگا۔ ''پھر تو چور بن کر ہی عامل موصل کے مکان میں داخل ہونا پڑے گا۔''

''کیا کہا تو نے...... ذرا بلند آواز میں کہو۔'' حمزہ نے اپنے ماتحت سے کہا۔

''کسی قدر رڈرتے جھجکتے ہوئے ماتحت نے اپنی بات ذرا بلند آواز میں دہرا دی۔

''ہاں یہ تدبیر بہتر معلوم ہوتی ہے۔'' حمزہ بولا۔ ''مگر اس کیلئے کسی کو اپنی جان کا خطرہ مول لینا پڑے گا۔ عامل موصل کے محافظ اول تو کسی کو مکان میں داخل نہیں ہونے دیں گے

اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر وہاں سے بچ کر نکلنا آسان نہیں ہوگا۔''

یہی موقع تھا کہ میں نے مداخلت کی اور حمزہ کے پہلے ماتحت کو میں نے اپنے اثر میں لے لیا اور اس سے کہلوایا۔ ''حضور! یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہمارے عملے کا جو فرد اس مکان میں داخل ہو ہم اسے تحفظ فراہم کریں۔''

''تمہارا مطلب یہ ہے کہ عملے کے بقیہ افراد بھی وہیں موجود رہیں؟'' حمزہ نے وضاحت چاہی۔

''جی ہاں حضور! میرا یہی مطلب ہے۔'' ماتحت نے جواب دیا۔ ''اس طرح یہ ہوگا کہ مکان میں اگر مفرور ابراہیم حرانی موجود ہوا تو ہمارا آدمی ہمیں اس وقت مطلع کر دے گا اور ہم اسے گرفتار کر لیں گے۔''

''پھر تو میری موجودگی بھی وہاں ضروری ہوگی۔'' حمزہ کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ پھر بولا مکان میں داخل ہونے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارا آدمی کمند ڈال کر اندر پہنچے دوسرا طریقہ نقب لگانا ہے۔ کون سا طریقہ آزمایا جائے؟

''نقب لگا کر داخل ہونا زیادہ بہتر ہوگا حضور۔'' پہلے ماتحت نے کہا وہ ابھی تک میرے زیر اثر تھا۔ پھر اس نے وضاحت طلب کئے بغیر مزید بتایا جہاں نقب لگائی جائے گی اس جگہ سے ہمارے عملے کے دوسرے افراد بھی بوقت ضرورت بآسانی اندر جا سکتے ہیں۔

اسی وقت حمزہ کے دوسرے ماتحت نے بولنے کی اجازت چاہی۔'' ہمارے عملے میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو یہ کام بآسانی انجام دے سکتا ہے۔ میری مراد نقب لگانے سے ہے۔ ایک جرائم پیشہ گروہ کے افراد کو پکڑنے کیلئے ہمیں ان کی کمین گاہ میں نقب لگانے کی......''

''بات صرف نقب لگانے کی نہیں۔'' حمزہ بول اٹھا۔ ''ایک تو یہ کہ وہ اندر پہنچ کر ابراہیم حرانی کو تلاش کر سکے، دوسرے......''

مجھے کیونکہ علم تھا کہ ابراہیم حرانی مکان کے کس حصے میں ہے اس لئے حمزہ کے ذہن میں یہ بات ڈال دی۔

حمزہ سمجھا کہ یہ خیال خود اس کے ذہن میں آیا ہے اس نے اسی لئے اپنے ماتحتوں سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ عامل موصل نے ابراہیم اور اس کے اہل خانہ کو اپنے مکان کے مہمان خانے میں ٹھہرایا ہوگا، کیا کہتے ہو۔''

دونوں ہی ماتحت تائید میں بولے۔ خادم، خادماؤں اور دیگر ملازمین کو چھوڑ کر اس مہم

میں حمزہ سمیت اس کے پورے عملے کو شریک ہونا تھا۔" طے یہ پایا کہ نصف شب کے قریب تمام عملے کو ضروری سامان اور ہتھیار ساتھ لے کر سرائے سے نکل جانا تھا۔ اس کے لئے سرائے کے مالک کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ یہ بات بھی میں نے ہی حمزہ کے دماغ میں ڈالی۔ یہ اس لئے لازمی تھا کہ عموماً نصف شب سے بہت پہلے ہی سراؤں کے صدر دروازے بند کر دیئے جاتے تھے۔ پھر نہ تو کوئی سرائے میں داخل ہو سکتا تھا' نہ کسی کیلئے باہر جانا ممکن ہوتا تھا' حفاظتی نقطہ نظر سے مسافر اس پر اعتراض نہیں کرتے تھے۔

اسی شام میرے ایماء پر حمزہ سرائے کے مالک سے ملا۔ اس نے سرائے کے مالک پر اپنی اصل شخصیت تو ظاہر نہیں کی البتہ یہ واضح کر دیا کہ وہ دارالحکومت بغداد سے آیا ہے اور اس کا تعلق فوج کے محکمے سے ہے۔ یہ بات بھی حمزہ نے اس تاکید کے ساتھ بتائی تھی کہ کسی کو بھی اس حقیقت سے آگاہ نہ کیا جائے۔ بصورت دیگر سرائے کے مالک سے اس سلسلے میں جواب طلبی ہو سکتی تھی۔

سرائے کا مالک بے چارہ سیدھا سادا آدم زاد تھا۔ اس نے ہامی بھر لی کہ رات کو نصف شب سے پہلے وہ خود صدر دروازے پر موجود ہوگا۔ وہ یہ سن کر ڈر گیا تھا کہ حمزہ کا تعلق فوج سے ہے۔ بات نہ بگڑے اس لئے میں بھی اس وقت حمزہ کے قریب ہی موجود تھی مگر میری مداخلت کی ضرورت پیش نہ آئی۔ میں لوٹ کر اپنی کوٹھڑی میں پہنچی تو میری مخصوص خوشبو محسوس کرتے ہی عارج کہنے لگا۔ "یہ تو کہاں اکیلی اڑی پھر رہی ہے۔ لگتا ہے جیسے میں تو تیرے ساتھ آیا ہی نہیں ہوا کیا ہوا کچھ مجھے بھی تو بتا۔"

"ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا' میں بولی۔ "جو ہونا ہے رات ہی کو ہوگا۔" میں نے یہ کہہ کر عارج کو سب کچھ بتا دیا۔

"رات کو بھی اکیلے اکیلے اڑ جائے گی کہ مجھے ساتھ لے چلے گی۔" عارج پوچھنے لگا۔

"تو کبھی کبھی تو بالکل بچہ بن جاتا ہے۔ جیسے ابھی تیری عمر صرف سو سال ہو۔ تجھے منع کس نے کیا ہے' چلنا ساتھ۔" میں بولی۔

اس رات کو مقررہ وقت پر حمزہ اور اس کا تمام عملہ پوری تیاری کے ساتھ اپنی اپنی کوٹھڑی سے نکل آیا۔ عارج اور میں بھی اپنے انسانی قالبوں سے باہر آ گئے تھے۔ سرائے کا مالک وعدے کے مطابق صدر دروازے پر مل گیا۔ اس نے لکڑی کے بڑے پھاٹک میں بنا ہوا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ حمزہ اور اس کے عملے والے یکے بعد دیگرے دروازے سے نکل آئے۔ احتیاط اور راز داری کے تحت انہیں یہ سفر عامل موصل کے مکان تک پیدل ہی کرنا تھا۔

اگر وہ گھوڑوں پر سوار ہوتے تو رات کے وقت ٹاپوں کی آوازوں سے لوگ جاگ سکتے تھے۔ پھر بھی انہیں اپنی منزل تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ انہوں نے تیز قدمی سے درمیانی فاصلہ طے کیا تھا۔

موصل پرامن علاقہ تھا۔ اسی بنا پر عامل موصل نے اپنے مکان کی حفاظت کا کوئی خاص بندوبست نہیں کیا تھا۔ دو پہرے داروں کو قابو کرنا مشکل نہ ہوا۔ انہیں حمزہ کے تربیت یافتہ عملے نے اس طرح پکڑ کر ہوش و حواس سے بیگانہ کیا تھا کہ وہ چیخ بھی نہ سکے تھے۔ کچھ ہی دیر میں عامل موصل اسحاق بن محمد کے مکان کو حمزہ کے مسلح آدمیوں نے گھیر لیا۔

نقب لگاتے وقت یہ توقع کی جا رہی تھی کہ مکان کے اندر اندھیرا اور خاموشی ہوگی مگر ایسا نہ تھا۔ عارج کو ساتھ لئے ہوئے میں پہلے ہی اندر داخل ہو گئی۔ مہمان خانے میں روشنی دیکھ کر میں ٹھٹک گئی۔

"آ اے عارج! ادھر چل کر دیکھتے ہیں کہ کون اور کیوں جاگ رہا ہے؟" میں نے کہا اور مہمان خانے کی طرف لپکی۔

مہمان خانے کے جس دالان میں روشنی ہو رہی تھی میں وہاں پہنچی تو دیکھا ابراہیم حرانی جاگ رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس رات ابراہیم حرانی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ عشاء کے بعد اسحاق بن محمد کا ایک بااعتماد طبیب ابراہیم حرانی کو دیکھ کر گیا تھا۔ اس وقت ابراہیم کو تیز بخار تھا۔ طبیب کی دوا کے اثر سے بخار تو کم ہو گیا تھا مگر ابراہیم کو نیند نہیں آئی تھی۔ دو خادم اس کی تیمارداری کیلئے خواب گاہ میں موجود تھے۔ ذرا سی دیر میں نقب لگانے کی مسلسل آوازیں آنے لگیں۔

میں نے ابراہیم حرانی کو چونک کر بستر پر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔

"کیا ہوا حضور!" ایک خادم نے اس سے پوچھا۔

"تم دونوں کیا بہرے ہو۔" ابراہیم حرانی ناگواری سے بولا۔ "کیا تمہیں کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا۔"

"جی...... جی ہاں حضور!" دوسرا خادم چونک کر کہنے لگا۔ "کچھ آوازیں آ تو رہی ہیں جیسے...... جیسے کوئی دیوار پر پتھر مار......"

"یہ دیوار پر پتھر مارنے کی آواز نہیں اے بے وقوف۔" ابراہیم حرانی نے تیز آواز میں کہا۔ دیوار کو کسی اوزار سے توڑا جا رہا ہے...... بلکہ شاید نقب لگائی جا رہی ہے۔ معلوم نہیں پہرے دار کہاں جا کے سو گئے ہیں۔ جاؤ جلدی سے جا کر عامل موصل کو بتاؤ کہ اس کے مکان

میں کوئی چور نقب لگا کر گھسنے والا ہے...... دوڑو...... جلدی کرو۔''

دونوں خادم یکے بعد دیگرے خواب گاہ سے تقریباً بھاگتے ہوئے نکل گئے۔ ابراہیم حرانی کو اپنے اثر میں لے کر میرے لئے پکڑ وا دینا کوئی مشکل نہ تھا مگر مجھے یہ مناسب معلوم نہ ہوا۔ ہر چند کہ ابراہیم سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی پھر بھی وہ اپنی بدسیرتی کے سبب مجھے سخت ناپسند تھا۔ اس کے باوجود میں مداخلت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں دشمن کو بھی مدافعت کا حق دینے کی قائل تھی۔

نقب لگانے کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ ان آوازوں کے ساتھ ابراہیم حرانی کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا اظہار ابراہیم حرانی کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ اب وہ بے چینی کے عالم میں بستر سے اٹھ کر ٹہلنے لگا تھا۔ سرہانے رکھی تلوار بھی اس نے نیام سے باہر نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ ذرا دیر ہوئی تھی کہ مکان میں بھاگ دوڑ مچ گئی۔

اسحاق بن محمد بھاگتا ہوا خواب گاہ میں آیا اور ہانپتے ہوئے ابراہیم حرانی کو بتانے لگا۔

''معلوم نہیں کون لوگ ہیں جو نقب لگا کر مکان میں گھس آئے ہیں۔ وہ سب مسلح ہیں۔ گھر میں جتنے بھی خادم ہیں انہیں روکنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ...

''مجھے تو یہ کوئی اور ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔'' ابراہیم حرانی بول اٹھا۔ ''تم نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ اس مکان سے نکلنے کا ایک خفیہ راستہ .....''

''لیکن وہ راستہ برسوں استعمال نہیں ہوا۔'' اسحاق نے ابراہیم کی بات کاٹ دی۔ ''معلوم نہیں وہاں کتنے حشرات الارض ہوں گے۔''

''تم ان کی پروا مت کرو اور مجھے فوراً وہاں لے چلو۔'' ابراہیم حرانی بولا۔

ابراہیم کی ضد پر اسحاق اسے مہمان خانے ہی کے ایک دالان میں لے گیا۔ روشنی کیلئے اس نے ایک شمع دان ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس دالان کی دائیں دیوار میں لوہے کا ایک کڑا پڑا تھا۔ اسحاق نے شمع دان فرش پر رکھا اور دونوں ہاتھوں سے لوہے کا کڑا پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی اور دیوار میں خلا نمودار ہو گیا۔ اس کے ساتھ بدبو کا بھبکا بھی محسوس ہوا۔

راہ فرار دیکھتے ہی ابراہیم حرانی کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے چند لمحے بھی صبر نہ کیا اور اسحاق سے مخاطب ہوا۔ ''اپنے اہل خانہ کو ساتھ لے جانا ان حالات میں میرے لئے ممکن نہیں میری واپسی تک ان کی حفاظت تمہاری ذمہ داری ہے' خدا حافظ۔''

پھر ابراہیم حرانی تاریک خلا میں داخل ہو گیا۔ ابھی چند ساعتیں ہی گزری ہوں گی کہ

خلا سے تیز چیخ سنائی دی۔

''سانپ......! سانپ...... مجھے سانپ نے ڈس لیا۔'' ابراہیم حرانی چیختا ہوا خلا سے باہر نکلا۔ اس کے ایک بازو پر سانپ لپٹا ہوا تھا۔ وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے سانپ کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ تلوار اس نے ہاتھ سے چھوڑ دی تھی۔

''میں نے کہا تھا نا تم سے ابراہیم مگر تم......'' اسحاق کی بات ادھوری رہ گئی۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بہت قریب آ گئی تھیں پھر اسحاق تو دالان سے نکل کر بھاگ گیا اور ابراہیم اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ اس نے ایک نہ سنی۔ عموماً ایسے وقت آدم زاد بہرے ہو جاتے ہیں۔ سن کر بھی کچھ نہیں سنتے۔

حمزہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس دالان میں داخل ہوا تو اس وقت تک ابراہیم حرانی فرش پر گر پڑا تھا۔ اس کے بازو سے لپٹا سانپ تاریک خلا میں گھس کر غائب ہو چکا تھا۔ شمع دان کی دھیمی روشنی میں غالباً حمزہ یہ نہ دیکھ سکا کہ ابراہیم حرانی کا چہرہ نیلا پڑتا جا رہا ہے اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے ہیں۔ حمزہ کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ تھی اس نے ایک ہی وار میں ابراہیم حرانی کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔ خلیفہ ہارون الرشید کو انتہائی مطلوب افراد میں سے ایک کم ہو گیا تھا۔

حمزہ کے اشارے پر اس کے ایک ماتحت نے ابراہیم حرانی کا کٹا ہوا سر اٹھا لیا۔

جس طرح حمزہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عامل موصل کے مکان میں داخل ہوا تھا اسی طرح باہر نکل گیا۔ اسحاق کو خبر بھی نہ ہوئی کہ اس کے مکان میں نقب لگا کر داخل ہونے والے لوگ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے۔

دوسرے ہی روز صبح موصل سے حمزہ کا قافلہ بغداد کے لئے روانہ ہو گیا۔ حمزہ نے دانستہ ایک باغی اور حکومت وقت کو انتہائی مطلوب شخص کی مدد کرنے اور اسے پناہ دینے کے جرم میں اسحاق کو گرفتار نہیں کیا تھا۔ اگر وہ خلیفہ کے علم و اطلاع میں لائے بغیر اسحاق کو گرفتار کر لیتا تو یہ اختیارات سے تجاوز ہوتا۔ کسی بھی عامل کو خلیفہ کے حکم ہی سے حراست میں لیا جا سکتا ہے۔ حمزہ کو اس حقیقت کا علم تھا۔

روز و شب کی بساط لپیٹتا اور منزل بہ منزل تیزی سے سفر کرتا ہوا حمزہ کا قافلہ ایک شام بغداد پہنچ گیا۔ اس نے فوری طور پر ہارون سے خلوت میں ملاقات کی اجازت چاہی۔ اجازت مل گئی تو وہ ہارون کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھی۔

''امیر المومنین ایک باغی کا کٹا ہوا سر ملاحظہ فرمانا چاہیں تو غلام.....''

ہارون نے حمزہ کی بات کاٹ دی۔ ''ہمیں کٹے ہوئے سر دیکھنے کا شوق نہیں تم صرف اس باغی کا نام بتادو جس کا سر کاٹ کر لائے ہو ہم تمہاری بات پر یقین کرلیں گے۔ بولو حمزہ! وہ باغی کون ہے جو اب اس دنیا میں نہیں رہا؟''

''اے امیر المومنین اس فسادی و باغی کا نام ابراہیم حرانی ہے۔'' حمزہ نے بتادیا۔

''ابراہیم حرانی۔'' ہارون چونک اٹھا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''وہ تمہیں کہاں مل گیا؟''

''موصل میں اے امیر المومنین۔'' حمزہ نے جواب دیا۔

''لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ بغداد سے فرار ہو کر وہ کہاں جا کر چھپ گیا ہے؟'' ہارون نے سوال کیا۔

''عامل موصل اسحاق بن محمد کے سوا ابراہیم کے تمام رشتہ داروں اور دوستوں سے پوچھ گچھ کی جا چکی تھی......'' حمزہ جواب میں وہی سب کچھ بیان کرنے لگا جو میں نے اس کے دماغ میں ڈالا تھا۔ آخر میں اس نے یہ بھی بتایا۔ ''میرا ایک غلام چمڑے کا وہ تھیلا لئے دروازے کے باہر کھڑا ہے جس میں ابراہیم حرانی کا کٹا ہوا سر موجود ہے۔ غلام اس لئے وہ تھیلا اندر نہیں لایا کہ اس سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے ہیں۔''

''اپنے غلام کو اس تھیلے سمیت رخصت کردو کہ ہمیں تم پر اعتماد ہے۔'' ہارون بولا۔ اس کے حکم کی تعمیل کر کے حمزہ پھر واپس آ گیا۔

ہارون کہنے لگا۔ ''ہمیں تو اسحاق بن محمد پر حیرت ہے اس کی یہ ہمت و جسارت کیسے ہوئی کہ ایک باغی کو پناہ دے دی۔ تم اگر اس جرم میں اسحاق کا سر بھی کاٹ کر لے آتے تو ہم جواب طلبی نہ کرتے' تاہم حدود سے تجاوز نہ کرنے پر ہم تمہیں لائق تحسین سمجھتے ہیں۔''

''شکریہ امیر المومنین!'' حمزہ احتراماً ہارون کے سامنے تھوڑا سا جھک گیا۔

ہارون نے ایک طرف تو حمزہ کو رخصت کیا دوسری جانب اسی وقت وزیر یحیٰی بن خالد کو طلب کرلیا۔ میں اب بھی وہیں تھی۔

''اے یحیٰی! ہمیں بتاؤ کہ کسی باغی کو پناہ دینے کی سزا کیا ہے؟'' ہارون نے اپنے وزیر سے پوچھا۔

''اے امیر المومنین! جو سزا باغی کی وہی اسے پناہ دینے والے کی سزا ہے۔'' یحیٰی نے بلا جھجک جواب دیا۔

پھر مختصراً ہارون نے ابراہیم حرانی کے مارے جانے اور اسحاق کی نافرمانی سے یحیٰی کو

آگاہ کیا۔ آخر میں اس نے کہا ''عامل موصل اسحاق بن محمد کو ہم اسی وقت معزول کرتے ہیں۔ اسحاق کے نام ہماری طرف سے حکم جاری کیا جائے کہ وہ فوراً دربار میں حاضر ہو۔''

''اور اسحاق کی جگہ اے امیر المومنین کسے موصل کا نیا عامل مقرر کیا جائے؟'' یحیٰی نے نرمی سے سوال کیا۔

''ابو حنیفہ بن قیس کو ہم موصل کا عامل مقرر کرتے ہیں۔''

''امیر المومنین کا فیصلہ قطعی درست ہے۔'' یحیٰی نے کہا۔ شاید اسحاق بن محمد کی تقرری پر بھی اس آدم زاد نے یہی کہا ہو۔ دراصل حکمرانوں کے سامنے بڑے بڑے اہل زبان گونگے بن جاتے ہیں اور ان کے ہر عمل کو درست قرار دیتے ہیں۔ یحیٰی تو یوں بھی حکمران خاندان کا دیرینہ خیر خواہ تھا' اتنے قریبی تعلقات کسی اور خلیفہ وقت کے نہیں تھے۔ یحیٰی بن خالد کا باپ خالد بن برمک تھا۔ خلیفہ منصور نے خالد کو اپنے بیٹے مہدی کا اتالیق بنایا تھا۔ یہی روایت مہدی نے قائم رکھی تھی۔ اسی سبب ہارون کا اتالیق یحیٰی کو مقرر کیا گیا تھا۔

برمکوں سے حکمران خاندانوں کی اس قدر قربت تھی کہ یحیٰی کا بیٹا فضل اور ہارون دودھ شریک بھائی تھے۔ فضل کو ملکہ خیزران نے بھی دودھ پلایا تھا۔ یہ اعزاز کسی اور غیر حکمران خاندان کو حاصل نہیں تھا۔ اسی بنا پر حکمران خاندان کے بعد برمکوں ہی کو فضیلت حاصل تھی۔

موصل سے لوٹ کر آنے کے بعد عارج اور میں نے اپنے اپنے انسانی قالبوں میں پناہ لے لی تھی۔

خلیفہ ہارون الرشید کی طلبی پر جب اسحاق بن محمد دربار میں حاضر ہوا تو اسے یقیناً معلوم نہ تھا کہ یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہے۔ ہارون نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس حکم سے پہلے اسحاق پر فرد جرم عائد کی گئی تھی۔ اسحاق نے اپنے جرم کا اقرار کر کے معافی کی خاطر درخواست کی۔ ہارون نے درخواست مسترد کرتے ہوئے حکم سنا دیا' حکم کی تعمیل میں اسی روز اسحاق کی گردن اڑا دی گئی۔

اس واقعہ کے تیسرے دن کا ذکر ہے کہ عارج نے مجھ سے پوچھا۔ ''یہ زینب جو نجف سے آئی ہے کیا واقعی تیری بہن ہے۔''

''یہ تو کہاں کی ہانکنے لگا اے عارج! کون زینب اور کس کی بہن۔'' میں بولی۔

''جمیلہ کی بہن زینب اس سے ملنے بغداد آئی ہوئی ہے۔'' ''اب سمجھی کچھ۔'' عارج نے بتایا۔ ''مجھے ابھی یہ اطلاع ملی ہے وہ قصر خلافت کی انتظار گاہ میں تیری منتظر ہے اس نے اپنے بارے میں محافظوں کو یہ بتایا ہے کہ وہ نجف سے آئی ہے۔''

''پتا نہیں کون بے چاری ہے وہ۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی مصیبت پڑی ہوگی تو اسے اپنی بہن یاد آئی ہوگی پہلے تو کبھی اس کا نام نہیں سنا۔''

''کیا خبر تیرا خاندان کتنا بڑا ہو۔'' عارج کے لہجے میں شوخی تھی۔ ''ابھی تو صرف ایک......''

''موقع محل دیکھ لیا کر۔ ہر وقت شرارت اچھی نہیں لگتی۔'' میں یہ کہتی ہوئی اٹھی اور اندرونی دالان سے نکل آئی۔

قصر خلافت کی انتظار گاہ بہت بڑی تھی۔ یہ انتظار گاہ بطور خاص ان افراد سے ملنے کیلئے آنے والوں کی خاطر بنائی گئی تھی جو کسی نہ کسی حیثیت سے قصر خلافت میں ملازمت کرتے تھے اور ان کا قیام بھی وہیں تھا۔ جب تک کوئی ملازم خود اپنے ملنے والے کو قصر میں ساتھ نہ لے جائے کسی کو بھی اندر گھسنے کی اجازت نہیں تھی' حفاظتی نقطہ نظر سے یہ اقدام مناسب بھی تھا۔

عمر میں وہ آدم زادی زینب' میرے انسانی پیکر جمیلہ سے دو چار سال بڑی لگتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دس بارہ سال کا لڑکا بھی تھا۔ مجھے اپنے قریب آتے دیکھ کر وہ کھڑی ہوئی اور پھر لپٹ کر رونے لگی۔ یوں جیسے اسے اپنے جذبات پر قابو نہ رہا ہو۔

زینب کو تسلی دیتے ہوئے میں نے اس کا ذہن پڑھ لیا۔ وہ واقعی جمیلہ کی بہن تھی اپنے ساتھ وہ اکلوتے بیٹے کو لائی تھی۔ جس کا نام ہلال تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''گھبراؤ نہیں میری بہن! تم سے تمہارا حق کوئی بھی نہیں چھین سکتا' چلو میرے ساتھ۔''

وہ دوپہر کا وقت تھا' زینب کہنے لگی۔ ''میرا سامان تو سرائے میں پڑا ہے۔''

''کوئی بات نہیں' فکر نہ کرو سامان بھی وہاں سے آجائے گا۔'' میں نے اسے دلاسا دیا۔ ''تم ساتھ تو چلو۔''

زینب اور اس کے بیٹے ہلال کو میں انتظار گاہ سے اپنی قیام گاہ میں لے آئی۔ وہ جمیلہ کے شوہر ایوب کو بھی پہچانتی تھی۔ اس نے سلام کیا تو عارج کو بھی جواب دینا پڑا۔ زینب سے میں نے کھانے کو پوچھا تو بولی۔ ''سرائے ہی میں کھالیا تھا۔''

پھر عارج کو میں نے زینب کے بیٹے ہلال کے ساتھ بھیج دیا تاکہ وہ سرائے سے سامان اٹھالائے۔

جمیلہ! تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ تمہارے دولہا بھائی بھی اپنے سوتیلے بھائیوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں۔ زینب اپنا دکھڑا سنانے لگی۔ واقعی اس کے ساتھ بڑا ظلم ہورہا

تھا۔ زینب کا یہ خیال درست ہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کے شوہر بلال پر سوتیلے بھائیوں یا ان کی بیویوں نے سحر کرا دیا تھا۔ حتمی طور پر ابھی میرے لئے کچھ بھی کہنا محال تھا کیوں کہ ابھی میں نے بلال کو نہیں دیکھا تھا۔

''دلہا بھائی بھی انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے اور حالات بھی' گھبرانے کی تمہیں ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے دولہا بھائی کی سوتیلی بھابیاں تو مجھے یہ طعنے بھی دیتی تھیں کہ اپنی بہن کے گھمنڈ میں نہ رہنا وہ اگر قصر خلافت میں خادمہ ہے تو نجف کے عامل تک ہماری بھی رسائی ہے۔ میں تو اس خوف سے تمہارے پاس دوڑی چلی آئی کہ...... وہ کم بختیں واقعی مجھے طلاق دلوا کر کہیں بلال کے ابو کی دوسری شادی نہ کرا دیں۔'' یہ کہتے ہوئے زینب کی آواز بھرا گئی۔

''اللہ نے چاہا تو ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا میری بہن! تم دل چھوٹا نہ کرو۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

زینب کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ اندر سے واقعی بہت دکھی تھی۔ قصہ یہ تھا جو مجھے زینب کا ذہن پڑھ کر معلوم ہوا کہ اس کے شوہر بلال کو سوتیلے بھائی دولت و جائیداد سے محروم کر دینا چاہتے تھے۔ اگر اس میں کوئی رکاوٹ تھی تو وہ زینب تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ سوتیلے بھائی بلال کو بے وقوف بنا رہے تھے۔ اپنے ارادوں میں زینب کو مزاحم جان کر انہوں نے اس پر طرح طرح کے الزامات لگانا شروع کر دیئے تھے۔ حد تو یہ ہوگئی تھی کہ بلال اب اس پر بھی شک و شبے کا اظہار کرنے لگا تھا۔ ہلال اسی کا بیٹا تھا' مگر وہ اس پر بھی شک کرنے لگا تھا۔ زینب کیلئے یہ انتہائی تکلیف دہ بات تھی۔ سوتیلے بھائیوں اور ان کی حاسد بیویوں کا مقصد یہ تھا کہ زینب کو طلاق دلوا کر کسی اور سے بلال کی شادی کرا دیں۔ زینب اور جمیلہ یہ اپنے والدین کی اولادیں تھیں۔ ان کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ والدین مر چکے تھے۔ اب وہی دونوں بہنیں ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹ سکتی تھیں۔ پانی جب سر سے اونچا ہونے لگا اور زینب کو یہ اندیشہ ہوا کہ بلال اسے طلاق نہ دے دے تو وہ اپنی چھوٹی بہن جمیلہ کے پاس بغداد چلی آئی۔ مصیبت کے وقت اپنے ہی یاد آتے ہیں اور زینب اپنوں ہی کے پاس آئی تھی۔ اس غریب کو گمان بھی نہ ہوگا کہ جسے وہ اپنی چھوٹی بہن سمجھ رہی ہے ایک جن زادی ہے۔

میرا تو مقصد حیات ہی خلق خدا کی خدمت کرنا تھا اور زینب تو اس کی زیادہ مستحق تھی۔ میں نے جس آدم زادی کے جسم پر قبضہ کر رکھا تھا وہ زینب ہی کی بہن جمیلہ تھی۔ دونم یہ

کہ وہ بہر حال مظلوم تھی۔

''اسی روز شام کو موقع پا کر اس مسئلے پر میں نے خلوت میں عارج سے بات کی تو وہ کہنے لگا۔ ''یقیناً اے دینار! ہمیں اس آدم زادی کی ضرور مدد کرنی چاہئے لیکن اس میں مجھے ایک قباحت معلوم ہوتی ہے۔''

''وہ کیا اے عارج؟'' میں نے دریافت کیا' سامنے سے کوئی آ رہا تھا تو میں نے عارج کو ستون کی آڑ میں ہونے کا اشارہ کیا۔

ایک غلام ہم سے کچھ فاصلے پر تھا۔ وہ گزر گیا تو عارج نے میرے سوال کا جواب دیا۔ ''اس کیلئے ہمیں حالات کا پوری طرح جائزہ لینا پڑے گا۔ یہ معاملہ بڑا نازک ہے جلد بازی میں زینب کا گھر بھی اجڑ سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ اس کی یہی صورت ہے کہ ہم خود نجف جائیں اور حالات کے مطابق جو بھی ضروری قدم ہو اٹھائیں۔''

''اس معاملے میں تو ہم جمیلہ اور ایوب کے انسانی پیکروں کو بھی بغداد میں چھوڑ کر نجف نہیں جا سکتے۔ ہمیں انہی قالبوں میں رہ کر نجف جانا پڑے گا جس طرح حمزہ کے ساتھ ہم موصل گئے اور واپس بغداد آ گئے۔ ایسا اس مرتبہ نہیں ہو پائے گا۔'' میں بولی۔ ''پھر تو بس ایک ہی راہ باقی رہ جاتی ہے کہ ہم کچھ عرصے کیلئے چھٹی لے لیں۔'' عارج نے مشورہ دیا۔

''ہاں۔'' میں نے بھی عارج کی تائید میں کہا۔ ''لگتا ہے کہ نجف جانے کیلئے چھٹی ہی لینا پڑے گی۔''

ہارون الرشید کے خلیفہ بننے کے بعد متعدد تبادلے اور نئی تقرریاں ہوئی تھیں۔ وہیں محکمہ نظارت (نگہبان) کا نگران اعلیٰ بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ قصر خلافت کے تمام ملازمین کی ذمہ داری اسی پر تھی۔ پہلے بوڑھا موسیٰ بن کعب اس عہدے پر عرصہ دراز تک رہا۔ اب طاہر بن یوسف نگران اعلیٰ تھا۔ مجھے اور ایوب کو چھٹی لینے کی غرض سے اسی کے روبرو پیش ہونا پڑا۔ طاہر قدرے سخت گیر آدمی تھا۔ وہ کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرتا' اپنے اختیارات کا استعمال اسے بخوبی آتا تھا۔

''پورے ایک ماہ کی چھٹی؟'' طاہر بن یوسف اپنی عادت کے مطابق رعونت سے بولا۔ ''ناممکن۔''

مجھے شرارت سوجھ گئی کہ اس آدم زاد کا اینٹھ مروڑ وقتی طور پر سہی ختم کر دوں۔ میں نے اس لئے چڑانے والا انداز اختیار کیا اور کہا۔ ''ایک ماہ تو کیا ایک سال کی چھٹی بھی ممکن ہے۔'' طاہر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ آخر وہ

بلند اور طیش بھری آواز میں بولا۔ ''اے خادمہ! کیا تجھے یہ احساس نہیں کہ تو اس وقت محکمہ نظارت کے نگران اعلیٰ کی خدمت میں حاضر ہے۔''

''دراصل امیر المومنین کی خدمت میں رہ کر ہمارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' میں نے طاہر کو مزید چڑایا۔

''یہی لگتا ہے۔'' طاہر کے نتھنے پھول گئے۔ ''تجھے شاید خبر نہیں کہ ہم بیک جنبش قلم تیری ملازمت ختم کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ اختیار حاصل ہے کہ اسی وقت تجھے اور تیرے شوہر کو برخاست کر سکیں۔ تو نے آخر ہمیں سمجھا کیا ہے؟''

''ایک مجبور و بے بس آدم زاد۔'' میں نے اس کے دماغ میں سرگوشی کی۔ میرے لب ساکت ہی رہے۔

طاہر تقریباً اچھل پڑا۔ ''کیا کہا تو نے؟''

''میں نے تو کچھ نہیں کہا حضور!'' میں بھولی بن گئی۔ پھر دوبارہ اپنی ہی آواز میں سرگوشی کی۔ ''چھٹی دے دے طاہر۔''

اس کی نظریں میرے ہی چہرے پر جمی ہوئی تھیں اب وہ انتہائی حیران پریشان نظر آ رہا تھا۔

''یہ چپ بھی ہے اور میرے دماغ میں اس کی آواز بھی گونج رہی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''تجھ جیسے غبی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی۔'' میں بولی اور پھر اسے اپنے اثر میں لے لیا۔

''کیوں نہیں تمہیں ضرور چھٹی ملے گی۔'' طاہر کہنے لگا۔ ''تمہاری چھٹی ایک ماہ کیلئے منظور کی جاتی ہے۔''

طاہر نے ایک فرد اٹھا کر اس میں چھٹی کا اندراج بھی کر دیا۔ اس وقت میں بول اٹھی۔ ''اجازت ہے حضور!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔ اب سے پہلے میں نے طاہر کی بد دماغی اور سخت گیری کے بارے میں سنا ہی سنا تھا۔ مجھے خود اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا جو آدم زاد اپنے اختیارات جتانے کیلئے بلاوجہ دوسروں پر سختی کرتے ہیں طاہر بھی انہی میں سے تھا۔ اس طرح شاید اس کی انا کو تسکین ملتی تھی۔ ایسے خود سر و مغرور آدم زادوں کو ذلیل کر کے مجھے خوشی ہوتی تھی۔

زینب کو علم تھا کہ ہم اس کے ساتھ نجف جانے کیلئے چھٹی لینے گئے ہیں۔ ہم لوٹ کر اپنی قیام گاہ میں آئے تو زینب نے متوقع نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے بتا دیا

کہ چھٹی مل گئی ہے۔ وہ خوش ہو گئی۔

دارالحکومت بغداد سے روز ہی مختلف شہروں کیلئے کارواں روانہ ہوتے رہتے تھے۔ یہی صورت کارواں آنے کی تھی۔ زیادہ تر کارواں محلہ کرخ کے بڑے بازار سے روانہ ہوتے تھے۔ میرے ایماء پر عارج ایک کارواں کے میر سے معاملہ طے کر آیا۔ میر کارواں نے اسے بتایا تھا کہ آئندہ روز صبح بعد نماز عصر بغداد سے نجف کیلئے کارواں روانہ ہو گا۔

''بڑا عجیب وقت ہے یہ۔'' میں نے کہا۔ ''عموماً تو کارواں صبح فجر کے بعد روانہ ہوتے ہیں۔''

''جو کارواں کل بعد فجر نجف کیلئے روانہ ہو رہا ہے اس میں جگہ نہیں تھی۔'' عارج بولا۔ ''میں نے اسی لئے شام کو جانے والے کارواں......''

''چلو ٹھیک ہے۔'' میں بول اٹھی۔ ''ہم جس قدر جلد نجف پہنچ جائیں اچھا ہے۔''

خاصا وقت تھا اس لئے ہم نے بڑے اطمینان سے جانے کی تیاری کر لی۔ دوسرے دن وقت سے کچھ پہلے ہی ہم محلہ کرخ کی کارواں سرائے میں پہنچ گئے۔ ہمارے ساتھ دو اونٹ اور ایک گھوڑا تھا' ایک اونٹ پر زینب اور ہلال بیٹھ گئے اور ان کا سامان بھی اسی پر لاد دیا۔ دوسرے اونٹ پر میں سوار ہو گئی۔ میرے ساتھ بھی ضروری استعمال کا سامان تھا۔ عارج گھوڑے پر سوار تھا۔

روانگی سے قبل میر کارواں نے کارواں کا جائزہ لیا تو پہلی بار اسے میں نے دیکھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے کوئی بھلا آدمی نہ لگا۔ آدم زادیاں ہوں کہ جن زادیاں ان میں صفت ہوتی ہے کہ وہ صنف مخالف کی نظروں کو بھانپ لیں۔ وقتی طور پر میں نے یہ سوچ کر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا کہ وہ برا ہو یا بھلا مجھے کیا۔ میرا کیا بگاڑ لے گا۔ عارج سے بھی میں نے اس کا سبب کچھ نہ کہا۔

آخرکار وہ کارواں بغداد سے نجف کیلئے روانہ ہو گیا۔ شہری آبادی سے نکل کر کچھ دیر صحرا میں سفر کرنے کے بعد اندھیرا پھیلنے لگا۔ میر کارواں کے حکم پر کارواں روک دیا گیا۔ کارواں کی دوبارہ روانگی اب صبح سے پہلے ممکن نہیں تھی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم اپنے خیمے میں بستروں پر دراز ہو گئے۔ پھر جانے کب ہماری آنکھ لگ گئی۔

سوتے سوتے اچانک مجھے شدید بو محسوس ہوئی اور پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ پائی کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔

آنکھ کھلی تو عارج کے گھبرائے ہوئے چہرے پر میری نظر پڑی۔ خیمے کے اندر جلنے والے چراغ کی لو ہرچند کہ دھیمی تھی مگر اتنی بھی دھیمی نہیں تھی جو کچھ دکھائی نہ دے۔ زینب اور اس کا بیٹا ہلال اپنے بستروں پر بے خبر سو رہے تھے۔

''تو خیریت سے تو ہے' لیکن تو کیسے جاگ گیا؟'' میں نے قدرے پست آواز میں عارج سے دریافت کیا تاکہ زینب یا اس کا بیٹا بیدار نہ ہو جائے۔ میرے آہستہ بولنے کو عارج نے بھی محسوس کر لیا اور کہنے لگا۔ ''اے دینار! بہتر یہ ہے کہ ہم کچھ دیر کیلئے اپنے انسانی قالبوں سے باہر نکل آئیں۔ اس طرح کسی کو ہماری آوازیں بھی سنائی نہ دیں گی اور ہم خیمے سے باہر بھی جا سکیں گے۔ اپنے پیکروں پر ہم نیند مسلط کر دیتے ہیں۔''

عارج کا مشورہ میں نے فوراً قبول کر لیا۔ کچھ دیر پہلے مجھ پر جو کیفیت گزری تھی' میں اس کی حقیقت جاننا چاہتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے یقین سا تھا کہ عارج پیش آنے والے واقعہ سے بے خبر نہیں ہو گا۔ اس یقین کی وجہ شاید عارج کی بیداری تھی۔ سوتے سوتے اچانک شدید بدبو محسوس ہونا اور پھر ذہن تاریکیوں میں ڈوب جانا' واقعی ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اپنے انسانی پیکر سے نکل کر اسے میں نے گہری نیند سلا دیا۔ عارج نے بھی میری تقلید کی۔

وہ قافلہ صحرا میں جہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا ہم اس سے تقریباً ایک فرسخ دور ریت کے ایک ٹیلے کے نیچے اتر گئے۔

''یہاں ہم سکون و اطمینان سے ہر بات کر سکیں گے۔'' عارج نے کہا۔

''ہاں۔'' میں بولی۔ ''اے عارج! میں نے تجھ سے جاگنے کی وجہ پوچھی تھی۔''

''شدید بدبو اور گھٹن سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔'' عارج بتانے لگا۔ ''آنکھ کھلتے ہی میرے سارے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے ایک ایسا ہی منظر دیکھا تھا' پھر اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا۔ ایک عفریت کو تجھ پر جھپٹتے دیکھا۔ شاید وہ بدبو اسی عفریت کے وجود کی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کوئی کافر عفریت ہو گا' وہ عفریت جیسے ہی تیرے قریب پہنچا تجھے بستر سے اٹھانے کیلئے جھکا۔ ایک دم اس کے گرداگرد شعلے بھڑک اٹھے وہ اسی عالم میں خیمے سے نکل گیا۔ میں نے ہمت کی اور خیمے سے باہر آیا تو اس عفریت کو شعلوں میں گھرا دیکھا وہ فضا میں بلند ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں خیمے میں واپس آیا تو گھبرایا ہوا تھا جو کچھ میں نے دیکھا تھا میرے لئے حیران کن

ہی تھا۔ یہ دیکھنے کی خاطر کہ تو کس حال میں ہے جیں اب تیرے قریب پہنچا تو تجھے آنکھیں کھولتے دیکھا۔''

''اے عارج! اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔'' عارج کی پوری بات سن کر میں بولی۔'' دراصل تو اگر غور کرے تو کم و بیش یہ وہی قصہ ہے جو ہم اپنے بڑوں کی زبانی بچپن سے سنتے آئے ہیں۔ وہی رات کا وقت' وہی صحرا اور وہی آوارہ عفریت! ہمارے بڑے ہمیں رات کے وقت صحرا میں نکلنے سے منع کرتے تھے کہ وہاں عفریت گھومتے ہیں جو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس واقعہ میں فرق صرف یہ ہے کہ ایک عفریت اپنی دانست میں ایک آدم زادی کو اٹھا کر لے جانا چاہتا تھا۔ یقیناً اسے گمان بھی نہ ہوگا کہ اس انسانی قالب میں کوئی جن زادی ہو گی۔ وہ بے خبری میں ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ میرے گرد قائم نادیدہ حصار کی زد میں آ کر وہ غیر متوقع صورتحال سے دوچار ہوا۔ جب وہ شعلوں میں گھر گیا تو راہ فرار ہی اسے غنیمت معلوم ہوئی۔ اس حادثے کا مجھ پر ردعمل ہوا کہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔''

''تو نے جس قصے کی طرف اشارہ کیا اے دینار! میں بھی بچپن سے سنتا آیا ہوں۔'' عارج کہنے لگا۔'' لیکن دوسرے جن زادوں کی طرح میں نے بھی اس پر یقین نہیں کیا۔ میں یہی سمجھا کہ ہمارے بڑے ہمیں ڈرانے کیلئے ایسے قصے سناتے رہتے ہیں۔ آج اندازہ ہوا کہ بڑے غلط نہیں کہتے تھے۔''

''اور عالم سوما کا یہ کہنا قطعی درست نکلا کہ نادیدہ حصار کی موجودگی میں کوئی عفریت بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' میں نے کہا۔

''بس اتنا ہوا کہ کچھ دیر کو ہوش و حواس کھو بیٹھی۔'' عارج بولا۔

''اس کی وجہ شاید کافر عفریت کے وجود کی شدید بدبو ہو۔'' میں نے خیال آرائی کی۔

''ہو سکتا ہے۔'' عارج نے میری تائید میں کہا۔

''اچھا چلو اب واپس چلتے ہیں۔'' میں بولی اور فضا میں بلند ہونے لگی۔

عارج نے بھی میرے ساتھ پرواز کرنے میں دیر نہ کی۔ ہم اس جگہ لوٹ آئے جہاں ''ہمارا'' کارواں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔

آگے بڑھتے بڑھتے میں ایک دم ٹھٹک کر رک گئی۔ میرے برابر والے خیمے سے ایک دراز قد حبشی نکل رہا تھا۔ ایک نازک سی آدم زادی کے حسین و نوجوان جسم کو اس حبشی نے اپنے بازوؤں میں اٹھا رکھا تھا۔

''آؤ دیکھتے ہیں اے عارج کہ یہ کیا معاملہ ہے۔'' میں نے عارج کو مخاطب کیا۔

انسانی قالبوں میں نہ ہونے کے سبب کوئی ہماری آوازیں نہیں سن سکتا تھا۔

عارج خاموشی سے میرے ساتھ ہو لیا۔ اس حبشی کا تعاقب کرتے ہوئے ہم ایک بڑے خیمے کے در تک پہنچ گئے۔

''ارے یہ تو میر کارواں جعفر کا خیمہ ہے۔'' عارج نے اظہار حیرت کیا۔

☆......☆......☆

سیاہ فام آدم زاد کو میں نے خیمے کے در پر پڑا ہوا پردہ اٹھا کر اندر جاتے دیکھا۔ خیمے کے اندر تیز روشنی تھی۔

میں بھی دوسرے ہی لمحے اس خیمے میں تھی۔ سامنے ہی میر کارواں کھڑا تھا۔ حبشی اس سے مخاطب ہوا۔'' اے میرے آقا جعفر! میں نے تیرے حکم کی تعمیل کر دی اور اس لڑکی کو اٹھا لیا۔''

''تو نے اس کے باپ کو بھی بے ہوشی کی دوا سنگھا دی تھی نا؟'' میر کارواں جعفر نے اپنے حبشی غلام سے پوچھا۔

''ہاں میرے آقا!'' حبشی نے جواب دیا۔'' پہلے میں نے اس کے باپ ہی کو بے ہوش کیا تھا۔''

''شاباش!'' میر کارواں نے حبشی غلام کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھا' پھر بولا۔ ''اسے خیمے کے اندرونی حصے میں بچھے بستر پر جا کر لٹا دے۔'' سیاہ فام غلام آگے بڑھا اور خیمے کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ ذرا دیر میں واپس آ کر اس نے میر کارواں سے رخصت کی اجازت چاہی۔

''ہاں اب تو جا' مگر صبح ہونے سے پہلے تجھے پھر ایک بار میرے پاس آنا ہے۔'' میر کارواں کا لہجہ تاکیدی تھا۔

''مجھے علم ہے میرے آقا کہ اس لڑکی کو واپس اس کے خیمے میں پہنچانا ہے۔'' حبشی کہنے لگا۔ پھر خیمے سے نکل گیا۔

میر کارواں جعفر یقیناً شیطان کا آلہ کار تھا۔ میں اس بھٹکے ہوئے آدم زاد کو سبق سکھانا چاہتی تھی۔ عارج سے میں نے اسی لئے کہا۔

''تجھے معلوم ہے کہ میر کارواں کا حبشی غلام کس خیمے سے آدم زادی کو اٹھا کر لایا ہے۔ تو اسے وہیں پہنچا آ!''

''اور تو اے دینار؟...... کیا تو یہیں رہے گی؟'' عارج نے پوچھا۔

"میری فکر چھوڑ اور میں نے تجھ سے جو کہا ہے اس پر عمل کر!" میں نے جواب دیا۔

عارج نے پھر کچھ نہیں کہا۔ وہ خیمے کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ میر کارواں جعفر کو بھی میں نے اسی طرف قدم بڑھاتے دیکھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میر کارواں خیمے کے اندرونی حصے میں پہنچتا۔ عارج اس آدم زادی کو وہاں سے نکال کر لے گیا۔ جس آدم زادی کو لے کر عارج گیا تھا میں نے اس کا خیالی انسانی پیکر اختیار کرنے میں دیر نہیں کی۔ جعفر کی پشت اب میری طرف تھی۔ اس نے جیسے ہی اندرونی حصے میں قدم رکھا اچھل پڑا۔ اس کے سامنے خالی بستر تھا۔ اسے دانستہ مزید بدحواس کرنے کی غرض سے میں بول اٹھی۔ "اے میر کارواں جعفر! مجھے تم وہاں کہاں تلاش کر رہے ہو...... میں تو یہاں ہوں مڑ کر دیکھ مجھے۔"

جعفر تیزی سے پلٹا۔ اس کے چہرے پر انتہائی حیرت تھی۔ وہ ہکلانے لگا۔ "مم...... مگر تم...... تم تو بے...... بے ہوش تھیں۔"

"مجھے تمہارے ہوش اڑانے کیلئے ہوش میں آنا پڑا۔" میں یہ کہتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

میر کارواں مبہوت سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا' پھر بڑبڑایا۔ "تم...... تم واقعی اس قدر حسین ہو کہ...... کہ کوئی بھی تمہیں دیکھ کر ہوش کھو سکتا ہے۔"

میں اس عرصے میں میر کارواں کے بالکل سامنے پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اے جعفر! اے ہوس کے غلام! میر کارواں رہنما ہوتے ہیں' تمہاری طرح راہزن نہیں۔ تم تو مسافروں کو سیدھی راہ دکھانے کے بجائے انہیں لوٹ لیتے ہو۔ بڑے ہی کمینے ہو تم۔"

"کیا کہا کمینہ!" میر کارواں چونک کر بولا۔ اسے یقیناً اپنے مرتبے کا خیال آ گیا تھا۔ "تم ہوش میں تو ہو لڑکی۔" اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"تو کمینہ ہی نہیں ذلیل بھی ہے۔" میں نے اسے مزید غصہ دلانے کیلئے کہا۔

غصے کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے مجھے مارنے کیلئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ میرا زوردار طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔ یہ کسی آدم زادی کا نہیں' ایک جن زادی کا طمانچہ تھا۔ میر کارواں اسی سبب لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہو گیا۔

"تو...... تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا...... میر کارواں جعفر کی بے عزتی کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔" وہ غصے کی زیادتی سے کانپنے لگا۔

"معاف کرنے یا سزا دینے کا اختیار تجھے نہیں' مجھے ہے اے جعفر! کوئی میر کارواں ہو یا مسافر غلام ہو کہ آقا' انصاف کی نظر میں سب ایک ہیں۔ تو نے مجھے اپنے غلام کے ذریعے اغوا کرا کے جرم کیا ہے۔" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"جھوٹ بولتی ہے تو!" وہ صاف مکر گیا۔ "میں نے تجھے اغوا نہیں کرایا بلکہ تو خود چوری کی نیت سے میرے خیمے میں گھس آئی ہے۔" اس نے مجھ پر الزام لگایا۔ "میں نے تجھے عین موقع پر دیکھ لیا تو اب تو مجھ پہ تہمت لگا رہی ہے۔"

"یہ کہانی تو کسے سنا رہا ہے اے جعفر! قافلے والے جب تجھ پر ملامت کریں تو یہ جھوٹ بولیو!" میں ابھی یہی کہہ پائی تھی کہ عارج آ گیا۔ ایک نظر عارج پر ڈالتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ "جرم کی سزا تو ملے گی تجھے!"

"تو کون ہوتی ہے' مجھے میرے جرم کی سزا دینے والی! میں ابھی تجھے بتاتا ہوں۔" جعفر یہ کہتے ہوئے ایک طرف جھپٹا۔

میں نے وہاں چمڑے کا ایک کوڑا پڑا ہوا دیکھا۔ جعفر نے اسے اٹھا لیا تو میں نے کہا۔ "تو نے یہ اچھا کیا اے جعفر کہ اپنی سزا خود تجویز کر لی۔ اب یہی کوڑا تجھے تیرے جرم کی سزا دے گا۔ میں چلتی ہوں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے خیالی انسانی پیکر ترک کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے جعفر کے ہاتھ سے چمڑے کا کوڑا چھین لیا۔

اچانک مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے غائب ہوتے دیکھ کر جعفر کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے۔ بظاہر اب وہ خیمے میں اکیلا تھا۔ اسی وقت کوڑا حرکت میں آ گیا۔ یقیناً جعفر کو یہی دکھائی دیا ہو گا کہ کوڑا خود بخود اس پر برس رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ خوفزدہ ہو کر چیخنے لگا۔ اس کے حبشی غلام اور دیگر ملازمین کا خیمہ برابر والا ہی تھا۔ میر کارواں کے خیمے سے اس کی چیخ پکار سن کر وہ لوگ بھی وہیں آ گئے۔

ان آدم زادوں کیلئے وہ انتہائی حیرت انگیز منظر تھا۔ میں کیونکہ ان کی نظروں سے اوجھل تھی اس لئے انہیں صرف چمڑے کا کوڑا ہی میر کارواں پر برستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پھر انہی میں سے ایک آدم زاد نے ایسا شوشہ چھوڑا جو حقیقت پر مبنی تھا۔

"لگتا ہے میر کارواں کے خیمے میں جنات گھس آئے ہیں۔" ان الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ میرے نزدیک یہ الفاظ خطرے کی گھنٹی تھے۔

عارج نے بھی غالباً خطرہ محسوس کر لیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اے دینار! اب یہاں

سے نکل چل۔"

چمڑے کا کوڑا میں نے میر کارواں جعفر کے قریب پھینک دیا۔ اسی وقت میری نگاہ جعفر کے حبشی غلام پر پڑی۔ وہ حیران حیران سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ شاید حبشی کو اس لڑکی کی تلاش تھی جسے وہ اپنے آقا کیلئے اغوا کر کے لایا تھا۔ صورتحال ایسی تھی کہ وہ اپنے آقا سے بھی کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ ہوس کے اس غلام آدم زاد جعفر کیلئے اتنی سزا کافی تھی۔ میں اسی لئے عارج کے ساتھ اس کے خیمے سے باہر نکل آئی۔

چیخ و پکار کی وجہ سے میر کارواں کے ملازمین ہی نہیں دیگر اہل قافلہ بھی جاگ اٹھے تھے۔ ان سبھی کا رخ میر کارواں کے خیمے کی طرف تھا۔ وہ غالباً حقیقت حال جاننا چاہتے تھے۔ میں نے ان میں ایک باریش خطرناک آدم زاد کو بھی دیکھا۔ اس کی پیشانی پر سجدے کا نشان واضح تھا۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر اب مجھے یہ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ کس وضع قطع اور کس حلئے کے آدم زاد عموماً ہم جنات کیلئے خطرناک ہوتے ہیں۔ میں اس قسم کے آدم زادوں سے دور ہی رہتی تھی۔

"تو نے اس آدم زاد کو دیکھا اے عارج؟" میں نے عارج سے کہا۔ "وہ باریش جو ابھی میر کارواں کے خیمے میں گیا ہے؟"

"ہاں دیکھا۔" عارج نے جواب دیا اور پھر اس آدم زاد کے متعلق میرے خیال کی تائید کر دی۔

"تو نے میر کارواں کے ملازمین میں سے کسی کی زبانی یہ الفاظ تو سن ہی لئے ہوں گے کہ خیمے میں جنات گھس آئے ہیں...... اگر کسی نے پھر یہ ذکر چھیڑ دیا تو ہمارے لئے باریش آدم زاد کی طرف سے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔" میں نے خدشے کا اظہار کیا۔

"جو کچھ ان آدم زادوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے دیکھ کر اور کیا نتیجہ نکلتا ہے۔" عارج نے کہا "چمڑے کا کوڑا خود بخود کس طرح حرکت میں آ سکتا ہے...... اس سے یہی تو ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی نظر نہ آنے والا وجود اس کوڑے کو حرکت دے رہا ہے۔ یہ حیران کن بات ایسی نہیں جسے وہ آدم زاد نظر انداز کر دیں۔ ابھی ٹھہر جا اے دینار! دیکھتے ہیں کہ اس واقعہ کا آدم زادوں پر کیا ردعمل ہوا ہے۔" عارج نے مشورہ دیا۔

"تو نے ہی تو پہلے نکل چلنے کو کہا تھا۔" میں بولی۔ "اب تو ہی رکنے کو کہہ رہا ہے' مگر یہاں رکنے سے کیا حاصل! خیمے کے اندر چلتے ہیں۔"

ہم اندر پہنچے تو وہاں موجود افراد میں سے کسی نے اس باریش خطرناک آدم زاد کو

پہچان لیا اور کہنے لگا۔ "بابا یاسر آ گئے ہیں' اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ بابا کو آگے آنے کیلئے راستہ دو!" یوں مجھے اس باریش آدم زاد کا نام معلوم ہو گیا۔

اس دوران میں میر کارواں جعفر اپنے خیمے کے اندرونی حصے سے باہر آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر دہشت برس رہی تھی۔ لوگوں نے یاسر کو میر کارواں تک پہنچنے کیلئے راستہ دے دیا۔ جعفر ہی کے ایک ملازم نے یاسر کا اس سے تعارف کرایا۔ "یاسر بابا ہیں حضور! اللہ کے ایک نیک اور برگزیدہ بندے ہیں۔ اللہ نے انہیں جنات پر قابو پانے اور انہیں مار بھگانے کی قوت و طاقت عطا فرمائی ہے۔"

کہو اے میر کارواں! تم پر کیا گزری؟ میں تمہاری ہی زبانی پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" یاسر نے جعفر کو مخاطب کیا۔

چند لمحے جعفر خاموش رہا پھر سہمی ہوئی سی آواز میں بتانے لگا۔ "میں خیمے کے اندرونی حصے میں سو رہا تھا کہ مجھے خوف زدہ کر دینے والی ایک آواز سنائی دی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔" میر کارواں جعفر من گھڑت کہانی سنا رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ یہ کیسے بتا دیتا کہ اس نے اپنی حبشی غلام کے ذریعے قافلے کی ایک لڑکی کو اغوا کرایا تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "خیمے کے اندر ہی زمین پر ایک طرف چمڑے کا کوڑا پڑا ہوا تھا۔ اچانک خود بخود اپنی جگہ سے بلند ہوا اور پھر مجھ پر برسنے لگا۔ اسی سبب میرے منہ سے چیخیں نکلنے گئیں اور لوگ یہاں آ گئے۔"

"اچھی طرح سوچ کر بتاؤ' کوئی ایسی بات تو نہیں جو تم بھول گئے ہو اور نہ بتائی ہو۔" یاسر نے کہا۔

"میں...... نے سب...... سب کچھ بتا دیا ہے۔" جعفر رک رک کر کہنے لگا۔

"سنو! تمہارے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی نادیدہ قوت نے تمہیں زدوکوب کیا ہے۔ نظر نہ آنے والا وہ کوئی جن بھی ہو سکتا ہے' لیکن کسی وجہ کے بغیر وہ ایسا کیوں کرتا...... کسی سے تمہاری دشمنی تو نہیں؟" یاسر نے اپنی بات کے آخر میں پوچھا۔

"نہیں۔" جعفر نے انکار میں سر ہلا دیا' پھر بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ کچھ جنات شریر بھی ہوتے ہیں اور وہ کسی وجہ کے بغیر بھی لوگوں کو ستاتے اور پریشان کرتے ہیں۔ کیا خبر مجھ پر کوڑے برسانے والا بھی ایسا ہی کوئی جن ہو۔"

"ممکن ہے' ایسا ہی ہو۔ شریر جنات بھی ہوتے ہیں' تم نے غلط نہیں سنا۔" یاسر نے تائید کی۔ "اس کے باوجود اے میر کارواں! تم ایک بات یاد رکھنا تمہارا بیان جھوٹ ہوا تو

تمہیں بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"وہ...... وہ کیسے؟" میر کارواں نے گھبرا کر دریافت کیا۔

"میں ایک عمل کے ذریعے اس قافلے کے گرد حصار کھینچ دوں گا۔" یاسر نے جواب دیا۔ "اگر قافلے کے ساتھ جنات بھی ہوئے تو پھر وہ حصار کے اندر نہ رہ سکیں گے۔ انہیں یہاں سے فرار ہونا پڑے گا۔ اس کے علاوہ یہ کہ نجف پہنچنے تک یہ حصار قافلے کے گرد قائم رہے گا اور حصار کے اندر جنات داخل نہیں ہو سکیں گے۔ بصورت دیگر اگر تم نے دروغ گوئی سے کام لیا ہوگا تو تمہیں جسمانی اذیت برداشت کرنی ہوگی۔"

"ہرگز نہیں۔" میر کارواں بلند آواز میں بولا۔ "میں تمہیں قافلے کے گرد حصار کھینچنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"لیکن اب تمہارے اجازت دینے نہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" باریش یاسر نے اطمینان سے کہا۔

"فرق کیوں نہیں پڑتا۔ میں میر کارواں ہوں۔" جعفر کی آواز میں تکبر تھا۔ "میری اجازت کے بغیر تم حصار نہیں کھینچ سکتے۔"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔" یاسر کہنے لگا۔ "یہ مفاد عامہ کا معاملہ ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں اہل قافلہ کو جنات کے ممکنہ شر سے محفوظ رکھوں۔ انہوں نے جس طرح تمہیں اذیت دی ہے، دوسروں کو بھی تکلیف و پریشانی میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ تمہیں آخر حصار نہ کھینچنے پر کیوں اصرار ہے؟"

"میری مرضی!" میر کارواں خودسری سے بولا۔ "نہیں کھینچنے دیتا میں حصار!"

اس وقت تک میر کارواں کے خیمے میں خاصے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ بھی یاسر کے حق میں بولنے لگے۔ جعفر اس لئے حصار کھینچنے سے اختلاف کر رہا تھا کہ اس کا بیان قطعی غلط تھا۔ اسے یہ فکر تھی کہ کہیں جسمانی اذیت برداشت نہ کرنی پڑے۔ ملازمین کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو جعفر کی طرف ہو۔ انہوں نے یاسر پر زور دیا کہ وہ حصار ضرور کھینچے۔

"تم سب لوگ فوراً میرے خیمے سے نکل جاؤ۔" جعفر نے بات بگڑتے دیکھی تو تقریباً چیخ اٹھا۔

پھر جعفر کے ملازمین کو چھوڑ کر سبھی لوگ یکے بعد دیگر خیمے سے چلے گئے۔ عارج اور میں البتہ وہیں رہے۔

"اب کیا ہوگا اے دینار!؟" عارج نے مجھ سے سوال کیا۔ اس کے لہجے سے

فکرمندی جھلک رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ عارج کے سوال کا میں کوئی جواب دیتی، جعفر اپنے ملازمین سے کہنے لگا۔ "جنات بھگانے والے اس بڑبولے کا خیمہ اکھاڑ کر پھینک دو۔ خیال رکھنا کہ وہ قافلے کے گرد حصار نہ کھینچ سکے۔ سمجھ گئے کہ نہیں۔"

"لیکن میرے آقا! ہمیں کس طرح پتا چلے گا کہ وہ حصار کھینچ رہا ہے؟" جعفر کے حبشی غلام نے پوچھا۔

"بیوقوف غلام!" جعفر نفرت و حقارت سے بولا۔ "وہ حصار کھینچے گا تو اسے قافلے کے گرد چکر لگانا پڑے گا۔ تم لوگ بھی جاؤ۔"

جعفر کے ملازمین خیمے کے در کی طرف بڑھ گئے۔ اسی وقت عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"پہلے جعفر کے ملازمین کو کوشش کر لینے دو۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ آدم زاد یاسر ان کے قبضے میں نہ آیا تو پھر ہم کوئی قدم اٹھائیں گے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمیں حالات پر نظر رکھنے کے لئے ابھی اپنے انسانی قالبوں سے باہر ہی رہنا پڑے گا۔" عارج بولا۔

"ظاہر ہے کہ ہم یاسر کی طرف سے غافل تو نہیں رہ سکتے۔ چل ہم بھی یہاں سے چلتے ہیں۔" میں یہ کہتی ہوئی جعفر کے خیمے سے نکل آئی۔ عارج بھی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ اسی وقت مجھے جمیلہ کی بڑی بہن زینب کا خیال آیا کہ کہیں چیخ و پکار سن کر وہ نہ جاگ اٹھی ہو۔ اپنے اس خدشے کا اظہار میں نے عارج سے کیا تو اس نے بھی یہی مشورہ دیا کہ "ہمیں پہلے اپنے خیمے کی طرف چلنا چاہئے۔"

میرا خدشہ درست ہی ثابت ہوا۔ خیمے میں پہنچتے ہی میری نظر پریشان حال زینب پر پڑی۔ پھر میں نے اپنے اور عارج کے انسانی پیکروں کو نیند میں جھونکے کھاتے دیکھا۔ زینب ان دونوں کو بار بار جھنجھوڑتے ہوئے روہانسی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو؟...... کب سے جگا رہی ہوں، اٹھتے ہی نہیں ...... باہر تو جا کر دیکھو کیسا شور ہے؟"

زینب کے کسی سوال کا جمیلہ یا ایوب نے کوئی جواب نہیں دیا اور اونگھتے اونگھتے پھر بستروں سے لڑھک گئے۔ زینب کا بیٹا ہلال البتہ اب تک سو رہا تھا۔ موجودہ صورتحال میں فوری طور پر مجھے ایک یہ تدبیر سوجھی اور میں نے اسی پر عمل کیا۔

دراصل عارج اور میں نے اپنے انسانی قالبوں سے نکل کر انہیں گہری نیند سلا دیا تھا۔

وہ اسی لئے زینب کے بار بار جھنجھوڑنے کے باوجود بیدار نہیں ہوئے تھے۔ اپنے انسانی قالبوں میں داخل ہو کے زینب کو مطمئن کرنے میں ہمیں دیر ہو جاتی۔ اسی خیال سے میں نے زینب پر بھی نیند مسلط کر دی۔ میرے زیر اثر وہ اپنے بستر پر لیٹتے ہی بے خبر ہو گئی۔

''اور اے دینار! صبح جب زینب تجھ سے پوچھے گی یا مجھ سے سوال کرے گی کہ ہم رات کو کیوں نہیں جاگے تو کیا جواب دے گی؟'' عارج بولا۔

''صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''فی الحال تو یہاں سے چل جعفر کے ملازمین کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے یاسر سے کیا سلوک کیا۔''

عارج کہنے لگا۔ ''مجھے تو وہ آدم زاد بڑا ڈھیٹ معلوم ہوتا ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ کر کے ہی دم لے گا۔''

اپنے خیمے سے نکل کر قافلے کا جائزہ لینے کیلئے فضا میں ہم تھوڑے سے بلند ہوئے۔

''اے عارج! ...... وہ دیکھ! ...... ادھر! ...... وہاں آدم زادوں کا ہجوم نظر آ رہا ہے۔'' میں نے عارج کو ایک طرف متوجہ کیا۔

''ہاں دیکھ لیا میں نے۔'' عارج نے تصدیق کی۔

''مجھے تو یہ لگتا ہے کہ جعفر کے ملازمین نے اس خطرناک آدم زاد یاسر کا خیمہ اکھاڑ پھینکا ہے۔'' میں یہ کہتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی۔

''تو نے ٹھیک ہی کہا تھا اے دینار!'' عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ واقعی میر کارواں کے ملازم ہیں۔ ان میں حبشی غلام بھی نظر آ رہا ہے۔''

ہم ہجوم کی جگہ پہنچ گئے تھے۔ وہاں موجود اہل قافلہ نے میر کارواں کے ملازموں کو گھیر رکھا تھا اور ان سے پوچھ رہے تھے کہ انہوں نے یاسر کا خیمہ کیوں اکھاڑ دیا۔ جعفر کے حبشی غلام نے ان سوالوں کا ایک ہی جواب دیا۔ ''یہ میر کارواں کا حکم تھا۔ اسی کے حکم پر ہم نے ایسا کیا ہے۔'' پھر وہ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جعفر کے دیگر ملازمین بھی اسی کے ساتھ چلے گئے۔

یاسر بھی وہیں اپنے اکھڑے ہوئے خیمے اور سامان کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ ہجوم میں سے ایک بوڑھا آدم زاد آگے آیا اور اس نے یاسر کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور نرمی سے کہنے لگا۔ ''اے یاسر! گھبراؤ مت ہم قافلے والے تمہارے ساتھ ہیں اگر میر کارواں کے ملازموں نے تمہارا خیمہ اکھاڑ دیا ہے تو تم اپنا سامان لے کر میرے خیمے میں آ جاؤ یہاں سے میرا خیمہ کچھ ہی فاصلے پر ہے۔''

ایک اور نوجوان آدم زاد بولا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے یہ کسی کے خیمے میں بھی رہ لیں گے مگر میر کارواں نے ایسا کیوں کیا؟''

''اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔'' متوسط عمر کا ایک شخص اس نوجوان سے مخاطب ہوا۔ ''میر کارواں نے دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ اس کی مرضی یہ ہے کہ قافلے کے گرد حصار نہ کھینچا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو جھوٹ بولنے کے سبب اسے بھی جسمانی اذیت ہو گی۔''

''پھر تو حصار ضرور کھینچا جانا چاہئے۔'' ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

بوڑھے آدم زاد نے بھی تائید کی۔ ''قافلے میں جنات ہوئے تو ہم سب ان سے محفوظ ہو جائیں گے اور اگر اس سلسلے میں میر کارواں کا بیان غلط ہے تو اسے جھوٹ بولنے کی سزا مل جائے گی۔ اس طرح کسی مسافر کا خیمہ اکھاڑ دینا تو ظلم ہے۔''

یاسر سے اہل قافلہ کی ہمدردی ہمارے لئے نقصان دہ ہی تھی لیکن ابھی ہم نے کسی اقدام سے گریز کیا۔ عارج کو بھی میں نے سمجھایا کہ مداخلت کا وقت نہیں آیا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یاسر اسی بوڑھے آدم زاد کے خیمے میں اپنا سامان لے کر آ گیا جس نے پہلے یہ پیشکش کی تھی۔ سامان اٹھا کر لانے میں دوسرے لوگوں نے بھی یاسر کے ساتھ تعاون کیا تھا۔

''اے یاسر! اب تم جو عمل پڑھنا چاہو پڑھو۔'' بوڑھے آدم زاد نے کہا۔ ''اور قافلے کے گرد......''

''پہلے مجھے وضو کیلئے پانی چاہئے۔'' یاسر بول اٹھا۔ ''عمل پڑھنے کیلئے میرا باوضو ہونا ضروری ہے۔''

''ابھی لایا پانی۔'' بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا۔

عارج اور میں اسی خیمے میں تھے۔ وہاں ہم نے چھوٹی سی ایک مشکی میں پانی رکھے دیکھا۔ اسی کے قریب مٹی کا ایک برتن رکھا تھا۔ میں لپک کر مشکی کے پاس پہنچ گئی۔ اس سے پہلے کہ بوڑھا اس مشکی سے پانی لیتا' میں نے مشکی پھوڑ دی۔

''ارے ارے! یہ کیا ہوا؟'' بوڑھا پھوٹی ہوئی مشکی سے پانی بہتے ہوئے دیکھ کر حیرت کے ساتھ بولا۔

بوڑھے کے خیمے میں کئی اور آدم زاد بھی تماشا دیکھنے آ گئے تھے کہ دیکھیں یاسر کیا کرتا ہے۔ انہی میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''بابا تم فکر نہ کرو' میں اپنے خیمے سے وضو کیلئے پانی لے کر آتا ہوں۔''

عارج کو میں نے اس آدم زاد کے پیچھے لپکتے دیکھ کر روک لیا اور بولی۔ ''ہم کتنی

مشکیاں اور مٹکے پھوڑیں گے..... یوں بھی اہل قافلہ کو محض ایک شخص کی وجہ سے پانی کی بوند بوند کو ترسا دینا اچھی بات نہیں ۔ہمیں کوئی اور تدبیر کرنی پڑے گی۔''

''تو پھر سوچ اے دینار!'' عارج کی آواز میں بیزاری تھی۔ ''میری سمجھ میں تو بس ایک ہی تدبیر آ رہی ہے۔''

''مجھے بھی تو بتا کیا تدبیر ہے وہ۔'' میں نے عارج سے دریافت کیا۔

''اس خطرناک آدم زاد کو یہاں سے اٹھا کر کہیں بہت دور پھینک آؤں۔'' عارج نے جھنجھلا کر کہا۔

''بات تو ٹھیک ہے تیری۔'' میں سنجیدہ ہو گئی۔ ''کچھ اور نہ بن پڑا تو تیری ہی تدبیر پر عمل کرنا پڑے گا۔''

''پھر دیر کس بات کی ہے؟'' عارج نے سوال کیا۔

''میں پہلے اس تدبیر پر عمل کرنا چاہتی ہوں جو بالکل سامنے کی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں اس آدم زاد کو اپنے اثر میں لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ کوشش کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ عموماً ایسے آدم زادوں کو اثر میں لینا نہ صرف مشکل بلکہ خطرناک بھی ہوتا ہے۔''

''اگر اس میں خطرے کی کوئی بات ہے تو ایسا نہ کر اے دینار!'' عارج نے مجھے سمجھایا۔

''اب تک بڑوں سے یہ بات سنی ہی سنی ہے کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا۔'' میں نے عارج کو بتایا۔ ''ایک دفعہ تجربہ تو کر لینے دے۔''

''سوچ لے اے دینار کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔''

''اللہ مالک ہے۔'' میں نے عارج کی ہمت بندھائی۔

اس عرصے میں وہ آدم زاد واپس آ چکا تھا جو یاسر کیلئے وضو کی غرض سے پانی لینے گیا تھا۔ یاسر خیمے کے در سے باہر نکل کے وضو کرنے لگا۔ میں اس کے قریب پہنچ گئی تو غیر متوقع طور پر اسے چونکتے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اسے وہاں میری موجودگی کا احساس ہو گیا ہے۔ وضو کرتے ہوئے معاً اس کے ہونٹ تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ اسی لمحے میں نے اس کے دماغ پر قبضہ کرنا چاہا۔ مجھے کئی بار کوشش کے بعد کامیابی ہوئی اور میں نے اس کے دماغ میں سرگوشی کی۔ ''اے یاسر! تو قافلے کے گرد حصار نہیں کھینچے گا۔''

میری سرگوشی کے ساتھ ہی یاسر کے ہونٹ اور بھی تیزی کے ساتھ حرکت میں آ گئے۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ یقیناً وہ کوئی عمل پڑھنے میں مصروف تھا۔ میرے لئے یہ سمجھنا بھی دشوار نہیں تھا کہ وہ مجھ سے محفوظ رہنے کی خاطر ہی عمل پڑھ رہا تھا۔ اپنی بات کا جواب نہ پا کر مجھے غصہ آ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اس کے دماغ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ جو عمل بھی کر رہا تھا ادھورا رہ گیا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

''کیا ہوا اے یاسر؟'' خیمے کے اندر سے بوڑھے آدم زاد کی آواز آئی۔

''میرا سر..... سر پھٹا جا رہا ہے۔'' یاسر نے چیخ کر بتایا۔ ''کوئی..... کوئی میرے دماغ پر..... وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

خیمے کے اندر جتنے بھی آدم زاد تھے باہر آ گئے۔ کوئی بولا۔ ''ارے یاسر کا چہرہ پیلا پڑ رہا ہے۔''

''مجھ پر... حملہ..... کسی جن زادی نے حملہ کیا ہے۔'' یاسر نے اٹک اٹک کر بتایا۔

''اس.....اس کی آواز میں..... نے سنی تھی۔''

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں نے آواز بدل کر اس کے دماغ میں سرگوشی نہیں کی تھی۔

''وہ جن زادی تم سے کیا کہہ رہی تھی؟'' بوڑھے آدم زاد نے یاسر سے معلوم کیا۔

''حصار... نہ.....نہ کھینچنے کو کہہ رہی تھی۔'' یاسر نے بڑی مشکل سے کہا۔

میں نے کچھ سوچ کر اس خطرناک آدم زاد یاسر کو مزید مہلت نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے یاسر کے ذہن کو ایک بار پھر زوردار جھٹکا دیا۔ یہ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ یاسر کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ چیخ بھی نہ سکا اور بے ہوش ہو گیا۔

''یہ..... یہ یاسر کو کیا ہوا؟..... اسے سنبھالو!'' بوڑھے آدم زاد نے وہاں موجود دوسرے لوگوں سے کہا۔

وہ لوگ یاسر کو اٹھا کر خیمے کے اندر لے گئے۔ میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''اب تیری تدبیر پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔''

''تو جو اسے اپنے اثر میں لینا چاہتی تھی' کیا اس کوشش میں تجھے کامیابی نہیں ہوئی؟'' عارج نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ پھر تفصیل بیان کر دی۔

''یہ اچھا ہوا کہ تجھے اس کوشش میں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔'' عارج نے اطمینان کا اظہار کیا۔

"ممکن ہے وہ جو عمل پڑھ رہا تھا' پورا ہونے پر مجھے نقصان پہنچ جاتا۔ میں نے اسی لئے اسے مہلت نہیں دی۔" میں بولی۔

"ٹھیک ہی کیا تو نے۔" عارج کہنے لگا۔ "ورنہ تو کیا خبر اونٹ کس کروٹ بیٹھتا اچھا اب یہ بتا..."

عارج کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے اپنے اگلے اقدام سے آگاہ کر دیا۔

چند ہی لمحے بعد وہ شخص جو یاسر کیلئے وضو کا پانی لایا تھا' ڈری ڈری سی آواز میں وہاں موجود دوسرے لوگوں سے مخاطب ہوا۔ "وہ...... وہ جن زادی اگر یاسر...... یاسر جیسے برگزیدہ اور نیک اعمال بندے پر حملہ کر سکتی ہے تو پھر ہم میں سے کوئی بھی... اس کا شکار بن سکتا ہے...... مجھے تو یہاں ڈر لگ رہا ہے۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے ذہن پر اپنا خوف مسلط کر دیا تھا۔

وہ شخص خیمے سے نکل کر گیا تو میں نے متوسط عمر والے آدم زاد کے دماغ میں سرگوشی کی۔ "تو بھی اٹھ رہا ہے یا میں تجھے اٹھا کر باہر پھینکوں۔"

"جن زادی...." وہ آدم زاد چیخ اٹھا۔ "ابھی ..... ابھی وہ جن زادی میرے دماغ میں بول رہی تھی۔ میں تو چلا۔"

ذرا سی دیر میں صرف بوڑھا آدم زاد وہاں بے ہوش یاسر کے پاس رہ گیا۔ اس کی مجبوری یہ بھی تھی کہ وہ خیمہ اسی کا تھا۔ وہی یاسر کو اپنے خیمے میں لے کر آیا تھا۔ دوسرے لوگوں کے چلے جانے سے بوڑھا بھی خوف زدہ سا لگ رہا تھا۔ وہ زیر لب قرآنی آیات کا ورد کر رہا تھا۔ مجھے اسی لئے اس بوڑھے آدم زاد پر ترس آ گیا۔ دوسرے آدم زادوں کی طرح میں نے ڈرانے کے بجائے اس کے ذہن پر نیند مسلط کر دی۔

بوڑھے نے جماہیاں لیں اور بڑبڑایا۔ "یہ اچانک مجھے اتنی زور کی نیند کیوں آنے لگی۔" پہلے تو اس نے نیند بھگانی چاہی' پھر مجبور ہو کر یاسر کے قریب ہی فرش پر لیٹ گیا۔ اسے سونے میں دیر نہیں لگی۔ میں اسی کی منتظر تھی۔ پھر ہم یاسر اور اس کے سامان کو وہاں سے نکال کر لے آئے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہوش میں آنے کے بعد سامان پاس نہ ہونے سے یاسر کو پریشانی ہو۔ میرے نزدیک وہ بہرحال بے قصور تھا۔ نادانستگی ہی میں وہ میرے خلاف قدم اٹھانے والا تھا۔ مجھے اس کی منزل معلوم تھی۔ سو اسے سامان سمیت کہیں اور نہیں نجف ہی پہنچا دیا۔ ہوش میں آ کر ظاہر ہے اس پر یاسر کو شدید حیرت ہوتی' مگر یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔

خطرہ ٹل چکا تھا' عارج کے ساتھ میں اسی لئے واپس اپنے پڑاؤ پر آ گئی۔ اب وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اپنے خیمے میں پہنچ کر میں نے جمیلہ کے انسانی قالب میں اور عارج ایوب کے پیکر میں سما گیا۔

دوسرے دن صبح سارے قافلے میں یاسر کی پراسرار گمشدگی موضوع گفتگو بنی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ جنات کے ہاتھوں میر کارواں جعفر کی پٹائی کے بھی چرچے ہو رہے تھے۔ زینب کو رات والا واقعہ یاد تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگی۔ "جمیلہ! رات کو تجھے کیا ہو گیا تھا؟ بھائی ایوب کو بھی میں نے جگانا چاہا مگر تم دونوں ہی نہیں جاگے۔ اٹھ کر بھی ایک بار بیٹھ گئے مگر دوبارہ سو گئے۔"

"اے میری بہن! مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔" میں جان کر انجان بن گئی۔

"اور بھائی ایوب! آپ...... آپ کو تو....."

"نہیں۔" عارج بول اٹھا۔ اس نے بھی صاف انکار کر دیا۔

لوگوں نے ناشتہ کر لیا تو قافلہ روانہ ہو گیا۔ بغداد اور نجف کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ رات ہوتے ہوتے قافلہ نجف پہنچ گیا۔ زینب کی رہنمائی میں ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔ گھر کے دروازے پر زینب نے دستک دی۔ اونٹوں اور گھوڑے کو ہم نے کارواں سرائے ہی میں چھوڑ دیا تھا۔

"کون ہے؟" دور سے ایک انسانی آواز آئی۔

"ارے یہ آواز تو یمامہ کی لگتی ہے۔" زینب چونک کر بولی۔ "دروازہ کھولو.... میں زینب ہوں۔"

میں نے زینب کے ذہن پر توجہ دی تو پتا چلا کہ یمامہ اس کی سوتیلی بھابی نائلہ کی غیر شادی شدہ بہن تھی۔ اپنے گھر میں یمامہ کی موجودگی زینب کیلئے حیران کن ہی تھی۔ ذرا سی دیر میں دروازہ کھل گیا اور ایک نوجوان آدم زادی نظر آئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" زینب نے گھر میں قدم رکھتے ہوئے نوجوان آدم زادی سے سوال کیا۔

"مجھے نائلہ بھابی نے گھر کا کام کرنے کیلئے یہاں بھیجا ہے۔" نیلی آنکھوں والی وہ دوشیزہ یمامہ ہی تھی۔

"تمہاری باجی کو تمہیں یہاں بھیجتے ہوئے ذرا بھی حیا نہ آئی کہ ایک غیر مرد کے پاس...."

زینب کی بات ادھوری رہ گئی۔ صحن کے دوسری طرف سے تیز مردانہ آواز سنائی دی۔

''یمامہ کون آیا ہے؟''

''آنا کون...... میں آئی ہوں اپنے گھر میں۔'' یمامہ کے بجائے زینب نے بلند آواز میں جواب دیا۔

زینب کے ساتھ ساتھ میں اور عارج بھی گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ اندر قدم رکھتے ہی مجھے اپنے اعصاب پر ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ مجھے اس وقت تک علم نہیں تھا کہ عارج کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔

اچانک مجھے سامنے سے بھاری ڈیل ڈول والا ایک آدم زاد آتا دکھائی دیا۔ زینب کے ذہن پر توجہ دے کر مجھے اس آدم زاد کے بارے میں پتا چلا کہ وہی اس کا شوہر بلال ہے۔ اپنے ڈیل ڈول کی طرح آواز بھی بھاری تھی۔

''آخر تم در در کی ٹھوکریں کھا کر واپس آ ہی گئیں۔'' بلال کی آواز میں طنز تھا۔ وہ زینب سے مخاطب تھا۔ ''تمہیں تمہاری بہن جمیلہ نے بھی اپنے گھر میں رکھنا پسند نہیں کیا۔ جمیلہ کو ڈر ہوگا کہ کہیں تم اس کے شوہر پر ڈورے نہ ڈالنے لگو۔ وہ اسی لئے تمہیں یہاں لے آئی۔''

''بس کرو!'' زینب تقریباً چیخ اٹھی۔ ''تم حد سے بڑھ رہے ہو۔''

''اگر حد سے بڑھتا تو تمہیں اس گھر میں قدم ہی نہ رکھنے دیتا۔'' بلال نے حقارت سے کہا۔

''یہ میرا گھر ہے اور مجھے یہاں قدم رکھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' زینب تیز آواز میں بولی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی ''آؤ جمیلہ!''

میں اور ایوب زینب کے پیچھے چل دیئے۔ زینب کے ساتھ ہی اس کا بیٹا ہلال بھی تھا۔ دانستہ میں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی اور مجھے خاموش دیکھ کر عارج بھی چپ تھا۔ زینب کے شوہر بلال نے اخلاقاً بھی مجھے یا عارج کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ حالانکہ ہمارے انسانی قالبوں سے اس کا قریبی رشتہ تھا۔ ہمیں ساتھ لئے زینب گھر کے ایک حصے میں آ گئی۔ وہاں قریب قریب دو دالان بنے ہوئے تھے۔ اس نے ایک دالان میں ہمیں ٹھہرا دیا۔ ہم نے وہاں اپنا سامان رکھا اور بستر بچھا دیئے جو ہم کارواں سرائے سے ساتھ لائے تھے۔ برابر والے دالان میں زینب نے اپنا ڈیرا جما لیا۔ اس نے غسل خانے تک ہماری رہنمائی کی۔ ہم نے ہاتھ منہ دھونے کے بعد لباس تبدیل کر لئے۔ کچھ ہی دیر میں زینب نے ہمارے لئے کھانے کا بندوبست کر دیا۔ مجھے زینب اپنے ہی گھر میں اجنبی سی لگ رہی تھی۔

دن بھر سفر کی وجہ سے تھکے ہوئے تھے اس لئے جلد ہی بستروں پر دراز ہو گئے۔ خلوت میسر آئی تو میں نے عارج سے کہا۔ ''تجھے اس گھر کا ماحول عجیب عجیب سا محسوس نہیں ہو رہا اے عارج؟''

''ہاں اے دینار!'' عارج نے تصدیق کی۔ پھر خود ہی بتایا ''یہاں آنے کے بعد مجھے اپنے اعصاب پر ایک بوجھ سا بھی لگ رہا ہے۔''

''یہی حال میرا ہے یہاں کچھ نہ کچھ ہے ضرور!'' میں بولی۔

''مگر کیا ہے......؟ میری سمجھ میں تو نہیں آ رہا۔'' عارج کہنے لگا۔

''میری سمجھ میں تو زینب کا شوہر بھی نہیں آیا۔ بڑا بداخلاق معلوم ہوتا ہے۔ ہم سے اس نے بات کرنی بھی پسند نہیں کی۔ بہرحال اب تک حالات کا جائزہ لینے سے ہمیں صرف یہ پتا لگا ہے کہ بلال کی سوتیلی بھابی نائلہ نے کسی خاص مقصد کے حصول کی خاطر اپنی غیر شادی شدہ بہن یمامہ کو یہاں رکھ چھوڑا ہے۔ ممکن ہے زینب کو بلال سے طلاق دلا کے وہ یمامہ ہی سے اس کی شادی کرانا چاہتی ہو۔'' میں نے تجزیہ کیا۔

''پھر تو اے دینار! ایسی صورت میں یہ ضروری ہے کہ کسی بھی طرح یمامہ کو یہاں سے نکال باہر کیا جائے۔'' عارج نے کہا۔

''ابھی تک ہم نے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم حالات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ بہت سی باتیں اب تک ہمارے علم میں نہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کا غیر فطری ماحول بھی میرے لئے ناقابل فہم ہے۔''

''مجھے تو یہ بتا اے دینار! کہ اب کرنا کیا ہے؟'' عارج نے پوچھا۔

''خود تو میں کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں تبھی تجھے کچھ بتاؤں گی نا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، جب تو کوئی نتیجہ اخذ کر لے تو مجھے بتا دیجیو۔ میں اس وقت تک سوتا ہوں۔'' عارج نے یہ کہہ کر آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

نیند مجھے بھی آ رہی تھی اس لئے کچھ نہ بولی۔ دالان میں موجود طاق کے اندر رکھے چراغ کی لو میں نے بستر پر لیٹنے سے پہلے ہی کم کر دی تھی۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے میں نے عارج سے کہا۔ ''خدا حافظ...... شب بخیر! انشاء اللہ کل صبح ملاقات ہو گی۔''

''انشاء اللہ...... خدا حافظ!'' عارج بھی جواباً بولا۔

مجھے سوتے ہوئے شاید زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ یوں محسوس ہوا جیسے زمین ہل رہی ہو۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ عارج کو بھی میں نے اٹھتے دیکھا۔ اسی وقت ہیبت ناک آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''اے دینار! یہ آوازیں کیسی ہیں؟..... ایسا لگ رہا ہے درندے آپس میں لڑ رہے ہوں۔'' عارج نے اظہار خیال کیا۔

اس وقت ایک دم خاموشی چھا گئی۔ میں نے کہا۔ ''اے عارج کوئی ایسا ہے جو نہیں چاہتا کہ ہم یہاں رہیں۔ اس کا مقصد ہمیں یہاں سے ڈرا کر بھگا دینا ہے۔ تو خود ہی سمجھ سکتا ہے کہ ایسا کون ہو سکتا ہے۔''

''زینب کا شوہر بلال۔'' عارج بولا۔

''نہیں۔'' میں نے انکار کر دیا۔ ''یہ ان آدم زادوں کی حرکت ہو سکتی ہے جنہوں نے بقول زینب اس کے شوہر بلال پر سحر کرا دیا ہے۔''

''تیرا اشارہ بلال کے سوتیلے بھائیوں کی طرف ہے؟'' عارج نے وضاحت چاہی۔

''حتمی طور پر تو خیر میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن امکان یہی ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''میرا قیاس یہ ہے کہ ابھی ہمیں خوفزدہ کرنے کا یہ سلسلہ بند نہیں ہو گا۔ اگر ہم سو بھی گئے تو کچھ دیر بعد ہمیں دوبارہ جاگنا پڑے گا۔''

''حیرت ہے کہ زینب برابر والے دالان میں آرام و اطمینان سے سو رہی ہے۔ وہ نہیں جاگی۔'' عارج نے کہا۔

''کیا خبر زمین ہلنے اور ہیبت ناک آوازیں سن کر اس کی آنکھ بھی کھل گئی ہو۔''

''اگر ایسا ہوتا تو وہ ہمارے پاس ضرور آتی۔ پھر بھی میں اٹھ کر اسے دیکھ لیتا ہوں۔'' عارج یہ کہتے ہوئے بستر سے اٹھا اور دالان کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ ذرا دیر میں اس نے واپس آ کر بتایا۔ ''زینب بے خبر سو رہی ہے۔''

''اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ فی الحال ہی کو اس گھر سے بھگانا مقصود ہے۔ میں بولی۔ ''میرا خیال یہ ہے کہ اے عارج ہمیں دشمن سے نمٹنے کے لئے اسے دھوکا دینا پڑے گا' اس کی چال کامیاب رہی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں اے دینار! تو کیا کہنا چاہتی ہے۔

ابھی میں عارج کو بات کا کوئی جواب نہیں دے سکی تھی کہ زمین دوبارہ ہلنے لگی اور پھر ہیبت ناک آواز بھی سنائی دینے لگیں۔ میرا یہ اندازہ درست ہی ثابت ہوا تھا کہ ہمیں خوفزدہ کیا جاتا رہے گا۔

زمین ہلنا بند ہوئی اور ہیبت ناک آوازوں کے بعد سناٹا چھا گیا تو میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''دشمن کو دھوکا دینے سے میرا مقصد یہ تھا کہ وہ جو چاہتا ہے ہم اس پر عمل کریں۔ یعنی بظاہر خوفزدہ ہو کر ہم اس مکان سے چلے جائیں۔''

''اگر ہم نے ایسا کیا تو بے چاری زینب کیا کہے گی جو ہمیں اپنی مدد کیلئے یہاں لے کر آئی ہے۔'' عارج نے اعتراض کیا۔

''اس کیلئے ہمیں زینب کو اعتماد میں لینا پڑے گا۔''

''اور ہم رہیں گے کہاں؟'' عارج نے دریافت کیا۔

''کسی سرائے میں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ دور رہ کر بہتر طور پر زینب کی مدد کی جا سکتی ہے۔''

پھر صبح ہونے تک ہمیں خوفزدہ کیے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ فجر کے وقت میں نے زینب کو جگایا اور اپنے دالان میں لے آئی۔ اسے میں نے بتایا کہ ہم رات بھر سو نہیں سکے۔ اس کے استفسار پر جب میں نے نہ سونے کی وجہ بتائی تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔

''تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں میری بہن!'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''جب تک حالات اعتدال پر نہیں آ جاتے' ہم یہیں نجف میں رہیں گے۔ تمہیں ہم تمہارا حق دلا کر ہی یہاں سے جائیں گے لیکن اس کیلئے ہمیں وقتی طور پر تم سے دور رہنا ہو گا۔''

''تو...... تو پھر تم کہاں رہو گی جمیلہ؟'' زینب نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اس سوال کا جواب میں عارج کو بھی دے چکی تھی زینب کو بھی وہی جواب دے کر مطمئن کر دیا۔

مجھے زینب کا ذہن پڑھ کر پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا شوہر بلال سرکاری ملازم ہے۔ وہ دیوان البرید (ڈاک اور خبر رسانی کا محکمہ) میں ملازمت کرتا تھا۔ وہ اپنے دفتر چلا گیا۔ یمامہ اپنی بہن نائلہ کے گھر چلی گئی۔ نائلہ برابر والے دومنزلہ مکان کی نچلی منزل پر رہتی تھی۔ اوپری منزل میں بلال کے دوسرے سوتیلے بھائی کی سکونت تھی۔ بلال کے دو سوتیلے بھائی تھے۔ وہ دونوں ہی برابر والے مکان میں رہتے تھے۔ ان کی نظریں بلال کے مکان پر تھیں۔ وہ بلال کو وہاں سے نکال کر مکان پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔

ہم اس مکان سے جانے کیلئے اپنا سامان باندھ چکے تھے کہ عارج بولا۔ ''اے دینار! جانے سے پہلے کیوں نہ ہم بھی اپنے دشمنوں کی مزاج پرسی کرتے چلیں...... یہ بڑا ظلم ہے کہ انہوں نے ہمیں رات بھر سونے نہیں دیا۔''

''ان کی خبر لینے کیلئے ہمیں انسانی قالبوں سے نکلنا پڑے گا۔'' میں راضی ہوگئی۔ پھر میں نے اپنے انسانی قالب سے نکلنا چاہا مگر ناکام رہی۔ اسی لمحے مجھے عارج کی آواز سنائی دی۔ اس نے بھی مجھے یہی بتایا۔

اس پر میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ ہمارے دشمنوں نے ہمیں انسانی قالبوں میں قید کر دیا ہے۔'' ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ کسی معاملے میں مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہو۔ خیر و شر کے درمیان معرکہ آرائی میں پہلے بھی میں ان مراحل سے گزر چکی تھی اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ پسپائی ہمیشہ عارضی ثابت ہوئی پھر بھی جب میں اپنے انسانی قالب سے نہیں نکل سکی اور یہی عارج کے ساتھ ہوا تو میرے ذہن پر خوف چھا گیا۔ اس کے بعد مجھے اپنے اعصاب پر بوجھ کا خیال آیا' اس مکان میں قدم رکھتے ہی مجھے اور عارج کو اعصاب پر یہ بوجھ محسوس ہوا تھا جو ابھی تک برقرار تھا۔ میں نے سوچا یہ بھی تو ممکن ہے کہ بلال کا مکان کسی سحر کے زیر اثر ہو ہم شاید اس مکان کی حدود سے نکل کر اپنے انسانی قالبوں کو چھوڑ سکیں۔ یہی بات میری زبان پر بھی آ گئی۔

''اے دینار! خدا کرے تیرا قیاس درست ثابت ہو۔'' عارج نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس کے لہجے سے مایوسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''اگر واقعی مکان سحر زدہ ہوا تو اس کی حدود میں زینب کا شوہر بلال بھی سحر کے زیر اثر آ جاتا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''اسی سبب وہ اپنے سوتیلے بھائیوں کی حمایت کرنے لگتا ہے۔ یوں گویا وہ خود اپنے ہی خلاف ہو جاتا ہے۔ ہم غالباً اس مکان کی حدود سے باہر ہی بلال کو قابو میں کر سکتے ہیں یہاں تو وہ ہماری پراسرار قوتوں کے اثر میں بھی شاید نہ آ سکے۔''

''گھبراتا کیوں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے عارج کو تسلی دی۔ ''چل سامان اٹھا یہاں سے نکلتے ہیں۔''

میرے ایماء پر عارج نے زینب کو آواز دے کر برابر والے دالان سے بلا لیا۔ وہ گھر کے دروازے تک ہمیں چھوڑنے آئی۔ میں نے اسے ایک بار پھر دلاسا دیا کہ وہ فکرمند نہ ہو ہم انشاء اللہ جلد ہی دوبارہ آئیں گے۔

اسی محلے کے بازار میں ہمیں چھوٹی سی ایک سرائے نظر آ گئی۔ دروازہ بند کرتے ہی میں اپنے انسانی قالب سے باہر آ گئی تو مجھے عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ عارج نے یہ دیکھا تو وہ بھی اپنے انسانی پیکر سے نکل آیا۔ میرا یہ قیاس قطعی درست ثابت ہوا تھا کہ بلال کا مکان سحر کے اثر میں ہے۔ ہم وہاں اسی لئے اپنے قالبوں سے باہر نہیں آ سکے تھے۔ ہمارے انسانی قالب جمیلہ اور ایوب ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''اے جمیلہ! ایوب نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ ''ہم تو قصر خلافت میں تھے پھر یہاں اس کوٹھری میں کہاں سے آ گئے۔''

''مجھے تو خود حیرت ہے اے ایوب!... معلوم نہیں یہ کون سی جگہ ہے۔'' جمیلہ بھی کہنے لگی۔

اپنے انسانی پیکروں کو ہم کلام دیکھ کر میری توجہ ادھر ہوگئی اور میں عارج سے بولی۔ ''بہتر یہ ہے کہ ہم ان دونوں کو سلا دیں انہیں اگر پتا چل گیا کہ یہ بغداد کے بجائے نجف میں ہیں تو ان پر نہ جانے کیا گزرے۔'' میں اور عارج ہی ایک دوسرے کی آواز سن سکتے تھے۔ ہم چاہتے تو وہ آدم زاد ہماری آوازیں سنتے ورنہ نہیں۔ میرا ارادہ فوری طور پر اپنے انسانی قالب میں واپس جانے کا نہیں تھا۔ میں نے اسی وجہ سے عارج کو انسانی قالبوں پر نیند طاری کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اپنے ارادے سے میں نے عارج کو بھی آگاہ کر دیا پھر جمیلہ کو میں نے اور ایوب کو عارج نے سلا دیا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ ابھی ہم نے اپنا سامان تو کھولا نہیں۔ جمیلہ اور ایوب اسی لئے کوٹھری کے فرش پر دراز ہو گئے تھے۔

جلدی سے ہم نے سامان کھول کر ان دونوں کیلئے بستر بچھائے۔ انہیں بستروں پر لٹانے کے بعد میں نے عارج کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

''چلنا کدھر ہے اے دینار! یہ تو بتا دے۔'' عارج نے پوچھا۔

''یوں سمجھ کہ ہم اپنے دشمنوں کی تلاش میں چل رہے ہیں۔'' میں نے بتایا پھر خود ہی وضاحت کی۔ ''ہمارے دشمن وہی ہیں جو زینب کے دشمن ہیں اور جو نہیں چاہتے کہ ہم بلال کے گھر میں رہیں ان تک ہم یمامہ کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔''

عارج نے میری بات سے اتفاق کیا۔ ہم سرائے سے نکل آئے۔ یمامہ کے جسم کی بو میرے حافظے میں تھی سو اس تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی اسے میں نے اسی جیسے نقوش والی ایک عورت کے پاس بیٹھے دیکھا۔

''تمہیں کیسے یقین ہے نائلہ باجی کہ وہ دونوں گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔'' نیلی آنکھوں والی نوجوان یمامہ نے اس عورت سے دریافت کیا۔

وہ عورت جو یمامہ کی بڑی بہن ہی لگتی تھی کہنے لگی۔ ''میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ کل بعد نماز عشاء شیخ ہمارے یہاں خود تشریف لائے تھے۔''

''تو پھر؟'' یمامہ اب بھی نامطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

''انہیں میں نے موقع غنیمت جان کر سب کچھ بتا دیا تھا۔'' نائلہ نے کہا۔ ''شیخ نے فرمایا تھا کہ زینب کی بہن جمیلہ اور بہنوئی ایوب دو روز بھی اس کے ساتھ نہیں رہ پائیں گے پھر جب زینب اکیلی رہ جائے گی تو اسے یہاں سے نکالنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔''

''پہلے تو تم نے زینب کو طلاق دلوانے کیلئے کہہ رہی تھیں۔'' یمامہ سوالیہ لہجے میں بولی۔

''جلد بازی کیلئے شیخ نے منع کیا ہے اس طرح کام بگڑ بھی سکتا ہے۔'' نائلہ نے اپنی چھوٹی بہن کو سمجھایا۔

اسی وقت میں نے نائلہ کے ذہن کی پرتیں کھولنا شروع کر دیں۔ زینب اور بلال کی ازدواجی زندگی میں زہر گھولنے والی نائلہ ہی تھی۔ اسی لالچی آدم زادی نے اپنے شوہر اور دیور کو بلال کیخلاف بھڑکایا تھا۔ نائلہ اور اس کے میکے والے شیخ نصر کے مرید تھے۔ شیخ نصر عملیات کا ماہر تھا۔ اسی کے ذریعے نائلہ نے بلال پر سحر کرایا۔ اس کیلئے بلال کے مکان کو ''کیلنا'' پڑا تھا۔ پڑھی ہوئی چار کیلوں کو مکان کے چاروں کونوں میں ٹھونکنا تھا۔ یہ کام نائلہ نے اپنی چھوٹی بہن یمامہ کے ذریعے کرایا۔ نائلہ جانتی تھی کہ یمامہ کو بلال پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بلال کے گھر اسی سبب یمامہ کا آنا جانا تھا۔ مکان کو ''کیلنے'' جانے کے بعد ہی سے بلال کا رویہ زینب کے ساتھ بدل گیا تھا۔

نائلہ کے کرائے ہوئے سحر کا توڑ مشکل نہیں تھا۔ مکان کے چاروں کونوں سے وہ کیلیں

اکھاڑ کر پھینک دی جاتیں تو سحر ختم ہو جاتا۔ وہ کیلیں کہاں کہاں ٹھونکی گئی تھیں یمامہ اس سے واقف تھی۔ میں نے اسی لئے مزید وقت ضائع کئے بغیر یمامہ کے ذہن کو اپنے قابو میں کر لیا۔

''یمامہ اپنی بہن کے کہنے پر تم نے جہاں جہاں بلال کے مکان میں کیلیں ٹھونکی ہیں انہیں وہاں سے اکھاڑ کر پھینک دو۔'' میں نے حکم دیا۔

میرے حکم پر یمامہ اپنی جگہ سے اٹھی تو نائلہ بولی۔ ''ارے تم کہاں چلیں۔''

''ایک ضروری کام یاد آ گیا ابھی آتی ہوں۔'' یمامہ نے میرے زیر اثر جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

اسی وقت میں نے نائلہ کے دماغ پر قبضہ کر لیا اور اس سے کہا۔ ''یمامہ کو جانے دو...... اور سنو! آج کے بعد تم بلال کیخلاف کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گی۔'' میں نے اسے ڈرایا۔ ''اگر اب تم نے اپنے شیخ سے کوئی عمل کرایا تو الٹا ہو جائے...... تم بیوہ ہو جاؤ گی۔'' پھر میں نے نائلہ کے دماغ میں جو باتیں بٹھائی تھیں زبانی بھی اس سے کہلوائیں۔ یمامہ پہلے ہی وہاں سے جا چکی تھی۔ کام ہو گیا تو عارج کو میں نے چلنے کا اشارہ کیا۔ عارج کو ساتھ لئے میں دیوان البرید پہنچ گئی۔ بلال اسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔ اس وقت وہ ڈاک چھانٹ رہا تھا۔ اسے میں نے اپنے زیر اثر لینے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

''تم نے اپنی بیوی زینب پر بڑا ظلم کیا ہے بلال!'' میں نے اس کے دماغ میں سرگوشی کی۔ ''تمہیں زینب سے معافی مانگنی چاہئے اور یمامہ کو اپنے گھر سے نکال دینا چاہئے بولو تم ایسا کرو گے نا۔''

ہاں میں زینب سے معافی مانگ کر یمامہ کو اپنے گھر سے نکال دوں گا۔'' بلال بڑبڑانے لگا۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری نہیں ہوئی کہ گھر کے اندر رہتے ہوئے ہی بلال سحر کے زیر اثر آ جاتا تھا مگر باہر ایسا نہیں تھا۔ گھر کے باہر وہ سحر کے اثر سے آزاد ہوتا تھا اسی بنا پر میں نے اسے بآسانی اپنے اثر میں لے لیا تھا۔

دیوان البرید سے واپسی پر عارج مجھ سے کہنے لگا۔ ''اے دینار! زینب کا مسئلہ تو ایک ہی دن میں حل ہو گیا اور ہم نے قصر خلافت سے پورے ایک ماہ کی چھٹی لی ہے اس سے پہلے ہم وہاں کیسے جائیں گے؟''

اچانک پرواز کرتے کرتے میں نے ایک آشنا آواز سنی تو چونک اٹھی۔

''تم دونوں کو فی الحال قصر خلافت میں جانا بھی نہیں ہے۔'' یہ آشنا آواز عالم سوما کی

تھی۔

''اے میرے باپ کے دوست سوما! تو یہاں نجف میں؟'' میں حیرت زدہ ہو کر بولی۔

''ہاں اے دینار! ان الفاظ کے ساتھ ہی عالم سوما! ظاہر ہو گیا۔ پہلے اس نے اندھیرے کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔'' مجھے تیری اور عارج کی تلاش تھی کہ تمہیں خطرے سے آگاہ کر دوں سنو کہ بوڑھے عفریت دہموش نے تمہارا سراغ پالیا ہے۔''

''وہ کیسے؟..... اسے ہمارے بارے میں کب اور کس طرح معلوم ہوا کہ ہم کہاں ہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔

''تم تک پہنچنے ہی کیلئے اس عیار عفریت نے کافر جن زاد مسعر کو استعمال کیا تھا۔'' عالم سوما نے جواب دیا۔ پھر کہنے لگا۔ ''بہتر یہ ہے کہ ہم کسی جگہ اتر کر اطمینان سے بات کریں یہ معاملہ پوری توجہ کا طالب ہے اور اس پر تفصیلی گفتگو ضروری ہے۔''

''تو پھر اے سوما! ہمارے ساتھ اس سرائے میں چل جہاں ہمارے انسانی قالب محو خواب ہیں۔'' میں نے تجویز پیش کی۔

یوں عالم سوما کو ساتھ لئے ہم سرائے کی کوٹھری میں آ گئے۔ عالم سوما نے دوبارہ اپنی بات شروع کر دی۔ ''جس رات تم دونوں اس کافر جن زاد مسعر سے ملے تھے اس نے تمہارا تعاقب کیا تھا۔ پھر مسعر کو یہ معلوم ہو گیا کہ تم قصر خلافت میں قیام پذیر ہو اس کے علاوہ مسعر کو یہ بھی پتا چل گیا کہ تم دونوں نے جمیلہ اور ایوب کے انسانی قالبوں میں پناہ لے رکھی ہے۔ مسعر کو اب اسی وقت کا انتظار تھا کہ جب عفریت اس سے رابطہ قائم کرتا۔ میں اسے تمہاری خوش بختی ہی کہوں گا کہ مسعر سے وہ عفریت فوری طور پر نہیں ملا۔ میں مسعر پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ آج صبح عفریت دہموش مسعر سے ملنے آیا تو مجھے خبر ہو گئی۔ عفریت اس سے مل کر چلا گیا تو میں بغداد کے اس محلے میں پہنچ گیا جہاں مسعر نے سب کچھ بتا دیا۔ اسے عفریت نے اپنا آلہ کار بنا کر بغداد بھیجا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ اسے مسعر سے تمہارے ٹھکانے کا علم ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اب وہ کسی بھی وقت قصر خلافت کا رخ کر سکتا ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ عفریت آج رات قصر خلافت پہنچے گا۔ وہاں وہ تمہارے انسانی قالبوں کو تلاش کرے گا پھر اسے یہ سراغ لگانے میں دشواری نہ ہو گی کہ تم دونوں نجف میں ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ نادیدہ حفاظتی حصار کی موجودگی میں وہ عفریت تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا پھر بھی میرا مشورہ یہ ہے کہ تم پہلے کی طرح کچھ عرصے کیلئے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤ تم ماضی یا

مستقبل کے کسی زمانے میں جا سکتے ہو۔'' آخر میں عالم سوما براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''بول اے دینار! کیا کہتی ہے۔''

''اے سوما! تیرا مشورہ بہتر ہے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں تمہاری طرف سے مطمئن ہو جاؤں۔'' عالم سوما نے پوچھا۔

''بالکل میں بولی۔'' ہم آج ہی کہیں کسی زمانے میں نکل جاتے ہیں۔''

ہماری طرف سے اطمینان ہونے کے بعد عالم سوما واپس چلا گیا جمیلہ اور ایوب کے قالب بے حس و حرکت پڑے تھے۔ ان پر ہم نے نیند مسلط کی تھی۔ ان دونوں کو اپنے اثر میں لے کر ضروری باتیں ان کے دماغوں میں ڈال دیں۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اس پر حیران نہ ہوں کہ بغداد سے نجف کیوں اور کس لئے پہنچ گئے۔ اب وہ دونوں زینب کے گھر جتنے دن چاہے رہ سکتے تھے۔

سرائے سے نکل کر میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''تو ہی بتا کدھر اور کس زمانے میں چلیں۔''

''ہندوستان کی سرزمین مجھے اچھی لگی تھی۔'' عارج کہنے لگا۔ ''وہاں صحرا بھی ہیں اور دریا بھی اور پہاڑ بھی۔''

''اور زمانہ۔'' میں نے سوال کیا۔

''اس کا فیصلہ وہاں پہنچ کر کر لیں گے۔'' عارج نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں خوشی جھلک رہی تھی۔ وہ یقیناً کسی اور زمانے میں جانے پر خوش تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہندوستان کا کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں ہم پہلے نہ گئے ہوں تو بہتر ہے۔''

عارج کو ساتھ لئے میں ایک بار پھر مستقبل کے سفر پر نکل گئی۔ اس مرتبہ بھی میں نے سینکڑوں صدیوں آگے کا سفر کیا۔

ہم آدم زادوں کی ایک آبادی کے قریب ٹھہرے تو ایک منظر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ایک وجیہ و خوبصورت نوجوان آدم زاد کسی حسین آدم زادی کا ہاتھ تھامے اسے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''عذرا! یقین کرو اب کی بار میں برہان پور سے لوٹ کر آیا تو تمہیں ہمیشہ کیلئے اپنا لوں گا۔''

''اے دینار!'' عارج مجھ سے بولا۔ ''مجھے یہ انسانی قالب اچھا لگ رہا ہے میں اسے اپنا لیتا ہوں تو اس آدم زادی کے جسم میں اتر جا یہ دونوں بھی ہماری طرح ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔''

"تو نے پہلے بھی جلد بازی سے کام لیا تھا اے عارج!" میں نے کہا۔ "اس مرتبہ بھی کہیں ایسا نہ ہو کہ تو کسی مصیبت میں......"

"کچھ نہیں ہوگا۔" عارج نے میری بات کاٹ دی۔

"اچھا اگر تجھے جلدی ہے تو یہ انسانی قالب اپنا لے مگر مجھے ابھی حالات کا جائزہ لینے دے۔" میں بولی۔

فی الحال میں نے عارج کے ساتھ ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان دونوں آدم زادوں کی گفتگو سے پتا چل رہا تھا کہ وہ جدا ہونے والے ہیں۔ قریب ہی ایک درخت سے گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ میں نے اس نوجوان آدم زاد کے ذہن پر توجہ دی۔ مجھے اس کے بارے میں سب کچھ پتا چل گیا۔ اس کا نام ہاشم تھا پھر وہ لمحہ آ ہی گیا جب وہ عشق کے مارے جدا ہوئے۔ ان کے چہرے آنسوؤں سے تر تھے۔

ہاشم نے درخت سے بندھا گھوڑا کھولا اور اس پر سوار ہو گیا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تو گھوڑا آگے کو لپکا۔ اس دوران میں عارج اس کے جسم کو اپنا چکا تھا۔ عارج نے گردن گھمائی اور عذرا کو دیکھا۔ عذرا کی گلابی اوڑھنی سر سے ڈھلکی ہوئی تھی۔ ایڑیوں کو چھونے والے گھنے بال شانوں پر پریشان تھے اور وہ دونوں ہتھیلیوں سے اپنا حسین چہرہ چھپائے ہوئے تھی۔ اس کا بدن ہچکیوں سے لرز رہا تھا۔

ہاشم برہان پور کے والی حمید خاں کی سپاہ میں تھا اور اب چھٹیاں گزار کر واپس برہان پور جا رہا تھا۔ وہ حمید خاں کی نظروں میں چڑھا ہوا تھا اور اس کی سپاہ میں پانچ صد سوار کے منصب پر فائز تھا۔ حمید خاں کی حویلی میں بھی اس کا بہت آنا جانا تھا اسے جاننے والے جانتے تھے کہ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک دن اسے دربار میں بلند مقام پر فائز کر دیں گی۔

عارج کے ساتھ میں بھی آخر برہان پور پہنچ گئی۔ فرق صرف یہ تھا کہ عارج ہاشم کے انسانی قالب میں تھا جب کہ میں اپنی اصل پر قائم تھی۔ میں ابھی تک کسی انسانی جسم میں نہیں اتری تھی۔ برہان پور پہنچتے ہی میں نے ضروری معلومات حاصل کر لیں۔ ابھی عارج اپنے حواسوں میں آیا بھی نہ تھا کہ ایک کنیز نے اسے زہرہ خانم کے حضور میں حاضری کا پروانہ پہنچایا۔

عارج یہ حکم سن کر گھبرا گیا اور کہنے لگا۔ "یہ زہرہ خانم کون ہے؟" یہ سوال اس نے مجھ سے کیا تھا۔

"جا کر اس سے ملے گا تبھی تو تجھے معلوم ہوگا کہ برہان پور کی سرزمین پر حمید خاں کی حکمرانی ہے زنان خانے میں اس کی بہن زہرہ خانم کا حکم چلتا ہے۔" میں نے عارج کو بتا دیا۔ "اس کے پیچھے لوگ اسے خانم کے بجائے خونم بھی کہتے ہیں مزاج کی وہ بہت تیز ہے ذرا سی بات پر شوہر کو لات مار کر چلی آئی تھی بعد میں اس نے اپنے شوہر کو اتنا تنگ اور بدنام کیا کہ طلاق ہو گئی۔ طلاق کے بعد اس کے شوہر کا کچھ سراغ نہ ملا کہ کہاں گیا۔ مشہور تھا کہ زہرہ خانم نے اسے قتل کروا کے اس کی لاش بھی غائب کرا دی۔"

"یہ آدم زادی تو بڑی خطرناک لگتی ہے اے دینار!" عارج خوفزدہ سی آواز میں بولا۔ "میں اسی لئے تجھے تاکید کرتی ہوں کہ اس کے سامنے سوچ سمجھ کر بولیو۔" میں نے عارج کو سمجھایا۔

عارج نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ دراصل عارج نے جو انسانی قالب اپنایا تھا مردانہ وجاہت، حسن و خوبصورتی اور دلکشی میں بہت کم مرد اس کی ہمعصری کرتے تھے۔ اس بات کا اندازہ ہاشم کو بھی تھا۔ اس نے کئی حسین عورتوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تھا لیکن اس کیلئے تمام حسن و دلربا عورتیں اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتی تھیں۔ وہ بچپن سے عذرا کا دیوانہ تھا اب جلد ہی وہ دونوں شادی کے مقدس بندھن میں بندھنے والے تھے۔ عذرا کی طرح ہاشم کو بھی بے چینی سے اس دن کا انتظار تھا۔

نگاہ روبرو کئے عارج اپنے انسانی قالب میں زہرہ خانم کی خلوت گاہ تک پہنچا۔ پہلے تو زہرہ خانم نے ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر اچانک پوچھ بیٹھی کہ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟ عارج تو پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا اس غیر متوقع سوال پر اور بھی گھبرا گیا۔

"اچھی لگتی ہیں۔" عارج نے گھبراہٹ میں کہہ دیا۔

زہرہ خانم کے ذہن پر میری توجہ تھی اس نے عارج کے جواب کو رضامندی سمجھا تھا۔

تھوڑی دیر خاطر تواضع کے بعد اس نے ہاشم کو رخصت کر دیا۔ اس کے بعد زہرہ نے ایسی چال چلی کہ بھائی کو بھی خبر ہو جائے حمید خاں کو بڑی خوشی ہوئی کہ چلو اس کی بہن دوسری شادی پر راضی تو ہوئی۔ وہ بھی ہاشم کو پسند کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ہاشم اس رشتے کو اپنی عزت افزائی سمجھے گا اور ہرگز انکار نہ کرے گا۔

میں نے عارج کو تمام باتوں سے آگاہ کر دیا تا کہ وہ بے خبری میں کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے۔ چند روز بعد حمید خاں نے عارج سے یہ ذکر چھیڑا۔ عارج نے بڑی لجاجت اور خاکساری کے ساتھ نہایت مہذب پیرائے میں انکار کر دیا۔

حمید خاں چپ ہو رہا۔ عارج کا انکار اسے برا تو لگا مگر وہ زبردستی کا قائل نہ تھا۔

زہرہ کو انکار کی خبر لگی تو وہ آگ بگولہ ہو گئی۔ "اس کی یہ مجال کہ ہمیں ٹھکرا دے۔ اسے شاید نہیں معلوم کہ جو ہمارا نہیں ہو سکتا وہ کسی کا بھی نہیں ہو سکتا۔" اس کا غصہ دیکھ کر کنیزیں تھر تھر کانپنے لگیں۔ "جاؤ اسے خبر کرو کہ ہم آخری بار اس سے ملنا چاہتے ہیں۔" ایک کنیز دوڑی دوڑی گئی اور عارج کو زہرہ کا پیغام پہنچایا۔ عارج کی سٹی گم ہو گئی کنیز نے اسے بتا دیا تھا کہ زہرہ غصے میں بپھری ہوئی ہے۔ کنیز چلی گئی تو عارج نے مجھ سے پوچھا۔ "اے دینار! اب میں کیا کروں؟"

"کرنا کیا ہے اس آدم زادی سے جا کر مل لے۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ تجھے کھا تو نہیں جائے گی، ڈرتا کیوں ہے۔" چاروناچار عارج کو حویلی میں جانا ہی پڑا۔ اسے دیکھتے ہی زہرہ آپے سے باہر ہو گئی۔ "بول تو نے ہماری توہین کی ہمت کیسے کی؟"

"حضور کو یقیناً خادم کی طرف سے غلط فہمی ہو گئی......"

"خاموش ہو جا۔" زہرہ درمیان میں چیخ اٹھی۔ "ہمیں اتنا بتا دے کہ مرنا چاہتا ہے تو یا زندہ رہنے کی خواہش ہے؟ سن کہ ہم نے آج تک جس شے کی آرزو کی وہ ہمارے قدموں میں آ گری تجھے خود پر فخر کرنا چاہیے تھا مگر تو ناشکرا نکلا ہم نے اس وقت تجھے حجت تمام کرنے کو بلایا ہے۔ تیرے اقرار کا مطلب زندگی اور انکار کا مطلب موت ہو گا تجھے کیا منظور ہے؟"

عارج نے اسے لاکھ سمجھایا مگر وہ نہ سمجھی میں نے اس دوران میں یہ بات محسوس کر لی تھی کہ عارج کے انسانی قالب کی عادات اس پر اثر انداز ہونے لگی ہیں۔ مجھے یہ تجربہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔ عارج کے نزدیک زہرہ کو قبول کرنے کا مطلب محبت کی موت ہے۔ اسے ہاشم کی محبت عزیز تھی۔ ہر چند کہ زہرہ بھی حسن میں کم نہ تھی مگر عذرا کی بات ہی کچھ اور تھی۔

وہ حویلی سے لوٹ کر آیا تو میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔ ہاشم کا انسانی قالب اس پر بڑی حد تک حاوی آ چکا تھا۔ اس نے اسی لئے فیصلہ کیا کہ حمید خاں کی ملازمت چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ ہاشم کے باپ نے اتنی زمین چھوڑی تھی کہ اس پر کاشت کر کے بآسانی گزر بسر ہو جاتی۔ میرے لئے یہ امر زیادہ حیران کن نہیں تھا کہ عارج اب ہاشم بن کر سوچنے لگا تھا۔

کوئی موقع دیکھ کر عارج حمید خاں سے بات کرنے ہی والا تھا کہ زہرہ کے انتقام کی آگ اس کے دامن تک پہنچ گئی۔ اس کا لکھا ہوا ایک جعلی خط پکڑا گیا۔ یہ خط اس کی طرف سے عادل شاہ کے ایک مصاحب کے نام تھا۔ خط کی عبارت ایسی تھی کہ ہاشم کو عادل شاہی حکومت کا جاسوس سمجھا جائے۔ زہرہ خانم کے اشارے پر یہ جعلی خط لکھا گیا اور اسی کے ایما پر

پکڑا گیا۔

حمید خاں کو سوتے سے جگا کر یہ جعلی خط پڑھوایا گیا۔ ہاشم کے انکار سے حمید خاں پہلے ہی بددل تھا اس نے معاملے کی تفتیش کرنے کے بجائے فی الفور ہاشم کے قتل کا حکم دے دیا۔ زہرہ یہی چاہتی تھی کہ ہاشم کو صفائی کا موقع نہ ملے۔

پیش آنے والے حالات پر میری پوری طرح نظر تھی۔ ہاشم کے قتل کا مطلب عارج کی موت ہوتی کیوں کہ وہ اسی کے انسانی قالب میں پناہ لئے ہوئے تھا۔ حمید خاں کے حکم پر اسی وقت عارج کو گرفتار کر لیا گیا۔

عارج زنداں میں تھا کہ میں اس سے ملی اور کہا۔ "میں نہ کہتی تھی کہ تو جلد بازی کر رہا ہے۔ آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ تجھے اب مجبوراً ہاشم کے انسانی قالب سے نکلنا پڑے گا کیوں کہ صبح کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی اس کی گردن مار دی جائے گی۔"

"یہ تو بہت برا ہوا اے دینار!" عارج نے اظہار افسوس کیا۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی اس انسانی قالب کو چھوڑنا پڑے گا۔"

"تیری جان تو بچ جائے گی اور ہاشم مارا جائے گا مگر یہ تو سوچ کہ ہاشم کی محبوب عذرا پر یہ خبر سن کر کیا گزرے گی۔" میں نے کہا۔ "اب تجھے میرا کہنا ماننا پڑے گا۔ کسی نئے انسانی قالب کو اپنانے میں تجھے جلدی نہیں کرنی۔"

مجھے ہاشم کی محبوبہ عذرا کا خیال تھا' سو عارج کے ساتھ اس کی بستی میں پہنچ گئی۔ میرا اندازہ قطعی درست نکلا عذرا کو ہاشم کے قتل کی خبر ملی تو اس پر قیامت گزر گئی جو شخص برہان پور سے خبر لایا تھا اس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ہاشم بے گناہ مارا گیا ہے۔ وہ بستی ہی کا ایک آدمی تھا اور حمید خاں ہی کا ملازم تھا۔ میں نے اس مظلوم آدم زادی عذرا کے ذہن پر توجہ دی تو مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ واقعی ہاشم کو بے انتہا چاہتی تھی اسے یقین نہیں آیا کہ اس کا محبوب نظام شاہی حکومت سے غداری کر سکتا ہے۔ عذرا کو اس قتل کے پیچھے کوئی سازش معلوم ہوئی۔ اس کا سینہ انتقام کی آگ میں سلگنے لگا۔ اس کیلئے دنیا میں ہاشم کے سوا جیسے کوئی دوسرا مرد موجود ہی نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی حوا تھی جسے صرف جنت سے نہیں نکالا گیا تھا بلکہ اس کا آدم بھی اس سے چھین لیا گیا تھا۔ کسی طرح کی بھی تسلی اس کی آتش انتقام کو سرد نہیں کر سکتی تھی۔

"اس آدم زادی کا انتقام میں لوں گی۔" میں نے عارج کو بتایا۔

"مگر کیسے اے دینار؟" عارج نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے تفصیل کے ساتھ عارج کو اپنے آئندہ اقدامات سے آگاہ کر دیا۔

ایک روز جب کہ ابھی فجر کی اذان بھی نہیں ہوئی تھی بستی میں نیند بچھی ہوئی تھی۔ اپنی بیوہ ماں کو بستر پر سوتا چھوڑ کر عذرا خاموشی سے باہر نکل گئی۔ میں نے ہی اس پر عذرا کو اکسایا تھا۔ اسے علم تھا کہ اب وہ کبھی گھر واپس نہ آ سکے گی لیکن ہاشم کے قتل کے بعد "گھر" بھی محض ایک لفظ رہ گیا تھا۔ وہ گھر سے نکلی اور راستے کی صعوبتیں اٹھاتی ہوئی برہان پور جا پہنچی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد انتقام تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے محبوب کو حمید خاں کے حکم پر قتل کیا گیا ہے۔ اس کے انتقام کا نشانہ حمید خاں ہی تھا مگر حمید خاں کی حویلی کے برج بہت اونچے تھے۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس تک عذرا کا پہنچنا آسان نہ تھا۔

میرے ایماء پر عذرا برہان پور آ تو گئی لیکن اپنے مقصد کا حصول اس کیلئے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ اس کی ایک ہی صورت تھی اور میں نے اسی پر عمل کیا۔ میں عذرا کے جسم میں اتر گئی۔

"اے دینار! تو نے اپنا ٹھکانا کر لیا مگر ابھی تک میں کسی انسانی قالب کے بغیر ہی سرگرداں ہوں۔" عارج کہنے لگا۔

"ابھی صبر کر اے عارج!" میں بولی۔ تیرے لئے انسانی قالب میں منتخب کروں گی۔ وقت تو آنے دے۔"

برہان پور میں اس شخص کو تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی جو ہاشم کے قتل کی خبر لے کر آیا تھا۔ اس کے جسم کی بو میرے حافظے میں تھی۔ میں اسے ہاشم کی بستی میں دیکھ چکی تھی۔ وہ ہاشم کا دوست تھا۔ اس کے باوجود میرے انسانی قالب کو دیکھ کر اس کے دل میں بدی آ گئی۔ مجھے اس شخص کو اپنے اثر میں لینا پڑا۔ میں پہلے ہی کسی ایسی صورتحال کیلئے تیار تھی۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر میں ان کی نس نس سے واقف ہو چکی تھی۔ ہاشم کا وہ دوست مجھ سے طعام و قیام کی قیمت وصول کرنا چاہتا تھا لیکن میرے زیر اثر بھیگی بلی بن گیا۔ وہ حمید خاں کے ذاتی خدمت گاروں میں تھا اور حویلی کی حدود میں ہی اس کی سکونت تھی۔ یوں مجھے حمید خاں کی حویلی میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔

میں موقع کی تاک میں رہی کہ کس طرح حمید خاں کے سامنے جاؤں۔ میں پر یقین تھی کہ میرے انسانی قالب عذرا کو حمید خاں نے دیکھ لیا تو خود پر قابو نہ رکھ سکے گا۔ اسی دوران میں حویلی کی کنیز کو میں نے اپنی سہیلی بنا لیا۔ وہ کنیز حمید خاں کی بہن زہرہ خانم کی ناک کا بال تھی۔ اس نے مجھ سے زہرہ خانم کا تذکرہ بھی کیا۔ میری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح حویلی کی کنیزوں میں شامل ہو جاؤں۔ اسی غرض سے میں نے اس کنیز پر ڈورے ڈالے۔ کنیز مجھے

زہرہ خانم کے حضور پیش کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ زہرہ خانم نے مجھے اپنی کنیز بنا لیا۔ چند ہی روز کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ زہرہ خانم پر عجیب سے دورے پڑتے ہیں اور وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتی۔ وہ چیخنے چلانے لگتی ہے۔ ایک رات خود میں نے بھی اس کی چیخ و پکار سنی۔ دو گھڑی رات بیت چکی تھی کہ زہرہ خانم کی خواب گاہ سے چیخیں بلند ہوئیں اور میری آنکھ کھل گئی۔

زہرہ خانم کسی کا نام لے کر چیخ رہی تھی کہ پہلے تو میں سمجھی کہ نیند کے خمار میں مجھ سے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے مگر جب دوبارہ بھی زہرہ ہاشم کا نام لے کر چیخی تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ہاشم میرے انسانی قالب عذرا کا مقتول محبوب تھا۔ اس بات کا علم مجھے پہلے ہی سے تھا کہ ہاشم کی اصل قاتل زہرہ ہے۔ دوسرے دن میں نے کنیزوں کو کریدا تو پتا چلا وہ بھی اس بات سے واقف ہیں۔ ہر چند کہ حمید خاں بھی قابل معافی نہ تھا کیوں کہ اسی کے حکم پر ہاشم کا قتل کیا گیا تھا مگر زہرہ اس سے کہیں زیادہ سزا کی مستحق تھی۔ میں نے ان دونوں ہی بہن بھائیوں سے بھیانک انتقام لینے کا عہد کیا۔ مجھ پر بھی عذرا کی فطری صفات غالب آتی جا رہی تھیں۔ انتقام کا عہد اسی کا ثبوت تھا۔

زہرہ بیمار رہنے لگی تھی۔ طبیب اس کا مرض سمجھنے سے قاصر تھے۔ بظاہر اسے کوئی بیماری نہ تھی مگر وہ پلنگ سے لگ گئی تھی۔ اب آئے دن اس پر دورے پڑنے لگے تھے۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ حمید خاں اپنی بہن کی عیادت کیلئے آنے والا ہے۔ اس روز میں نے اپنے انسانی قالب کے بناؤ سنگھار میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

میں طے کر چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میری توقع پوری ہوئی حمید خاں میرے تیر نظر کا شکار ہو گیا۔ بہن کی عیادت کے بہانے وہ دیر تک حویلی کے اس حصے میں رہا۔ میں نے اس کے ذہن پر توجہ دی تو باسی کڑھی میں ابال آنے کا علم ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنی بہن زہرہ سے مجھے مانگ لے مگر ہمت نہ پڑی۔ پھر یہ کہ وہ اپنی بیوی سے بھی ڈرتا تھا۔ میں نے پیش قدمی نہ دیکھی تو خود پہل کی۔ عورت پہل کرے تو بزدل سے بزدل مرد ہمت پکڑ لیتا ہے۔ حمید خاں نے بھی ڈرتے ڈرتے مجھ سے راہ و رسم بڑھانا شروع کر دی۔ میں نے ان ملاقاتوں کے باوجود اپنے اور حمید خاں کے درمیان مناسب فاصلہ رکھا۔ اس کا مقصد اسے تڑپانا بھی تھا۔

حمید خاں میرے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے ناز و ادا سے حمید خاں کا دل اپنی مٹھی میں لے لیا۔ میرے انسانی قالب کے حسن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ حمید خاں اسی لئے مجھے اپنا لینے پر آمادہ ہو گیا۔ دراصل وہ اتنا بدصورت تھا کہ کوئی حسین لڑکی اس کی صورت پر

تھوکنا بھی پسند نہ کرتی۔ پھر عمر بھی کافی تھی۔ وہ اس غلط فہمی میں پڑ گیا کہ میں اسے چاہتی ہوں۔ بیوی اسے منہ نہیں لگاتی تھی۔ کنیزیں دور بھاگتی تھیں اسی عالم میں میرے اظہار عشق نے اسے جیسے میرا بندہ بے دام بنا دیا۔

یہی وہ مرحلہ تھا کہ جب ایک دن میں نے عارج کو بتایا۔ ''اے عارج! میں نے تیرے لئے ایک انسانی قالب تلاش کر لیا ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' عارج نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''حمید خاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرے نصیب میں وہی حبشی رہ گیا تھا۔''

''مجبوری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تجھے اس کے جسم میں اترنا ہی پڑے گا کیونکہ میرا انسانی قالب اس سے شادی کر رہا ہے۔''

''یہ تو نے کیا کہا اے دینار!'' عارج نے تاسف کا اظہار کیا۔

''حمید خاں سے اسی طرح انتقام لیا جا سکتا ہے۔'' میں بولی۔ ''اسے میں ذلیل اور رسوا کر دینا چاہتی ہوں..... اس طرح کہ وہ سسک سسک کر جیے اور موت کی آرزو کرنے لگے۔ اس کے لئے تجھے میرے اشاروں پر چلنا ہو گا۔''

''یعنی؟'' عارج نے وضاحت چاہی۔

''میں جب اشارہ کروں تو اس کے جسم پر اتر جا اور جب نکلنے کو کہوں نکل جا' میں نے عارج کو بتایا۔'' تجھے ہر وقت اس کے جسم میں نہیں رہنا..... آج رات وہ میرے انسانی پیکر سے شادی کر لے گا۔ تجھے اس کے فوراً بعد اس کے جسم پر قبضہ کر لینا ہے۔''

''اے دینار! میں سمجھ گیا کہ تو کیا چاہتی ہے۔'' عارج نے کہا۔ پھر وہی ہوا جو میرا منشا تھا۔ حمید خاں مجھ پر صدقے واری ہونے لگا۔ عارج عموماً دن کے وقت حمید خاں کے جسم سے میرا اشارہ پا کر نکل جاتا مگر اردگرد منڈلاتا رہتا تھا کہ مجھے نہ جانے کب اس کی ضرورت پڑ جائے۔

حویلی میں اب میری حیثیت بدل گئی۔ کسی کو میرے ارادوں کا علم نہیں تھا۔

اول اول حویلی کی خواتین نے مجھے قبول نہیں کیا لیکن جلد ہی میں نے اپنے حسن اخلاق سے سب کے دل میں جگہ بنا لی۔ زہرہ تو اٹھتے بیٹھتے میرا دم بھرنے لگی۔ سال بھر ہی میں میں نے ساری حویلی پر اپنا سکہ بٹھا دیا۔ حمید خاں میری زلف گرہ گیر کا ایسا اسیر ہوا کہ میں جو کہتی وہ مان لیتا۔ اب وہ مرحلہ آ گیا تھا کہ میں حمید خاں کی ذلت و رسوائی کا سامان کر سکتی۔

اس کے پیش نظر میں ایک دن حمید خاں سے بولی۔ ''ترقی و مناصب یوں ہی نہیں مل جاتے' اس کیلئے آدمی کو کوشش کرنی پڑتی ہے اور حکمران وقت کا تقرب حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے جو حکمراں سے زیادہ قریب ہوتے ہیں زیادہ ترقی پاتے ہیں۔''

حمید خاں نے کہا۔ ''تمہاری بات سے مجھے اتفاق ہے لیکن حضور نظام الملک کی توجہ کیسے حاصل ہو۔''

میں فوراً بول اٹھی۔ ''مجھے محل میں آنے جانے کی کھلی چھٹی دے دو میں راہ ہموار کر دوں گی۔''

یہ بات سن کر حمید خاں کے چہرے سے حیرت ظاہر ہونے لگی۔ بولا۔ ''کس طرح؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو' میں یہ کہہ کر معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔

حمید خاں نے مجھے اجازت دینے میں تاخیر نہ کی۔ یہی اس کی بدنصیبی کا آغاز تھا مگر میرے عشق نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ محل میں میرا آنا جانا شروع ہو گیا۔ نظام الملک کو میں نے اپنے اثر میں لے کر یہ تاثر دیا جیسے وہ میرا دیوانہ ہو گیا ہے۔ خود میں نے اس بات کو شہرت دی جو قطعی بے حقیقت تھی۔ محل اور اس کے باہر لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگے۔

مجھے خبر تھی کہ یہ بات حمید خاں کے کانوں تک بھی پہنچے گی۔ میں یہی چاہتی تھی۔

''عذرا!'' حمید خاں نے مجھے میرے انسانی قالب کے نام سے مخاطب کیا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں جانتی ہوں۔'' میں اطمینان سے بولی۔ ''لوگوں کا کام تو باتیں بنانا ہی ہے۔''

''لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ محض باتیں ہیں یا ان میں کوئی حقیقت ہے؟'' حمید خاں نے استفسار کیا۔ لہجے میں تڑپ تھی۔

''اگر حقیقت بھی ہو تو کیا مضائقہ ہے۔'' میں نے دانستہ اس کے احساس پر ضرب لگائی۔ ''تمہاری ہی خاطر تو میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔''

معاملہ بہت نازک تھا۔ حمید خاں کو خبر تھی کہ اس نے مجھ پر ذرا بھی سختی کی یا مجھے محل میں آنے جانے سے روکا تو نتیجہ اچھا نہ ہو گا پھر بھی وہ بدنامی کے خوف سے کڑھنے لگا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اب تک وہ کتنا بدنام ہو چکا ہے۔ اس پر بھی میرے انتقام کی آگ سرد نہیں ہوئی تھی۔ میں نے حمید خاں کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ برہان پور کے ہر باحیثیت شخص کو خبر تھی کہ حمید خاں حبشی کی بیوی عذرا کا حکم اب محل میں بھی چلتا ہے۔ نظام الملک اس کی کوئی بات نہیں ٹالتا۔

میں نے نظام الملک کو بھی اسی طرح اپنے قابو میں کر لیا تھا کہ محل کے اندر بس میں ہی مالک و مختار تھی۔ محل کے باہر حمید خاں سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا۔ مغل تاجدار جہانگیر کے عہد حکومت کا یہ آخری زمانہ تھا۔ جگہ جگہ بغاوتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ نظام الملک نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ دکن کا جو حصہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا' دوبارہ اسے ہتھیا لیا۔

نظام الملک کی سرکوبی کیلئے دارالحکومت سے بھاری مغل لشکر لے کر خان جہاں لودھی دکن کی طرف آیا۔ حمید خاں حبشی کو حکم ہوا کہ وہ بڑھ کر خان جہاں لودھی کو روکے۔ اس موقع پر میں نے بھی حمید خاں کے ساتھ چلنے کی ضد کی۔ حمید خاں نے مجھے بہت سمجھایا کہ میدان جنگ میں خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے' تم ساتھ نہ چلو مگر میں نہ مانی۔ میرا مقصد حمید خاں کو مزید ذلیل و بدنام کرنا تھا۔

خان جہاں لودھی مغل لشکر ساتھ لئے حمید خاں حبشی کے مقابل آ کر ٹھہر گیا۔ مغل لشکر کی تعداد حمید خاں کے لشکر سے دگنی تھی۔ حمید خاں اسی سبب گھبرایا ہوا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا اس لئے فوری طور پر جنگ نہ چھڑی۔ حمید خاں کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں اس کے ساتھ ہوں وہ اسی بنا پر مجھ سے کہنے لگا۔ ''کیا خبر کل کیا ہو تم برہان پور چلی جاؤ میں تمہارے ساتھ ایک دستہ کر دیتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آئی کہ تمہیں اتنی گھبراہٹ کیوں ہے' اچھی طرح سن لو کہ میں تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گی اگر تمہیں جنگ ہارنے کا ڈر ہے تو صلح کر لو۔''

حمید خاں آہ بھر کر بولا۔ ''یہ اتنا آسان نہیں ! خان جہاں لودھی بہت سخت آدمی ہے۔''

''مگر میں نے اس کے بارے میں کچھ اور بھی سنا ہے۔''

حمید خاں نے پوچھا۔ ''کیا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''یہ کہ وہ لالچی آدمی ہے۔''

''ہاں ایسا تو ہے۔'' حمید خاں نے تائید میں کہا۔ ''مگر اس بات سے جنگ کا کیا تعلق؟''

''تعلق ہے۔'' میں پرزور آواز میں بولی۔ پھر جو کچھ میں نے سوچا تھا حمید خاں کو بتا دیا۔

''تمہاری ہر بات مجھے منظور ہے مگر یہ نہیں کہ تم خود نذرانے اور تحفے لے کر سپاہیوں

کے ساتھ جاؤ۔'' حمید خاں میری پوری بات سن کر بولا۔

''میں اس مغل سردار سے جو گفتگو کر سکتی ہوں کوئی اور نہیں کر سکتا۔'' میں اپنی بات پر اڑی رہی۔ ''اسے معلوم ہوگا کہ حمید خاں کی بیوی خود مصالحت کی گفتگو کرنے آئی ہے تو نرمی سے کام لے گا۔ عورتوں کے ساتھ یوں بھی مرد سختی سے پیش نہیں آتے۔''

حمید خاں کو میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ میرے ہی ایما پر اس نے خان جہاں لودھی کے نام مصالحت کا پیغام بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو میں تحفے تحائف اور حمید خاں کا پیغام لے کر سرداران لشکر کے جلو میں روانہ ہو گئی۔ حمید خاں کو یقین نہیں تھا کہ میں کامیاب لوٹوں گی۔ مغل لشکر نصف منزل پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ سفید جھنڈے بلند کئے پانچ گھڑ سوار تیز رفتاری سے مغل لشکر کی طرف بڑھے۔ میں بھی انہی میں تھی اور میرے چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ ہم پانچوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے مغل لشکر کے قریب پہنچے تو ہمیں گھیر لیا گیا۔ مجھے دیکھ کر مغل سپاہیوں کے چہروں پر حیرت نظر آئی۔

''کون ہو تم لوگ؟'' مغل سپاہیوں کے ایک سردار نے پوچھا۔ ''تم کہاں سے اور کس ارادے سے آئے ہو؟''

میرے اشارے پر ایک سردار نے جواب دیا۔ ''ہم دکن کے معزز سردار حمید خاں حبشی کے سفیر ہیں اور ان کی طرف سے تمہارے محترم سردار کیلئے ایک پیغام لے کر آئے ہیں تم ہمیں اپنے سردار کے پاس پہنچا دو۔''

اس پر مغل سردار میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ کون ہے؟''

''ادب ملحوظ رکھو!'' حمید خاں کے ایک سردار نے دبنگ آواز میں کہا۔ ''یہ محترم خاتون ہمارے نامور سردار کی زوجہ ہیں۔''

مغل سردار یہ سن کر متاثر نظر آنے لگا۔ سپاہی بھی مرعوب لگ رہے تھے۔ میرے لباس میں جو ہیرے جواہر لٹکے ہوئے تھے ان پر بھی مغل سپاہیوں کی نظر گئی۔ کچھ سپاہی رہنمائی کیلئے ہمارے ساتھ چل دیئے باقی وہیں رہ گئے۔ وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ آج تک ایسا نہیں ہوا کسی سردار نے میدان جنگ میں اپنی عورت کو بھیجا ہو۔ کچھ نے خیال ظاہر کیا کہ دکنی سرداروں نے جھوٹ بولا ہے۔ یہ عورت دراصل کوئی حسین و قیمتی کنیز ہے جو بطور تحفہ خان جہاں کی خدمت میں بھیجی گئی ہے۔ میں نے اپنے بارے میں یہ تبصرے سنے لیکن کسی سے کچھ نہ کہا۔ وہ اپنی محدود عقل کے مطابق ہی تو گفتگو کر سکتے تھے۔

مغل سپاہی کچھ ہی دیر میں ہمیں ساتھ لئے خان جہاں کے خیمے تک پہنچ گئے۔ اس

بڑے خیمے کے باہر مغل پرچم لہرا رہا تھا۔

خان جہاں لودھی کو خبر کی گئی۔ وہ سر شام سے محفل ناؤ نوش سجائے بیٹھا تھا۔ مغل سپاہیوں کی گفتگو سے یہ بات میرے علم میں آئی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید خان جہاں اس وقت ملاقات نہ کرے مگر ایسا نہیں ہوا۔ مجھے اور میرے ساتھی سرداروں کو خیمے کے باہر روک لیا گیا تھا ہم ابھی تک اپنے گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب اندر سے طلبی ہوئی تو ہم گھوڑوں سے اتر گئے۔ خان جہاں کے محافظوں نے ہمارے گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں۔ اس وقت کچھ مغل سردار بھی خان جہان کی محفل میں موجود تھے۔

میں شاہانہ انداز سے چلتی ہوئی آگے بڑھی اور خیمے کے اندرونی حصے میں داخل ہوتے ہی اپنے رخ سے نقاب ہٹا دی۔ میرے سردار ہاتھ باندھے پیچھے چل رہے تھے۔ خان جہاں کے چہرے سے مرعوبیت جھلکنے لگی۔ یوں جیسے اس کے خیمے میں کوئی ملکہ آ گئی ہو۔

خان جہان کے دماغ پر یقیناً نشے کا بھی کچھ اثر تھا ورنہ وہ یوں سحر زدہ ہو کر اپنی مسند سے نہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ خان جہاں میرے استقبال کیلئے اٹھا تو وہاں بیٹھے ہوئے مغل سردار بھی احتراماً کھڑے ہو گئے۔ میں نے محسوس کر لیا کہ ان پر بھی رعب حسن طاری ہے۔

مجھے خان جہاں نے اپنے قریب مسند پر بٹھایا۔ اس کے سردار مسند کے دائیں طرف دوزانو بیٹھے بوڑھے خان جہاں کو ایک ہی نظر دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے رام کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ سب سے پہلے میں نے خان جہاں کو قیمتی تحفے پیش کئے اور غور سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ یہ ایک لالچی آدم زاد کا چہرہ تھا۔ خان جہاں کی آنکھوں میں ایسی ہی چمک تھی اسی وقت میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ اس بوڑھے کو یہ کہہ کر بے وقوف بنایا جا سکتا تھا کہ اس کا چہرہ میرے مرحوم باپ سے بڑی حد تک ملتا ہے۔ میں نے فوری طور پر اس خیال کا اظہار نہیں کیا اور جو تحریری پیغام ساتھ لائی تھی وہ خان جہاں کو پیش کر دیا۔

خان جہاں کے حکم پر یہ پیغام بلند آواز میں پڑھا جانے لگا۔ پیغام کی ابتدائی تین سطریں صرف القاب و آداب پر مشتمل تھیں انہیں سن کر خان جہاں کا سینہ پھول گیا۔ وہ القاب تقریباً بادشاہ کے ہم پلہ تھے۔ خان جہاں کو یقیناً اب سے پہلے ایسے القاب سے کسی نے یاد نہیں کیا ہوگا۔ میں نے خاص طور پر اس کے نفس کیلئے یہ خوراک فراہم کی تھی۔

اس پیغام میں جو اہم بات لکھی گئی تھی وہ یہ تھی کہ جنگ سے پہلے مناسب ہے دونوں سردار خلوت میں مل کر کوئی ایسی راہ تلاش کریں جو خلق خدا کا خون ناحق بہنے کی نوبت نہ آئے۔

☆......☆......☆

تجویز پیش کی گئی کہ دونوں لشکروں کے بیچوں بیچ ایک خیمہ نصب کیا جائے۔ دونوں سردار اور ان کا ایک ایک ساتھی غیر مسلح ہو کر اس خیمے تک پہنچ جائیں گے۔ پیغام میں مذاکرات کے وقت کا تعین خان جہاں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جب تک پیغام پڑھا جاتا رہا خاموشی چھائی رہی۔ خان جہاں کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس پیغام سے متاثر ہوا ہے۔ ہر چند کہ وہ پیغام صلح نہیں تھا مگر اس کی عبارت بڑی پر اثر تھی۔ یہ عبارت میں نے ہی لکھوائی تھی۔

''ہم تمہارے شوہر کی اس تجویز پر صاد کرتے ہیں۔'' پیغام سننے کے بعد خان جہاں نے نرم آواز میں کہا ''کل آفتاب طلوع ہوتے ہی ہمارے آدمی جن کی تعداد پانچ ہوگی تمہارے لشکر تک پہنچ جائیں گے۔ تمہاری طرف سے بھی اتنے ہی آدمی مقررہ وقت تک یہاں آ جانے چاہئیں۔ ہم جاننا چاہیں گے کہ تمہیں یہ منظور ہے؟''

میں نے خوشی خوشی ہامی بھر لی۔ میں نے اپنی دانست میں اپنی کارگزاری سے حمید خاں کو آگاہ کیا تو اسے یقین نہ آیا۔ اس پر میں بولی۔

''جنگ صرف تلواروں سے نہیں ذہن سے بھی لڑی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس بوڑھے گھاگ کو شکست دے دوں گی۔ ابھی تو میرے ترکش میں اور بہت سے تیر ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میری نگاہ حمید خاں کے چہرے پر تھی۔

میری بات سن کر حمید خاں کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کے گزر گیا۔ وہ کچھ اور ہی سمجھا اس لئے مردہ سی آواز میں مجھ سے پوچھنے لگا۔

''کیا وہ بوڑھا مغل سردار خان جہاں لودھی تمہیں بدنظر بھی محسوس ہوا؟''

میں ہنس دی ''مجھے تو ایسے ہی موقعوں کی تلاش رہتی تھی۔ ایک ادا سے بولی۔'' وہ بوڑھا ایسا لگتا تو نہیں ہے لیکن بدنظر ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کے کردار کی کجی ہمارے لئے سود مند ہوگی۔ پھر وہ زیر دام آنے سے کسی صورت نہیں بچ سکے گا۔ ایک بھی آدمی کا خون بہائے بغیر اتنی بڑی جنگ جیت لینا کوئی معمولی بات نہیں۔'' میں دانستہ ایسے الفاظ استعمال کر رہی تھی جو نشتر بن کر حمید خاں کے دل میں اتر جائیں۔

مجھے بخوبی علم تھا کہ حمید خاں میرے عشق میں دیوانہ ہے۔ اگر میں نے اسے اپنا دیوانہ نہ بنایا ہوتا تو شاید اب تک زندہ نہ ہوتی۔ اس کے باوجود میں حمید خاں کی طرف سے پوری طرح چوکنا اور محتاط رہتی تھی۔ کسی بھی وقت اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو سکتا تھا۔ وہ بھی یقیناً کوئی ایسا ہی لمحہ تھا کہ حمید خاں کی غیرت جاگ اٹھی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اس کے

ہاتھوں میں پھل والا خنجر نظر آیا۔ وہ دہشت زدہ سا لگ رہا تھا۔ جیسے اپنے حواسوں میں نہ ہو۔ غیر متوقع صورتحال دیکھ کر میں سناٹے میں رہ گئی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی قدم اٹھاتی وہیں موجود عارج نے حمید خاں حبشی کی کلائی پکڑ لی۔ اسی لمحے جیسے مجھے ہوش آ گیا اور میں نے حمید خاں سے خنجر چھین لیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہو گیا کہ حمید خاں مجھ پر حملہ نہیں کر رہا تھا' اس کے خنجر کا رخ خود اسی کے سینے کی طرف تھا۔ گویا وہ خودکشی کرنے والا تھا۔ اس کا سبب مجھ سے بہتر اور کون جانتا۔

''یہ تم کیا کر رہے تھے؟...... کیا تمہیں نہیں معلوم کہ خودکشی کرنا حرام ہے۔'' میں نے حمید خاں کو مخاطب کیا۔

''مجھ سے اب مزید بے عزت ہو کر نہیں جیا جاتا۔'' حمید خاں کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ''کوئی تم پر بری نظر ڈالے یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے نزدیک ایسی زندگی سے بہتر عزت کی موت ہے۔''

''سنو حمید خاں! ہم اپنے ارادوں پر تو کسی طرح کے پہرے بٹھا سکتے ہیں لیکن دوسروں کو پابند بنانا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ اگر کوئی کسی کو بری نظر سے دیکھتا ہے تو اسے ایسا کرنے سے کس طرح روکا جا سکتا ہے۔'' میں نے حمید خاں کو سمجھایا۔

میں نے حمید خاں کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کیلئے ہی اسے یہ تاثر دیا تھا کہ میں اس سے بے وفائی کر رہی ہوں حالانکہ یہ حقیقت نہیں تھی۔ اس پر بھی حمید خاں خود کبھی میرے روبرو حرف شکایت زبان پر نہیں لایا تھا۔ یہ الگ بات کہ میری طرف سے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر وہ اندر ہی اندر کھولتا اور کڑھتا رہتا تھا۔ یہ غم اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا کہ نظام الملک کی توجہ حاصل کرنے کی خاطر اس نے بڑی قیمت ادا کی ہے۔ اسے یہ بھی خبر تھی کہ لوگوں کی زبان پر کیا ہے۔ جو تیر کمان سے نکل چکا تھا اس کا واپس آنا محال تھا مگر کبھی کبھی اپنی بے عزتی پر بہت ملال ہوتا' آج اس نے اظہار بھی کر دیا تھا۔ اب سے پہلے اس نے میرے سامنے زبان نہیں کھولی تھی۔

''تمہارے ذہن میں بے عزتی کا جو خیال آیا ہے اسے ذہن سے جھٹک دو۔ چند لمحے خاموش رہ کر میں پھر کہنے لگی۔ ''اب کل صبح کی تیاریوں کا حکم دو۔'' حمید خاں نے اقرار میں سر ہلایا تو میں نے مزید کہا۔ ''دکن کی بہترین شراب اور دیگر لوازم بھی ضروری ہیں۔ یہ محفل عشرت ہو گی۔ ایک یادگار محفل تمہارے ساتھ اس محفل میں جانے والی میں ہوں گی۔'' میں نے یہ کہہ کر حمید خاں کے ذہن پر توجہ دی۔

حمید خاں کو یہ اندازہ پہلے ہی تھا کہ میں اس کے ساتھ جاؤں گی ورنہ سردار کے ساتھ ایک ساتھی کی شرط بھی نہ ہوتی۔ اس وقت حمید خاں کے ذہن میں یہ کھچڑی پک رہی تھی کہ اگر مغل سردار واقعی بدنظر ہوا تو کیا ہو گا؟ حمید خاں نے وہ شب سخت اضطراب اور بے چینی میں گزاری۔ حمید خاں کو میں نے ہی اپنی طرف سے غلط فہمی میں مبتلا کیا تھا لیکن یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ جان دے کر اس عذاب سے نجات پا جائے۔ اسی خیال سے میں نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ اگر میں بے وفا ہوتی تو نظام الملک کے حرم میں ہوتی۔ اسی بنا پر جب دوسرے دن حمید خاں بیدار ہوا تو رات کا کوئی زخم اس کے سینے میں ہرا نہ تھا۔ میں بھلا اس کی سزا کم کیوں ہونے دیتی۔

میں اپنے شکار کو دوبارہ تازہ دم ہوتے دیکھ کر خوش ہوئی۔ اب مزید مشق ستم کی راہ کھل گئی تھی۔ میں کوئی تازہ ستم ایجاد کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب حمید خاں کو یہ اطلاع دی گئی کہ مغل سردار خان جہاں کے آدمی آ گئے ہیں تو وہ مجھے ساتھ لئے خیمے سے باہر آ گیا۔ میرے اور حمید خاں کے پاس کوئی ہتھیار نہیں' یہ تسلی ہونے پر بھی وہ لوگ وہیں ٹھہرے رہے۔ میں اور حمید خاں گھوڑوں پر سوار ہونے والے تھے۔

اپنے گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے میں نے ان لوگوں کو مخاطب کیا اور رکنے کا سبب پوچھا۔

ان میں سے ایک بولا۔ ''ہمیں خان جہاں نے حکم دیا ہے کہ آپ کے ساتھ ساتھ درمیان میں نصب ہونے والے خیمے تک جائیں۔ پھر اپنے لشکر سے جا ملیں۔ ایسا ہی آپ کے آدمیوں سے بھی کہا جائے گا۔ اگر آپ کو ہمارے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض ہے تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔''

''نہیں۔'' میں فوراً بول اٹھی۔ ''تم لوگ درمیانی خیمے تک ہمارے ساتھ چلو گے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں بلکہ اس سے تو ہم خان جہاں کے فہم و فراست کے قائل ہو گئے۔'' یہ کہہ کر میں اپنے گھوڑے پر چڑھ گئی۔

حمید خاں پہلے ہی گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ ان لوگوں کی باتیں سن کر میں سمجھ گئی کہ خان جہاں بالکل ہی احمق نہیں ہے۔ درمیانی خیمے تک جاتے جاتے بھی مسلح ہونے کے خیال سے پلٹ کر آیا جا سکتا تھا۔ خان جہاں نے اس امکان کو ختم کر دیا تھا۔

دونوں فوجوں کے درمیان نصب کیا جانے والا وہ عالی شان خیمہ دور ہی سے نظر آ رہا تھا میرے اور حمید خاں کے گھوڑے اسی خیمے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے خان جہاں

کے آدمی اپنے گھوڑوں پر سوار دوڑے چلے آ رہے تھے۔

ہم درمیانی خیمے کے قریب پہنچے تو دوسری جانب سے بھی چند گھڑ سوار آتے دکھائی دیئے۔ آگے آگے خان جہاں لودھی کا گھوڑا تھا۔ میں نے اس مغل سردار کو دور ہی سے پہچان لیا۔ میں اور حمید خاں خیمے کے باہر ہی گھوڑوں سے اتر کر کھڑے ہو گئے۔ خان جہاں کے جو آدمی خیمے تک ہمارے ساتھ آئے تھے سیدھے نکلے چلے گئے۔

کچھ ہی دیر میں خان جہاں کی سواری وہاں آ کر رکی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان مغل فوجی افسر بھی تھا۔ یہ مغل افسر گزشتہ رات بھی خان جہاں کے خیمے میں موجود تھا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ حمید خاں اور میں نے بڑھ کر ان دونوں کا استقبال کیا۔ پھر انہیں خیمے کے اندر لے گئے۔ وہاں کوئی خدمت گار نہیں تھا۔ صرف چار افراد تھے۔ میں نے گفتگو شروع ہونے سے پہلے خود کو بطور ساقی پیش کیا اور دور ساغر کیلئے درخواست کی۔

خان جہاں یہ سن کر بولا۔ ''ہر چند کہ ہم دن کے وقت شغل سے گریز کرتے ہیں مگر تم نے جس محبت سے دعوت دی ہے اسے ٹھکرانا کفران نعمت کے برابر سمجھتے ہیں۔ ہم تمہاری دعوت منظور کرتے ہیں۔''

اس پر میں نے خان جہاں کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ہاتھ سے ساغر بنا کر خان جہاں اور مغل فوجی افسر کو پیش کیے۔ پھر حمید خاں کیلئے بھی ساغر بنایا۔ شاید خان جہاں کو خیال ہو کہ میں اپنے لئے بھی ساغر بناؤں گی مگر ظاہر ہے مجھ سے یہ گناہ کیسے سرزد ہوتا۔ ایمان والوں میں سے ہونے کے سبب شراب کو میں حرام ہی سمجھتی تھی۔ خان جہاں نے جو کچھ بھی سوچا ہو لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔

گفتگو میں پہل میں نے کی۔ میں ٹھہرے ہوئے پرسکون لہجے میں بولی۔ ''دکن کی زمین پر بڑا خون بہہ چکا ہے۔ اب ہمیں چاہئے کہ اس زمین پر مزید خون نہ بہائیں' خلق خدا کا خون بہانا یوں بھی کون سی اچھی بات ہے۔ یقیناً حضور کو میری رائے سے اتفاق ہوگا۔''

خان جہاں نے ایک دنیا دیکھی تھی۔ وہ اسی لئے سنبھل کر بولا۔ ''تمہاری اس بات سے کون ذی ہوش انکار کرے گا مگر جنگ رکنے کی کوئی صورت تو ہو۔''

میں نے یہ سن کر کہا۔ ''حضور سے چند سوال کرنے کی اجازت چاہتی ہوں۔'' اس کے ساتھ یہ درخواست ہے کہ ان سوالوں کو گستاخی تصور نہ کیا جائے۔ ان کا مقصد محض یہ ہے کہ اصل صورتحال واضح ہو جائے۔'' ہر چند کہ مذاکرات میں دونوں فریقوں کی حیثیت مساوی ہوتی ہے لیکن میں دانستہ خان جہاں کو اہمیت دے رہی تھی۔ اجازت طلب کرنے کا مقصد بھی

یہی تھا کہ میں خان جہاں کو برتر تصور کرتی ہوں۔ خان جہاں پر اس کا اچھا اثر مرتب ہوا۔ اس نے بڑی خوش دلی کے ساتھ مجھے سوال کرنے کی اجازت دے دی۔ میں بولی۔ ''میرا پہلا سوال یہ ہے کہ عرش آشیانی شہنشاہ اکبر سے پہلے اس زمین پر کس کا قبضہ تھا' جس کیلئے جنگ ہو رہی ہے؟''

خان جہاں میرا سوال سن کر شپٹا گیا۔ اس نے گول مول سا جواب دیا۔ ''سبھی کو معلوم ہے کہ عرش آشیانی سے پہلے یہاں کس کا قبضہ تھا۔''

''پھر بھی یہ کنیز خود حضور کی زبان سے سننے کی آرزومند ہے۔''

''مگر اس سے تمہارا مقصد کیا ہے؟'' خان جہاں نے سوال کیا۔

''صرف یہ ظاہر کرنا کہ دکن والوں نے کبھی اپنی حدود سے باہر قدم نہیں نکالے' اس کے باوجود ان پر ظلم کیا جاتا رہا۔ انہیں خود انہی کے علاقے میں امن و سکون کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دی گئی اور اب پھر یہی نوبت آ گئی ہے۔''

خان جہاں نے یہ سن کر کہا۔ ''اگر تمہاری یہ حجت تسلیم کر لی جائے تو فتوحات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔''

''ہاں وہ فتوحات یقیناً بے معنی ہیں جو لوگوں کو امن و سکون سے نہ رہنے دیں۔'' میں بے دھڑک بولی۔ ''بے شک جو لوگ مفسد اور شری ہوں انہیں راہ راست پر لانے کیلئے اقدامات کیے جا سکتے ہیں تا کہ خلق خدا ان مفسدوں کے فساد سے نجات پائے۔''

معلوم نہیں کہ وہ میرا دل نشیں پیرائۂ اظہار تھا یا تیز دکنی شراب کا تاثر میری باتوں سے خان جہاں متاثر نظر آنے لگا۔ شروع شروع میں اس نے مزاحمت کی پھر یہ مزاحمت مفاہمت و تائید میں بدلتی چلی گئی۔ خان جہاں کے ساتھی نوجوان فوجی افسر کا بھی اس میں ہاتھ تھا۔ وہ اب کھلم کھلا میری تائید میں بول رہا تھا۔ ایک جن زادی کی حیثیت سے میرے لئے یہ مشکل نہیں تھا کہ اس بوڑھے مغل سردار کو اپنا ہم نوا بنا لیتی مگر اپنی پراسرار جناتی قوتوں کو میں اسی وقت استعمال کرتی تھی جب کوئی دوسری راہ نہ رہتی۔

''تو گویا حضور نے یہ تسلیم کر لیا کہ اس زمین پر تصرف کا حق دکن والوں کو ہے۔'' میں نے گفتگو کو سمیٹا۔

خان جہاں نے اعتراف کیا۔ ''ہاں اب تک کی گفتگو کا تو یہی حاصل ہے۔''

میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک قدم اور آگے بڑھایا' بولی۔ ''اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو علاقے اب مغل فوج کے قبضے میں ہیں انہیں پہلے ہی کی طرح نظام شاہی

حکومت میں ہونا چاہئے۔"

خان جہاں سنبھلا اور کہا۔"لیکن قبضہ بھی تو کوئی چیز ہے نا پھر اس علاقے پر قبضہ حاصل کرنے کیلئے ہمیں کتنے اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اس حقیقت کو بھی تو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

میں نے ایک اور پانسا پھینکا۔"اگر اخراجات ادا کر دیئے جائیں تو؟"

خان جہاں گھبرا گیا وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ میرے جال سے نکلنے کیلئے وہ بولا۔

"تو کیا خبر کیا کہا جا سکتا ہے...... ظل سبحانی کو یہ صورت قبول ہو گی یا نہیں اس کا فیصلہ تو وہ بہ نفس نفیس ہی کر سکتے ہیں۔"

اپنے شکار کو جال سے نکلنے کی جدوجہد کرتے دیکھ کر میں نے پھر ڈور کھینچی اور کہا۔

"ہمارے لئے تو حضور ہی سب کچھ ہیں حضور کا فیصلہ ہی ہمارے لئے بادشاہ کا فیصلہ ہے۔ حضور یہاں بااختیار ہیں اور بادشاہی کی طرف سے گویا اس کی نیابت کر رہے ہیں۔"

خان جہاں توقع کے مطابق بانس پر چڑھ گیا اور بولا۔"اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہم ظل سبحانی کی طرف سے کوئی بھی فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں لیکن اپنے دشمنوں سے ڈرتے ہیں۔ وہ یقیناً ظل سبحانی کو ہماری طرف سے ورغلا دیں گے۔"

"اس کی بھی ایک صورت ہے۔"لوہے کو گرم دیکھ کر میں جلدی سے بولی۔"حضور کے خیال میں جو منصفانہ فیصلہ ہو سنا دیں اس پر عملدرآمد بھی ہو جائے مگر حضور اس وقت تک دکن ہی میں ہمارے مہمان رہیں جب تک یقین کامل نہ ہو جائے کہ بادشاہ حضور سے خفا نہیں۔"

خان جہاں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ اگر وہ اخراجات کے نام پر ایک بڑی رقم وصول کر کے دکن کے تمام مفتوحہ علاقے نظام الملک کے حوالے کر دے گا تو بادشاہ اس پر اسے ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ ایسی صورت میں نظام الملک سے ملنے والی بھاری رقم اس کے پاس ہو گی اور وہ نظام الملک کی پناہ میں ہو گا۔ میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔ وہ لالچی آدم زاد یہ سوچ رہا تھا کہ میں کیوں نہ یہیں دکن میں رہ جاؤں؟ اگر میں نظام الملک سے مل گیا تو وہ دو ایک محالات کا محصول بھی میرے نام کر سکتا ہے۔ یوں مستقل آمدنی کی صورت بھی نکل آئے گی۔ اس ادھیڑ بن میں وہ کافی دیر خاموش رہا پھر بولا۔"یہ معاملہ اتنا نازک ہے کہ ہم فوری طور پر اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ ہمیں سوچنے کیلئے کچھ وقت چاہئے' کل صبح پھر ہماری ملاقات ہو گی۔"

"تو گویا یہ طے ہو گیا کہ ہمارے درمیان فی الحال مذاکرات ختم ہونے تک جنگ نہیں ہو گی۔"میں نے تصدیق چاہی۔

"یقیناً!"خان جہاں بولا۔"کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے جنگ کیسے ہو سکتی ہے؟"

میری کوششوں سے میدان رزم' بزم میں تبدیل ہو گیا اور دوستی و موافقت کے رشتے استوار ہونے لگے۔ اس ضمن میں ذکر کے قابل یہ بات تھی کہ مجھے اپنی پراسرار قوتیں استعمال نہیں کرنی پڑی تھیں۔ میں نے خان جہاں کو سوچنے کا وقت دے دیا مگر اسی کے ساتھ بولی۔

"مجھے حضور سے خلوت میں بھی کچھ عرض کرنا ہے۔ اگر حضور اجازت مرحمت فرمائیں تو یہ کنیز حضور کے ساتھ ہی چلے' کل جب حضور یہاں تشریف لائیں گے تو ساتھ ہی یہ بندی بھی آ جائے گی۔"

حمید خاں اس موقع پر خاموش نہ رہ سکا اور مضطرب آواز میں مجھ سے بولا۔"تو کیا تم رات بھی وہیں گزارو گی۔"

میں اس کی بے چینی سے خوش ہوئی اور بھانپ گئی کہ اس کے دل میں کیا کیا وسوسے اٹھ رہے ہوں گے۔

"حضور کے زیر سایہ رہنا تو میرے لئے سعادت ہے۔"میں نے خان جہاں کی طرف اشارہ کیا۔"حضور کے ہوتے مجھے کیا کھٹکا۔"

خان جہاں نے بھی تائید میں کہا۔"یہ ہماری مہمان بن کر رہیں گی۔ ان کی حفاظت کا ذمہ ہم لیتے ہیں۔"

مجھے اندازہ تھا کہ حمید خاں مجبوراً خاموش ہوا ہے ورنہ اس کے اندر طوفان اٹھ رہے ہوں گے۔ میں نے یہی سوچ کر اس کے ذہن پر توجہ دی۔

حمید خاں سوچ رہا تھا کہ دکنی فوج سے یہ بات چھپی نہ رہ سکے گی کہ عذرا بوڑھے مغل سردار کے ساتھ گئی۔ کیا فوجی یہ نہیں سوچیں گے آخر اس کی بیوی نے مغل فوج کے درمیان رات کیوں گزاری؟ پھر صلح ہو جائے گی تو اور بھی افواہیں سر اٹھائیں گی۔

اپنے ماتھے پر کلنک کا وہ ٹیکہ سجانے پر حمید خاں مجبور ہو گیا۔ میں نے اشاروں کی زبان میں عارج کو اس کی نگرانی پر مقرر کر دیا۔ حمید خاں دوبارہ خودکشی کی کوشش کر سکتا تھا۔ حمید خاں بڑی حسرت سے مجھے خان جہاں اور مغل افسر کے ساتھ جاتے دیکھتا رہا۔ ان دونوں کے درمیان میرا گھوڑا تھا۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا دن گزرتا تھا کہ میں حمید خاں کے دل پر کوئی چرکا نہ لگاتی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی صورت مجھ سے استفسار کر سکتا۔

خان جہاں کے ساتھ میں اس کے خیمے تک پہنچی اور گھوڑے سے اتر گئی۔ ایک خدمت گار نے میرے گھوڑے کی لگام تھام لی تھی۔ اب میرے چہرے پر نقاب بھی نہیں تھی۔ خان جہاں نے مجھے اپنے ہی خیمے میں ٹھہرایا۔

میں اس بات سے بے خبر نہیں تھی کہ مغل لشکر میں میری آمد پر طرح طرح کی باتیں بنائی جا رہی ہوں گی ممکن ہے سپاہی یہ سمجھ رہے ہوں کہ خان جہاں نے دکنی سردار سے کوئی سودے بازی کر لی ہے۔

خلوت میسر آتے ہی میں نے خان جہاں کو بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''حضور کی شکل میرے مرحوم والد سے بہت ملتی ہے۔ حضور کی صورت دیکھ کر اسی لئے مجھے اپنے مرحوم والد کی یاد آ گئی۔''

توقع کے مطابق خان جہاں متاثر ہو کر بولا۔ ''تم ہمیں اپنے باپ کی جگہ سمجھ سکتی ہو۔''

یوں خان جہاں کو میں نے اپنا منہ بولا باپ بنا لیا اور آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی کی خواہش ہے کہ باپ اسے چھوڑ کر نہ جائے۔''

''مگر اس کی سبیل کیا ہے؟'' یہ سوال کرتے ہوئے خان جہاں غور سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں جلدی سے بولی۔ ''سبیل میں بتاؤں گی' اس پر عمل کرنا حضور کا کام ہے۔''

''بتاؤ۔'' خان جہاں راضی ہو گیا۔

خان جہاں کو آمادہ پا کر میں نے ہوشیاری سے کہا۔ ''دکن کا جو علاقہ مغلوں کے قبضے میں ہے اسے چھوڑنے کے عوض اخراجات کے نام پر میں نظام الملک سے حضور کو اتنی بڑی رقم دلا دوں گی کہ حضور کی کئی پشتیں دکن میں سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گی۔ ظاہر ہے کسی مغل قلعہ دار یا حاکم کو اتنی ہمت نہیں ہو گی کہ وہ حضور کے حکم سے روگردانی کر سکے۔''

''تمہارا کیا اندازہ ہے نظام الملک ہمیں کتنی رقم دے سکے گا؟'' خان جہاں کے لہجے میں لالچ کا اظہار ہونے لگا۔

پھر کچھ ہی دیر میں میں نے سودا پکا کر لیا۔ مجھے یقین تھا یہ سودا بہت سستا ہے۔ نظام الملک فوراً اس پر راضی ہو جائے گا۔ یہ اس سرزمین کا سودا تھا جس کے حصول کی خاطر مغل تاجدار اکبر اور پھر جہانگیر نے کروڑوں روپیہ خرچ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ہزارہا مغل سپاہی مارے گئے تھے۔ دو مغل بادشاہوں' تین مغل شہزادوں اور متعدد مغل امیروں کی سالہا سال کی

محنت و جان فشانی پر پانی پھر گیا۔ میں نے خان جہاں کو شیشے میں اتار کر یہ سارے علاقے گویا کوڑیوں کے مول خرید لئے۔

صرف پانچ لاکھ ہون اور تین لاکھ کے جواہر میں دکن کا سودا ہو گیا۔ خان جہاں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس نہیں جائے گا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ دکن کے دو محالات کا محصول بھی اس کے نام کر دیا جائے۔ میں نے یہ مطالبہ بھی مان لیا۔ خان جہاں کی باتوں سے مجھے محسوس ہوا کہ اسے یقین نہیں تھا نظام الملک بھی اس سودے پر راضی ہو جائے گا۔

میں نے اسے تسلی دی اور یقین دلایا۔ پھر بولی۔ ''میں آج ہی نظام الملک سے ملنے برہان پور جا رہی ہوں۔''

معاملہ طے ہونے کے بعد مزید ڈھیل دینا میرے نزدیک مصلحت کیخلاف تھا۔ میں اسی خیال سے وہاں نہیں رکی اور سیدھی حمید خاں کے پاس پہنچ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''تم لوٹ آئیں؟'' حمید خاں کے لہجے سے خوشی جھلک رہی تھی۔ اپنی دانست میں وہ ممکنہ رسوائی سے بچ گیا تھا۔ میں نے مغل لشکر کے درمیان وہ رات نہیں گزاری تھی۔

میں نے حمید خاں کو خوش ہونے کا موقع نہیں دیا اور نشتر زنی کی۔ ''دیکھ لو کہ میں نے اس بوڑھے مغل سردار سے اپنی بات منوا ہی لی اور جنگ جیت لی۔'' یہ کہہ کر میں معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔

حمید خاں کا چہرہ بجھ گیا۔ میں مزید نمک مرچ چھڑک کر اس کے زخموں سے کھیلتی رہی۔ میں نے حمید خاں کو وہ سب کچھ باور کرایا جس میں نام کو بھی حقیقت نہیں تھی۔ مقصد اسے ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا تھا۔

''سوچ کیا رہے ہو! میرے ساتھ برہان پور چلو۔'' میں حمید خاں کو خاموش دیکھ کر بولی۔ ''کیا تمہیں اس بات پر خوشی نہیں کہ تمہاری بیوی نے تن تنہا مغلوں کے بھاری لشکر کو شکست دے دی... بولو۔''

''ہاں میں خوش ہوں۔'' حمید خاں نے سرد آہ بھری۔

پھر اسی روز شام ہونے تک حمید خاں کو ساتھ لے کر میں برہان پور پہنچ گئی۔ نظام الملک کو میں نے خود تمام واقعات سے آگاہ کیا۔ اس وقت حمید خاں بھی وہیں موجود تھا۔ نظام الملک نے خوش ہو کر اپنے گلے سے مروارید کا ایک ہار اتارا اور خود مجھے پہنایا۔

وہ رات برہان پور ہی میں بسر ہوئی۔ رات گئے تک جشن طرب جاری رہا۔ اس جشن میں میں نظام الملک کی ساقی بنی۔ سپہ سالار کنفاف اور دیگر متعدد سردار بھی اس جشن میں شریک

تھے۔ جب رات ڈھل گئی تو میں نے بھری محفل میں یہ کہتے ہوئے نظام الملک کا ہاتھ تھام لیا۔

''حضور کو یہ کنیز خواب گاہ تک پہنچائے گی۔''

نظام الملک ہنستا ہوا اٹھا اور میرے ساتھ اپنی خواب گاہ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ یہ ''حرکت'' میں نے دانستہ حمید خاں کو ذلیل و رسوا کرنے کیلئے کی تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے میں نے دیکھا کہ دکن کے سردار معنی خیز انداز میں حمید خاں کو دیکھ رہے تھے۔ اس کا سر شرم سے جھک گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بھری محفل میں سب کے سامنے میں نے اسے بے آبرو کر دیا تھا۔ احساس ذلت کے سبب وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے' اسی کو روکنے کیلئے غارج اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا تھا۔

دوسرے ہی دن خان جہاں کو طے شدہ رقم کی ادائیگی کر دی گئی اور دو محالات کا محصول بھی اس کے نام ہو گیا۔ اس کے بعد خان جہاں کے حکم پر تمام مغل حاکموں نے نظام الملک کے گماشتوں کو اپنے علاقے سپرد کر دیئے اور نظام الملک کی اطاعت قبول کر لی۔ خان جہاں کی اس کارروائی کی مخالفت اگر کسی نے کی تو وہ احمد نگر کا قلعہ دار تھا۔ اس نے خان جہاں کے حکم اور تحریر کو بالکل رد کر دیا اور یہ جواب دیا کہ ظل سبحانی کے حکم کے بغیر قلعے کی چابی کسی کو نہ دوں گا' سمجھو قلعے کی چابی میرے سر سے بندھی ہوئی ہے۔ قلعے کے اطراف کے پرگنے اور تعلقے نظام الملک کے آدمیوں کے قبضے میں آ گئے۔ انہوں نے قلعہ دار کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

نظام الملک کی یہ بہت بڑی فتح تھی۔ اس فتح کا سہرا میرے سر تھا۔ دکن پر اب بالواسطہ میری حکومت تھی۔ نظام الملک میری مٹھی میں تھا۔ اب میری راہ میں صرف ایک امیر کفاف تھا جو تمام امور مملکت انجام دیتا تھا۔ نظام الملک کے ایماء پر میں نے ملک اور فوج کے سارے اختیارات کفاف کے ہاتھ سے اس طرح اپنے قبضے میں کر لئے کہ سب کچھ میرے اشارے سے وابستہ ہو گیا۔

رفتہ رفتہ کچھ ہی دن میں میرا اختیار و اقتدار اس درجہ بڑھ گیا کہ جب میں سواری کیلئے باہر نکلتی تو بڑے بڑے امیر اور سردار میرے ہاتھی کے ساتھ پیدل چلتے۔ یہ امیر اور سردار میرے ہی حضور میں اپنے عریضے یا بادشاہی پروانے پیش کرتے۔ اب میرے سامنے حمید خاں کی حیثیت کچھ نہ رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں اب اتنے اختیارات تھے کہ میں اپنے حکم سے حمید خاں کی زندگی کا چراغ گل کرا سکتی تھی مگر مجھے موقع کا انتظار تھا۔ میں یہ بھولی نہ تھی کہ میرے انسانی قالب عذرا کے محبوب ہاشم کو حمید خاں کے حکم پر کس جرم میں قتل کیا گیا تھا۔ اب حمید

خاں کی حویلی کے بجائے میرا زیادہ تر وقت نظام الملک کے محل میں گزرتا تھا۔

عادل شاہی اور نظام شاہی سلاطین میں ہمیشہ سے عداوت اور فوج کشی رہتی تھی۔ انہی دنوں عادل شاہ نے ایک آراستہ لشکر جنگی ہاتھی اور توپ خانہ لے کر نظام شاہی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ نظام الملک نے اس کے مقابلے میں تیاریاں کیں۔ اس کی ساری توجہ جنگ کی طرف ہو گئی۔ وہ خود ایک بڑا لشکر لے کر عادل شاہ کے مقابلے پر روانہ ہونے والا تھا۔

سرحدوں پر جنگ جاری تھی اور پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ مجھے ایک طویل عرصے سے کسی ایسے موقع کی تلاش تھی حمید خاں سے آخری انتقام لینے کیلئے یہی وقت تھا مگر اس سے پہلے میں نے ایک اور چال چلی۔

میں خلوت میں نظام الملک سے ملی اور اس سے کہا۔ ''یقیناً کسی نے غداری کی ہے اور وہ غدار ہم میں سے کوئی ہے۔ اس نے موقع دیکھ کر ہمارے دشمن کو ہم پر حملہ کرنے کیلئے اکسایا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ردعمل جاننے کیلئے میری نظریں نظام الملک کے چہرے پر جمی تھیں۔

''غداری۔'' نظام الملک حیرت سے بولا ''ہمارے درمیان کون غدار ہو سکتا ہے۔''

''مجھے ایک شخص پر شبہ ہے مگر جب تک مجھے اس کے خلاف واضح ثبوت نہیں مل جاتا میں اس کا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ توقع ہے جلد ہی ثبوت مل جائے گا پھر میں خود اس کے قتل کا حکم دوں گی۔ فی الحال تو مجھے حضور سے کچھ عرض کرنا تھا۔''

''ہاں بولو کیا کہنا چاہتی ہو؟'' نظام الملک نے پوچھا۔

''حضور بہ نفس نفیس عادل شاہ کے مقابلے پر جا کر اسے اہمیت نہ دیں۔'' اصل بات کہنے سے پہلے میں نے تمہید باندھی۔

اس پر نظام الملک نے انکار میں سر ہلایا اور بولا۔ ''تمہیں شاید خبر نہیں کہ میدان جنگ سے کتنی ہولناک خبریں آ رہی ہیں' اگر ہم یہیں ٹھہرے رہے تو وہ یہاں تک بڑھ آئے گا۔ یہ بات جنگی حکمت عملی کے خلاف ہے اس طرح دشمن کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔''

''حضور کی جگہ یہ کنیز فوجیں لے کر مقابلے پر جائے گی۔'' میں پرعزم لہجے میں بولی۔

نظام الملک میری بات سن کر حیران رہ گیا۔ بولا۔ ''تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔''

''ممکن ہے جبھی تو کنیز نے عرض کیا۔'' میں نے پرسکون آواز میں کہا۔ ''کنیز کی درخواست ہے کہ اس جنگ کے سارے اختیارات اسے دے دیئے جائیں۔''

نظام الملک نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا تم یہ چاہتی ہو کہ ہم تمہیں شاہی افواج کا سپہ سالار بنا دیں؟''

میں نے اقرار کیا۔ ''جی ہاں حضور! کنیز یہی چاہتی ہے اور اس کی ایک خاص وجہ ہے حکم ہو تو کنیز وجہ بیان کرے۔''

''ہاں کہو!'' نظام الملک نے جلدی سے کہا۔ اس کے لہجے سے اضطراب جھلک رہا تھا۔

میں کہنے لگی۔ ''اگر میں حضور کے اقبال سے دشمن پر غالب آ گئی تو صدیوں تک لوگوں کی زبانوں پر رہے گا کہ نظام الملک کی ایک عورت نے بیجاپور کے بادشاہ سے مقابلہ کر کے اسے بھگا دیا۔ اگر خدا نہ کرے قضیہ اس کے برعکس ہوا تو لوگ یہی کہیں گے کہ ایک بادشاہ نے ایک عورت کو مغلوب کر لیا۔ اس کے بعد حضور اس شکست کا بدلہ لینے کا انتظام کر سکتے ہیں۔''

نظام الملک کو میری تجویز پسند آئی۔ وہ کھل اٹھا اس نے مجھے اپنی افواج کا سپہ سالار بنا دیا۔ سارے دکن میں نظام الملک کا یہ حکم حیرت کے ساتھ سنا گیا۔ پہلے یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ خود نظام الملک فوجیں لے کر محاذ جنگ پر جائے گا۔ اب لوگوں کو یہ اطلاع ہوئی کہ میں اس کی جگہ عادل شاہ سے لڑنے جاؤں گی۔ لوگوں کے ردعمل سے میں بے خبر نہ تھی۔

جن سرداروں کی ترقی میری سفارش پر ہوئی تھی انہوں نے بڑے نظم و ضبط سے احکام کی تعمیل کی۔ ان کے ساتھ یہ ان کی محسن کی عزت کا سوال بھی تھا۔ وہ میری خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہو گئے۔ ان میں سے ہر ایک کو یہی گمان تھا کہ میں اس پر زیادہ مہربان ہوں۔ حمید خاں بھی میرے اشاروں پر ناچا ناچا پھر رہا تھا۔ مجھے سرداروں کی سرگرمی اور جوش دیکھ کر پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ میں کتنی ہر دلعزیز ہوں۔ جو سردار ابھی مجھ سے اپنا کوئی کام نہ نکلوا سکے تھے انہیں میں نے امید پر رکھا اور وہ بھی جان لڑانے پر تیار ہو گئے۔ اس سے قطع نظر میری خوشنودی حاصل کر کے نظام الملک کے قریب بھی ہو سکتے تھے۔

میں نے بڑی تن دہی سے فوجوں کو مرتب کیا۔ عارج بھی میرے ساتھ ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس نے بھی میری بھر پور مدد کی۔ میرے حکم پر جنگی ہاتھیوں کو بھی تیار کیا گیا اور توپ خانے کا بندوبست بھی ہوا۔ مجھے جنگی تجربہ نہیں تھا مگر میرے فوجی سردار منجھے ہوئے تھے۔ حمید خاں حبشی بھی کم نہ تھا۔ اس نے دشمنوں سے بڑے معرکے کئے تھے۔ اب تک آدم زادوں کے درمیان رہ کر میں نے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا مگر مجھے اس بات کا پوری طرح اندازہ تھا

کہ آدم زاد اندر سے کتنے بے رحم اور سفاک ہوتے ہیں۔

دکن میں دستور تھا کہ کوئی اہم معاملہ آ پڑتا تو سونے اور چاندی کے بہت سارے جڑاؤ کڑے بنوا کر سپہ سالار اپنے پاس رکھ لیتا۔ یہ سونے چاندی کے کڑے میدان جنگ ہی میں سپاہیوں کے کارناموں پر انعام میں انہیں دیئے جاتے تھے۔

عین موقع پر کوئی کارنامہ انجام دینے پر قیمتی انعام ملتا تو لڑنے والے اور جی توڑ کر لڑتے۔ تجربے کار سرداروں کے مشورے پر میں نے بھی بے شمار کڑے بنوا کر اپنے پاس رکھ لئے اور اس بات کو بڑی شہرت دی۔ دکن میں یہ بھی دستور تھا کہ توپ خانے کے پیادوں کی تالیف قلب کیلئے مٹھائی بھرے ٹوکرے بھی ساتھ ہوتے تھے۔ میں نے منوں مٹھائی کے ٹوکرے بھی تیار کرا لئے۔

مجھے ہر قیمت پر یہ جنگ جیتنی تھی۔ اس کیلئے میں نے عارج سے بھی مشورہ کیا۔ اس نے کہا۔ ''دینار! دشمن کی فوج کے پیر اکھاڑنے کیلئے میں نے ایک تدبیر سوچ رکھی ہے۔''

میرے استفسار پر عارج نے جو کچھ بتایا اسے سن کر میں مطمئن ہو گئی۔ عارج نے غلط نہیں کہا تھا۔ آدم زاد اپنے جیسوں سے تو جنگ کر لیتے مگر کسی جن زادے سے لڑنا ان کے لئے ممکن نہ ہوتا۔

بالآخر فوجوں کی روانگی کا دن آ گیا۔ میں سرداروں کے جلو میں ایک ہاتھی پر سوار ہو کر محل سے نکلی۔ خود نظام الملک نے مجھے الوداع کہا۔

میں بڑی شان سے بنی سنوری ہاتھی کے ہودج میں بیٹھی تھی۔ میرے حسین انسانی قالب پر ہتھیار سجے ہوئے تھے۔ چہرے پر مرصع نقاب پڑی تھی۔ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں انسانی قالب میں ایک جن زادی شاہی افواج کی قیادت کر رہی ہوں۔ دکن کی یہ پہلی جنگ تھی جس کی سپہ سالار ایک نازک اندام عورت تھی۔ یہ وہ عورت تھی جس نے ایک جنگ ہتھیار اٹھائے بغیر جیتی اور دوسری جنگ میں ہتھیار باندھ کر میدان میں اتری۔ اس سے میں یہ بھی ثابت کرنا چاہتی تھی کہ حوصلے اور بہادری میں مردوں سے پیچھے نہیں۔

میری فوج کوچ پر کوچ کرتی جب محاذ جنگ پر پہنچی تو نظام شاہی فوج پسپا ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے عقب میں بھاری لشکر دیکھا تو پسپا ہوتے ہوتے اس کے قدم پھر جم گئے۔ اس فوج کی کمان کفاف کے ہاتھ میں تھی۔ اسے پہلے ہی حکم مل چکا تھا کہ وہ میرے حکم کی تعمیل کرے۔ میں نے موقع پر پہنچتے ہی اپنے سرداروں کے ایماء پر کفاف کو یہ حکم بھیجا کہ لڑتے ہوئے پیچھے ہٹ آؤ۔ دشمن کو یہ تاثر دو کہ تم جی ہار چکے ہو اور جان بچا کر میدان جنگ سے

بھاگ رہے ہو۔

کفاف کو میرا حکم ملا تو اسے تعمیل کرنی ہی پڑی۔ مجھے علم تھا کہ میرا حکم کفاف کیلئے باعث حیرت ہی ہوگا۔ تازہ کمک آنے کے بعد پسپائی کا کوئی جواز نہیں تھا پھر اس طرح سپاہی بھی ہمت چھوڑ دیتے اور بڑی تعداد میں مارے جاتے۔

چال کارگر ثابت ہوئی' دشمن دھوکہ کھا گیا اور جوش میں اڑتا ہوا آگے بڑھ آیا۔ میری فوج نے دشمن کو تین طرف سے گھیر لیا۔ پھر جو بھرپور حملہ ہوا تو دشمن گھبرا گیا۔ یہی موقع تھا کہ میدان جنگ میں ایک حیران کن منظر دیکھا گیا۔ ایک طاقتور اور غیر معمولی جسامت والے شیر نے حملہ کر کے اس کی صفوں کو الٹ دیا۔ دشمن سپاہی شیر کی دہاڑ سن کر بھاگنے لگے۔ عارج نے بھی اپنے حصے کا کام کر دیا تھا۔ اس نے مجھے یہی تدبیر بتائی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی ہلے میں عادل شاہی فوج سامنے سے بھاگ گئی۔ میرے مردانہ وار حملوں سے غنیم کے ہزار آدمی مارے گئے۔ انہیں راہ فرار نہ مل سکی۔ ہزاروں دشمن سپاہی زندہ گرفتار کر لئے گئے۔

میں فتح و نصرت کے شادیانے بجاتی برہان پور لوٹی۔ نظام الملک کی نظر میں اب میں پہلے سے زیادہ معزز بن گئی۔ اس فتح کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ جشن کی رات میں نے نظام الملک سے کہا۔ "حضور کو یقیناً یاد ہوگا کہ اس کنیز نے کہا تھا عادل شاہ نے کسی کی شہ پر حملہ کیا ہے' کسی نے غداری کی ہے۔"

نظام الملک تائید میں بولا۔ "ہاں ہمیں یاد ہے' تمہیں کسی شخص پر غداری کا شبہ بھی تھا۔"

میں بڑے سفاکانہ انداز میں مسکرائی اور کہا۔ "حضور اس غدار کا نام سنیں گے تو حیرت ہوگی۔ کنیز کو اس پر خود بھی بے حد ملال ہے' خود اپنی زبان سے کچھ کہنے کے بجائے حضور کی خدمت میں کنیز ایک ناقابل تردید ثبوت پیش کرنا چاہتی ہے۔" پھر میں نے ایک مہر بند خط نظام الملک کے سامنے پیش کیا۔ اس خط پر سردار حمید خاں حبشی کی مہر تھی وہ خط عادل شاہ کے نام تھا۔ نظام الملک وہ خط کھولنے لگا۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔

میں نے اس دوران میں مزید کہا۔ "اس غدار پر بہت دن سے کنیز کی نظر تھی۔ اسی وجہ سے یہ خط کنیز کے ہاتھ لگ گیا۔ یقیناً یہ غداری کا ثبوت ہوگا۔ کنیز کو یقین ہے کہ حضور اس غدار کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں کریں گے۔"

نظام الملک خط کھول کر پڑھنے لگا۔ اس خط میں جو کچھ لکھا تھا مجھے پہلے ہی خبر تھی۔ خط کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حمید خاں پہلے بھی عادل شاہ سے مراسلت کرتا رہا ہے۔ اس

میں پچھلے خط کا حوالہ بھی دیا گیا تھا کہ فی الفور حملہ کر دیا جائے۔ یہ خط لکھنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ حمید خاں نے گویا عادل شاہ سے یہ اجازت طلب کی تھی کہ فتح و شکست دونوں صورتوں میں وہ بیجاپور آنا چاہتا ہے۔ کیا وہ جنگ کے فوراً بعد بیجاپور آ جائے؟ خط پڑھ کر میری توقع کے مطابق نظام الملک طیش میں بھر گیا۔ اس کا اظہار ہڑے سے ہو رہا تھا۔

"وہ غدار بیجاپور نہیں بلکہ ملک عدم سدھارے گا۔" نظام الملک غصے میں بولا۔ "ہم اسی وقت اس کی گرفتاری اور قتل کا حکم دیتے ہیں۔"

پھر اس نے ذرا توقف سے اور ٹھہرے ہوئے ستائش لہجے میں کہا۔ "آفریں ہو تم پر کہ تمہارے دل میں یہ خیال نہ آیا تم اس غدار کی بیوی ہو اور اس رشتے کا تقاضا ہے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دو۔ ہمیں تم پر ناز ہے تم واقعی ہمارے لئے گوہر نایاب ہو۔"

نظام الملک کو ذرا یہ خیال نہ آیا کہ جس شخص کو دولت عزت اور جاہ و نصب کی کوئی کمی نہ تھی وہ بھلا غداری کا مرتکب کیسے ہوتا؟ جو ایک عرصے سے حق نمک ادا کر رہا تھا' نمک حرامی پر کیوں اتر آیا؟ وہ ایک جعلی خط کو سچ سمجھا۔ اس کی یقین دہانی کیلئے صرف یہی کافی ہوا کہ اس خط پر حمید خاں حبشی کی مہر تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ خود سردار حمید خاں کی بیوی یعنی میں اپنے شوہر کی غداری کا ثبوت پیش کر رہی تھی۔ ایک جعلی خط لکھوا لینا اور پھر حمید خاں کی مہر حاصل کرنا میرے لئے کوئی دشوار کام نہ تھا۔ میں نے اس موقع پر نظام الملک سے ایک درخواست اور کی۔ بولی۔ "کنیز کی خواہش ہے کہ خود اپنے ہاتھوں سے اس غدار کا سر قلم کرے تاکہ ایک لازوال مثال قائم ہو اسی کے ساتھ یہ بھی التماس ہے کہ اس غدار کو صفائی کا موقع نہ دیا جائے اور اسے قتل کر دیا جائے۔ قتل کے بعد ہی لوگوں کو اس کی فرد جرم پڑھ کر سنائی جائے۔ یہ طریقہ کنیز کے خیال میں زیادہ موثر ہوگا۔"

نظام الملک نے اس پر کہا۔ "ہم تمہاری گزارشات منظور کرتے ہیں' تمہیں ہم مکمل اختیار دیتے ہیں کہ اس غدار کو جس طرح چاہو سزا دو۔"

میں اسی وقت شاہی محافظوں کا مخصوص دستہ لے کر محل سے روانہ ہوگئی۔ دو گھڑی رات بیت چکی تھی۔

جس وقت میں حویلی میں پہنچی تو حمید خاں اپنی خواب گاہ میں جا کر سو چکا تھا۔ محافظ جو میرے ساتھ تھے انہیں کچھ معلوم نہ تھا ان کو تو نظام الملک کی طرف سے یہ حکم ملا تھا کہ وہ میرے ہر حکم کی تعمیل کریں۔

حویلی میں داخل ہو کر میں نے محافظوں کو حکم دیا۔ "خواب گاہ میں گھس جاؤ اور سردار

حمید خاں حبشی کو گرفتار کر کے گھسیٹتے ہوئے زنداں میں لے جا کر ڈال دو۔ خبردار تعمیل حکم میں ذرا سی بھی بے احتیاطی قابل معافی نہیں ہوگی۔" اس کے ساتھ میں نے محافظوں کو تاکید کر دی۔ "حمید خاں اپنی گرفتاری کے بارے میں کچھ پوچھے تو ہرگز نہ بتایا جائے' کس کے حکم پر کارروائی کی گئی۔ یہ بھی راز رکھا جائے۔"

میرا حکم پا کر محافظ حمید خاں کی خواب گاہ میں گھس گئے۔ میں نے اپنی چشم تصور کو متحرک کیا اور بند آنکھوں سے خواب گاہ کے اندر کا منظر دیکھنے لگی۔ حمید خاں بستر پر بے خبر سو رہا تھا کہ اچانک محافظوں نے اسے بستر سے گھسیٹ لیا۔

بیدار ہونے کے بعد حمید خاں بہت چیخا چلایا اور اس طرح حراست میں لینے کی وجہ پوچھی مگر محافظوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ حویلی میں کہرام مچ گیا۔ حمید خاں کو محافظ اب خواب گاہ کے باہر لے آئے تھے۔ میں ایک ستون کی آڑ میں چھپی ہوئی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ میرے انسانی قالب عذرا کے محبوب ہاشم کو بھی اسی طرح ایک رات بغیر کچھ بتائے حمید خاں کے حکم پر گرفتار کیا گیا ہوگا۔ ہاشم بھی یوں ہی چیخا چلایا ہوگا۔ اس لمحے میں نے اپنے انسانی قالب کی فطری صفات کو خود پر حاوی آتے محسوس کیا۔ اس وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور سامنے کا منظر دھندلا گیا۔ محافظ حمید خاں کو گھسیٹتے لے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔

☆ ... ☆ ... ☆

پھر میں نے اسی راہداری میں ننگے سر اور پابرہنہ زہرہ خانم کو بھاگتے دیکھا۔

زہرہ خانم گھبرائی ہوئی اور بدحواس نظر آ رہی تھی۔ شاید کسی خادم نے اسے خبر کر دی تھی کہ اس کے بھائی سردار حمید خاں حبشی کو سپاہی پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ اس عیار آدم زادی کو دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ حمید خاں کے بعد اب اسی کی باری تھی۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

پہرے دار نے زنداں کا دروازہ کھولا اور میں اندر داخل ہو گئی۔ بظاہر مجھے جو کوئی دیکھتا تو اسے چہرے پر اداسی ہی نظر آتی' لیکن میری اندرونی کیفیت قطعی مختلف تھی۔ حمید خاں کو میں نے جس حال میں دیکھا اس سے بھی مجھے خوشی ہوئی۔

زنداں میں حمید خاں کو آج تیسرا دن تھا۔ اب تک اسے یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کیوں اور کس جرم میں قید کیا گیا ہے۔ تین دن میں اسے جو ذہنی اذیت برداشت کرنی پڑی ہوگی اس کا اندازہ کرنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ یہ تین دن شاید اس کی زندگی کے تمام آلام و مصائب پر بھاری تھے۔ اس کے پیروں میں بیڑیاں اور گلے میں طوق تھا۔ دونوں ہاتھ گلے میں پڑے ہوئے طوق سے بندھے ہوئے تھے۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ زنداں کا سکوت زنجیروں کی جھنکار سے ٹوٹ گیا۔

"عذرا!" حمید خاں نے مجھے میرے انسانی قالب کے نام سے مخاطب کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چیخ اٹھا۔ بتاؤ..... عذرا بتاؤ.... تمہی بتاؤ عذرا کہ مجھے کس جرم میں پکڑ کر پابہ زنجیر کیا گیا ہے؟.... تمہیں تو معلوم ہوگا۔"

میں آہستہ قدمی سے چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ کر زنداں کے چبوترے پر بیٹھ گئی۔

"بڑی کوشش اور مشکل کے بعد میں آج تم سے ملنے میں کامیاب ہو سکی ہوں۔" میں اداس آواز میں بولی۔ "تم سے ملاقات کی خاطر مجھے زنداں کے محافظوں کو بھی رشوت دینی پڑی ہے۔ سنو! میں تمہیں اس روح فرسا اعلان سے آگاہ کرنے آئی ہوں جو آج تمہارے

متعلق نظام الملک کی طرف سے کیا گیا ہے۔ شاہی ڈھنڈورچی بستی بستی یہ اعلان کرتے پھر رہے ہیں میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہو رہی ہے کہ...... کہ میں تمہیں اس اعلان کے بارے میں کچھ بتاسکوں۔'' میں یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔ حمید خاں سے میں نے جو کہا غلط نہیں تھا۔

حمید خاں بے چین ہوگیا اور تڑپ کر بولا۔'' مجھے بتاؤ... بتاؤ عذرا کہ وہ اعلان کیا ہے؟''

''اس اعلان کے مطابق بہت...... بہت جلد تمہارا سر... سر قلم کر دیا جائے گا اور... ''میں دانستہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''اور کیا؟... کیا عذرا؟ جلد بتا دو ورنہ میں اپنی موت سے پہلے مر جاؤں گا۔'' حمید خاں کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''اور یہ کہ میں... میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارا سر قلم کر دوں گی۔''

''نہیں۔'' حمید خاں چیخ اٹھا۔'' یہ... یہ سزا بہت... بہت بڑی سزا ہے مگر میرا جرم کیا ہے... میں نے کیا جرم کیا ہے؟''

میں اسے شاہی اعلان کی تفصیلات بتانے لگی۔'' اعلان میں کہا گیا ہے کہ تمہاری گردن مارے جانے کے بعد فردِ جرم پڑھ کر سنائی جائے گی۔''

''تو... تو میں اپنی... اپنا جرم جانے بغیر ہی مر جاؤں گا...... مجھے... مجھے اپنی صفائی کا موقع بھی نہیں ملے گا۔'' حمید خاں جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھا۔

''میں پوری کوشش کروں گی کہ کسی طرح مجھے آخری وقت تک کچھ معلوم ہو جائے...... اگر مجھے کامیابی ہوگئی تو... تو یقین کرو کہ... کہ تمہاری موت سے پہلے میں تمہیں حقیقت سے آگاہ کر دوں گی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں...... ہاں اس وقت تم... تم میرے قریب ہوگی...... مجھے بتا سکو گی، مگر... مگر کب تک... مجھے کب تک قتل کر دیا جائے گا؟''

''تاریخ کا اعلان ابھی نہیں کیا گیا۔'' میں نے بتایا۔'' کچھ معلوم نہیں کب یہ سانحہ ہو جائے۔''

مجھے اندازہ تھا کہ حمید خاں کیلئے یہ اور بھی عذاب ناک بات تھی۔ اسے تو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ قتل کیا جانے والا ہے مگر کب؟ اس کا علم نہیں تھا۔ موت سے زیادہ بھیانک موت کا انتظار ہوتا ہے۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے ایک اور تیر چلایا۔ بولی۔'' حمید خاں سنو! مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے قدرت تم سے کوئی انتقام لے رہی ہے۔ یاد کرو کبھی تم نے کسی بے گناہ کو بغیر

تفتیش کے قتل تو نہیں کرا دیا۔ خون ناحق کبھی نہ کبھی رنگ ضرور لاتا ہے۔ یہ تو تمہیں بھی پتا ہو گا۔''

''ہاں، ہاں عذرا! حمید خاں بھول اٹھا۔'' مجھے...... برسوں پہلے کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔''

''کیا ہوا تھا؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''ساری...... ساری زندگی میں بس ایک بار ایسا ہوا ہے عذرا۔'' حمید خاں کہنے لگا۔ ''میرا دل...... اب گواہی دے رہا ہے کہ...... کہ وہ نوجوان بے گناہ تھا...... اس کےخلاف غالباً کوئی سازش کی گئی تھی۔''

میں سمجھ گئی کہ حمید خاں کس کا ذکر کر رہا ہے مگر دانستہ انجان بن کر بولی۔'' کون تھا وہ؟''

حمید خاں نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔'' اس نوجوان کا نام ہاشم تھا۔''

''کیا اس نوجوان ہاشم کو تمہارے حکم پر قتل کیا گیا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔ مقصد اسے ایک ایک بات یاد دلانا تھا۔

''ہاں اس کی گردن میرے حکم پر اڑائی گئی تھی۔'' حمید خاں نے اعتراف کیا۔

میں نے پھر دریافت کیا۔'' اس نوجوان کو قتل کئے جانے سے پہلے کیا صفائی کا موقع دیا گیا تھا...... اسے بتایا گیا تھا کہ کس جرم میں اس کی گردن ماری جا رہی ہے؟...... کسی کو یوں ہی تو قتل نہیں کر دیا جاتا۔''

''ٹھیک کہتی ہو تم عذرا! مگر اس... اسے کچھ نہیں بتایا گیا اور...... اور افسوس کہ... کہ صفائی کا موقع بھی نہیں دیا گیا...... تمہارا یہ کہنا ٹھیک ہی لگتا ہے کہ قدرت مجھ سے انتقام لے رہی ہے... خود میرے...... میرے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہو رہا ہے...... مجھے بھی تو......''

''اس نوجوان پر الزام کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''عادل شاہ کے ایک مصاحب کے نام اس کا خط پکڑا گیا تھا۔ خط اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ عادل شاہ حکومت کا جاسوس ہے۔''

میں نے حمید خاں کا جواب سنا اور بولی۔'' اس پر جرم ثابت ہوگیا تھا نا؟'' اس کی تحریر ملا کر دیکھی گئی ہوگی۔''

حمید خان نے ٹھنڈا سانس بھرا۔'' افسوس کہ نہیں اور اب...... اب میں سوچ رہا ہوں ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا...... تفتیش ضروری تھی کیا خبر وہ مجرم نہ ہو۔''

"اب افسوس کرنے سے کیا حاصل۔ اب تو وہ نوجوان زندہ نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں اب کیا حاصل۔" حمید خاں پژمردہ لہجے میں بولا۔ پھر کہا۔ "سنو اگر معلوم ہو جائے کہ مجھے کب قتل کیا جائے گا تو ضرور بتا جانا۔"

"ان دنوں جو حالات ہیں ان کے پیش نظر میں حتمی وعدہ تو نہیں کر سکتی ہاں کوشش پوری کروں گی۔"

اس کے بعد میں وہاں مزید نہیں رکی۔ میں جس لئے وہاں آئی تھی وہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی خوبصورتی سے اور غیر محسوس طور اسے احساس گناہ میں مبتلا کر دیا تھا۔ حمید خاں کو ذہنی اذیت دینے کی خاطر میں اب تک اس سے نہیں ملی تھی۔ آج میں ملی بھی تو اسے صرف اتنا بتایا کہ وہ قتل کیا جانے والا ہے۔ میری سکونت اب بھی حمید خاں کی حویلی میں تھی۔

☆......☆......☆

حمید خاں اپنے انجام کو پہنچنے والا تھا۔ میں اسے صرف ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کیلئے زندہ رکھے ہوئے تھی۔ حمید خاں کی زندگی گویا میرے اشارہ ابرو سے بندھی ہوئی تھی۔ میں جب چاہتی حمید خاں کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جاتا۔

اپنے ایک دشمن کو لب گور پہنچانے کے بعد مجھے دوسرے دشمن کی فکر ہوئی۔ اب زہرہ خانم سے انتقام لینے کا وقت بھی آ گیا تھا۔ حمید خاں تو محض ایک ذریعہ بنا تھا ورنہ میری نظر میں اصل مجرم حمید خاں کی بہن زہرہ خانم تھی۔ میں اپنے اس دشمن کو بھی تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتی تھی ورنہ میرے انسانی قالب عذرا کے انتقام کی آگ نہ بجھتی۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں ایک نتیجے پر پہنچی۔ اپنے فیصلے پر عمل کرنے کیلئے مجھے کسی منجھے ہوئے تجربے کار اور بااعتماد طبیب کے مشورے کی ضرورت تھی۔ نظام الملک سے قریب ہونے کے سبب دربار شاہی سے وابستہ ہر شخص میری عزت و احترام کرنے لگا تھا۔ انہی میں شاہی طبیب بھی تھا۔ میرا انسانی قالب کچھ ایسے عارضوں میں مبتلا تھا کہ شاہی طبیب سے ربط ضبط بڑھانا ضروری ہو گیا۔ شاہی طبیب مجھے ایسی دوائیں استعمال کرانے لگا کہ میری بیماریاں بڑھ نہ پائیں۔ میں ان دواؤں کی عادی سی ہو گئی تھی۔ زہرہ خانم سے انتقام لینے کی میں نے جو راہ نکالی تو اس موقع پر مشورے کیلئے بھی شاہی طبیب یاد آیا۔ وہ تجربے کار بھی تھا اور میں اس پر اعتماد بھی کر سکتی۔ میں نے طبیب کو بلوا لیا۔

رسمی گفتگو کے بعد میں نے شاہی طبیب سے پوچھا۔ "کیا کوئی ایسا زہر بھی ہے جو بے رنگ اور بے ذائقہ ہو؟"

اس بات کی مجھے توقع تھی کہ شاہی طبیب میری زبان سے زہر کا ذکر سن کر حیران ہو گا۔ سو ایسا ہی ہوا۔ "زہر" طبیب نے اظہار حیرت کیا۔

"ہاں زہر!" میں نے زور دے کر کہا۔ "میں فی الحال تم سے کچھ ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میری بات کا جواب دو۔"

شاہی طبیب نے اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "جی ہاں ایسا زہر ہے مگر قیمتی اور نایاب ہے۔"

میں نے دوسرا سوال کیا۔ "اس زہر کو کھانے میں ملا دیا جائے تو کھانے کی رنگت یا ذائقہ تو نہیں بدلے گا؟" یہ سوال میں نے محض احتیاطاً کیا تھا۔

ہرگز نہیں حضور!" طبیب نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

اب میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا بولی۔ "کیا ایسا زہر فوراً ہلاک کر دیتا ہے؟"

جی ہاں حضور! زہر کا کام ہی یہ ہے۔ وہ زہر ہی کیا جو ہلاک نہ کرے۔

"دراصل ہمارا مقصد یہ تھا کہ وہ زہر ہلاک تو کرے مگر آہستہ آہستہ!" میری زبان پر اصل بات آ گئی۔

"ایسا بھی ممکن ہے مگر اس کیلئے زہر میں کچھ دواؤں کی آمیزش کرنی پڑے گی۔ پھر یہ بھی کہ ایسی صورت میں کم از کم ایک ہفتے تک زہر کی ایک خاص مقدار دینی پڑے گی تاکہ وہ فوری ہلاکت کا سبب نہ بن سکے۔" طبیب نے وضاحت سے پوری بات کہی۔

طبیب کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ میں بول اٹھی۔ "جسے زہر دیا جائے گا اسے زہر دیئے جانے کا احساس کتنے دن کے بعد ہو گا؟"

"ایک ہفتے کے بعد" طبیب نے بتایا۔ "کیوں کہ زہر اپنی مطلوبہ مقدار میں جسم کے اندر پہنچ چکا ہو گا اس لئے یہ مدت گزرنے کے بعد ہی آٹھویں نویں روز سے زہر کے اثرات ظاہر ہونے لگیں گے۔ مثلاً یہ کہ اس شخص کو غیر معمولی حدت اور گرمی کا احساس ہونے لگے گا پھر یہ حدت ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی اور ناقابل برداشت ہونے لگے گی۔ ممکن ہے کہ زہر کے اثر سے ایسے شخص کا گوشت رفتہ رفتہ گلنا شروع ہو جائے۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے حضور کہ کوئی شخص اس کرب ناک موت سے گزرے۔ ایسے شخص کو موت سے ہمکنار ہونے کیلئے کم سے کم چالیس دن اذیت میں گزارنے پڑیں گے۔

طبیب سے یہ سن کر میں کھل اٹھی۔ یقیناً یہ میرا اصل مزاج نہیں تھا بلکہ میرے انسانی قالب کی فطری صفات مجھ پر غالب آ گئی تھیں۔ انہی صفات کے سبب میں سفاکانہ انداز میں

مسکرانے لگی۔ طبیب مجھے یوں مسکراتے دیکھ کر حیران نظر آنے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد میں نے طبیب کو مخاطب کیا۔ ''تو پھر مجھے ایسا زہر فراہم کردو۔ قیمت کی فکر نہ کرنا۔ جتنی قیمت بتاؤ گے اس سے دگنی ادا کروں گی۔''

میں نے طبیب کو چونکتے محسوس کیا تو اس کے ذہن پر توجہ دی وہ سوچ رہا تھا کہ میں اس سے زہر لے کر کسی کو عبرت ناک موت سے دوچار کروں گی۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ شاہی دربار سے منسلک ہونے کے باوجود اب تک اس کے دامن پر کوئی داغ نہیں تھا۔ طبیب کی نگاہ میں کسی کو قتل کرنے سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں تھا۔ اگر وہ مجھے زہر فراہم کر دیتا تو گویا گناہ میں برابر کا شریک ہوتا۔ میرے لئے یہ بھی مشکل نہیں تھا کہ شاہی طبیب سے زبردستی اپنی بات منوا لیتی۔ اس کیلئے مجھے اپنی پراسرار قوتوں کو حرکت میں لانا پڑتا۔ میں خود بھی طب کا علم رکھتی تھی لیکن ایک تو میرے علم کا زیادہ تعلق جنات کی بیماریوں سے تھا' دوسرے میں نے آدم زادوں کی عام بیماریوں کا علاج کیا تھا غرض کہ میرے علم کا رخ مثبت سمت میں تھا۔ زہروں کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات نہیں تھی۔ میری نظریں ابھی تک سوالیہ انداز میں شاہی طبیب کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ لجاجت سے بولا۔ ''حضور مجھے اس پر مجبور نہ کریں۔ میں یہ خدمت انجام نہیں دے سکوں گا' معذرت خواہ ہوں۔''

''آخر کیوں؟'' میری پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

''حضور! کے خادم کو یہ منظور نہیں کہ روز حشر کوئی اس کا دامن گیر ہو۔ خادم اس عظیم گناہ میں حصے دار نہیں بن سکتا۔'' طبیب نے جواب دیا۔ پھر میں نے لاکھ کوشش کر لی مگر شاہی طبیب میرے ورغلانے میں نہ آیا۔ اس سلسلے میں بھی میں اپنی جناتی صفات استعمال کرنا نہیں چاہتی تھی ورنہ طبیب انکار نہ کرتا۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ طبیب کہیں یہ راز فاش نہ کر دے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے پینترا بدلا اور ہنس کر کہنے لگی۔ ''ہمیں ہرگز ایسا زہر مطلوب نہیں۔ ہم تو یہ دیکھ رہے تھے کہ تم کتنے دین دار ہو۔ تم جا سکتے ہو۔''

''خادم...... خادم کا بھی یہی خیال تھا۔'' طبیب خجالت آمیز لہجے میں بولا۔ ''بھلا حضور کو ایسے زہر کی کیا ضرورت ہے۔'' اس کے لہجے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ حقیقت جان چکا ہے۔ موقع غنیمت جان کر وہ میری خدمت میں تعظیم بجا لایا اور رخصت ہو گیا۔

دربار سے اور بھی طبیب وابستہ تھے۔ آخر ایک لالچی طبیب میری باتوں میں آ ہی گیا۔ اس نے مجھے مطلوبہ زہر فراہم کر دیا۔ اس زہر کو صرف ایک بوند روز کھانے میں ملایا جاتا تھا۔ میں نے اس طبیب سے ایک اور زہر بھی طلب کیا جو فوراً اثر انداز ہو سکے۔ پردہ پوشی کی

خاطر میں ایک اور فیصلہ کر چکی تھی۔ میں نے اسی روز شاہی طبیب کو دعوت پر بلا لیا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ پہلے بھی میں طبیب کو کئی بار مدعو کر چکی تھی۔ طبیب کی دوائیں میں اب بھی باقاعدگی سے استعمال کر رہی تھی۔

اس دعوت کیلئے میں نے اپنے خدمت گاروں کو خاص ہدایات دی تھیں۔ دستر خوان بچھ گیا تو خدمت گاروں نے ہمارے سامنے کھانا چن دیا۔ ایک طشتری خاص طور پر طبیب کے سامنے رکھی گئی جس میں کسی قسم کا حلوہ تھا۔

''یہ حلوہ ہم نے بطور خاص تمہارے لئے اپنے ہاتھ سے تیار کیا ہے۔'' میں نے طبیب سے کہا۔ ''کھانے کے بعد اسی سے منہ میٹھا کرنا۔''

شاہی طبیب شکر گزاری کے اظہار میں جھک گیا اور بولا۔ ''حضور نے خادم کی عزت بڑھا دی۔'' کھانے کے بعد طبیب نے حلوہ کھانے کیلئے پلیٹ اپنی طرف بڑھائی۔

حلوے کا پہلا لقمہ کھا کر ہی اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''حضور نے یہ بہت برا کیا ہے۔ میں تو خیر اب نہ بچ سکوں گا کہ حضور نے مجھے جو زہر دیا ہے اس کا تریاق نہیں' مگر حضور بھی نہ جی سکیں گی۔''

میں چونک اٹھی اور فوراً سوال کیا۔ ''وہ کیسے؟''

''یہ خادم حضور کو جو مقوی دوائیں استعمال کراتا رہا ہے' ان کا توڑ بھی کرتا رہا ہے کہ حضور کا جسم ان تیز دواؤں کی گرمی برداشت کر لے۔ یہ دوائیں اتنی مقدار میں حضور کے جسم کا حصہ بن چکی ہیں کہ اب اس خادم کے سوا کوئی طبیب ان کی حدت پر قابو نہیں پا سکتا۔ حضور کی نبض دیکھ کر مطلوبہ مقدار میں ضروری دوائیں دی جاتی ہیں۔ خادم کے خاندان میں یہ نسخے سینہ بہ سینہ چلے آ رہے تھے کسی کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی۔ چند ہی روز میں حضور کو خادم کی باتوں پر یقین آ جائے گا۔'' شاہی طبیب یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھہرو۔'' میں نے طبیب کو روکا۔

''اب کوئی فائدہ نہیں حضور!'' اگر خادم وہ نسخہ بتا بھی دے تو لاحاصل ہے۔'' طبیب بولا۔

''وہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''حضور کی نبض دیکھ کر ہر مرتبہ نسخے میں ردوبدل کی ضرورت پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میرے بعد کوئی اور طبیب یہ ردوبدل نہیں کر سکتا۔ مجھے جانے دیں تاکہ میں اپنے گھر جا کر مروں اور مرنے سے پہلے اپنے بیوی بچوں کو وصیت کر جاؤں کہ وقت بہت کم ہے۔ میں گھڑی

دو گھڑی سے زیادہ نہ جی سکوں گا۔"

طبیب کے لہجے سے مجھے گمان ہوا کہ اس نے محض مجھ کو خوف میں مبتلا کرنے کی خاطر یہ بات کی ہے۔ یہی سوچ کر میں نے اسے جانے دیا کہ اگر اس کی بات سچ ہوئی تو میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا' اپنا انسانی قالب چھوڑ دوں۔

اسی روز سے حویلی کے مطبخ کا نگراں میری ہدایت پر زہرہ خانم کے کھانے میں زہر کی خاص مقدار ملانے لگا۔ یہ زہر میں نے ہی اسے دیا تھا مگر بتایا نہیں تھا کہ زہر ہے۔ اس رات کے گزرنے کے بعد دوسرے ہی روز صبح مجھے شاہی طبیب کے انتقال کی خبر مل چکی تھی۔

ہفتے بھر کی دوائیں میرے پاس تھیں۔ میں انہیں پابندی سے روزانہ استعمال کرتی رہی۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر جسم میں کوئی غیر معمولی حدت محسوس ہوئی یا کمزوری پائی تو دوسرے طبیب سے رجوع کرلوں گی۔

شاہی طبیب کی دی ہوئی دوائیں ختم ہوئے دوسرا دن تھا کہ مجھے اپنی طبیعت کچھ گری گری سی محسوس ہوئی۔ جسم میں ایک آگ سی لگی تھی۔ میں نے فوراً ایک طبیب کو بلا بھیجا۔ طبیب نے میرا تفصیلی معائنہ کیا اور حیران ہو کر بولا۔ "خادم کو سخت حیرت ہے کہ حضور اب تک زندہ کیسے ہیں؟" مجھے طبیب پر غصہ آ گیا اور طیش میں بولی۔ "تو تمہارے خیال میں کیا ہمیں مر جانا چاہیے تھا؟"

طبیب نے خلاف توقع اقرار میں سر ہلایا اور کہا۔ "جی ہاں حضور! خادم نے آج تک اتنی مقدار میں سنکھیا کھا لینے کے بعد کسی کو زندہ نہیں دیکھا۔"

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ تم میرا علاج نہیں کر سکتے۔"

"خادم واقعی مجبور ہے۔" طبیب کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ "خادم کے حساب سے حضور بہت جی لیں تو دو تین ہفتے جی سکیں گی' وہ بھی بڑی اذیتیں برداشت کر کے۔ عین ممکن ہے میرے منہ میں خاک حضور کا جسم حدت کے سبب گلنا شروع ہو جائے۔"

طبیب کی زبان سے ایسی صاف اور کھری بات سن کر مجھے پہلی مرتبہ یہ خوف محسوس ہوا کہ اب زیادہ عرصے اس انسانی قالب میں رہنا میرے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ اب مجھے یقین آ گیا کہ شاہی طبیب نے غلط نہیں کہا تھا۔ اسے زہر دے کر مجھ سے ایسی ہولناک غلطی ہو چکی تھی جس کا ازالہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس کے باوجود اسی دن میں نے کئی مشہور اور تجربے کار طبیبوں سے اپنا معائنہ کرایا اور مجھے مایوسی ہوئی۔

اسی رات کو میں نے عارج سے مشورہ کیا اور بولی۔ "اے عارج! اب تو ہی میری

آخری امید ہے۔ آدم زاد طبیبوں کے پاس تو میرا کوئی علاج نہیں تو میرے انسانی پیکر کا معائنہ کر کے دیکھ۔"

عارج فوراً اس پر راضی ہو گیا۔ وہ خود بھی ایک اچھا طبیب تھا۔ جن زاد ہانہ بن ہیم کے اس شاگرد نے بھی میرا تفصیلی معائنہ کر کے یہی کہا۔ "اے دینار! تیرا انسانی قالب سخت بیمار ہے اور تجھے یہ قالب چھوڑنا ہی پڑے گا۔"

"تو کیا میں زہرہ خانم کو اپنی آنکھوں سے سسک سسک کر مرتے ہوئے نہ دیکھ سکوں گی؟ کیا میں اس سے پہلے مر جاؤں گی؟"

"تو یہ بھول رہی ہے اے دینار! کہ زہرہ خانم سے تیری نہیں' تیرے انسانی پیکر کی دشمنی ہے۔" عارج نے مجھے سمجھایا۔

"معلوم ہے۔" میری آواز میں بے بسی تھی۔ "ابھی تو حمید خاں بھی زندہ ہے۔" دوسرا جملہ ادا کرتے ہوئے میری آواز بہت دھیمی ہو گئی۔

"کیا کہا اے دینار؟" عارج نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے عارج کی بات کا جواب دے کر مزید کہا۔ "تو بھی جانتا ہے اے عارج کہ میں دونوں بہن بھائی کے قتل کا سامان کر چکی ہوں مگر ابھی دونوں ہی زندہ ہیں..... جو ہو سو ہو' میں پہلے اپنے ایک دشمن کو تو خود اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار دوں۔"

دوسرے ہی دن صبح سے میرے حکم پر شاہی ڈھنڈورچی برہان پور کے گلی کوچوں میں یہ ڈھنڈورا پیٹتے پھر رہے تھے کہ آج بعد نماز ظہر قلعے کے صدر دروازے پر سردار حمید خاں حبشی کا سر قلم کیا جائے گا جو شخص بھی یہ عبرت انگیز نظارہ دیکھنا چاہے مقررہ وقت اور جگہ پر پہنچ جائے۔ میرے ہی ایما پر اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ سردار حمید خاں حبشی کا سر قلم کرنے والی عذرا ہوگی۔

قلعے کے سامنے جو میدان تھا اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ پورا شہر جیسے وہاں امنڈ آیا تھا۔ اعلان سنتے ہی لوگ وہاں جمع ہونے لگے تھے۔ دروازے کے سامنے ذرا فاصلے پر ایک چبوترا تھا۔ اس چبوترے پر حمید خاں پابہ زنجیر کھڑا تھا۔ سامنے ہی لکڑی کا موٹا سا ایک تختہ رکھا تھا جس میں گردن رکھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ حمید خاں کے سپاہی ادھر ادھر برہنہ شمشیریں لئے کھڑے تھے۔ پھر جب لوگوں نے مجھے چہرے پر نقاب ڈالے قلعے کے دروازے سے نکلتے دیکھا تو ان میں ہیجان پیدا ہو گیا۔

سپاہی میرے لئے راستہ بنانے لگے۔ میرے ساتھ شاہی جلاد بھی تھا۔ جسے لوگ

پہچانتے تھے۔ انہیں شک گزرا کہ کہیں میرے بجائے وہ جلاد حمید خاں کا سر قلم نہ کرے۔ عام لوگوں کو یہ علم نہیں تھا کہ جلاد کا کام صرف سر قلم کرنا ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے کی تیاریوں کو بھی دیکھنا ہے۔

شاہی جلاد میرے ساتھ ساتھ چبوترے پر چڑھ آیا۔

حمید خاں کی گردن میں اب طوق نہیں تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ مجھے کیوں کہ حمید خاں سے بات کر کے اس کے سینے میں آخری خنجر اتارنا تھا اس لئے شاہی جلاد اور سپاہیوں سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑے ہونے کو کہا۔ میں انہیں حکم دے کر آگے بڑھی۔ مجھے قریب آتے دیکھ کر حمید خاں کی متوقع نظریں میری طرف اٹھیں۔

''مجھے معلوم ہو گیا کہ کس جرم میں تمہاری گردن ماری جانے والی ہے لیکن اب کچھ بتانے سے کیا فائدہ؟'' حمید خاں کے بالکل قریب پہنچ کر میں نے کہا۔

موت کے خوف سے حمید خاں کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور ہونٹ خشک تھے۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بہ مشکل التجا آمیز لہجے میں بولا۔ ''نہیں' مجھے بتا دو...... خدا کیلئے بتا دو ورنہ میری روح کو مر کے بھی چین نصیب نہیں ہو گا۔'' یہ کہتے ہی اس نے پانی مانگا۔

ایک سپاہی نے اسے پانی دیا۔ سپاہی تجربے کار تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ قتل کئے جانے والا شخص آخری دم تک پانی مانگتا ہے۔ انہوں نے اسی لئے پہلے ہی پانی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ پانی پلا کے سپاہی دوبارہ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت میں نے دھیمی آواز میں حمید خاں کو مخاطب کیا۔ ''زنداں میں تم نے مجھ سے ایک بے گناہ نوجوان ہاشم کا ذکر کیا تھا' اسی بے گناہ کو ناحق قتل کرانے پر تمہارا سر قلم کیا جا رہا ہے۔ وہ جعلی خط تھا جو تمہاری بہن زہرہ نے بطور ثبوت تمہیں دکھایا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ زہرہ کو ہاشم نے قبول نہیں کیا تھا اس لئے ہاشم کے خلاف یہ سازش کی تھی۔ تم کیوں کہ اس سازش کے آلۂ کار تھے اور تمہارے ہی حکم پر ہاشم کو قتل کیا گیا۔ سو تم بھی میرے انتقام کا نشانہ بنے۔''

حمید خاں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''انتقام...... تم...... مگر......''

میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہاشم کا انتقام میں کیوں لے رہی ہوں...... تو سنو کہ ہاشم نے تمہاری مغرور بہن زہرہ کو اس لئے قبول نہیں کیا تھا کہ اس کے دل میں میری محبت تھی۔ وہ میرا محبوب تھا۔''

حمید خاں چند لمحے کچھ نہ بول سکا۔ اس کے ہونٹ پھر خشک ہو گئے۔ ذرا دیر بعد وہ

اٹک اٹک کر بولا۔ ''مگر تم...... تم نے...... حضور نظام الملک کو میرے قتل پر کیسے راضی کر لیا......؟ ہاشم کے واقعہ کا تو کوئی...... کوئی ثبوت نہیں کہ...... کہ اسے بے گناہ قتل کیا گیا تھا۔''

میں اس پر مسکرائی اور کہا۔ ''تمہاری بہن زہرہ نے جس طرح تمہیں ہاشم کے قتل پر آمادہ کر لیا تھا اسی طرح نظام الملک کو......''

حمید خاں نے مضطرب آواز میں میری بات کاٹ دی۔ ''تو...... تو کیا مجھ پر بھی وہی الزام لگایا گیا ہے؟''

میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''بظاہر تو یہی ہے' مگر تمہارے قتل کی اصل وجہ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔''

حمید خاں کو جانے ایک دم کیا سوجھی کہ وہ زور زور سے چیخ کر کہنے لگا۔ ''لوگو! نظام الملک کو خبر کرو کہ میں غدار نہیں ہوں۔ میں عادل شاہ کا جاسوس نہیں۔ وہ خط جعلی ہے جو انہیں دکھایا گیا ہے۔ مجھے یہ مکار اور عیار عورت فریب دے کر قتل کرا رہی ہے۔ میں بے گناہ ہوں...... بے گناہ ہوں۔'' حمید خاں چیختا رہا۔

میرے اشارے پر سپاہیوں نے اسے گھسیٹ کے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اسے گھٹنوں کے بل بٹھا کر اس کی گردن تختے پر رکھ دی گئی۔ وہ بار بار گردن اٹھا کر چیخنے لگا تو شاہی جلاد کے کہنے پر ایک سپاہی نے اس کے سر کے بڑے بڑے بال سامنے سے پکڑ کر نیچے کی طرف کھینچ لئے۔ سپاہی کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اب حمید خاں سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس کی گدی صاف نظر آ رہی تھی۔

شاہی جلاد نے اپنی نیام سے ایک آب دار تلوار نکال کر مجھے پیش کی۔ میں آگے بڑھی اور جھک کر آہستہ سے بولی۔ ''حمید خاں! میں اپنے محبوب ہاشم کو بے گناہ قتل کرانے کے جرم میں تیرا سر قلم کر رہی ہوں۔ میں' ہاشم کے خون کا قصاص لے رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہی میں پیچھے ہٹی اور حمید خاں کی گردن پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ حمید خاں کا سر کٹ کر تختے کے دوسری طرف جا پڑا اور گردن سے خون کا فوارہ ابلنے لگا۔

سردار حمید خاں حبشی کے قتل کے پورا ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں مجھے زہرہ خانم کے متعلق معلوم ہوا کہ زہر نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ زہرہ ہر وقت ''آگ آگ'' چلاتی رہتی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت اپنے جسم پر ٹھنڈا پانی ڈالتے ہوئے گزرتا تھا۔ میرے علم میں یہ بات بھی آ چکی تھی کہ زہرہ دکن کے مشہور و معروف طبیبوں سے اپنا معائنہ کرا چکی تھی۔

زہرہ تو خیر زہر کے زیر اثر رفتہ رفتہ موت کے قریب ہوتی ہی جا رہی تھی لیکن میری حالت بھی بہت ابتر تھی۔ میں شدید اذیت میں مبتلا تھی اور اب یوں لگتا تھا جیسے عذرا کے انسانی قالب کو اپنائے رکھنا شاید مزید ممکن نہیں ہوگا۔ مجھے موت کا خوف نہ تھا۔ اگر خواہش تھی تو صرف اس بات کی کہ میرے انسانی قالب کو زہرہ خانم سے پہلے موت نہ آئے۔

میرے انسانی قالب کی تمنا یہ تھی کہ ہاشم کے خون کا مکمل قصاص لینے تک زندہ رہے۔

آخر کار میرا انسانی قالب جیت گیا۔ جیسے ہی میں نے زہرہ خانم کے مرنے کی خبر سنی عذرا کے بیمار اور موت کے قریب جسم سے باہر آ گئی۔ اسی لمحے عذرا کا سر ایک طرف ڈھلک گیا اور آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ ہاشم کا قصاص مکمل ہو گیا تھا۔

ابھی میں حمید خاں کی حویلی ہی میں تھی کہ عارج نے مجھے مخاطب کیا۔ ''اے دینار! مجھے اس حویلی کے در و دیوار سے وحشت سی ہو رہی ہے۔ اب یہاں سے نکل چل! یہاں تو ہر طرف سے بین کرنے کی صدائیں آ رہی ہیں۔''

''تو نے ٹھیک کہا اے عارج! مگر ابھی ہمیں بغداد سے چلے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ بوڑھا عفریت وہوش وہاں ہماری تلاش میں ہوگا۔ ایسی صورت میں ہماری بغداد واپسی فی الحال مناسب نہیں۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''لیکن میں کب یہ کہتا ہوں کہ تو بغداد ہی واپس چل۔'' عارج نے کہا۔ ''ہم اس زمانے سے کسی اور زمانے بھی تو چل سکتے ہیں۔''

''تیرا مشورہ مجھے اس شرط پر قبول ہے کہ تو کسی آدم زاد کے جسم کو اپنانے میں جلدی نہیں کرے گا۔'' میں بولی۔ ''پہلے ہم کسی بھی زمانے میں جا کر حالات کا جائزہ لیں گے' پھر کسی انسانی قالب میں اترنے کا فیصلہ کریں گے۔''

''تیری شرط مجھے منظور ہے اے دینار!''

''اے عارج! ہندوستان کی یہ سرزمین تجھے بھی پسند ہے اور مجھے بھی۔ سو ہم اسی سرزمین پر کسی اور زمانے میں چلتے ہیں... مستقبل میں کچھ اور آگے چل کر دیکھتے ہیں۔'' میں یہ کہتی ہوئی عارج کے ساتھ اس حویلی سے نکل آئی۔

عارج کے ساتھ میں نے مستقبل کا سفر شروع کر دیا پھر ہم مغلیہ تاجدار اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں پہنچ گئے۔ اس عہد کے ایک سنسنی خیز منظر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ ان کے گھٹنوں کا دباؤ گھوڑوں کی پسلیوں پر تھا اس لئے گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ ہاتھوں میں وہ مشعلیں اٹھائے ہوئے تھے اور چہروں پر نقابیں تھیں۔ ان کی تعداد سو سے اوپر لگتی تھی اور وہ سبھی مسلح تھے۔ ان کا رخ اکبر آباد (آگرہ) سے متھرا کی طرف تھا۔ معاً اگلی صف سے ایک گھڑ سوار نے اپنی مشعل بلند کر کے مخصوص انداز میں اسے حرکت دی۔ اسی کے ساتھ ہی وہ سب رک گئے۔

یہی گھڑ سوار نوجوان ان کا رہنما معلوم ہوتا تھا۔ نوجوان نے ان سے کہا۔ ''راستے کے دونوں جانب پیڑوں کی آڑ لے کر کھڑے ہو جاؤ۔''

وہ نوجوان خود بھی ایک پیڑ کی آڑ میں ہو گیا۔ اب مشعلیں بجھا دی گئی تھیں۔ یوں بھی اب مشعلوں کی زیادہ ضرورت نہیں رہی تھی۔ صبح کا دھندلکا ہر طرف پھیلنے لگا تھا۔ نوجوان کی نگاہیں راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ وقت گزرنے پر کافی دور خفیف سی حرکت نظر آئی اور چراغ سے جلتے دکھائی دیئے۔

''ہوشیار!'' نوجوان نے صدا لگائی۔ اسی صدا کے ساتھ تلواریں نیاموں سے باہر آ گئیں۔

جھومتا جھامتا دیو پیکر ہیولا واضح ہو گیا۔ وہ ایک ہاتھی تھا اس کے ہودج پر پردے پڑے ہوئے تھے۔

میری توجہ نوجوان کے ذہن پر تھی۔ اسے میں نے خوش دیکھا۔ نوجوان کے خیال میں اسی ہودج کے اندر وہ اہم قیدی ہو سکتا تھا جس کی رہائی کا بیڑا اس نے اٹھایا تھا۔ اس ہاتھی پر فیل بان آنکس سنبھالے بیٹھا تھا۔ ہاتھی کے اطراف گھڑ سوار سپاہیوں کا ایک دستہ چوکنا چل رہا تھا۔

آگے آگے چلنے والے دونوں گھڑ سواروں کو نوجوان نے پہچان لیا۔ وہ دونوں ہی بادشاہ وقت کے جنگ جو امیروں میں سے تھے۔ ذاتی طور پر وہ نوجوان ان کا مداح تھا مگر یہ وقت اظہار مداحی کا نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ دونوں شاہی امیر اپنے سپاہیوں سمیت نرغے میں آ گئے تو نوجوان چیخ اٹھا۔ ''بزن!'' پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

نوجوان کی آواز سنتے ہی راستے کے دونوں طرف گھات میں کھڑے ہوئے مسلح گھڑ سوار سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے سپاہیوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا مگر سپاہی بڑے آزمودہ کار تھے۔ وہ بھی تلواریں سونت کر مقابلے پر ڈٹ گئے۔ فیل بان نے ہاتھی کو روک دیا اور تلوار نکال لی۔ وہ کبھی سہمی ہوئی نظروں سے ہودج کی طرف دیکھتا اور کبھی ہاتھی کے اطراف

ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ کر وار کرنے والوں پر اس کی نظر جاتی۔ اس کے چہرے پر حیرت کی وجہ شاید نقاب پوش حملہ آور تھے۔ غالباً اس کے خیال میں حملہ آوروں کو نقابوں کی ضرورت نہیں تھی۔

تلواروں سے تلواریں ٹکراتی رہیں، گھوڑے ہنہناتے رہے۔ خنجر سینوں میں اترتے رہے اور چیخیں بلند ہوتی رہیں۔ دونوں فریقوں میں سے کوئی بھی میدان چھوڑنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ سپاہیوں کی تعداد کم تھی، مگر وہ مغل سپاہی تھے جنہیں اپنی تعداد نہیں عزت کا خیال رہتا تھا۔ ان میں کم ہی ایسے ہوتے تھے کہ جی چھوڑ بیٹھیں۔ اس کے باوجود انجام ظاہر تھا کہ وہ کھیت کر دیئے جاتے۔ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچتا کہ ان کے حریف بھی داؤ گھات میں کم نہ تھے۔

نوجوان کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ دونوں شاہی امیروں کو بڑھ چڑھ کر حملے کرنے سے روکنا بہت ضروری ہے۔ وہ دونوں ہی بڑی جی داری سے لڑ رہے تھے۔ سپاہیوں کے حوصلے انہی دونوں کی وجہ سے بڑھے ہوئے تھے۔ نوجوان اپنے چند ساتھیوں کو لے کر ان دونوں کی طرف جھپٹا۔ دونوں ساتھ ساتھ برسرِ پیکار تھے۔ ان کے مقابل جو بھی آتا جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ تیزی سے اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا نوجوان ان دونوں کے سامنے پہنچ گیا۔ اس کے ساتھی پیچھے رہ گئے۔

وہ دونوں پہلے ہی سمجھے ہوں گے کہ ایک نیا شکار اور آیا مگر جب نوجوان کی تلوار بجلی کی طرح کوندی تو وہ سنبھل گئے۔ نوجوان کوئی عام شمشیر زن نہ لگتا تھا۔ اس کے بدن میں بڑا لوچ اور تلوار میں بڑی کاٹ تھی۔ نوجوان نے بیک وقت ان دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ بہرحال یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اتنے میں نوجوان کے ساتھی بھی آ گئے۔

اب ان دونوں شاہی امیروں کے مقابل پانچ افراد تھے۔ ان میں وہ نوجوان بھی شامل تھا جس نے آتے ہی انہیں الجھا لیا تھا۔ نوجوان کا پلہ بھاری ہو گیا۔ دونوں امیروں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ان کے گھوڑوں کی زینیں خالی ہو جاتی۔ وہ قتل کر دیئے جاتے۔ انہیں پیچھے ہٹتے ہی مہلت مل گئی۔ وہ تلواریں علم کیے نوجوان اور اس کے ساتھیوں کی طرف لپکے۔ اب انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بات یوں نہیں بنے گی۔ انہیں جان پر کھیلنا پڑے گا۔ نوجوان نے ان کے تیور بھانپ لئے۔ نوجوان کے ساتھ ہی میری توجہ شاہی امیروں کے ذہنوں پر بھی تھی۔ نوجوان یہ نہیں چاہتا تھا کہ شاہی امیر مارے جائیں۔ شاید اسی لئے نوجوان نے ان کا حملہ تو روک لیا مگر موقع دانستہ نظر انداز کر دیا۔ جب فیصلہ کن لمحہ آ سکتا تھا۔

امیروں نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ ان کے ساتھ رعایت کی گئی ہے۔

فیل بان کے بوڑھے چہرے پر اب گھبراہٹ کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ ہاتھی کے گرد سپاہیوں کی تعداد کم تھی۔

ابھی معرکہ جاری ہی تھا کہ فیل بان کی نگاہ شاہی امیروں پر پڑی۔ وہ دونوں لڑتے لڑتے ہاتھی کے بہت قریب آ گئے تھے۔ چار گھڑ سواروں نے انہیں جیسے نرغے میں لے رکھا تھا۔ فیل بان کو خبر نہ تھی کہ امیروں پر ہلا بولنے والے پانچ تھے جن میں سے ایک مارا گیا تھا۔ فیل بان کے اوسان خطا ہونے لگے۔ پھر اس کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

دونوں امیروں نے لڑتے لڑتے چیخ کر سپاہیوں کو پسپائی کا حکم دیا اور پھر خود بھی اپنے گھوڑوں کی راسیں چھوڑ کر کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح نرغے سے نکل گئے۔ فیل بان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ سپاہی لڑتے ہوئے جان بچا کر بھاگنے لگے۔ نوجوان نے اپنے ساتھیوں کو ان کے تعاقب میں جانے سے روک دیا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا ہاتھی کے قریب پہنچ گیا۔

فیل بان نے جو یہ رنگ دیکھا تو ہاتھی کو اسی طرف موڑنے لگا جدھر سے آیا تھا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے اس پر تیر چلایا جو گدی میں پیوست ہو کر آر پار ہو گیا اور وہ ہاتھی سے نیچے آ رہا۔

پھر ہاتھی کو قابو کر کے بٹھانے میں دیر نہ لگی۔ نوجوان اپنے گھوڑے سے اتر کر ہاتھی پر چڑھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود تلوار تھی۔ تلوار ہی کی نوک سے اس نے عماری کا پردہ اٹھایا تو دنگ رہ گیا۔ اس میں کوئی نہ تھا۔

ادھر عارج بول اٹھا۔ ''اے دینار! آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔''

''سمجھی تو میں بھی نہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیا لیکن یہ عقدہ حل کرنا ہی ہو گا۔''

''اس کا ایک ذریعہ نوجوان بھی بن سکتا ہے اے دینار!'' عارج بولا۔ ''اگر تیری صلاح ہو تو میں اس کے جسم میں اتر جاؤں۔''

''ذرا ٹھہر جا پہلے میں اس نوجوان کے بارے میں معلوم تو کر لوں کہ یہ کون ہے؟'' میں نے کہا اور پھر اس نوجوان کے ذہن پر توجہ مرکوز کر دی۔

پھر جب مجھے اس نوجوان کے متعلق سب کچھ معلوم ہو گیا تو میں نے عارج کو اس کا

قالب اپنانے کی اجازت دے دی۔ میں اس نوجوان کا ذہن پڑھ کر خود اپنے لئے بھی ایک انسانی پیکر کا انتخاب کر چکی تھی۔ عارج اس نوجوان کے جسم میں اتر گیا۔

''ہمیں سخت حیرت ہے کہ عماری خالی تھی حالانکہ آپ نے حتمی طور پر......''

''قطع کلامی کیلئے معذرت! غلام نے بہ گوش ہوش جو کچھ سنا وہی عرض کیا تھا۔ اس وقت یہ غلام عالی مرتبت شہزادے کے حضور میں تھا۔ جب قاصد شاہی پیغام لے کر آیا۔ شہزادے کے حکم پر غلام ہی نے وہ پیغام پڑھا تھا۔ خبر یہی تھی کہ انہیں قلعہ اکبر آباد ہی میں نظر بند رکھا جائے گا۔ اس میں کیا امر مانع آیا اور کیا واقعہ گزرا غلام آج شام تک اس کی وضاحت کر دے گا۔ شاہجہاں آباد (دہلی) سے غلام کے ہرکارے اب تک رخت سفر باندھ چکے ہوں گے۔''

''آج شام ہم باغ نور کی سیر کو نکلیں گے۔ بہار آپ کو ہمارے نظام الاوقات سے مطلع کر دے گی۔ فی الحال ہم رخصت چاہیں گے۔ ہمیں اپنے محل میں پہنچنا ہے۔ خبر ہے کہ آج برادر بزرگ شہزادہ سلطان محمد محلات شاہی کا معائنہ فرمائیں گے۔ ان کے ہمراہ پھوپی جان نواب بادشاہ بیگم بھی ہوں گی۔''

''غلام دیدار حضور کی خاطر باغ نور میں حاضر ہو جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے نوجوان اس سراپا ناز کے حضور میں کسی قدر جھک گیا۔ وہ مڑی اور نوجوان کے دل پر بجلیاں گراتی ہوئی محرابی دروازے کا پردہ اٹھا کر باہر آ گئی۔ محافظ دستے کی کنیزیں اسے دیکھ کر مودب ہو گئیں۔ تمکنت و ناز سے چلتی ہوئی وہ برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچی۔ وہاں کنیز اس کے مشکی گھوڑے کی لگام تھامے کھڑی تھی۔ کنیز نے اسے سہارا دے کر گھوڑے پر چڑھایا۔ اس دوران میں محافظ دستے کی کنیزیں اپنے اپنے گھوڑوں پر تن کر بیٹھ گئی تھیں۔ ان مسلح کنیزوں کے جسموں پر مخصوص وردیاں تھیں۔ ایسی وردیاں پہننے کی اجازت قلعے میں کسی کو نہ تھی۔ شہزادی آسائش بانو کے محافظ دستے کی کنیزیں ہی ایسی وردیاں زیب تن کر سکتی تھیں۔

گھوڑے پر بیٹھ کر اسے ایڑ لگانے سے پہلے شہزادی نے نوجوان کی طرف نگاہ کی جو محرابی دروازے سے نکل کر اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شہزادی کا دل اس کے پہلو میں تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے نوجوان کی طرف سے نظر ہٹا کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

یہی وہ لمحہ تھا جب میں شہزادی آسائش بانو کے جسم میں داخل ہو گئی۔ میں اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر چکی تھی۔ مسلح کنیزوں کے جھرمٹ میں میری سواری آگے بڑھ گئی۔ مگر نوجوان وہیں کھڑا رہا۔ اسی راستے پر نگاہیں جمائے جہاں سے سواری گزری تھی۔

یہ وہی نوجوان تھا جس کے چہرے پر گزشتہ شب نقاب تھی۔ ایرانی ہونے کے باوجود اس کے خدوخال یونانیوں جیسے تھے۔ اس کا قد بھی دراز تھا اور وہ اپنی جسامت کے سبب اصل عمر سے زیادہ لگتا تھا۔ اس کے چہرے سے بھول پن ٹپکتا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اندر سے وہ سخت گیر اور تند خو ہو گا۔ اب اس کے جسم پر عارج کا قبضہ تھا۔

وہ نوجوان جب ایران سے اپنی جان بچا کر ہندوستان بھاگ آیا تو مغل تاجدار شاہجہاں نے اس کی پذیرائی کی۔ شاہجہاں نے اسے ہزاری دو سو سوار کا منصب عطا کیا۔ اس کا تعلق ایران کے شاہی خاندان سے تھا۔ وہ اپنے باپ خواجہ ظاہر نقش بندی سے اجازت لئے بغیر ایران سے چلا آیا تھا۔ وہ یہ قدم نہ اٹھاتا تو بغاوت میں دھر لیا جاتا۔ اس الزام میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ ایران کا شاہ عباس اس کا خالہ زاد تھا۔ اس نے اپنے خلاف کسی کو سر اٹھانے کی مہلت نہ دی۔ پھر محمد صالح کو وہ کیسے معاف کر دیتا۔ نوجوان کا نام محمد صالح تھا۔ بچپن ہی سے وہ دلیر اور ذہین تھا۔ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اسی کی بنا پر حسن پرستی اس کے مزاج کا حصہ بن گئی۔ وہ خود بھی کم وجیہہ اور ایسا نہ تھا کہ دلبران خوش اندام اسے نظر انداز کر دیتیں۔ وہ حسینان ایران کی آنکھ کا تارا بن گیا مگر اسی کے ساتھ اس نے رموز مملکت سے آگاہی حاصل کرنا بھی ضروری سمجھا۔ اس پاداش میں اسے اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑا۔

ہندوستان آئے ہوئے اسے صرف پانچ سال ہوئے تھے اور یہ پانچ سال اس نے میدان جنگ میں گزارے تھے۔ شاہجہاں نے اسے منصب دے کر دکن بھیج دیا تھا جہاں اس کا بیٹا اورنگزیب اپنی تلوار کے جوہر دکھا رہا تھا۔

بہادر اور شجاع صالح اپنی جواں مردی اور بہادری کی وجہ سے اورنگزیب کی نظروں میں چڑھ گیا۔ صالح اور اس کا لشکر جاں بازی میں مشہور ہو گیا۔ دربار سے اسے جاگیریں اور نقد انعام عطا ہوئے۔ اس نے دکن کی خوں ریز لڑائیوں میں داد شجاعت دی اور صلہ پایا۔ شاہجہاں کے عہد میں کوئی امیر' شہزادوں کے سوا ہفت ہزاری منصب سے زیادہ نہ پاتا۔ پورے ہندوستان میں صرف چودہ امیر چار ہزاری منصب پر فائز تھے۔ مناصب کا حصول اور ان میں اضافہ آسان نہیں تھا مگر صالح نے صرف پانچ سال کے عرصے میں ایک ہزاری منصب سے سہ ہزاری منصب تک کا سفر طے کر لیا۔ اب اس کا منصب سہ ہزاری دو سو سوار تھا۔ خوفناک معرکوں میں سردھڑ کی بازی لگا کر اس نے اورنگزیب جیسے شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا جو خود بھی تلوار کا دھنی تھا۔

اورنگ زیب کی صحبت میں رہ کر صالح نے بہت کچھ دیکھا۔ بہت کچھ سیکھا۔

ہندوستان کی بساطِ سیاست کا اس نے گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اورنگ زیب اس کا مثالیہ تھا' اسے گمان تھا کہ اس نے اورنگ زیب کو سمجھ لیا ہے مگر یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ خاص طور پر مراد بخش کے باب میں اورنگ زیب کی حکمت عملی سے اسے ذہنی جھٹکا لگا تھا۔ اس ذہنی جھٹکے کا سبب کلام اللہ تھا جسے اورنگ زیب اور مراد بخش نے اپنے عہد و پیماں کے بیچ گواہ ٹھہرایا تھا۔

مراد بخش کو اورنگ زیب نے خط لکھا۔ اس کی عبارت جیسے صالح کے ذہن پر نقش تھی۔ عبارت یہ تھی۔ ''مجھے اس دنیائے غدار کے معاملات سے کوئی وابستگی نہیں ہے۔ میرے پیش نظر تو صرف بیت اللہ کا طواف ہے۔ اس برادر بے شکوہ (داراشکوہ) کی زیادتیوں اور بے انصافیوں کے نتیجے میں دوسرے بھائی جو کچھ سوچ رہے ہیں اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ بالکل حق بجانب اور بجا ہے۔ مجھے بھی اپنا شریک کار اور مددگار سمجھا جائے مگر چونکہ والد بزرگوار بھی بہ قید حیات ہیں اس لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ دونوں بھائی والد محترم سے اس بے دین کی خیرہ سری کا تدارک کریں۔ جو بادہ غرور اور نخوت و خود آرائی میں مست ہو رہا ہے۔ اگر تقدیر یاوری کرے تو حضرت والی نعمت (شاہجہاں) کا دیدار کر لیں اور فتنہ فساد کا قلع قمع کر کے اس بھائی (مراد) کے قصور کی معافی طلب کر لیں جو حالت اضطرار میں سرزد ہو گیا ہے (یعنی بادشاہت کا اعلان) سلطنت کا نظم و نسق درست کرنے اور مخالفین کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد حضور والا سے کعبتہ اللہ کی اجازت حاصل کر لوں گا لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ جائز ارادے میں تاخیر نہ ہو اور (تم) ایک منظم فوج لے کر اس بے ادب کافر جسونت سنگھ کی تادیب کیلئے کوچ کرو اور سمجھ لو کہ ہم بھی دریائے نربدا کے اس کنارے تک پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے ساتھ جولا ؤلشکر اور توپ خانہ ہے اسے تم اپنی فتح یابی کا وسیلہ سمجھو۔ ایک خیر خواہ کے عہدہ پیمان کے لئے کلام اللہ کا ضامن جان کر کسی وسوسے کو دل میں جگہ نہ دو۔''

اورنگ زیب نے اس مضمون کا عہد نامہ روانہ کر کے توپ خانے کا اہتمام اور فوجوں کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے مراد بخش کی طرح سکہ اور خطبہ اپنے نام جاری کرنے پر کوئی توجہ نہ کی۔ صالح کا ذہن پڑھ کر میں اس عہد کے تمام واقعات سے آگاہ ہو چکی تھی۔

یہ 1027 ہجری کا واقعہ ہے۔ اورنگزیب دکن میں تھا۔ بڑا بھائی داراشکوہ شاہجہاں کے پاس اکبرآباد میں' ایک بھائی شجاع بنگال میں اور مراد بخش احمد آباد میں تھا۔ شجاع بنگال کا صوبے دار تھا اور مراد بخش احمد آباد کا۔ یہ دونوں اپنی اپنی خود مختاری اور بادشاہت کا اعلان کر چکے تھے۔ شاہجہاں نے داراشکوہ کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیا تھا۔

سارا فساد دراصل شاہجہاں کی علالت سے شروع ہوا۔ شاہجہاں حبس بول (پیشاب کا رک جانا) کے عارضے میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس نے کاروبار حکومت داراشکوہ کو سونپ دیا۔ تینوں بھائیوں میں سے کسی نے داراشکوہ کے اقتدار کو پسند نہ کیا۔ ان کے متعلق سرگرمیوں کی اطلاعات اکبرآباد پہنچیں تو داراشکوہ نے حفظ ماتقدم کے طور پر راجا جسونت سنگھ کو ایک بڑا لشکر دے کر دکن کی طرف بھیجا کہ وہ اورنگ زیب کو راستے ہی میں روک لے۔ ایسی ہی تدبیر اس نے شجاع اور مراد کے باب میں کی۔

اورنگ زیب کا محبت آمیز عہد نامہ پہنچتے ہی مراد بخش نے احمد آباد سے کوچ کیا۔ ادھر اورنگ زیب دکن سے چل چکا تھا۔ دونوں بھائیوں کی ملاقات دیپال پور میں ہوئی۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے اور ایک دوسرے کو ضیافت دی۔ پھر از سر نو عہد و پیماں ہوئے۔ دونوں لشکر آگے بڑھے اور اجین میں قلعہ دہار کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ راجا جسونت سنگھ کا لشکر وہاں سے صرف ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ دوسرے دن 22 رجب (1068 ہجری) کو دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔

داراشکوہ کا لشکر دو مغل شہزادوں اورنگزیب اور مراد بخش کے مقابلے پر نہ ٹک سکا۔ بڑی خون ریز لڑائی ہوئی۔ خود صالح نے بھی اس جنگ میں اپنی تلوار کا لوہا منوایا۔ وہ اورنگزیب کے ساتھ قلب لشکر میں تھا۔

راجا جسونت سنگھ کی شکست کے بعد سامر گڑھ کی فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ اورنگ زیب اور مراد بخش کے مقابلے پر اب بذات خود داراشکوہ تھا۔ اس جنگ کا سارا دباؤ مراد بخش کے لشکر پر پڑا۔ اورنگ زیب کی طرف سے پسپا ہو کر داراشکوہ نے مراد بخش کی طرف رخ کیا۔ دونوں فوجیں صف بہ صف دست بدست لڑنے لگیں۔

داراشکوہ کا پیش آہنگ ایک امیر خلیل اللہ تھا۔ اس نے ازبک کماں داروں کو ساتھ لے کر مراد بخش کے ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ دونوں اطراف سے تیر برسنے لگے۔ مراد بخش کے لشکر میں ایک قیامت سی برپا ہو گئی۔ بہت سوں کے قدم اکھڑ گئے۔ قریب ہی تھا کہ تیروں کی بوچھاڑ اور گرز وسناں کی ضرب سے مراد بخش کے ہاتھی کا منہ پھر جائے مراد بخش نے حکم دیا ہاتھی کے پیروں میں زنجیریں ڈال دی جائیں۔ اسی دوران میں ایک بہادر راجپوت راجا رام سنگھ آگے بڑھا۔ اس کے سر پر مرداریدکا سہرا تھا اور کیسریا بانا پہنے ہوئے تھا۔ وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ رجز پڑھتا ہوا مراد بخش کی سواری کے قریب پہنچ گیا اور چیخ کر کہا۔ ''تو داراشکوہ کے مقابلے پر بادشاہی کی ہوس کر رہا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک برچھی مراد بخش کی طرف پھینکی

اور مہاوت سے پٹ کر بولا۔ "ہاتھی کو بٹھا۔"

☆......☆......☆

مراد بخش نے اس کے حملے کو روکا اور پھر ایسا تیر جوڑ کر اس کی پیشانی پر مارا کہ وہ گھوڑے سے الٹ کر گر گیا، اس کے ہمراہ جو راجپوت تھے ان میں سے بیشتر مراد بخش کے ہاتھی کے پیروں تلے کچلے گئے، ہاتھی کے چاروں طرف زمین خون سے گلنار ہوگئی، اورنگزیب کو پل پل کی خبر ملتی رہی مگر وہ اپنی جگہ ڈٹا کھڑا رہا، اس نے مراد بخش کی مدد نہیں کی۔

اس جنگ میں داراشکوہ بالآخر شکست کھا گیا اور اسے راہ فرار اختیار کرنا پڑی، فاتح اورنگزیب اس کامیابی پر اپنے ہاتھی سے نیچے اتر آیا اور شکرانے کے دو نفل پڑھے، اس کے بعد وہ داراشکوہ کے خیمے کی طرف گیا، اس وقت تک خیمہ، توپ خانہ اور دوسرا ساز و سامان لوٹ لیا گیا تھا۔ اورنگزیب نے داراشکوہ کے خیمے ہی میں قیام کیا۔

شہزادوں اور امیروں نے نذرانے گزارے اور تحسین و آفریں سے معزز ہوئے، ان معززین میں صالح بھی تھا، پھر صالح نے جنگ میں شدید زخمی ہو جانے والے بھائی کا سر دوسرے بھائی کے زانو پر دیکھا۔ مراد بخش کے چہرے پر تیروں کے زخم تھے، اورنگزیب نے ماہر جراحوں کو طلب کیا اور مراد بخش کا سر اپنے زانوں پر رکھ کر مرہم لگوایا، اس نے آنسو بہاتے ہوئے اپنی آستین سے بھائی کے رخساروں کا خون صاف کیا۔

اورنگزیب نے اس عماری کا بھی معائنہ کیا جس میں مراد بخش سوار تھا، عماری میں اس کثرت سے تیر لگے تھے کہ اس کی سطح خار پشت کی مانند ہوگئی تھی اور اس کا تختہ نظر نہیں آتا تھا، اورنگزیب نے حکم دیا کہ اس عماری کو اکبر آباد کے قلعے میں بطور یادگار رکھا جائے گا۔

ساموگڑھ سے کوچ کرنے کے بعد اکبر آباد کے قریب چھاؤنی قائم ہوئی، اورنگزیب اس سے پہلے ہی شاہجہاں کو ایک خط لکھ چکا تھا، شاہجہاں کو پانسا پلٹنے کی خبر ہو چکی تھی، اس نے نامہ و پیام کے ذریعے اورنگزیب کو رام کرنا چاہا، مگر تلخی کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی گئی۔

اس دوران میں اپنے بیٹے کا دل جیتنے کیلئے شاہجہاں نے اسے "عالمگیر" نامی تلوار بھیجی۔ یہ تلوار شاہجہاں کی پسندیدہ تھی، دورِ شہزادگی سے اب تک شاہجہاں نے تلوار اپنی کمر سے باندھی تھی اور مختلف معرکوں میں اس کے جوہر دکھائے تھے۔ نکتہ سنجوں نے اسے نیک شگون قرار دیا اور اس مژدہ غیبی کی رعایت سے اورنگزیب کا لقب عالمگیر ہوا۔

تلخ و تند مراسلت کے نتیجے میں اورنگزیب نے اکبر آباد کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

اورنگ زیب نے اس قدر سختی کی کہ قلعے کا پانی بند کردیا۔ محصورین نے تنگ آ کر

اورنگزیب سے مراسلت شروع کردی، ان میں شاہجہاں کے وفادار امراء بھی شامل تھے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ اورنگزیب کیلئے قلعے کا دروازہ کھول دیں گے، آخر کئی دن بعد امراء کے پیغامات کی تصدیق ہونے پر اورنگزیب نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد سلطان کو حکم دیا کہ وہ قلعہ میں داخل ہو جائے اور قلعے کے دروازے پر معتمدوں کو مقرر کردے، شہزادہ محمد سلطان جوان تھا اور بوڑھے امیروں کی صحبت پسند نہ کرتا تھا اس نے اورنگزیب سے درخواست کی کہ صالح کو اس کے ساتھ کردیا جائے۔ اورنگزیب نے شہزادے کی درخواست قبول کرلی۔

یوں صالح جنگ کے تپتے ہوئے صحراؤں سے نکل کر دوبارہ زلفوں کی گھنی چھاؤں میں آ گیا۔

اورنگزیب کے حکم پر شاہجہاں کو نظر بند کردیا گیا اور اختیارات سلب کرلئے گئے۔

سہ ہزاری منصب دار اور اورنگزیب کے جاں نثار نوجوان امیر محمد صالح کے قیام کا بندوبست حدود قلعہ ہی کی ایک حویلی میں کیا گیا، صالح اب تک اسی حویلی میں تھا، قلعے میں آ جانے کے بعد بھی صالح غافل نہ تھا، اس کی نظر بدلتے ہوئے حالات پر تھی، اسے معلوم ہوگیا کہ مراد بخش اور اورنگزیب کے درمیان کیا طے پایا ہے! اورنگزیب نے مراد بخش سے وعدہ کیا کہ داراشکوہ سے مکمل طور پر نمٹنے کے بعد وہ تمام معاملات حکومت مراد بخش کو سونپ دے گا، اس نے داراشکوہ کے تعاقب کا فیصلہ کیا۔ داراشکوہ کے متعلق اطلاعات ملی تھیں کہ وہ لاہور پہنچ چکا ہے۔

شاہجہاں کے تیور دیکھ کر اورنگزیب نے اس سے ملاقات کا ارادہ ملتوی کردیا، اس نے داراشکوہ کے تعاقب میں جانے کیلئے ضروری اقدامات کئے، اپنی جگہ اس نے اپنے بیٹے شہزادہ اعظم کو باپ کے پاس بھیجا، محمد صالح اور دیگر چند امیروں کو شہزادہ محمد سلطان کے پاس چھوڑ کر اورنگزیب مراد بخش کے امراہ اکبر آباد سے نکل گیا۔

شاہجہاں آباد (دہلی) سے خبر آئی کہ اورنگزیب نے وہاں پہنچ کر مراد بخش کو 26 لاکھ روپے اور 230 گھوڑے تحفے کے طور پر دیئے ہیں، ان گھوڑوں پر طلائی اور میناکاری کے ساز تھے، اس کے بعد اطلاع ملی کہ اورنگزیب لاہور روانہ ہوگیا اور مراد بخش اب اپنا لشکر لے کر احمد آباد کی طرف جائے گا، کب؟ اس بارے میں کوئی خبر نہ تھی۔

گزشتہ روز ایک تیز رفتار قاصد شاہجہاں آباد کی طرف سے آیا تھا، یہ اورنگزیب کا قاصد تھا، قاصد نے خلوت میں شہزادہ محمد سلطان سے ملاقات کی، قاصد کے رخصت ہوتے ہی شہزادے نے صالح کو طلب کرلیا، صالح کو شہزادے سے معلوم ہوا کہ قاصد کیا پیغام لایا تھا!

شاہجہاں آباد سے چل کر اورنگزیب ایک منزل پر رک گیا تھا۔ اسے مراد بخش کی طرف سے سخت تشویش تھی جو احمد آباد کا رخ کرنے کے بجائے اکبرآباد سے 20 کوس کے فاصلے پر پڑاؤ ڈال چکا تھا، اورنگزیب نے شہزادہ محمد سلطان کو ہوشیار رہنے کی تاکید کے ساتھ جو اہم بات لکھی تھی اسے سن کر صالح کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ اورنگزیب کو نہیں سمجھ سکا، اورنگزیب نے لکھا تھا کہ اب مراد بخش کا تصفیہ نمٹانے کا وقت بھی آ گیا ہے کیونکہ اس کے ارادے نیک معلوم نہیں ہوتے۔

اس دن سورج ڈھلے اورنگزیب کے پاس سے ایک اور قاصد آیا، یہ قاصد بھی شہزادہ محمد سلطان سے خلوت میں ملا۔ صالح کو پھر طلب کرلیا گیا، اس بار بڑی دہشت خیز خبر ملی۔

خبر کے مطابق مراد بخش کو گرفتار کرلیا گیا تھا، اس کے لشکر نے اکبرآباد سے 20 کوس کے فاصلے پر متھرا کی منزل پر قیام کیا تھا، پڑاؤ کا یہ پہلا ہی دن تھا، گرفتاری کے بعد مراد کا تمام خزانہ اور ساز وسامان ضبط کرلیا گیا، پیغام میں مطلع کیا گیا تھا کہ مراد بخش کو گرفتار کر کے اکبرآباد بھیجا جارہا ہے، شہزادے نے اس سلسلے میں صالح کو خصوصی احکام دیئے اور کہا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، صالح شہزادے کے پاس سے اٹھ آیا۔

پیغام میں یہ تفصیل نہیں تھی کہ مراد بخش کو کس طرح گرفتار کرلیا گیا، صالح کے نزدیک یہ بات انتہائی حیران کن تھی، وہ بہت مضطرب تھا اور اس اضطراب کا بڑا سبب مراد بخش کی بیٹی شہزادی آسائش بانو تھی۔ وہ آسائش بانو جس کے رعب حسن نے صالح کو پہلی ہی ملاقات میں ہکلانے پر مجبور کردیا تھا۔

آسائش بانو اس وقت تیراندازی کی مشق کررہی تھی۔ صالح ادھر جانکلا اور ہدف بن گیا۔

''کون ہو تم؟...... اور بغیر اجازت باغ کے اس حصے میں کیسے داخل ہوئے؟''

تیرانداز نے پوچھا۔

وہ جو کبھی اورنگزیب کے سامنے نہ ہکلایا تھا، جواب دیتے ہوئے اس کی زبان میں کئی بار لکنت آ گئی۔ پھر آسائش بانو سے تیسری ملاقات میں اس کے اندر اتنی ہمت ہوئی کہ اپنا مکمل تعارف کرا سکا۔ اس دوران میں صالح نے آسائش بانو کے بارے میں بہت کچھ جان لیا۔ اسے کچھ کچھ اندازہ تھا مگر یقین نہ تھا کہ دوسری طرف بھی آتش عشق بھڑکنے لگی ہے۔

مراد بخش کے متعلق جب صالح کو حقیقت کا علم ہوا تو اپنے محبوب کی وجہ سے مراد کے ساتھ اسے ایک تعلق خاطر کا خیال آیا، اسے معلوم ہوا تھا کہ آسائش بانو اپنے باپ سے بہت

محبت کرتی ہے جو اس سے ملنے قلعے میں بھی نہ آیا تھا۔ آسائش بانو نے صالح سے بھی اپنے اس دکھ کا اظہار کیا تھا۔ اس کے دل کو بڑی ٹھیس پہنچی تھی۔ اسے اپنے باپ سے یہ توقع نہیں تھی۔

آسائش بانو کے احساسات اور جذبات سے قطع نظر صالح نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا اس کے پیش نظر مراد بخش اس کا سزاوار نہ تھا کہ اسے گرفتار کرلیا جاتا۔ اسے مراد بخش کی گرفتاری پر حیرت ہوئی۔ اس وقت تک صالح کو تفصیلات کا علم نہ تھا کہ شاہین کیسے زیر دام آ گیا! صالح بڑی دیر تک کشمکش کا شکار رہا اور کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔ ایک طرف اورنگزیب تھا، دوسری جانب ایک نوخیز لڑکی تھی۔ وہ لڑکی شہزادی بانو کہلاتی تھی، وہ شہزادی جو نوعمری میں ماں کی محبت سے محروم ہوگئی تھی۔ ماں کی موت کے بعد باپ نے اس کی پرواہ نہیں کی اور عیش کوشی میں مبتلا رہا۔ اسے باپ کی محبت وشفقت بھی نہ ملی۔ خالہ نے اس کی پرورش کی جو اورنگزیب کی بڑی بیوی تھی۔ چچا نے باپ کی محبت کا خلا پر کرنا چاہا اور یہ چچا اورنگزیب تھا مگر خلا پر نہ ہوا۔

صالح خود کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو اس نے فیصلہ آسائش بانو پر چھوڑ دیا۔ وہ خبر جو اکبرآباد میں شہزادہ محمد سلطان اور صالح کے سوا کسی کے علم نہ تھی، آسائش بانو تک بھی پہنچ گئی۔ اس نے بڑے صبر وتحمل کے ساتھ سب کچھ سنا اور سوالیہ نظروں سے صالح کو دیکھا۔ ان نظروں کا سوال صالح نے پڑھ لیا اور فیصلہ ہوگیا۔

وہ بولا۔ ''اگر بانو بیگم اس غلام سے کوئی خدمت لینا چاہیں تو غلام اسے اپنی عزت افزائی سمجھے گا۔''

ہم کچھ زیادہ نہیں بس اتنا چاہتے ہیں کہ وہ زندہ رہیں اور ہماری عمر بھی انہیں لگ جائے۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے شہزادی کی آواز میں لرزش سی آ گئی۔ ذرا توقف سے وہ پھر بولی'' جہاں تک ہمارا قیاس ہے ان کی زندگی کا دارومدار رہائی پر ہے لیکن اس طرح کہیں آپ غداری کے مرتکب تو نہ ہوں گے؟'' شہزادی کا اشارہ اورنگزیب کی طرف تھا۔ اب اس کی آواز میں لرزش نہیں تھی بلکہ پہلے جیسی تمکنت اور کھنک تھی۔

صالح نے اسے یقین دلایا کہ وہ اورنگزیب کا بے دام غلام ہے، پھر اس نے کہا'' میں اس معاملے میں ہرگز اپنا نام نہ آنے دوں گا اور ہر قیمت پر خدمت انجام دے کر رہوں گا۔''

آسائش بانو سچ اور جھوٹ کو پرکھنے کی اہل تھی، اس نے صالح کی بات پر یقین کرلیا۔ صالح نے اپنے محبوب سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے ہی کی خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لیا

تھا۔ اگر یہ راز کھل جاتا تو اس کی زندگی کا چراغ لمحے بھر میں گل کر دیا جاتا۔

''اورنگزیب...... مراد بخش...... وہ سوچتے سوچتے بڑبڑانے لگا'' عماری خالی...... خالی کیوں تھی؟'' اسی سوال کے جواب کی خاطر اس نے اپنے دو خدمت گاروں کو شاہجہاں آباد (دہلی) بھیجا تھا۔

شہزادہ محمد سلطان بھی بے چین تھا۔ اسے یہ فکر تھی کہ کہیں راستے میں مراد کے بہی خواہوں نے کوئی گڑبڑ نہ پھیلا دی ہو! وہ اس بات کا اظہار صالح سے بھی کر چکا تھا۔ صالح نے اس سے یہ بات نہیں چھپائی کہ اس نے اپنے دو خاص خدمتگاروں کو شاہجہاں آباد بھیج دیا ہے۔ ان خدمت گاروں کی واپسی کا انتظار صالح کو بھی تھا اور شہزادہ محمد سلطان کو بھی! اب ان انتظار کرنے والوں میں آسائش بانو یعنی میرا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔

عارج کے انسانی پیکر صالح کے بارے میں مجھے دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی پتہ چلا تھا کہ وہ حسن پرست اور عاشق مزاج ہے۔ یہ فطری صفات عارج پر بھی غالب آ سکتی ہیں، میں نے اسی سبب اپنی کنیز کو عارج کے پاس بھیج کر اپنی چشم تصور کا دائرہ وسیع کر لیا۔ اسی کے ساتھ میری دیگر پراسرار قوتیں بھی بیدار ہو گئیں، اب میں سب کچھ دیکھ اور سن سکتی تھی۔

میری چشم تصور میں عارج کے انسانی قالب صالح کا چہرہ ابھرا اور میں نے اس کے ذہن پر توجہ دی۔ اسے یہ احساس تھا کہ وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اپنے محبوب یعنی میرے انسانی پیکر آسائش بانو کی نظروں میں سرخ رو نہ ہو سکا۔ وہ اسی تدارک کی فکر میں تھا۔ حقیقت حال جاننے کے بعد وہ ان الفاظ کی شرم رکھنا چاہتا تھا جو اس نے آسائش بانو سے کہے تھے۔ وہ اسی فکر میں غلطاں چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک کنیز نے اندر آنے کی اجازت طلب کی، اس کے استفسار پر کنیز نے بتایا کہ آسائش بانو کے محافظ دستے کی نگران آپ سے ملاقات کی منتظر ہے۔

''اسے یہیں بھیج دو۔'' عارج نے کہا۔

کنیز اس کا حکم سن کر الٹے قدموں واپس چلی گئی۔

عارج نے میری خوبصورت کنیز بہار کو پہلے نہیں دیکھا تھا، اگر دیکھا بھی تو ایک نظر میں کیا کیا دیکھتا! قابل دید تو بہت کچھ تھا، پہلی بار بہار اس کے سامنے آئی تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ گویا ایک شاخ صنوبر اس کے سامنے جھکی کھڑی تھی۔

آداب تسلیمات کے بعد بہار نے عارج کو میرا پیغام دیا کہ عصر اور مغرب کے درمیان میں، باغ نور میں ہوں گی۔ عارج کو اسی دوران میں مجھ سے ملنا تھا، پیغام دے کر

بہار نے اجازت طلب نگاہ اٹھائی۔

میں نے دیکھا کہ عارج کی نظریں گھڑی بھر کو بہار سے مل گئیں۔ عارج بامعنی لہجے میں اس سے بولا'' باغ میں بہار بھی ہو گی نا!'' یہ الفاظ ایسے تھے جن کی توقع مجھے عارج سے نہیں تھی۔ یقیناً یہ اثر عارج کے انسانی پیکر کا تھا، اسے حسینوں سے ہم کلامی کا ہنر آتا تھا۔

بہار کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، اس نے کہا'' حضور تو خود آگاہ ہیں کہ بہار کے بغیر باغ، باغ نہیں ویرانہ ہوتا ہے۔''

اس لمحے عارج سوچ رہا تھا کہ بہار کو گویا اپنے حسن کا احساس تھا۔ وہ بہار کے برجستہ جواب کی گہرائی تک پہنچ گیا۔

''تمہیں واپسی کی جلدی تو نہیں۔'' عارج نے بہار سے پوچھا؟

بہار نظر شناس تھی سمجھ گئی کہ یہ سوال کیوں کیا گیا ہے! وہ بولی'' حضور اگر اسے جسارت خیال نہ کریں تو کنیز عرض کرے کہ اس عزت افزائی کے لائق نہیں، حضور کی خلوت کنیز کیلئے عزت افزائی کا سبب ہے اور کنیز خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتی۔''

عارج ایسا بن گیا جیسے کچھ سمجھا ہی نہ ہو، اس نے کہا'' ہم نہیں سمجھے کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔''

''گستاخی معاف!...... حضور اگر کچھ نہیں سمجھے تو یہی بہتر ہے، اجازت!'' بہار یہ کہتے ہی چل دی اور مزید وہاں رکی نہیں۔

بہار کے وہاں زیادہ نہ رکنے کا اصل سبب میں تھی۔ میں نے ہی اسے یہ ذہنی ترغیب دی تھی، صالح کی فطری صفات لحہ بہ لحہ عارج پر حاوی آتی جا رہی تھیں، اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس کے قدم بہک جاتے۔ بہار لازماً ان کے بہکے ہوئے قدموں کو نہ روک پاتی۔ یوں بھی کنیز ایسے مواقع کی تلاش میں رہتی ہیں کہ کسی بڑے منصب دار کے قریب ہو سکیں۔ سو مجھے اس معاملے میں بہار پر اعتبار نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے عارج کے پاس واپس بلا لیا۔ یوں بھی بہار کا شباب چڑھتی ندی کی طرح تھا جو اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے جاتی ہے، اس کا سوج موج بدن، وہ بہار مجسم عارج کے وجود کو مہکا سکتی تھی، میں نے اندازہ لگایا تھا کہ بہار کے دامن میں پہلے بھی پھول کھلتے رہے ہیں مگر اس کے باوجود اس کی مہک جدا تھی، رنگ مختلف تھے۔ ایسے رنگ جو آنکھوں میں نہ چبھیں ان پر نظر پڑے تو سکون اور ٹھنڈک کا احساس ہو، ایسی خوشبو جس سے جی نہ بھرے۔ عارج کے پاس بھیجنے سے پہلے ہی میں نے بہار کا ذہن پڑھ لیا تھا۔

☆……☆……☆

شام ہونے سے پہلے پہلے وہ دونوں خدمت گار اکبرآباد (آگرہ) سے لوٹ آئے جنہیں شاہجہاں آباد (دہلی) بھیجا گیا تھا۔

ان خدمت گاروں نے یقیناً بڑی تیز رفتاری کا ثبوت دیا تھا۔ وہ دونوں بڑے گھاگ تھے۔ کسی بات کا کھوج نکالنے میں ان کا جواب نہ تھا وہ اسی کی روزی کھاتے تھے۔ مجھے پتا چلا کہ انہوں نے عارج کو حقیقت سے آگاہ کردیا ہے۔ انہوں نے جو تفصیلات بیان کیں ان سے عارج کو بھی اورنگزیب کی ذہانت کا علم ہوگیا۔ یہ اقدام بہرحال اسے پسند نہیں آیا تھا۔

اطلاعات کے مطابق مراد بخش کے چند امیروں کو اورنگزیب نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اورنگزیب نے اسے حسن تدبیر کہا، تقدیر بھی موافق تھی کہ وہ اپنے بھائی کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگیا ورنہ مراد بخش پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہ تھا۔ جن امراء نے مراد بخش سے بے وفائی کی وہ بعد میں حاضر خدمت ہوئے اور انعام واکرام سے نوازے گئے۔ گرفتاری کے فوراً بعد مراد کو پابہ زنجیر کردیا گیا۔ قید ونظر بندی کا فرق سمجھنا میرے یا عارج کیلئے مشکل نہ تھا، چار ہاتھیوں پر پردہ دار ہودج بندھوائے گئے، ہر ہاتھی کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ دو دو نامی گرامی امیروں کے ساتھ مقرر ہوا اور پھر ان ہاتھیوں کو چار مختلف سمتوں میں روانہ کردیا گیا۔ جہاں جہاں وہ ہاتھی بھیجے جانے کا حکم ہوا وہاں وہاں پہلے ہی قاصد خبر کر چکے تھے کہ مراد بخش کو گرفتار کرکے روانہ کیا جارہا ہے۔

اور اس کے دو خاص امیروں کے سوا کم ہی لوگوں کے علم میں یہ بات آسکی کہ مجبور قیدی مراد بخش کس ہاتھی پر اور کس سمت روانہ کیا گیا ہے! یہ سارا بندوبست اس لئے کیا گیا کہ مغل سرداروں اور مراد کے دیگر بہی خواہوں کی توجہ بٹ جائے اور وہ اس ہاتھی پر زیادہ توجہ نہ دے سکیں جس کے ہودج میں وہ خاص قیدی تھا۔

اورنگزیب کے دادا نورالدین محمد جہانگیر نے جو اپنے ایام شہزادگی میں شہزادہ سلیم کے نام سے مشہور تھا، ایک مضبوط ومستحکم قلعہ بنوایا تھا، پرانی دہلی سے ملی ہوئی ایک گڑھی تھی یہیں یہ قلعہ تعمیر ہوا، یہی گڑھی، سلیم گڑھی کہلائی، مراد بخش کو دو امیروں شیخ میر اور دیر خان کے ہمراہ سلیم گڑھ کے قلعے کی طرف بھیجا گیا تھا، خدمت گار یہ تصدیق بھی کرآئے تھے کہ مراد کو واقعی سلیم گڑھ کے قلعے میں قید کیا گیا ہے۔

عارج کی نقل وحرکت پر میں اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے نظر رکھے ہوئے تھی۔

اسے یہ اطلاعات ملیں تو وہ شہزادہ محمد سلطان سے ملنے روانہ ہوگیا، وہ پہلے شہزادے کو ان خبروں

سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ پھر باغ نور کا قصد تھا۔

شہزادے سے مل کر عارج کو معلوم ہوا کہ اورنگزیب اپنے ایک پیغام کے ذریعے پہلے ہی اس صورتحال سے باخبر کرچکا تھا۔

عارج وہاں سے باغ نور کی طرف چل دیا۔ اس کا انسانی قالب صالح کیونکہ اورنگزیب کے جاں نثاروں اور شہزادہ محمد سلطان کے خاص معتمدوں میں شمار ہوتا تھا اور اس کا منصب بھی کم نہ تھا اس لئے وہ بے روک ٹوک ہر جگہ آتا جاتا تھا، قلعے اور محلات شاہی کے صرف چند ہی حصے ایسے تھے جہاں اس کی پہنچ نہ تھی۔ انہی میں ایک حصہ وہ تھا جہاں شاہجہاں کو قید کیا گیا تھا۔

شاہجہاں سے ملنے کی اجازت محض شاہی خاندان کے افراد کو تھی اور ان میں سے بھی ہر ایک کو نہیں۔ ان افراد کے سوا شاہجہاں سے صرف وہی مل سکتا تھا جسے شہزادہ محمد سلطان کی اجازت حاصل ہو۔ شاہجہاں کو قلعے کے جس حصے میں قید کیا گیا تھا وہاں ہتھیار بند محافظوں کے سوا پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔

عموماً شاہی محلات میں آزادی تھی، نامور شہزادیاں اور بیگمات سب مسلح رہتی تھیں۔ ان میں سے اکثر میدان جنگ میں مردوں کے پہلو بہ پہلو رہ چکی تھیں۔ انہیں اس لئے عام خواتین کی طرح قید کرکے نہ رکھا جاتا، یہی حال آسائش بانو کا تھا۔

آسائش بانو پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اسلام نے عورت کیلئے پردے کی جو حدود مقرر کی تھیں وہ ان سے تجاوز نہ کرتی۔ نوجوانی کے باوجود وہ صاحب شعور تھیں۔ وہ باغوں میں سیر کو جاتی شکار بھی کھیلتی اور صنف نازک ہونے کے سبب کسی احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوتی کیونکہ اس کے دل میں کوئی کھوٹ نہ تھا اس لئے وہ بے دھڑک صالح سے ملتی۔ صالح سے اس نے کئی بار تخلیے میں بھی گفتگو کی۔ لیکن ان ملاقاتوں کو اس نے راز رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی، شاہی خاندان کے افراد بھی ان ملاقاتوں سے واقف تھے مگر انہیں آسائش بانو کے مضبوط کردار کا بھی علم تھا اور صالح پر بھی یقین تھا کہ وہ کبھی حد ادب سے نہ گزرے گا، صالح سے میل جول کو ہم عمری کا تقاضا سمجھا گیا، کسی کو گمان بھی نہ گزرا کہ آسائش بانو کے وجود میں کیا پکار جاری ہے، ان حالات میں صالح اور آسائش بانو کی ملاقات اہل قلعہ کیلئے کوئی عجیب یا غیر معمولی بات نہیں تھی، میں نے آسائش بانو کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرکے ہی اس کا جسم اپنایا تھا۔

باغ نور شہر کی آبادی کے ایک سرے پر تھا۔ قلعے سے اس کی مسافت کم نہ تھی مگر وہ

ایسے رخ پر تھا کہ محلات شاہی کی بالائی منزلوں کے جھروکوں سے صاف نظر آتا تھا۔ اب اکبرآباد کے رہنے والے یہ بھول گئے تھے کہ اسے باغ نور کے نام سے کیوں یاد کیا جاتا تھا! وہاں کچھ بوڑھوں کو اس کا علم ضرور تھا جنہوں نے اپنے پرکھوں سے اس باغ کے قصے سنے تھے۔

بادشاہوں کے بھی الگ الگ مزاج اور شوق ہوتے ہیں، یہ باغ اس مغل تاجدار کے عہد میں باغ نور کہلایا جس نے آگرے کا نام بدل کر اپنے نام پر اکبرآباد رکھ دیا تھا۔ یہ جلال الدین محمد اکبر تھا، اورنگزیب کا پردادا! اکبر ہی کے حکم پر ایسا بندوبست کیا گیا تھا کہ رات کے وقت یہ باغ جگمگ جگمگ کرتا تھا، قلعے سے یہ نظارہ رات کے وقت بھلا لگتا۔ سرشام ہی باغ میں فانوس روشن کردیئے جاتے۔ یہ فانوس باغ میں جگہ جگہ اس طرح نصب تھے کہ بادی النظر میں دکھائی نہ دیتے، اکبر کے بعد جہانگیر کے ابتدائی زمانے تک یہ فانون روشن کئے جاتے رہے، جہانگیر کو اور بہت سے شوق تھے۔ اس نے اس باغ پر توجہ نہ کی، پھر رفتہ رفتہ باغ تو باقی رہ گیا، روشنی غائب ہوگئی۔ فانوس بھی دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب ٹوٹ پھوٹ گئے، ہاں چمن بندی اب تک وہی چلی آتی تھی، روش روش پر پھولوں کے تختے تھے اور یہ باغ اب تک شاہی تصرف میں تھا۔ اس میں ہر کس و ناکس کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

آسائش بانو کو بھی یہ باغ بہت پسند تھا، وہ اکثر سیر کرنے ادھر آنکلتی۔ میں نے اسی لئے عارج سے ملاقات کی خاطر اس باغ کو منتخب کیا تھا، میرا ارادہ محض باغ کی سیر نہ تھا، حسب معمول میرا محافظ دستہ ساتھ تھا، اس محافظ دستے میں بہار بھی تھی، محافظ دستے کی کنیزوں کو میرے قریب آنے کی اجازت نہ تھی جب تک کہ میں خود انہیں قریب آنے کی اجازت نہ دوں، یہ سب طریق و اطوار آسائش بانو کے تھے جواب میں نے بھی اپنا لئے تھے، کنیزوں کے قریب آنے سے آسائش بانو کی خلوت مجروح ہوتی تھی وہ کچھ زیادہ نازک مزاج اور حساس تھی، سیر کے وقت خاص طور پر حکم تھا کہ کنیزیں فاصلہ قائم رکھیں اور طلبی ہی پر قریب آئیں۔

یہی وجہ تھی کہ اس طویل وعریض باغ میں جب عارج داخل ہوا اور اس حصے تک پہنچا جہاں گلابوں کے تختے لگے تھے تو اسے پہلے بہار ہی نے دیکھا۔ میں اپنی چشم تصور کی پراسرار قوت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی، بہار کی نظریں بڑی دیر سے ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں کیونکہ اسے عارج کے آنے کی خبر تھی، عارج کے انسانی قالب صالح کی سج دھج شہزادوں سے کم نہ تھی اور وہ تھا بھی شہزادہ ہی، ایک جلاوطن شہزادہ! وقت اور حالات نے اس کا ساتھ نہیں دیا ورنہ وہ اپنا

وطن کبھی نہ چھوڑتا۔

بہار کی نگاہ عارج کی طرف اٹھی تو اٹھی رہ گئی۔ اس کے انداز خرام میں وقار اور شخصیت میں بڑی وجاہت تھی، بہار نے اس بات کو محسوس کرلیا تھا کہ عارج کی نظروں میں اس کیلئے پسندیدگی ہے، عارج سے پہلے کبھی اس رتبے کے کسی امیر نے اسے قریب نہ آنے دیا تھا۔

جانے کب تک بہار گزری ہوئی ساعتوں کے خواب آنکھوں میں سجائے عارج کی طرف نگراں رہتی کہ قریب ہی کھڑی ہوئی محافظ دستے کی ایک اور کنیز نے اسے چونکا دیا، وہ ایک دم مؤدب ہوگئی، کنیز نے اسے خبردار کیا تھا کہ میرا رخ اس کی طرف ہوگیا ہے اس نے نگاہ نیچی کرلی اور اس وقت تک نگاہ نہ اٹھائی جب تک عارج ان کے قریب سے گزر کر میری طرف نہ بڑھ گیا۔

جب عارج اور میں قدم سے قدم ملائے آگے بڑھ گئے تو بہار نے اپنی جگہ سے حرکت کی وہ بھی محافظ دستے کی کنیزوں کو ساتھ لئے اور فاصلہ برقرار رکھے آگے بڑھتی رہی۔ اسے کچھ کچھ شبہ ہو چلا تھا کہ عارج اور میرے انسانی قالب ایک دوسرے سے دلی وابستگی رکھتے ہیں لیکن اس باب میں زبان پر کوئی حرف لانے کا انجام وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ بہار کے بارے میں ساری باتیں مجھے اس کے ذہن پر توجہ دے کر ہی معلوم ہوئی تھیں جو آدم زاد یا آدم زادی میرے قریب تھی اس کی طرف سے میں پوری طرح آگاہ رہنا چاہتی تھی۔

بہار ہر چند میرے انسانی قالب آسائش بانو کو پسند کرتی تھی اور دل سے اس کی وفادار تھی مگر اس کے مزاج میں ایک باغیانہ عنصر بھی شامل تھا، بہار خود بھی اپنے اس مزاج سے خوف کھاتی تھی، اس کے مزاج کی یہ بغاوت صرف آسائش بانو تک محدود نہ تھی، بلکہ اس کا تعلق ان تمام افراد سے تھا جو محلوں ہی میں پیدا ہوتے ہیں اور محلوں میں مرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ آسائش بانو بھی اسی کی طرح ہے، پھر یہ تخصیص کیسی؟ کئی پشتوں سے ان کے اجداد غلام تھے اور کئی پشتوں سے آسائش بانو کے اجداد آقا!

آقا اور غلام کا فرق کب اور کیوں کس نے قائم کیا؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوال بہار کی روح کو مضطرب کردیتے، اس کی چھوٹی سی عقل میں ان سوالوں کے جواب نہ آتے۔ جب اس پر ایسے باغیانہ خیالات کا غلبہ ہوتا اور وہ بہت پریشان ہوجاتی تو بیماری کا بہانہ کرکے ایک طرف پڑی رہتی، اس کے فرائض کوئی اور کنیز سنبھال لیتی۔

میں تو عارج کے ساتھ کھلے دل سے گفتگو کررہی تھی، مگر وہ خود کو چور چور محسوس کررہا

تھا۔ بات کرتے ہوئے جب بھی اس کی نگاہ بہار کی طرف اٹھ جاتی، ہڑبڑا جاتا، عارج کی اس کیفیت سے میں بے خبر نہیں تھی، بہار میں دلچسپی لینے کے سبب عارج ایک طرح کے احساس گناہ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں نے اس لئے دھیمی آواز میں اس سے کہا" اے عارج! تو بات کرتے کرتے کہاں کھو جاتا؟"

"تن..... نہیں تو اے دینارا!" وہ گھبرا کر اس طرح بولا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

"اچھا ایک بات سن! اورنگزیب کو تجھ پر یا مجھ پر کسی طرح کا شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم مراد بخش کے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔"

میں نے عارج کو تاکید کی" وہ ہماری توقعات سے بڑھ کر چالاک ہے، ایسے آدم زاد کم ہی میری نظر سے گزرے ہیں۔"

عارج مجھے بتا چکا تھا کہ مراد بخش کو کہاں قید کیا گیا ہے! وہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے مرضی جان لینا چاہتا تھا۔

"یہ تو طے ہے اے عارج کہ مراد بخش بے گناہ ہے۔" میں بولی۔

عارج نے میری تائید کی پھر سوال کیا۔" اے دینارا! اگر اورنگزیب کے کانوں میں بھنک پڑ گئی تو اس کا اثر تجھ پر کیا ہوگا؟..... میری مراد تیرے انسانی قالب آسائش بانو سے ہے، مراد بخش کی رہائی کے معاملے میں کس حد تک تیرا آگے بڑھنا مناسب ہوگا؟"

میں اس بات سے متفق تھی کہ مراد بخش کو کسی نہ کسی طرح قید سے نکال لیا جائے، لیکن اس پر آمادہ نہ تھی اورنگزیب کو مجھ پر شک ہو، مراد بخش پر اورنگزیب نے بغاوت کا جو الزام لگایا تھا اس سے اختلاف یا اتفاق کے بجائے میں صرف اپنے انسانی قالب کی حد تک گفتگو کر رہی تھی، گفتگو کے دوران میں نے کہا" ہمیں اس سے کیا کہ دونوں بھائیوں میں کون حق پر ہے، کون نہیں، شواہد سے ظاہر ہے کہ مراد بخش کی زندگی خطرے میں ہے، اس پر جو الزام ہے اسی طرف اشارہ کرتا ہے، شاہجہاں کی نظر بندی اور مراد بخش کی گرفتاری میں فرق ہے۔"

عارج نے میری بات سے پورا اتفاق کیا، پھر بولا" جلد ہی میں کوئی تدبیر نکال لوں گا۔"

"مگر ایک بات کا خیال رکھیو کہ اس تدبیر کی کامیابی کا انحصار میری جناتی صفات پر نہ ہو۔" میں نے اپنی بات پر زور دیا۔

"ہمارے لئے یہ امر انتہائی خطرناک ہوگا کہ کسی کو ہم پر غیر انسانی ہونے کا شبہ ہو۔"

"میں سمجھتا ہوں اے دینار۔" عارج بولا۔" مراد بخش کی رہائی کیلئے میں جناتی صفات ہرگز استعمال نہیں کروں گا مجھے احساس ہے کہ ایسی صورت میں ہمارا یہاں رہنا مشکل ہو جائے ہمیں کسی اور زمانے میں جانا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے، اب تو جا!" میں نے کہا۔

عارج مجھ سے رخصت ہو گیا، سورج ڈوبنے کو تھا اور مغرب کا وقت دبے پاؤں قریب آ رہا تھا، مجھے علم تھا کہ عموماً آسائش بانو اس وقت تک قلعے کی طرف لوٹ جاتی تھی، لیکن اس روز ایسا نہیں ہوا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اب آسائش بانو کے جسم پر میرا قبضہ تھا، ایک جن زادی کا قبضہ جو آدم زادوں سے نہیں ڈرتی، عارج چلا گیا تو مجھ پر اپنے انسانی قالب کے اثرات ہونے لگے، میں نے اپنی آنکھوں میں نمی سی تیرتی محسوس کی ایک دکھ کا احساس میرے اوپر غالب آنے لگا۔

ابھی میرے انسانی قالب کی عمر ہی کیا تھی۔ اس نے دوسری دہائی کا نصف طے کیا تھا، اتنی مختصر سی عمر میں اس کے معصوم دل پر کئی چرکے لگے تھے۔ پہلی بار وہ اس وقت روئی تھی جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ اس میں اتنی سمجھ تھی کہ کیا حادثہ گزر گیا! ماں کی محبت سے محرومی کے بعد اب اس کی محبت کا رخ باپ کی طرف ہو گیا، وہ اپنے باپ کا رعب اور دبدبہ دیکھتی، آتے جاتے تسلیمات بجالاتی اور موقع کی منتظر رہتی کہ کب اس کا باپ اسے خلوت میں آنے کی اجازت دے مگر ایسا کم ہی ہوتا۔

مراد بخش اپنی بیوی کے غم کو بھلانے کیلئے خوب رو اور کنیزوں کے ہجوم میں گم ہو گیا تھا۔ اسے یہ خیال تک نہ آتا کہ کہیں اسی محل میں ایک معصوم دل اس کی محبت میں دھڑک رہا ہے۔

کسی بھی قسم کی محرومی انسان کو یا تو خاک میں ملا دیتی ہے یا کندن بنا دیتی ہے، محرومی کی اس آگ میں تپ کر آسائش بانو کندن بنتی گئی، وہ بچپن ہی سے ایسی باتیں کرنے لگی جن کی توقع بچوں سے نہیں ہوتی، اسی وجہ سے وہ شاہجہاں کی لاڈلی بن گئی اور اورنگزیب کی چہیتی ہو گئی، خالہ اس پر جان نچھاور کرنے لگی، شاہجہاں نے خاص اپنے اہتمام سے پوتی کی تعلیم کیلئے ایک معلمہ مقرر کی، یہ معلمہ رسمی علوم و فنون میں مہارت رکھتی تھی۔

آسائش بانو اتنی ذہین طالبہ ثابت ہوئی کہ معلمہ بھی حیران رہ گئی، چند ہی سال میں وہ عربی اور فارسی زبان روانی سے بولنے کے ساتھ ترکی بھی سیکھ گئی، اس نے قرآن حفظ کر لیا تو محل میں بڑی خوشی منائی گئی، سب نے اسے شاباش دی، مگر مراد بخش نے اس کے سر پر ہاتھ نہ

رکھا، وہ اس وقت غرقِ بادہ و جام تھا اور اس حالت میں بیٹی ہی کو کیا کسی کو باریابی کی اجازت نہ ملتی تھی، وہ بلانوش تھا اور اسے اپنی بلانوشی کا احساس تھا، وہ اس لئے شاہجہاں کے سامنے زیادہ آنے سے گریز کرتا تھا۔

آسائش بانو اپنے باپ کی بے توجہی کا شکار رہی، مگر باپ کی محبت دل سے نہ گئی وہ انہی حالات میں پروان چڑھتی رہی، پھر اس نے جینے کے بہانے ڈھونڈ لئے، شمشیرزنی، شہسواری، نیزہ بازی، تیراندازی اس نے فنونِ حرب کا کوئی شعبہ نہ چھوڑا اور اب بھی اس کی مشق جاری تھی، ان مشقوں نے اس کے جسم پر بھی اچھا اثر کیا، نوخیز نوجوانی کے باوجود وہ بھرپور لگتی، بظاہر وہ نازک اندام ہی دکھائی دیتی مگر اس کی کلائی مروڑنا آسان نہ تھا، کنیزیں اسے سنوارتیں تو اس کے حسن و جمال میں کھو جاتیں اور پھر حدِ ادب سے تجاوز کا خوف ان کی نگاہیں جھکا دیتا، شانوں پر زلفوں کی گھٹائیں جھومتیں اور بادامی آنکھوں میں نشہ سا ڈولتا رہتا مژگان کھولتی تو یوں لگتا کہ درِ میخانہ باز ہے، بند کر لیتی تو گمان گزرتا کہ ہر نوکِ مژگان سینے میں اتر جائے گی، ابرو ماہِ اولِ شب کا سماں پیش کرتے، رخساروں کی سرخی و شادابی شفق کو شرماتی، اس کی تیز مزاجی کے باوجود چوڑی پیشانی پر کبھی کبھار ہی کوئی شکن نمودار ہوتی، بالائی ہونٹ پر دائیں جانب ایک تل تھا کہ نظر نہ لگے، لبوں میں وہ نازکی، وہ گداز کہ وا ہوں تو چٹکتے غنچوں کا گمان ہو، مل جائیں تو یوں لگے کہ گلاب کی ایک پنکھڑی پر دوسری پنکھڑی رکھی ہو، رنگ ایسا کہ چھولو تو میلا ہو، انگ انگ یوں کہ پیمائش کے اعلیٰ معیار پر پورا اترے، صالح نے یوں ہی تو اپنے دیدہ و دل فرشِ راہ نہیں کر دیئے تھے۔

صالح اور آسائش بانو کی عمر میں تقریباً چھ سال کا فرق تھا مگر یہ فرق زیادہ ظاہر نہ تھا، اس کی وجہ آسائش بانو کی اٹھان تھی۔

جب صالح نے اس سے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں ایران سے آیا ہوں تو آسائش بانو کو اپنی ماں یاد آ گئی، وہ بھی ایرانی النسل تھی، شاہ نواز صفوی کی بیٹی جس کا تعلق ایران کے ایک معزز خاندان سے تھا، صالح سے تعلقِ خاطر کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی، صالح کیلئے اس کے دل میں جتنی جگہ پیدا ہو گئی تھی اس کا اظہار آسائش بانو کی آنکھوں سے ہوتا تھا، وہ اپنے رویے سے کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیتی تھی، اسے صبر کرنا آتا تھا اور بچپن سے اس نے صبر ہی کیا تھا، وہ خلوت میں تو صالح کے چہرے کو آنکھیں بند کئے دیکھتی رہتی لیکن جب صالح سامنے ہوتا تو اس کی طرف کم ہی نگاہ اٹھاتی، اپنے جذبات کو وہ کبھی بے قابو نہ ہونے دیتی۔

''یقین کرا دے دینار کہ میری اطلاع غلط نہیں۔'' عارج خلوت میں مجھ سے مخاطب تھا،

تنہائی کے باوجود اس کی آواز دھیمی تھی۔

''مگر..... مگر مراد بخش کو یہ کیا ہو گیا! اسے اپنے وقار کا کوئی خیال نہیں!'' میرے لہجے میں حیرت تھی، عارج نے خبر ہی ایسی دی تھی۔

میری حیرت کی وجہ سوسن تھی، سوسن مراد بخش کی ایک کنیز کا نام تھا۔ بظاہر تو سوسن ایک کنیز تھی مگر سبھی کو معلوم تھا کہ اس کا درجہ مراد کی محبوبہ ہے، عارج کو شاہجہاں آباد (دہلی) سے خبر ملی تھی کہ مراد نے اورنگزیب کو ایک عریضہ بھیجا ہے، اس نے اورنگزیب سے درخواست کی تھی کہ سوسن کو سلیم گڑھ کے قلعے میں اس کے پاس بھیج دیا جائے۔

اورنگزیب نے مراد کی یہ درخواست قبول کر لی تھی۔

سوسن احمد آباد میں تھی۔ اسے مراد کے پاس پہنچا دیا گیا، مراد کی حالت پر مجھے حیرت کے ساتھ ہی رنج غالباً اس لئے ہوا کہ وہ میرے انسانی پیکر کا باپ تھا۔ عارج اب مجھ سے ملنے کیلئے میرے محل میں بھی آنے جانے لگا تھا۔ اس کا سبب امیر الامرا ذوالفقار علی خان تھا۔

امیر الامراء ذوالفقار علی خان کے بارے میں تمام معلومات میں نے حاصل کر لی تھیں۔ اسے اکبرآباد آئے تین ماہ سے زیادہ گزر چکے تھے۔ وہ عجیب طبیعت و مزاج کا آدمی تھا۔ اسے سمجھنا آسان کام نہیں تھا۔ اس نے اکبرآباد آتے ہی سارے قلعے میں مخبروں کا جال پھیلا دیا۔ وہ اورنگزیب کی خصوصی ہدایات پر شاہجہاں آباد سے اکبرآباد آیا تھا۔

اورنگزیب کو جانے کیوں شاہجہاں کی طرف سے فکر لگی تھی۔ اس کے خیال میں شاہجہاں نظر بند ہونے کے باوجود اس کے اقتدار کو خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ نظر بندی کے دوران بھی کم از کم مراسلت کے ذریعے وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر سکتا تھا۔ ذوالفقار علی خان نے انہی امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی دانست میں ضروری کارروائیاں کی تھیں۔ اب قلعے میں موجود ہر اہم شخصیت ذوالفقار علی خان کے مخبروں کی نظر میں تھی۔ ان اہم شخصیات میں عارج اور میرے انسانی قالب بھی تھے۔ اب ہم دونوں مراد کے بارے میں کھلے عام گفتگو سے گریز کرتے تھے، میرے محل میں بھی کوئی کنیز یا غلام مخبری کر سکتا تھا اس لئے وہاں بھی ہم تخلیے کے باوجود دھیمی آواز میں بات کرتے تھے۔ اس وقت بھی عارج میرے محل میں تھا۔ گزشتہ چند مہینوں کے دوران عارج نے بھی شاہجہاں آباد میں اپنے کئی مخبر مقرر کر دیئے تھے اور سلیم گڑھ کے حالات سے بھی وہ بے خبر نہ تھا۔

☆......☆......☆

مراد بخش کو قید سے نکالنے کیلئے ضروری تھا کہ عارج خود کوئی موقع نکال کر سلیم گڑھ جاتا اور رہائی کے امکانات پر غور کرتا۔ اس کے بعد ہی کوئی لائحہ عمل مرتب کر سکتا تھا لیکن اسے پورے دو ماہ بھی اکبر آباد میں نہ گزر رہے تھے کہ وہاں ذوالفقار علی خان پہنچ گیا۔

اورنگزیب نے پہلی ذیقعد 1028 ہجری کو شاہجہاں آباد (دہلی) میں اپنی تخت نشینی کا پہلا جشن منعقد کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ذوالفقار علی خان کو اکبر آباد روانہ کر دیا تھا۔

اکبر آباد آنے کے کچھ دن بعد ذوالفقار علی خان نے شہزادہ محمد سلطان کو اپنی مٹھی میں لے لیا، شہزادے کا جھکاؤ بھی اس کی طرف ہو گیا۔ اس کا سبب وہ ہدایات تھیں جو اورنگزیب نے ایک پیغام کی شکل میں شہزادے کو بھیجی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صالح کے ساتھ شہزادے کا رویہ بڑی حد تک بدل گیا۔ عملاً شہزادے کے بجائے اب ذوالفقار علی خان کا حکم چلنے لگا تھا اور وہ بڑا سخت گیر آدمی تھا۔ پہلے تو شہزادے سے کوئی بہانہ کر کے صالح شاہجہاں آباد چلا جاتا تھا مگر اب یہ آسان نہ تھا خصوصاً مخبروں کی وجہ سے!

یہی سبب تھا کہ عارج اب تک سلیم گڑھ نہ جا سکا تھا۔ میں بھی ان تمام حالات سے بدلی ہوئی فضاء سے واقف تھی۔

عارج کے انسانی چہرے پر فکرمندی کے آثار دیکھ کر میں نے اسے سمجھایا ''تو زیادہ فکرمند نہ ہو۔ تقدیر کے لکھے کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اگر مراد بخش نے سوسن کو بلوا لیا ہے تو اس میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس وقت قلعے کے جو حالات ہیں انہیں مدنظر رکھتے ہوئے تیرا سلیم گڑھ جانا کسی بھی طرح مناسب نہیں بلکہ مصلحت کے خلاف ہے۔''

عارج کو ایک شرارت سوجھ گئی اور گویا صالح بن کر بولا ''بانو بیگم! محبت مصلحت کی غلام نہیں ہوتی۔''

''محبت!'' میں دھیرے سے ہنس دی ''تو کیا تجھے میرے اس انسانی قالب سے محبت ہو گئی ہے؟''

''تو کسی بھی رنگ، کسی بھی جسم میں ظاہر ہو اے دینار، میں تجھ سے محبت کرتا رہوں گا۔'' عارج کہنے لگا۔

''اور بہار!'' میں نے بھی اسے چھیڑا۔ ''وہ...... اس میں بھی تجھے میرا ہی جلوہ نظر آتا ہے؟''

''یہ تو کیسی باتیں کرنے لگی اے دینارا!'' عارج سنبھل کر بولا۔ ''تیرا اور بہار کا کیا مقابلہ! کہاں ایک شہزادی، کہاں ایک معمولی کنیز!''

''یوں کہہ کہ کہاں ایک جن زادی، کہاں ایک آدم زادی!'' میں نے گویا تصحیح کی۔

''چل یوں ہی سمجھ لے، ویسے اگر تجھے مجھ پر بھروسا نہیں تو اس آدم زادی کو میرے پاس آئندہ نہ بھیجنا۔'' عارج بولا۔

''سن کہ میں تیرے پاس اسے بھیجتی ہوں تو اس کی نکیل اپنے ہی ہاتھ میں رکھتی ہوں تو اسے بہکا نہیں سکتا۔'' میں نے کہا۔

عارج نے میری بات سن کر ٹھنڈا سانس بھرا۔ وہ یقیناً سمجھ گیا تھا کہ بہار اس کے پاس کیوں نہیں رکی تھی۔ پھر اس نے موضوع گفتگو بدل دیا اور کہنے لگا۔ ''اے دینار! میں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی موقع نکال کے خلوت میں شہزادہ سلطان سے مل لوں۔''

''تو شاید اس ملاقات میں شہزادے سے شاہجہاں آباد جانے کی اجازت لینا چاہتا ہے۔'' میں نے اپنے قیاس کا اظہار کیا تو عارج نے تصدیق کر دی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے سوال کیا۔ ''مگر اے عارج، تو شاہجہاں آباد جانے کیلئے شہزادے سے کیا بہانہ کرے گا؟''

''ابھی میں نے اس سلسلے میں کچھ سوچا نہیں۔'' عارج نے جواب دیا۔

''بہر حال بہانہ ایسا ہونا چاہئے کہ بہانہ معلوم نہ ہو۔''

میں نے تاکید کی۔ حسب معمول عارج کی نقل و حرکت پر میں نظر رکھے ہوئے تھی۔

اس نے چند روز بعد موقع غنیمت دیکھ کر شاہجہاں آباد جانے کی بابت اجازت لینے کیلئے شہزادہ محمد سلطان سے ملنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ عارج کا اصل مقصد سلیم گڑھ کے قلعے تک رسائی تھا۔

شہزادے کو امیر الامراء ذوالفقار علی خان ہی کبھی فرصت نہ دیتا تھا۔ اس سے خلوت میں ملنا ضروری تھا ورنہ بات بگڑ جاتی۔ دیرینہ خدمت و تعلق کے پیش نظر عارج کو امید تھی کہ شہزادہ اس کے انسانی قالب سے بے رخی نہ برتے گا۔ پھر وہ شہزادے سے ملا اور اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ منہ بناتے ہوئے شہزادے نے اسے شاہجہاں آباد جانے کی اجازت دے

دی۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔

عارج نے شاہجہاں آباد جانے کیلئے شہزادے سے یہ بہانہ کیا تھا کہ میرا ایک قریبی عزیز ایران سے وہاں آیا ہوا ہے۔ وہ خفیہ طور پر ایران سے شاہجہاں آباد پہنچا ہے۔ میں اس کی تصدیق کرنے شاہجہاں آباد جانا چاہتا ہوں۔ اپنے کسی قریبی عزیز کا قصہ عارج نے اس لئے سنایا تھا کہ بعد میں بوقت ضرورت کہہ سکے، اطلاع غلط تھی۔

صبح عارج، شہزادے سے ملا تھا، دوپہر کے بعد اس نے مجھے یہ مژدہ سنایا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ میں اس کی طرف سے ہر وقت باخبر رہتی ہوں۔ خود میں نے بھی اسے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا۔

''یہ بہت اچھا ہوا اے عارج!'' میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''اب تو مراد بخش کی رہائی کیلئے کوئی راہ نکال سکے گا۔''

مجھ سے مل کر جانے کے بعد عارج روانگی کی تیاریاں کر رہا تھا کہ خلاف توقع کافی دن بعد شہزادہ محمد سلطان نے اسے خود طلب کرلیا حالانکہ وہ آج ہی شہزادے سے مل چکا تھا۔ عارج کو اس طلبی پر حیرانی تھی۔

عارج شہزادے کے حضور میں پہنچا تو وہاں امیر الامراء اکبرآباد کے صوبے دار اور دیگر چند منصب داروں کو دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔ ان سبھی کے چہروں پر ایک تناؤ سا تھا۔ عارج تسلیمات بجالانے کے بعد کچھ ذرا ذرا سا ایک طرف بیٹھ گیا۔ امیر الامراء ذوالفقار خان کے چہرے سے اس وقت غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں اپنے تصور کی قوت کو بروئے کار لا کر ذوالفقار خان کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار دیکھ کر میں سوچنے لگی کہ کہیں مخبروں کے ذریعے ذوالفقار خان کو عارج کے اصل ارادے کا علم تو نہیں ہو گیا؟

میں ابھی ان وسوسوں کا شکار تھی کہ شہزادہ محمد سلطان نے عارج کو مخاطب کیا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر شہزادے کی بات سننے لگی۔

''...... ہمارے ساتھ تمہیں بھی طلب کرلیا گیا ہے، گزشتہ احکام کو منسوخ جانو۔'' شہزادے نے عارج سے کہا۔

شہزادے کے ان الفاظ سے میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ اب عارج، مراد بخش کی رہائی کے سلسلے میں فوری طور پر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ شہزادہ محمد سلطان کو اورنگزیب کی طرف سے طلبی کے احکام اسی روز ملے تھے۔ اورنگزیب نے شہزادہ محمد سلطان، امیر الامراء

ذوالفقار خان اور عارج کے انسانی قالب صالح کو فوراً شاہجہاں آباد پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ خود اورنگزیب بھی داراشکوہ کا تعاقب ترک کر کے لاہور سے شاہجہاں آباد پہنچ گیا تھا۔

اورنگزیب کو خبر ملی تھی کہ اس کا بھائی شجاع، بنگال سے نکل کر بنارس تک آ گیا ہے۔ شجاع نے ایک بڑے علاقے کو اپنے قبضے میں کرلیا تھا اور وہ اورنگزیب کے اقتدار کیلئے خطرہ بن گیا تھا۔ اورنگزیب نے داراشکوہ کے تعاقب میں اپنے دو امیروں کو چھوڑا اور خود پلٹ آیا۔ احکام کے مطابق اب اکبرآباد کا قلعہ رعد انداز خان کے سپرد کیا جانا تھا جو وہیں ایک جانب دوزانو بیٹھا تھا۔

شہزادہ محمد سلطان کا ذہن پڑھ کر مجھے تازہ تر حالات کا پورا علم ہو گیا تھا، اب میں سمجھ گئی تھی کہ ذوالفقار خان کے چہرے پر غصہ نظر آنے کی وجہ کیا ہے! اورنگزیب سے وفاداری کا تقاضا یہی تھا کہ وہ مخالفین پر خفگی کا اظہار کرے۔ کشیدہ صورتحال کے سبب مجھے جو غلط فہمی ہو گئی تھی، اب دور ہو گئی۔ عارج کا یہ راز کھلا نہیں تھا کہ وہ مراد بخش کی رہائی کیلئے شاہجہاں آباد جا رہا تھا۔ اورنگزیب کی طرف سے بھی اسے شاہجہاں آباد ہی طلب کیا گیا تھا مگر اب وہ سلیم گڑھ کے قلعے نہ جا پاتا بلکہ اورنگزیب کی نظر میں رہتا، خود شاہجہاں آباد جانے اور اورنگزیب کی طرف سے وہاں طلب کئے جانے میں بڑا فرق تھا۔ عارج کو شاہجہاں آباد پہنچ کر یقیناً اتنی مہلت نہ ملتی کہ وہ سلیم گڑھ جا سکتا۔ اس سے قطع نظر موجودہ حالات میں عارج کب اکبرآباد آ سکے گا، اس کیلئے یہ بھی ایک مسئلہ ہی تھا۔ جب شہزادے نے عارج کو یہ بتایا کہ آئندہ روز صبح لشکر اکبرآباد سے شاہجہاں آباد کی طرف کوچ کرے گا تو وہ چونک اٹھا۔ وہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اکبرآباد واپسی کب ہو گی؟ اسے مجھ سے کب تک جدا رہنا ہو گا؟

کچھ دیر بعد مجلس برخاست ہو گئی۔ عارج اپنی حویلی میں چلا آیا۔ لشکر کی روانگی سے متعلق اسے بھی کچھ کام سونپے گئے تھے مگر فی الحال وہ حالات پر غور کرنا چاہتا تھا۔ یہ وہ صالح نہیں تھا جو ایران سے ہندوستان آیا تھا۔ اب تو اس کے جسم پر عارج کا قبضہ تھا جو مجھ سے دور رہنے پر فکرمند تھا۔ یہ امر بہرحال اس کیلئے تشویش کا باعث تھا کہ وقتی طور پر سہی میں اکبرآباد میں اور وہ شاہجہاں آباد میں رہتا ہے۔ ایسی صورتحال پہلی بار پیش آئی تھی کہ مجھے اور عارج کو دو الگ شہروں میں ایک دوسرے سے دور رہنا تھا۔ عارج سوچ رہا تھا کہ میرے بغیر اسے کیسے قرار آئے گا! وہ دیر تک یہی سوچتا رہا مگر اکبرآباد میں رہنے کی کوئی راہ نظر نہیں آئی۔ عارج ہی کیا خود شہزادہ محمد سلطان بھی اورنگزیب کے احکام ٹالنے کی جسارت نہیں کرسکتا تھا۔

اسی دن عارج مجھ سے ملا اور مجھے حالات سے بے خبر جان کر تئی صورتحال سے آگاہ

کیا۔

''اب کیا ہوگا اے دینار؟'' عارج نے مجھ سے دریافت کیا۔ تجھ سے بچھڑ کر میں بھلا کیسے رہ سکوں گا!''

یہ بات تو اس طرح کہہ رہا ہے جیسے ہم خدانخواستہ ہمیشہ کیلئے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔'' میں بولی۔

''تو تجھے کوئی فکر نہیں؟'' عارج نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اس میں فکر کی کیا بات ہے!......تو شاید یہ بھول گیا ہے کہ ہم آدم زاد نہیں جن زاد ہیں اور جن زادوں کیلئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ تو جب چاہے اپنے انسانی پیکر کو گہری نیند سلا کر میرے پاس آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''اے دنیار! تو بھی تو میرے پاس آ سکتی ہے۔'' عارج کہنے لگا۔

''ضرورت محسوس ہوئی تو آ جاؤں گی۔ ویسے ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ آدم زادوں کے درمیان رہ کر ہم آدم زاد بن کے ہی رہیں۔'' میں نے عارج کو سمجھایا، پھر مزید تسلی دی۔

''فکر نہ کرو، میں تیری طرف سے غافل نہیں رہوں گی۔''

اس پر عارج خوش ہو گیا اور بولا ''یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لا کر تو میرے حال سے باخبر رہ سکتی ہے۔''

''اگر تجھے اس دوران میں وقت ملے تو سلیم گڑھ بھی ہو آئیو، مگر کسی کو خبر نہیں ہونی چاہئے۔'' میں نے تاکید کی۔

''دیکھتا ہوں کہ وہاں جا کر کیا صورت پیش آتی ہے!''

عارج یہ کہتے ہوئے بولا ''ارے میں یہ تو بھول ہی گیا کہ لشکر کی روانگی کیلئے مجھ پر بھی کچھ ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں...... میں چلتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

دوسرے دن صبح لشکر کی روانگی سے پہلے عارج کچھ دیر کو مجھ سے مل سکا۔ جس وقت وہ مجھ سے رخصت ہو رہا تھا تو جانے کیوں میرا دل بیٹھا جا رہا تھا! پھر بھی اپنے جذبات و احساسات پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا ''اے عارج! تجھے اللہ اپنی حفظ و امان میں رکھے۔''

''اور تجھے بھی اے دینار!'' عارج فوراً بولا۔ ''خدا حافظ!''

''خدا حافظ۔'' میری آواز یہ کہتے ہوئے قدرے بھاری ہو گئی۔ طرح طرح کے اندیشوں اور وسوسوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ ان اندیشوں کا سبب موجودہ حالات تھے جو شجاع کے ساتھ جنگ پر بھی منتج ہو سکتے تھے۔

عارج کا انسانی قالب بہرحال میدان جنگ میں اب تک متعدد مواقع پر داد شجاعت دے چکا تھا، لیکن عارج کو اس کا تجربہ نہیں تھا۔ میدان جنگ میں کیا صورت پیش آئے، اس سلسلے میں قبل از وقت کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کب کس طرف سے آنے والا تیر پیغام قضا بن جائے، پیشگوئی نہیں کی جا سکتی۔ میری تشویش اور فکرمندی کا سبب یہی تھا۔

اپنے محل کی چھت پر چڑھ کر میں نے لشکر کے کوچ کرنے کا منظر دیکھا۔

میں اپنی چشم تصور کی پراسرار قوت کو بروئے کار لا کر ہندوستان کے ایک ایسے شہر کو دیکھ رہی تھی جہاں کبھی گئی نہیں تھی۔ یہ شہر شاہجہاں آباد (دہلی) تھا۔ اس شہر کے گلی کوچے اور بازار دلہن کی طرح سجے ہوئے تھے۔ اس شہر میں جشن (بادشاہ کی سالگرہ کا دن) منایا جا رہا تھا۔ اس جشن کے دوران ہی اکبر آباد سے لشکر وہاں پہنچا۔ لشکر میں عارج بھی تھا۔

شہزادہ محمد سلطان اور دیگر امرائے سلطنت کے ساتھ عارج نے بھی جشن میں شرکت کی۔ اس جشن میں اورنگزیب نے دوسرے امراء کے ساتھ عارج کو بھی صالح سمجھ کر انعام و اکرام سے نوازا۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عارج نے اورنگزیب سے کہا۔ ''یہ غلام، حضور ظل الٰہی سے خلوت میں ملاقات کا متمنی ہے۔ درخواست ہے کہ غلام کو خلوت میں باریابی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔''

دھیمی آواز میں ادا کئے ہوئے ان الفاظ کو اورنگزیب نے توجہ سے سنا، پھر بغور عارج کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''یقیناً کوئی ایسی ہی بات ہوگی جس کیلئے خلوت ضروری ہے۔ آج بعد نماز مغرب تم ہم سے مل سکتے ہو۔''

اس پر عارج نے شکریہ ادا کیا۔ اس کے انسانی قالب صالح کی شجاعت و ذہانت کا اورنگزیب معترف تھا۔

وقت مقررہ پر عارج نے اورنگزیب سے ملاقات کی اور وہ بات کہہ دی جو اس کے دل میں تھی۔ شہزادہ محمد سلطان کا بدلا ہوا رویہ عارج کیلئے قابل برداشت نہ تھا۔ اس نے ہمت و جسارت سے کام لے کر دبی زبان میں شہزادے کی شکایت بھی کی۔ اس شکایت پر اورنگزیب نے جو کچھ کہا، وہی عارج کی مرضی تھی۔ فیصلہ اس کے حق میں ہوا۔ اورنگزیب نے کہا تھا کہ اب اسے شہزادہ محمد سلطان کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

اورنگزیب کے ساتھ خود ایک زبردست لشکر تھا اور اب اکبر آباد سے بھی افواج آ گئی تھیں۔ چند ہی روز بعد اورنگزیب نے مغل افواج کو شاہجہاں آباد کے مشرق کی طرف کوچ

کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ بذات خود شجاع سے نبرد آزما ہونے کیلئے نکلا تھا۔

اس عرصے میں عارج، سلیم گڑھ ہو آیا تھا جہاں مراد بخش قید تھا۔ عارج کے ذہن پر توجہ دے کر مجھے حقائق پتا چل گئے تھے۔ سلیم گڑھ کے قلعے کا اچھی طرح معائنہ کر کے عارج اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہاں سے مراد بخش کو رہا کرانا زیادہ دشوار نہیں۔ وہ وہاں اپنے مخبروں کو بھی متعین کر آیا تھا اور دیگر ضروری انتظامات بھی کئے تھے تاکہ موقع ملتے ہی وہاں سے مراد بخش کو فرار کرا دے۔

اٹاوہ سے ذرا آگے کھجوہ پر اورنگزیب اور شجاع کے لشکر ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ بڑی زبردست جنگ ہوئی۔ عارج نے بے دلی کے باوجود اس جنگ میں کئی مواقع پر دلیرانہ جرأت کا مظاہرہ کیا۔ جنگ کے دوران میں ایک موقع ایسا آیا کہ شجاع کے لشکر سے ایک امیر تین ہاتھی لے کر نکلا۔ اس نے اورنگزیب کے میسرے پر حملہ کر دیا۔ خوفناک ہاتھیوں اور سادات کے زبردست حملے سے لشکر کا بایاں بازو تقریباً پسپا ہو گیا۔ اس کا اثر قلب لشکر پر بھی پڑا۔ یہاں تک کہ اورنگزیب کی رکاب میں صرف عارج اور اس کے دو ہزار جواں ہمت سپاہی رہ گئے۔ اس موقع پر بھی عارج اور اس کے سپاہیوں نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ اورنگزیب نے خود بھی مخالف لشکر پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھی آگے بڑھایا اور دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ اورنگزیب اور عارج کو مردانہ وار آگے بڑھتے دیکھ کر بھاگتے ہوئے سپاہیوں کے قدم رک گئے۔ ان کی غیرت نے جوش مارا اور وہ پلٹ آئے۔ اورنگزیب کی سواری کے اردگرد جمع ہو کر وہ جان توڑ حملے کرنے لگے۔ سادات بارہہ کی پیش قدمی رک گئی۔ اسی کے ساتھ گھمسان کی لڑائی میں مجھے ایک ایسا منظر دکھائی دیا کہ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ دائیں جانب سے سنسناتا ہوا ایک تیر آیا اور پھر میں نے عارج کو گھوڑے سے گرتے دیکھا۔

اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ عارج کو صالح کے جسم سے نکلنے کی مہلت نہ ملی۔ میری تشویش کی اصل وجہ یہی تھی۔ یہ حقیقت میرے علم میں تھی کہ کبھی کبھی انسانی قالب ہم جنات کیلئے قید خانہ ثابت ہوتے ہیں۔ انسانی قالبوں میں پھنس کر جنات اپنی جان بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس سے پہلے بھی ایک بار عارج، انسانی قالب میں قتل ہوتے ہوتے بچا تھا۔ یہ انسانی قالب مغلیہ تاجدار ہمایوں کے ایک خادم خاص شاہم بیگ کا تھا۔ اگر میں نے بروقت عارج کو اس انسانی قالب سے نکلنے کی تاکید نہ کی ہوتی تو وہ مارا جاتا۔

میری چشم تصور عارج ہی پر مرکوز تھی جو پشت پر دائیں جانب ایک تیر لگنے کے سبب

گھوڑے سے گر گیا تھا۔ ادھر وہ گھوڑے سے گرا، ادھر اس کے سپاہی اسے میدان کارزار سے اٹھا کر لے گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر سکون محسوس ہوا کہ سپاہیوں نے فوری طور پر پشت میں پیوست تیر نکال کے مرہم پٹی کر دی۔ عارج کو ساتھ لئے وہ خیمہ گاہ میں آ گئے تھے۔

پشت پر تیر لگنے کے علاوہ اس معرکے میں عارج کے انسانی قالب کو کئی اور زخم بھی لگے تھے مگر وہ زخم زیادہ گہرے نہ تھے۔ جنگ کے دوران میں کوئی سپاہی لڑنا نہ بھی چاہے تو اسے کم از کم اپنی جان بچانے کیلئے تو لڑنا ہی پڑتا ہے۔ یہی عارج کے ساتھ ہوا۔ وہ بہر حال بزدل بھی نہیں تھا کہ دوسروں کی طرح میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ جاتا مگر اورنگزیب نے اسے عارج کی دلیری ہی سمجھا۔

شجاع کا لشکر بالآخر پسپا اور منتشر ہونے لگا پھر کچھ ہی دیر میں شجاع کے فرار ہونے کی خوشخبری مل گئی۔ امراء نے اورنگزیب کو مشورہ دیا کہ شجاع کو فرار ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ اورنگزیب نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ شجاع کے تعاقب میں جانے کیلئے شہزادہ محمد سلطان کو حکم ہوا۔ شہزادے کے ہمراہ مغل افواج کے کئی جنگجو امیر تھے مگر ان میں عارج نہ تھا۔ اورنگزیب اپنا یہ وعدہ بھولا نہ تھا کہ اسے شہزادہ محمد سلطان کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا پھر یہ کہ عارج زخمی بھی ہو چکا تھا اور اسے آرام کی ضرورت تھی۔

شجاع کے تعاقب میں جانے اور اس سے نبرد آزما ہونے کے سبب شہزادہ محمد سلطان کو بہت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اورنگزیب نے اسی لئے ضروری سامان سفر، تین پوشاک والی خلعت، خاصے کی تلوار اور ایک سو گھوڑے شہزادے کو دیئے۔

اس مقام پر اورنگزیب ایک ہفتے تک مقیم رہا۔ اس عرصے میں عارج کے زخم بھر گئے۔ اورنگزیب نے جن امراء کو اعزازات اور نقد انعامات سے نوازا ان میں عارج بھی شامل تھا۔ عارج کو خلعت، ایک مرصع تلوار اور زنجیر مروارید کی دی گئی۔ اس کے علاوہ 2 لاکھ روپے نقد ملے اور منصب میں بھی ایک ہزار کا اضافہ ہوا۔ اب اس کا منصب 4 ہزاری 3 ہزار سوار ہو گیا۔ یہ سب اس شجاعت اور حوصلے کا صلہ تھا جس کا اظہار میدان جنگ میں ہوا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد جب اورنگزیب نے کھجوہ سے اکبر آباد کی طرف کوچ کا حکم دیا تو مجھے زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ اس کا سبب ملکی حالات پر میری گہری نظر تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اورنگزیب کا مقصد کیا ہے! وہ اکبر آباد میں چند روز سے زیادہ نہ رکتا۔

کھجوہ کے دوران قیام ہی میں احمد آباد سے اورنگزیب کو خبر مل چکی تھی کہ دارا شکوہ وہاں اپنے قدم جما چکا ہے۔ مراد بخش کو پابہ زنجیر کرتے ہی اورنگزیب نے اپنے خسر شاہ نواز

خان صفوی کو وہاں کا صوبے دار بنا دیا تھا۔ پہلے یہ صوبہ مراد بخش کے زیر نگیں تھا۔ آسائش بانو کا نانا شاہ نواز خان صفوی اورنگزیب سے کچھ زیادہ خوش نہ تھا۔ ایک موقع پر اورنگزیب خود اسے بھی قید کرا چکا تھا۔ ذاتی طور پر شاہ نواز خان، اورنگزیب کے بجائے دارا شکوہ کو حکومت و اقتدار کا اہل سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دارا شکوہ جب لٹا پٹا احمد آباد پہنچا تو شاہ نواز خان اس سے مل گیا۔

یہ وہ اطلاعات تھیں جنہیں سن کر اورنگزیب نے احمد آباد کا قصد کیا۔ وہ چند روز اکبر آباد میں رک کر احمد آباد بڑھ جاتا۔ اسی بنا پر اکبر آباد پہنچ کر اورنگزیب شہر میں داخل نہ ہوا۔ اس نے باغ نور کے قریب قیام کیا۔

عارج کی خواہش تو یہی تھی کہ وہ اکبر آباد ہی میں رک جائے مگر یہ ممکن نہ ہوا۔ صرف پانچ دن مغل لشکر وہاں رکا اور پھر احمد آباد کیلئے کوچ کر گیا۔ اس عرصے میں عارج مجھ سے بس ایک بار مل سکا۔ اس نے کہا ”اے دینار! یہ انسانی قالب تو میرے لئے وبال جان ہو گیا ہے۔ کیوں نہ میں اسے چھوڑ کر کوئی اور انسانی پیکر اپنا لوں تا کہ تیرے ساتھ اکبر آباد میں ہی رہ سکوں۔“

”نہیں اے عارج!“ میں نے انکار کر دیا۔ ”کیا خبر کسی اور انسانی قالب میں تجھے قرار نہ آئے!“

”لیکن میں آخر کیوں اور کب تک تیرا فراق جھیلوں؟“ عارج کہنے لگا۔

”میرا دل کہتا ہے کہ فراق کا یہ موسم جلد گزر جانے والا ہے۔“ میں نے عارج کو تسلی دی۔

عارج نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ وہ سلیم گڑھ ہو آیا ہے اور اب منتظر ہے کہ اسے کب مہلت ملے! میرے ایما پر وہ مراد بخش کو قید سے رہا کرانا چاہتا تھا مگر ابھی اورنگزیب اس کی جان نہیں چھوڑ رہا تھا۔

مغل لشکر پر میری توجہ عارج ہی کی وجہ سے تھی۔ ابھی لشکر اکبر آباد سے نکل کر چند منزلیں طے کر پایا تھا کہ مخبروں نے خبر دی، دارا شکوہ، احمد آباد سے ایک بڑا لشکر لے کر چل دیا ہے۔ اس عرصے میں دارا شکوہ اپنے قدیم امیر نمک خوار راجا جسونت سنگھ سے بھی مراسلت کرتا رہا تھا۔ راجا جسونت سنگھ وہی تھا جو پہلے اورنگزیب سے شکست کھا کر اپنے علاقے میں چلا گیا تھا۔ راجا نے دارا شکوہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ راجپوتانہ آ جائے گا تو بہادر راجپوت اس سے مل جائیں گے۔

اورنگزیب نے دارا شکوہ کی طاقت توڑنے کیلئے راجا جسونت سنگھ کے نام معافی کا فرمان جاری کر دیا۔ راجا جسونت اس لئے دارا شکوہ سے غداری پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے ایک پٹے ہوئے مہرے کے مقابلے میں اورنگزیب کو ترجیح دی۔

راجا جسونت سنگھ کی طرف سے مطمئن ہو کر اورنگزیب نے اجمیر جانے کا فیصلہ کیا۔ ادھر دارا شکوہ، اجمیر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ آخری وقت تک راجا کو رام کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر اس کی مراسلت کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ راجا جسونت سنگھ سے دارا شکوہ کی تمام امیدیں منقطع ہو گئیں۔ اسی دوران میں اورنگزیب کے اجمیر پہنچنے کی اطلاع ملی۔

دارا شکوہ نے مقابلے پر کمر باندھ لی لیکن اورنگزیب اور اس کے لشکر کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ کھلے میدان میں جنگ کرنا دارا شکوہ کیلئے مفید نہ تھا۔ وہ اسی لئے اجمیر کے نواحی کوہستان میں مورچے باندھ کر محصور ہو گیا۔

اورنگزیب نے دارا شکوہ کی مورچہ بندیوں سے نصف کوس کے فاصلے پر لشکر گاہ قائم کی اور مورچہ بندی کا حکم دے دیا۔ یہاں سے بہ آسانی دارا شکوہ کے مورچوں پر گولہ باری کی جا سکتی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ یہ جنگ انتہائی خونریز اور ہلاکت آفریں ہو گی۔ گزشتہ جنگ میں عارج موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا تھا۔ اب میں ہرگز ایسا نہیں چاہتی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ جنگ چھڑتی میں نے ایک رات شہزادی آسائش بانو کے جسم کو چھوڑ دیا۔ اکبر آباد سے اجمیر پہنچنا ایک جن زادی کیلئے کون سا مشکل تھا! آسائش بانو کو میں گہری نیند سلا آئی تھی۔

نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی جب میں اورنگزیب کی لشکر گاہ میں پہنچی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

عارج کا خیمہ اورنگزیب کے خیمے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں وہاں پہنچی اور خیمے میں داخل ہوئی تو عارج کو بے خبر سوتے دیکھا، وہ خیمے کے اندرونی حصے میں تھا۔ اس کے خدمت گار بیرونی حصے میں تھے۔ میں نے اسی لئے عارج کو دھیرے سے جگایا۔

”چل اے عارج، اس جسم سے نکل چل!“ میں دھیمی آواز میں بولی۔

”کہاں اے دینار؟“ عارج نے سوال کیا۔

”جہاں بھی کہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیا تجھے میرے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض ہے؟“

”نہیں اے دینار!......“ وہ یہ کہتے ہی ضارج کے قالب سے نکل آیا اور اس پر نیند

مسلط کردی۔

فوری طور پر عارج کو ساتھ لئے ہوئے میں قریبی پہاڑوں کی طرف نکل آئی۔ وہاں میں ایک چٹان کے نیچے بیٹھ گئی۔

"ہاں اب ذرا بتا کہ تو اچانک یہاں کیسے آ گئی؟" عارج نے پوچھا۔ وہ بھی میرے پاس بیٹھ چکا تھا۔

مختصراً میں نے عارج کو ممکنہ خطرے سے آگاہ کیا اور بولی۔ "ان حالات میں تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ وقتی طور پر صالح کے انسانی قالب کو چھوڑ دے۔ ضروری نہیں کہ اس قالب سے نکل کر فوراً ہی تو کوئی دوسرا قالب اپنا لے۔"

عارج کیلئے میری بات سمجھنا دشوار نہ ہوا۔ وہ اسی رات میرے ساتھ اکبرآباد آ گیا۔ کسی انسانی قالب میں پناہ لئے بغیر بھی ہم خطرے سے محفوظ رہ سکتے ہیں، مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اسی بنا پر میرے نزدیک عارج کو بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ یوں بھی صالح کے جسم سے نکل آنے کا اقدام عارضی تھا۔ جنگ کے بعد عارج پھر اس انسانی پیکر کو اپنا سکتا تھا۔

ممکنہ جنگ کے بارے میں میرے خدشات اور اندیشے درست ہی ثابت ہوئے۔

اس خونریز معرکے میں دونوں جانب کے بڑے بڑے بہادر لڑاکا مارے گئے۔ صالح بھی کئی بار موت کے منہ میں جانے سے بچا۔ وہ اوپر سے لڑھکائے جانے والے ایک بڑے پتھر کی زد میں آتے آتے بچا، مگر لڑائی کے دوران وہ شدید زخمی ہو گیا۔ اسے پچھلی صفوں میں پہنچا دیا گیا کیونکہ وہ اگلی صفوں میں لڑ رہا تھا۔ لڑتے ہوئے جو افراد زخمی ہو جاتے انہیں پچھلی صفوں میں پہنچا دیا جاتا۔ جہاں جراح و طبیب انہیں پوری طبی امداد فراہم کرتے۔ اس میں منصب دار یا کسی عام فوجی کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔

میرے انسانی قالب شہزادی آسائش بانو کا نانا شاہ نواز خان بھی اس جنگ میں بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے مارا گیا۔

دارا شکوہ کو جب شاہ نواز خان کے مارے جانے کی خبر ملی تو اسے شکست کا یقین ہو گیا۔ وہ اپنی بیوی اور چار خواصوں کے ساتھ بہت تھوڑے جواہر اور اشرفیاں لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

دارا شکوہ کا سارا لاؤ لشکر تاخت و تاراج کر دیا گیا۔ اس کے جو امیر زندہ بچ گئے انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔

مغل لشکر جب اجمیر سے دوبارہ اکبرآباد لوٹ کر آیا تو صالح کسی حد تک صحت یاب

ہو چکا تھا، مگر اب بھی اسے علاج اور آرام کی ضرورت تھی۔ عارج تو اس کا منتظر ہی تھا کہ صالح کب اکبرآباد آئے۔ اس نے مجھ سے کہا "اے دینار! اگر تو کہے تو میں دوبارہ صالح کے جسم میں پناہ لے لوں؟"

"سوچ لے، وہ ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا۔" میں بولی۔

"بس سوچ لیا۔" عارج کہنے لگا "اس کے جسم میں اتر کر اورنگزیب سے میں، اکبرآباد میں رک جانے کی اجازت لے لوں گا۔"

"اورنگزیب اجازت دے دے گا؟" میں نے سوال کیا۔

"مجھے توقع ہے کہ وہ منع نہیں کرے گا۔" عارج نے جواب دیا۔

پھر وہی ہوا جو عارج نے کہا۔ اورنگزیب نے عارج کے انسانی پیکر صالح کو اکبرآباد میں رکنے کی اجازت دے دی۔ عارج نے اب صالح کے جسم پر قبضہ کر لیا تھا۔ اورنگزیب مزید ایک ماہ اکبرآباد میں قیام کر کے شاہجہان آباد چلا گیا۔

صالح کے قالب میں عارج اب قلعہ اکبرآباد میں تھا۔ اس نے اسی حویلی میں قیام کیا جہاں پہلے رہتا تھا۔ شہزادی آسائش بانو کی حیثیت سے میں نے اس کی عیادت ضروری تھی۔ اب اکبرآباد میں نہ تو شہزادہ محمد سلطان تھا نہ امیرالامراء ذوالفقار خان اس لئے مجھے اور عارج دونوں ہی کو کوئی فکر نہ تھی۔ جب اورنگزیب شاہجہان آباد روانہ ہوا تو عارج کے زخم مندمل ہونے لگے تھے، مگر اس نے مصلحتاً دانستہ بستر نہ چھوڑا۔ میرے ایما پر اس نے یہی شہرت دے رکھی تھی کہ ابھی وہ بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں ہوا۔ مبادا اورنگزیب پھر اسے اپنے ساتھ شاہجہان آباد چلنے کا حکم صادر کرے۔ صحت یاب ہونے کے بعد ابھی اس کا ارادہ شاہجہان آباد جانے کا نہ تھا۔ وہ میرے پاس اکبرآباد میں رہنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ میری مرضی یہ تھی کہ وہ مراد بخش کے معاملے کو بھی نمٹا دے۔ میں اس سے یہ اظہار بھی کر چکی تھی۔

میری چشم تصور متحرک تھی۔ فقیروں کے ایک گروہ کو میں قلعے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ان فقیروں کی نظریں قلعے کے پھاٹک پر تھیں۔ عشاء کی نماز کے بعد روز انہیں قلعے سے کھانا ملتا تھا۔ قلعے کا پھاٹک کھلا تو ان کے چہرے پر رونق آ گئی۔ پھاٹک سے چار سپاہی نکلے اور انہیں کھانا تقسیم کر کے چلے گئے۔ وہ ٹکڑیوں میں بٹ کر کھانا کھانے لگے۔ دو ادھیڑ عمر فقیر بقیہ سے ہٹ کر بیٹھے تھے۔ انہی دونوں میں سے ایک اپنے ساتھی کی طرف جھکا اور سرگوشی کی۔ "وہ کب آئیں گے؟"

دوسرے نے مدھم آواز میں جواب دیا "جب نصف شب ہو جائے گی۔"

پہلے فقیر نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور کھانا کھانے لگا۔

یہ سلیم گڑھ کا قلعہ تھا اور یہاں اورنگزیب کا بھائی مراد بخش ایام اسیری گزار رہا تھا۔ اس سے میرا تعلق یہ تھا کہ وہ میرے انسانی قالب آسائش بانو کا باپ تھا۔ مراد بخش کو خورد ونوش کیلئے روزانہ جو خرچ ملتا، اسی میں فقیروں کیلئے کھانا پکتا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ قلعے کے باہر فقیر بیٹھے رہتے ہیں۔ مراد بخش کو جو خرچ ملتا تھا وہ کافی ہوتا تھا۔ اس میں فقیروں کو بھی کھانا کھلایا جاسکتا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اس پر قلعہ دار اعتراض کرتا۔ فقیروں کو کھانا ملنے لگا۔ اس سے مراد بخش کا منشا صرف اتنا تھا کہ اس کی سخاوت کی دھوم ہو، یہ کہ ایام اسیری میں بھی اس نے خلق خدا کا خیال رکھا۔ اسے یقین تھا کہ جلد یا بدیر رہائی مل جائے گی۔ اورنگزیب اسے زیادہ دن قید نہ رکھ سکے گا۔ اس کے خیال میں اورنگزیب کو کوئی بڑی غلط فہمی ہوگئی تھی۔ اس سے قطع نظر مراد بخش کو اپنے بہی خواہوں اور دیرینہ وفاداروں سے بھی امید تھی کہ وہ اس کی رہائی کیلئے کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکالیں گے۔ سلیم گڑھ کے مضبوط قلعے سے خود مراد بخش کا نکلنا ناممکن تھا۔ جب تک باہر سے کوئی کوشش نہ ہوتی۔ اسے اس قلعے میں قید ہوئے یہ دوسرا سال تھا۔ اس عرصے میں باہر کیا ہوا اسے کچھ خبر نہ تھی۔

قید کے دوران میں مراد بخش نے اورنگزیب سے صرف دو رعایتیں چاہی تھیں۔ اورنگزیب کے حکم پر یہ دونوں رعایتیں مل گئی تھیں۔ شام ہوتے ہی وہ زندان میں اسی طرح محفل سجاتا۔ بادہ وساغر بھی ہوتے اور ساقی بھی! غرق مئے ناب ہو کر وہ بھول جانا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا گزر چکی ہے! سوسن اس کی دل بستگی کا پورا خیال رکھتی۔ جب سے سوسن آئی تھی، قید اسے زیادہ گراں معلوم نہ ہوتی تھی۔ مے نوشی ہی کے دوران میں کھانا کھاتا اور پھر مسلح پہرے داروں کی نگرانی میں زندان کی کوٹھری سے نکل کر چہل قدمی کرتا۔ اس کے بعد سوسن کو اور اسے کوٹھری میں بند کر دیا جاتا۔ کوٹھری میں ضرورت کا تمام سامان تھا تاکہ رات کے وقت کسی ضرورت سے اسے باہر نہ نکالنا پڑے۔

رات بھر کوٹھری کے طاق میں چراغ روشن رہتا۔ مراد بخش نے پہلے اس پر اعتراض کیا تھا، پھر اسے روشنی کی عادت ہوگئی تھی۔ ہاں پہرے داروں نے اس کی یہ بات ضرور مان لی تھی کہ رات کے وقت کوئی پہرے دار آہنی سلاخوں والے دروازے کے سامنے آکر کھڑا نہ ہوتا۔ اس سے مراد بخش کی خلوت پر اثر پڑتا تھا۔ اس رات بھی وہ نصف شب سے کچھ پہلے سو گیا تھا۔ اسے خبر نہ تھی کہ وہ رات اس کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہو سکتی ہے۔

مراد بخش قلعے کے اندر اپنی کوٹھری میں محو خواب تھا اور قلعے کے باہر دو سپاہی آخری

گشت لگانے نکلے تھے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ قلعہ دار کا حکم تھا کہ نصف شب کے قریب قلعے کے باہر کا جائزہ لیا جائے۔ اگر اس وقت کوئی شخص قلعے کے آس پاس نظر آئے تو اسے ہٹا دیا جائے اور مشتبہ دکھائی دے تو گرفتار کر لیا جائے۔ کھانا کھانے کے بعد فقیر ایک ایک کر کے وہاں سے چلے جاتے تھے، مگر اس رات دو فقیر قلعے کی دیوار کے قریب چادر بچھائے سوئے نظر آئے۔ دونوں سپاہی اپنے ہاتھوں میں مشعلیں اٹھائے ان دونوں کی طرف بڑھ گئے۔ یہ وہی فقیر تھے جو کھانا کھاتے ہوئے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

دور سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ دونوں قریب قریب چادر بچھائے ہوئے سو رہے ہیں مگر درحقیقت ایسا نہ تھا۔ دونوں فقیر جاگ رہے تھے، سپاہیوں کے قریب پہنچتے ہی وہ دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہی میں سے ایک فقیر نے اپنی گدڑی سے ایک کاغذ نکالا اور ایک سپاہی کو تھما دیا۔ سپاہیوں اور ان فقیروں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ سپاہی لوٹ کر پھر قلعے کی طرف چلے گئے۔ فقیروں نے اٹھ کر اپنی چادریں اور سامان سنبھال لیا اور ایک جانب بڑھنے لگے۔ دونوں سپاہی قلعے کے پھاٹک میں داخل ہوگئے تو فقیر پھر اسی جگہ واپس آگئے۔ قلعے میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ زیادہ تر پہرے دار اونگھ رہے تھے۔ دونوں سپاہی انہی اونگھتے ہوئے پہرے داروں میں سے ایک کے پاس پہنچے۔ اونگھتا ہوا پہرے دار ایک دم مستعد نظر آنے لگا۔

ایک سپاہی نے اس پہرے دار کو وہ کاغذ تھما دیا جو اسے فقیر نے دیا تھا۔ پہرے دار نے وہ کاغذ جلدی سے اپنی جیب میں سرکا لیا۔ دونوں سپاہی وہاں سے لوٹ گئے۔ سپاہیوں کے قدموں کی چاپ معدوم ہوگئی تو پہرے دار نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا کہ فرش پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ پہرے دار نے اپنے ساتھی کا شانہ پکڑ کر ہلایا تو وہ جاگ اٹھا۔

''کیا وقت ہوگیا ہے؟'' پہرے دار کے ساتھی نے دہشت زدہ آواز میں پوچھا۔

''ہاں، پیغام آگیا ہے، ہوشیار ہو جاؤ!'' پہرے دار نے سرگوشی کی اور پھر دبے پاؤں کوٹھری کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے کوٹھری کا قفل کھولا کہ زیادہ آواز نہ ہو۔ پھر وہ کوٹھری میں داخل ہوگیا۔ اس نے چراغ کی روشنی میں کوٹھری کا جائزہ لیا۔ مراد بخش اور سوسن دونوں ہی بے خبر سو رہے تھے۔ پہرے دار، مراد بخش کے بستر کی طرف بڑھا۔

مراد بخش کو پہرے دار نے اس طرح جگایا کہ سوسن کی آنکھ نہ کھلے۔ مراد بخش نے نشے اور نیند سے سرخ آنکھیں سوالیہ انداز میں پہرے دار کی طرف اٹھائیں۔ پہرے دار نے

پیغام نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور خاموشی کے ساتھ دبے پاؤں کوٹھری کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر اس نے کوٹھری کے دروازے کو قفل نہ لگایا بلکہ اسے صرف بھیڑ دیا اور پھر دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

ابھی تک مراد بخش کا ذہن نشے سے بوجھل تھا۔ کچھ دیر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے! پھر اسے کاغذ کا خیال آیا جو پہرے دار دے گیا تھا۔ وہ اٹھ کر چراغ کے قریب گیا اور اسی عالم میں کاغذ کی تہہ کھول کر عبارت پڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

پہلا فقرہ پڑھ کر مراد بخش کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ بغیر القاب و آداب کے لکھا گیا تھا کہ یہ آپ کی رہائی کی رات ہے۔ پھر اس کی نظر تیزی سے بقیہ عبارت پڑھنے لگی۔

"کوٹھری کا دروازہ اس وقت کھلا ہوا ہے۔ آپ کو باہر نکلنے سے روکا نہیں جائے گا۔ آپ کے کچھ وفادار قلعے میں ہیں جو آپ کو ایک کمند تک پہنچا دیں گے۔ کمند قلعے کی فصیل پر لگا دی گئی ہے۔ جیسے ہی آپ کوٹھری سے نکلیں گے' آپ کا یہ وفادار آگے چلنے لگے گا۔ آپ احتیاط اور خاموشی کے ساتھ اس کے پیچھے ہو جائیں۔ قلعے کی فصیل پر جہاں کمند لگائی گئی ہے ایک پہرے دار مشعل لئے کھڑا ہوگا جو آپ کے قریب آتے ہی وہاں سے ہٹ جائے گا۔ آپ خوب واقف ہیں کہ قلعے میں آپ کی حفاظت کا کتنا سخت بندوبست ہے! ذرا سا بھی شور ہونے پر ہر طرف سے مسلح پہرے دار دوڑ پڑیں گے اس لئے درخواست ہے کہ خاموشی اور احتیاط سے کام لیں۔" اس عبارت کے نیچے کسی کا نام درج نہیں تھا۔

مراد بخش اب پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ اس کے چہرے سے دبے دبے جوش کا اظہار ہونے لگا۔ وہ بستر کے قریب آیا اور پیغام کو تکیے کے نیچے رکھ دیا، پھر سوسن کی طرف نگاہ اٹھائی جو اب تک غافل سو رہی تھی۔

میری توجہ مراد بخش کی نقل و حرکت کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن پر بھی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، میں تنہا فرار ہو گیا تو بے گناہ سوسن پر الزام آئے گا اور یہ قتل کر دی جائے گی۔ پھر اس نے خود ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اب وہ یہ سوچنے لگا کہ کم از کم سوسن کو اس بھید سے آگاہ تو کر دے اور اسے سمجھا دے۔

اس نے سوسن کو جگایا اور ساری بات بتا کر بولا۔ "تم سے پوچھ گچھ ہو تو کہہ دینا تمہیں کچھ خبر نہیں' تم سو رہی تھیں۔"

سوسن ابھی تک نیم غنودگی کے عالم میں تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مراد بخش سچ

کہہ رہا ہے۔ وہ منہ پھاڑے مراد بخش کو دیکھے جا رہی تھی۔ مراد بخش نے اسے پھر مخاطب کیا۔

"اب ہم چلتے ہیں۔ تمہیں ہم نے خدا کے سپرد کیا۔ اگر زندگی نے وفا کی اور تقدیر مددگار ہوئی تو پھر ملیں گے۔" یہ کہتے ہی مراد بخش کھڑا ہو گیا اور چلنے کے لئے پلٹا۔

سوسن نے جو یہ دیکھا کہ واقعی مراد بخش جا رہا ہے تو اس نے ایک چیخ مار کر مراد کا دامن پیچھے سے تھام لیا اور روتے ہوئے کہنے لگی:

"آپ مجھے کس کے سپرد کر کے جا رہے ہیں؟ خدا کے لئے مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلئے!"

مراد رک گیا اور پلٹ کر اسے نزاکت وقت کا احساس دلانے لگا، مگر سوسن اور زیادہ آہ و فغاں کرنے لگی۔

سوسن کی آہ و زاری سے محافظ ہوشیار ہو گئے۔ پھر ہر طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔

ذرا سی دیر میں اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وہ پہرے دار جس نے مراد کی کوٹھری کا قفل کھول دیا تھا۔ یہ رنگ دیکھ کر جلدی سے جھپٹا اور پھر اس نے دوبارہ قفل لگانے میں دیر نہ کی۔ اسے بہر حال اپنی زندگی عزیز تھی۔ فصیل پر جہاں کمند لگائی گئی تھی، اس کے قریب جو پہرے دار مشعل لئے کھڑا تھا، ہنگامہ ہوتے ہی اپنی جگہ سے بھاگ گیا۔

قلعے کے اندر شور اور ہنگامے کی آوازیں سن کر باہر کھڑے ہوئے دونوں فقیر بھی فرار ہو گئے۔

مراد بخش کو قید سے رہائی دلانے کی کوشش خود اس کی سادہ لوحی کے سبب ناکام ہو گئی۔

دوسرے دن وہ دونوں فقیر عارج کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے، مگر اس وقت ان کے جسموں پر بہترین لباس تھا۔ وہ دونوں عارج کے انسانی پیکر صالح کے وہی خدمت گار تھے جن سے صالح بھی اس نوعیت کے کام لیتا رہتا تھا۔ ان دونوں کا کوئی قصور نہ تھا اور نہ عارج کی غلطی تھی۔ اس نے مراد کی رہائی کا منصوبہ کافی غور و غوض کے بعد بنایا تھا۔ اس میں عارج یا اس کے منصوبے کی کوئی خامی نہ تھی۔ اس کے دونوں خدمت گاروں نے اسی منصوبے پر عمل کیا تھا۔ عارج نے اسی لئے ان سے جواب طلبی نہیں کی اور انہیں نئی ہدایات دیں۔

ادھر شاہجہان آباد میں اورنگ زیب کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ مراد بخش کو فوری طور پر سلیم گڑھ کے قلعے سے نکال کر گوالیار کے قلعے میں محصور کر دیا جائے۔ اس حکم کے ساتھ اس نے بقیہ ہدایات بھی دیں کہ مراد کی منتقلی کو انتہائی راز میں رکھا جائے۔ جو

رعایتیں مراد کو پہلے دی گئی تھیں، وہ بھی واپس لے لی گئیں۔ اسے بیڑیاں پہنانے کا حکم ہوا۔ ساغر و مینا اور ساقی کو بھی اس سے جدا کرنے کی ہدایت ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اورنگ زیب اس معاملے کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتا تھا، قرائن سے یہی پتا چل رہا تھا۔

مجھے اور عارج کو اکبر آباد میں رہتے ہوئے چار سال بیت چکے تھے۔ اس عرصے میں کئی اہم واقعات رونما ہوئے تھے۔ ان واقعات کی وجہ سے اورنگ زیب کا اقتدار مزید مضبوط و مستحکم ہو چکا تھا۔ داراشکوہ کا کانٹا گزشتہ سال ہی نکل گیا تھا۔ دہانڈر کے ایک زمیندار ملک جیون نے اس سے غداری کی۔ داراشکوہ کو گرفتار کرلیا گیا۔ پھر شاہجہان آباد پہنچنے پر دوسرے ہی دن اسے اورنگزیب کے حکم پر قتل کر دیا گیا۔

دوسرا بھائی شجاع حکومت و اقتدار سے محروم ہونے کے بعد مفقود الخبر ہو چکا تھا۔ اب صرف مراد زندہ بچا تھا جو گوالیار کے قلعے میں قید تھا۔ اورنگزیب کو داراشکوہ کے معاملے میں بڑی بدنامی اٹھانی پڑی تھی۔ اس نے مراد کو راستے سے ہٹانے کیلئے ایک اور راہ اختیار کی اورنگ زیب نے اس سلسلے میں جس تدبیر پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی سن گن عارج کو بھی ہو گئی۔ اس کے مخبر شاہجہاں آباد سے ایک ایک خبر پہنچا دیتے تھے۔ عارج اس لئے فکر مند ہو گیا۔

مراد کے متعلق عارج کو جو خبریں ملتی تھیں اور وہ جو قدم بھی اٹھاتا تھا، میں بھی اس سے بے خبر نہ رہتی تھی۔ عارج مجھے ہر بات بتا دیتا تھا۔ کچھ باتیں میں اپنے طور پر معلوم کر لیتی تھی۔ مراد کے باب میں اورنگ زیب کے احکام پر اتنی راز داری سے عمل ہوا تھا کہ کافی دن بعد عارج کو حالات کا علم ہو سکا۔ گوالیار کے قلعے میں اس قدر سخت انتظامات تھے کہ کئی بار کوشش کے باوجود عارج کے آدمیوں کو ناکامی ہوئی۔ اسی کے پیش نظر ایک روز عارج مجھ سے کہنے لگا۔ ’’اے دینار! اب ایسا لگتا ہے کہ خود مجھی کو گوالیار جانا پڑے گا۔‘‘

’’اس معاملے میں تجھے زیادہ جلد بازی کرنے کی ضرورت نہیں۔‘‘ میں نے تاکید کی۔ ’’تجھ پر اورنگ زیب کو شک نہیں ہونا چاہئے۔ یہ نہ بھول کہ مراد بخش کو جب سلیم گڑھ کے قلعے میں رکھا گیا تھا تو وہاں بھی تو گیا تھا اور اب گوالیار جانے کی بات کر رہا ہے۔‘‘

’’کسے یاد ہوگا کہ میں سلیم گڑھ گیا تھا۔‘‘ عارج بولا۔

’’یہ نہ سمجھ! یاد رکھنے والے سب یاد رکھتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ ابھی کچھ دن اور ٹھہر جا۔‘‘ میں نے سمجھایا۔

عارج مان گیا۔ اس کے چند ہی روز بعد ایک نیا فتنہ کھڑا ہو گیا۔ عارج کو اس کے

مخبروں نے خبر دی تھی کہ شاہجہاں آباد کا ایک نوجوان عرفان بیگ، مراد بخش پر اپنے باپ کے خون کا دعویٰ کرنے والا ہے۔ مخبروں نے اس بارے میں تمام ضروری معلومات فراہم کی تھیں۔

عرفان بیگ ایک شخص علی نقی کا بیٹا تھا۔ مراد بخش جب احمد آباد کا صوبے دار تھا تو یہی علی نقی اس کا دیوان اور مشیر تھا۔ کسی بات پر خفا ہو کر مراد نے اس کے سینے میں برچھی گھونپ دی۔ پھر خواجہ سراؤں نے مراد کے اشارے پر علی نقی کو قتل کر دیا۔ یہ پورا واقعہ کس طرح پیش آیا۔ عارج کے مخبروں نے بھی اس سلسلے میں کچھ نہ لکھا تھا۔ وہ چھان بین کر رہے تھے۔ مخبروں کی اطلاعات کے مطابق شاہجہاں آباد میں ہر طرف یہی خبریں گشت کر رہی تھیں۔ ایک غیر مصدقہ اطلاع یہ بھی تھی کہ اورنگ زیب کے دربار کا ایک امیر کنور رام سنگھ بھی خفیہ طور پر عرفان بیگ سے ملا ہے۔ عارج کو اس آخری اطلاع سے کچھ زیادہ وزن معلوم نہ ہوا۔ میری رائے مختلف تھی، مگر میں نے فی الحال اس کا اظہار نہیں کیا۔ یوں بھی اس اطلاع کی تصدیق نہ ہو سکی۔

’’میرا خیال یہ ہے اے دینار کہ اس قتل کے دعوے میں کم از کم اورنگ زیب کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔‘‘ عارج نے رائے زنی کی۔

’’تصدیق کے بغیر حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا‘ لیکن مجھے لگتا ہے اے عارج تو اورنگ زیب کی طرف سے کچھ زیادہ ہی خوش فہمی کا شکار ہے۔ اس کا سبب غالباً تیرا انسانی قالب ہے جو اورنگ زیب کا وفادار ہے۔‘‘ میں نے اپنی بات کہہ ہی دی۔

’’اے دینار! حالات کا تقاضا یہ ہے کہ میں خود شاہجہاں آباد جاؤں۔‘‘ عارج کہنے لگا۔ ’’اگر شاہ جہاں آباد سے آنے والی اطلاعات درست ہیں تو میں ہر قیمت پر عرفان بیگ کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) عبدالوہاب کی عدالت میں یہ دعویٰ دائر کرنے سے روک دینا چاہتا ہوں۔ میں نے یہ قدم نہ اٹھایا تو مراد بخش کو سزائے موت سنا دی جائے گی۔‘‘

’’تیری تمام باتیں درست سہی مگر تو یہ بھول رہا ہے کہ تو چار ہزاری منصب دار ہے‘ کوئی معمولی آدمی نہیں جو تیری غیر حاضری اخفا میں رہ سکے۔ خفیہ طور پر شاہ جہاں آباد جا کر واپس آ جانا ذرا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری نہیں کہ عرفان بیگ دعویٰ نہ کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ میں پھر تجھے یہ تاکید کردوں گی کہ حالات کے دباؤ میں آ کر کوئی غیر ذمہ دارانہ قدم نہیں اٹھانا...... کوئی ایسا قدم جو کسی آدم زاد کیلئے اٹھانا ناممکن ہو۔‘‘ میں نے عارج کو اچھی طرح سمجھایا۔

’’اللہ مالک ہے۔‘‘ عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ’’وہی کوئی راہ نکالے گا‘ تو مطمئن رہ‘ میں اپنی جناتی صفات بروئے کار نہیں لاؤں گا۔‘‘

دو روز بعد ہی راہ نکل آئی۔ میر سامان فاضل خان سے عارج کی ملاقات ہو گئی۔ عارج جس بہانے کی تلاش میں تھا' اسے ہاتھ آ گیا۔ چند دن پہلے اورنگ زیب نے میر سامان فاضل خان کو حکم بھیجا تھا۔ فاضل خان اس حکم کی تعمیل میں اس دن آخری بار نظر بند شاہ جہاں سے ملا تھا۔ اورنگ زیب کی ہدایت تھی کہ سختی کئے بغیر شاہجہاں سے وہ جواہر' مروارید اور مرصع اشیاء حاصل کر لی جائیں جو اس کے استعمال میں ہیں۔ حکم میں کوئی معیاد مقرر نہیں کی گئی تھی۔

اول اول شاہجہاں گریز کرتا رہا' مگر جب فاضل خان کا تقاضا بڑھتا گیا اور ایک خواجہ سرا ہر وقت اس کے سر پر مسلط رہنے لگا تو وہ جھنجھلا گیا۔ اس نے تمام مطلوبہ اشیاء ان کے حوالے کر دیں۔ اسی ضمن میں اورنگ زیب نے بھی شاہجہاں کو ایک خط لکھا تھا۔ وہ خط بھی میر سامان فاضل خان نے شاہجہاں کو پہنچا دیا تھا۔ اس خط میں اورنگ زیب نے شاہ جہاں کو لکھا تھا کہ ایسے قیمتی تحفے جو ایام سلطنت کی پوشاک سے متعلق ہیں' اس گوشہ نشینی میں اپنے پاس رکھ چھوڑنا تقوے کے خلاف ہے۔

شاہجہاں نے صرف ایک تسبیح اپنے پاس رہنے دی مگر فاضل خان کے مقرر کردہ خواجہ سرا نے اس کا مطالبہ بھی کر دیا۔ یہ تسبیح مروارید کی تھی۔ تسبیح کے سو (100) دانے تمام کے تمام ہم رنگ اور ہم وزن تھے۔ ان دانوں کو بڑی تلاش سے فراہم کیا گیا تھا اور تسبیح کے لئے امام بھی بڑی کوششوں کے بعد دستیاب ہوا تھا۔ اس تسبیح کی مالیت اس زمانے میں چار لاکھ روپے تھی۔ یہ تسبیح شاہ جہاں نے الماس کی ایک آرائی کے ساتھ اپنے گلے میں ڈال رکھی تھی۔ اس نے آرائی تو اتار کر دے دی اور دوسرے جواہر بھی مگر تسبیح نہ دی۔

جب خواجہ سرا نے اس تسبیح کیلئے بھی اصرار کیا تو شاہجہاں کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا' وہ غصے میں بولا۔ ''اس سے وظیفہ پڑھا جاتا ہے' اگر اسے دینا ہی ہوا تو میں ہاون میں کوٹ کر بھجواؤں گا۔''

خواجہ سرا یہ درشت جواب سن کر خاموشی کے ساتھ میر سامان فاضل خان کے پاس لوٹ آیا۔

سختی کرنے کیلئے اورنگ زیب نے منع کیا تھا اس لئے فاضل خان نے بقیہ اشیاء پر صبر کیا جن کی مالیت سولہ لاکھ روپے کے قریب تھی۔ اب فاضل خان یہ تمام مرصع اور قیمتی اشیاء لے کر شاہ جہاں آباد جانے والا تھا۔ شاہ جہاں آباد کو اب اورنگ زیب نے باقاعدہ طور پر اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا۔ اکبر آباد کو اب پہلی سی اہمیت حاصل نہیں رہی تھی۔

عارج نے میر سامان فاضل خاں کو شیشے میں اتار لیا۔ ایک قیمتی تحفے کے عوض میر سامان اس پر راضی ہو گیا کہ مطلوبہ اشیاء کے حصول میں اورنگ زیب کے سامنے عارج کے انسانی پیکر صالح کا نام بھی لے دے۔ میر سامان کو اورنگ زیب کے حضور یہ کہنا تھا کہ اس سلسلے میں صالح نے بڑی کوشش کی ہے اور وہ اورنگ زیب کی قدم بوسی کیلئے ساتھ ہی شاہ جہاں آباد آیا ہے۔ اس طرح اورنگ زیب بھی اس سے خوش ہو جاتا اور اسے شاہجہاں آباد میں عرفان بیگ سے ملنے کا موقع بھی ہاتھ آ جاتا۔

عارج کو یقین تھا کہ وہ اپنی پراسرار جناتی قوتوں کو استعمال کئے بغیر ہر حال میں عرفان بیگ سے اپنی بات منوا لے گا۔ کسی سے اپنی بات منوانے کیلئے بہ حیثیت آدم زاد اس کے پاس دو راستے تھے' انعام و اکرام اور دولت کا لالچ یا پھر طاقت کا استعمال! ضرورت پڑنے پر وہ کوئی بھی راہ اختیار کر سکتا تھا لیکن پہلے اصل معاملے کی تہہ تک پہنچنا ضروری تھا' اس کے بعد وہ کوئی قدم اٹھاتا۔ اس کے لئے دونوں ہی صورتیں آسان تھیں۔ وہ دولت کے ذریعے عرفان بیگ کو خرید سکتا تھا اور ضرورت پڑنے پر اسے قتل بھی کرا سکتا تھا۔ اسے ہر صورت میں اپنا مقصد حاصل کرنا تھا۔ اگر مراد بخش اس مقدمے میں ماخوذ ہو کر مروا دیا جاتا تو اسے ہی نہیں مجھے بھی افسوس ہوتا۔ مراد بخش سے میری دلچسپی اور تعلق کا سبب آسائش بانو کا انسانی قالب تھا۔ اسی قالب کی فطری صفات کے سبب میرے دل میں اس کی عزت اور محبت تھی' وہ محبت جو ایک بیٹی کو اپنے باپ سے ہوتی ہے۔ عارج کو بھی اس کا بخوبی علم تھا۔ شاہجہاں آباد جانے سے پہلے اس لئے عارج نے مجھے یقین دہانی کرائی کہ وہ عرفان بیگ کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لے گا۔

اس پر میں نے کوئی رائے زنی نہیں کی۔ قبل از وقت میرے لئے کچھ کہنا مشکل تھا۔ میں بہرحال عارج کی نقل و حرکت پر نظر رکھے رہی۔ وہ اکبر آباد سے روانہ ہو چکا تھا' پھر میں نے اپنی چشم تصور کی قوت سے اسے شاہجہاں آباد میں دیکھا۔ وہ میر سامان فاضل خان کے ساتھ اورنگ زیب سے ملا۔

اورنگ زیب نے خلاف توقع عارج کو میر سامان کے ساتھ دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ جب میر سامان نے اس سلسلے میں وضاحت کی تو اورنگزیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ بولا۔ ''ہم نے کچھ سوچ کر ہی تو صالح کو اکبر آباد میں چھوڑ رکھا ہے۔''

میر سامان نے مطلوبہ اشیاء اورنگ زیب کے ملاحظے میں پیش کیں۔ اورنگ زیب نے انہیں ملاحظہ کیا اور پھر داروغہ جواہر خانہ کو طلب کر لیا۔ داروغہ جواہر خانہ آ گیا تو اورنگ

زیب کے اشارے پر تمام جواہر اور دیگر اشیاء اس کے سپرد کر دی گئیں۔

عارج نے اگلے ہی دن واپس اکبر آباد آنا تھا اس لئے عرفان بیگ سے اسی روز ملنا ضروری تھا۔ اسے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ عارج نے اسی دن شاہجہان آباد میں متعین اپنے مخبروں سے رابطہ قائم کرلیا۔ اس دوران میں عارج کے مخبر اور بہت سی باتیں معلوم کر چکے تھے۔ عرفان بیگ کے باپ علی نقی کے قتل کا پورا واقعہ عارج کے علم میں آ گیا۔

یہ واقعہ تقریباً چار سال پہلے کا تھا۔ مراد بخش کے مشیر علی نقی سے مراد کا ایک مقرب خواجہ سرا بہت حسد رکھتا تھا۔ وہ علی نقی کی دشمنی میں لگا رہتا تھا۔ علی نقی دیانت دار اور منتظم شخص تھا مگر نہایت سخت گیر اور سزا دینے میں شدید' ذرا ذرا سے قصور پر علی نقی لوگوں کو قتل کرا دیتا تھا۔ اتفاق سے ایک فقیر کو چوری کے الزام میں علی نقی کے سامنے پیش کیا گیا۔ علی نقی نے اس کے قتل کا حکم دیدیا۔ فقیر نے سزائے موت کا حکم سن کر آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور کہا۔ ''تو مجھے ناحق قتل کرا رہا ہے۔ دیکھنا تو بھی کسی دن ایسی ہی تہمت میں مارا جائے گا۔'' اس پر علی نقی نے فقیر کو ڈانٹ دیا۔

اس واقعے کے چند روز بعد ہی حاسد خواجہ سرا نے علی نقی کی طرف سے دارشکوہ کو ایک جعلی خط لکھوایا۔ طرز تحریر بالکل علی نقی ہی کا سا تھا۔ اس خط میں مراد بخش سے غداری کا مضمون لکھا ہوا تھا۔ خواجہ سرا نے ایسی تدبیر کی کہ وہ خط پکڑا گیا۔ علی نقی کے خلاف خواجہ سرا کی تدبیر کامیاب رہی۔ طلوع آفتاب سے پہلے سویرے سویرے وہ خط مراد بخش کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

خط پڑھتے ہی مراد بخش بھڑک اٹھا۔ اسے علی نقی سے یہ توقع نہ تھی۔ شدت غضب میں مراد نے حکم دیا کہ علی نقی اس وقت جس حالت میں بھی ہو' اسے حاضر کر دیا جائے۔ جس وقت چوبدار پہنچے علی نقی قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔ مراد کے کارندوں نے اسے لباس تبدیل کرنے تک کی مہلت نہ دی۔ علی نقی سمجھا کہ اسے کسی فوری نوعیت کے اہم کام کے سلسلے میں طلب کیا گیا ہے۔ وہ جلدی سے ساتھ چل دیا۔ علی نقی جب مراد بخش کے روبرو پہنچا تو دیکھا کہ وہ ہاتھ میں برچھی لئے بیٹھا ہے۔

مراد نے علی نقی کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ ''جو شخص اپنے ولی نعمت کے ساتھ نمک حرامی کرے' اس کی سزا کیا ہے؟''

علی نقی خود کو خیانت سے پاک سمجھتا تھا اس لئے بولا۔ ''ایسے شخص کو اس کی سخت سزا ملنی چاہئے۔''

یہ سن کر مراد نے وہ جعلی خط علی نقی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

علی نقی کو مراد سے تقرب' عقیدت اور اپنی وفاداری پر بھروسہ تھا۔ اس لئے اپنی صفائی پیش کرنے کے بجائے اس کے لہجے میں گستاخی کا عنصر شامل ہو گیا۔ اس نے بے باکانہ کہا۔ ''آفرین ہے اس دشمن پر جس نے یہ سازش کی اور حضور کی عقل و دانش پر افسوس ہے۔ اللہ تعالٰی نے حضور کو عزت عطا کی' اقتدار بخشا مگر حضور اپنے دوستوں اور دشمنوں میں امتیاز نہ فرما سکے۔''

مراد پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا' اس گستاخی پر اور مشتعل ہو گیا۔ اس نے علی نقی کے سینے پر برچھی اتار دی۔ پھر اسی وقت علی نقی کو قتل کر دیا گیا۔ علی نقی کے قتل کا اصل پس منظر یہ تھا جسے مخبروں نے لفظ بہ لفظ تو نہیں مگر صحیح صحیح ضرور بیان کر دیا۔ اپنے مخبروں کی اس کارگزاری پر عارج نے انہیں انعامات دیئے اور پھر مزید کچھ دیر ان سے ضروری معلومات حاصل کرتا رہا۔ اس کے ساتھ عارج نے ان مخبروں کو کچھ ہدایات بھی دیں۔ وہ بہ خوبی صالح کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کے قول و فعل سے قطعی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ آدم زاد نہیں بلکہ ایک جن زاد ہے جو حیرت انگیز پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ وہ میری ہی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔

رات کے وقت عارج معمولی لباس پہن کر خاموشی کے ساتھ شاہی مہمان خانے سے نکل گیا۔ اس وقت ایک پہر رات گزر چکی تھی۔ عارج چوری چھپے عرفان بیگ کی حویلی میں داخل ہوا۔ اس کے آدمی پہلے ہی تمام بندوبست کر چکے تھے۔

حویلی کا دروازہ توقع کے مطابق اسے کھلا ہوا ملا۔ اب عارج کے چہرے پر سیاہ نقاب تھی۔

اپنی خواب گاہ میں خلاف توقع ایک نقاب پوش کو دیکھ کر عرفان بیگ ڈر گیا۔ فطرتاً وہ بزدل تھا۔ عارج کے مسلح آدمی خواب گاہ کے دروازے پر بھی موجود تھے۔ ان کے چہرے بھی نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔

تلوار سونت کر عارج جب عرفان بیگ کی طرف بڑھا تو وہ لرزتی آواز میں بولا۔ ''تم کون.... کون ہو؟ اور مجھے کیوں قتل.....''

عرفان بیگ کی بات عارج نے کاٹ دی اور قریب پہنچ کر کہا۔ ''تو اس بات سے کوئی غرض نہ رکھ کہ میں کون ہوں صرف یہ دیکھ کہ تجھے قتل کرنا میرے بس میں ہے یا نہیں؟ .....جواب دے!''

عارج کی تلوار کو اپنی گردن کے قریب دیکھ کر عرفان بیگ جلدی سے بولا۔ ''ہاں ہاں

تم.... آپ مجھے قتل..... قتل کر سکتے ہیں مگر......''

''مگر یہ کہ میں تجھے قتل نہیں کروں گا۔'' عارج نے تلوار کو نیام میں ڈال لیا۔

''پھر..... پھر؟''

''تجھے اس وقت موت یا زندگی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔'' عارج کہنے لگا۔'' اگر تو زندگی چاہے گا تو انعام پائے اور تجھے موت کی تمنا ہوئی تو یہ تمنا بھی پوری کر دی جائے گی۔ بول زندگی چاہتا ہے یا موت؟''

''مجھے انعام نہیں صرف زندگی بخش دیں۔'' عرفان بیگ کانپتی آواز میں بولا۔

''کیا تو جانتا ہے کہ ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے؟ کیا تو اپنی زندگی کی قیمت ادا کر سکتا ہے؟''

عارج کے اس سوال نے عرفان بیگ کو الجھن میں ڈال دیا۔ اس کا واضح اظہار عرفان بیگ کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

بالآخر وہ کہنے لگا۔

''میرے پاس جو کچھ بھی ہے' میں آپ کی نذر کرنے کو راضی ہوں۔''

یہ سن کر عارج ہنس دیا اور کہا۔'' تو غلط سمجھا' قیمت سے میری مراد یہ تھی' میں تو مراد بخش کا ذکر کرنا چاہتا تھا جس پر تو اپنے باپ کے خون کا دعویٰ کرنے والا ہے۔ تیری زندگی کی قیمت یہی دعویٰ ہے۔ تو اگر دعویٰ دائر نہ کرے تو زندہ چھوڑ دیا جائے گا ورنہ میں آج کی طرح کسی شب تیری گردن اڑانے کہیں بھی پہنچ سکتا ہوں۔ بتا اب کیا فیصلہ ہے تیرا؟''

عرفان بیگ نے عارج کی توقع کے مطابق جواب دیا۔ اسے زندگی عزیز تھی۔ عارج نے ایک قیمتی ہار اپنی جیب سے نکالا اور عرفان بیگ کی طرف اچھال دیا' انعام کا وعدہ اسے یاد تھا۔

عارج کو اکبر آباد سے واپس پہنچے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ شاہجہاں آباد سے ایک بری خبر ملی۔ اس کی کوششوں کے باوجود کھیل بگڑ گیا تھا۔ اب یہ خبر آئی تھی کہ علی نقی کے چھوٹے بیٹے نے باپ کے خون کا دعویٰ کر دیا۔ خبر کے مطابق کسی کو بھی اس وقت تک کچھ معلوم نہ ہوا جب تک کہ معاملہ نمٹ نہ گیا۔

خبر کی بقیہ تفصیلات یہ تھیں کہ اورنگ زیب کے حکم پر مراد بیگ کی حویلی کو حفاظت میں لے لیا گیا ہے۔ شاہی گرز بندوں کے داروغہ اللہ یار خان کا عملہ ہر وقت موجود رہتا۔ کسی کو بھی مراد بیگ سے ملنے کی اجازت نہیں۔ ان دنوں شاہجہاں آباد میں اورنگ زیب کی انصاف

پروری کے چرچے تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اب تک ایسا نہ ہوا تھا۔ کسی بھی بادشاہ نے شریعت کا اتنا خیال نہیں کیا۔ قانون اور انصاف کے تقاضے پورے کرنے کیلئے ہی اورنگ زیب نے اپنے سگے بھائی مراد بخش کی بھی پروا نہ کی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے بھائی پر خون کا دعویٰ کرنے والے کو اپنے تحفظ میں لے لیا تاکہ اس کی جان کو کوئی شخص ضرر نہ پہنچا سکے۔

شاہ جہاں آباد سے ملنے والی یہ خبر یقیناً افسوسناک تھی۔ علی نقی کے قتل کا واقعہ ایسا نہ تھا جسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ اس واقعے سے مراد بخش پر جرم ثابت ہو جاتا۔ عارج کی سٹی گم ہو گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں اس پر نظر رکھے ہوں اور مجھے تمام حالات کا علم ہے۔ وہ تو اس فکر میں تھا کہ مجھے کیا منہ دکھائے گا! شاہ جہاں آباد سے آنے کے بعد تو اس نے میرے سامنے بازی جیت لینے کا دعویٰ کیا تھا' مگر بازی الٹ گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟

میں اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں عارج کا کوئی قصور نہیں۔ اس نے تو اپنی سی پوری کوشش کر لی تھی۔ اب ضرورت یہ تھی کہ عارج کو احساس ناکامی سے نکالنے کیلئے میں خود اس سے مل لیتی۔ ملاقات ہونے پر وہ لازماً اپنی دانست میں مجھے تازہ ترین بدلے ہوئے حالات کے متعلق بتاتا۔ عارج کی حویلی پہنچ کر میں نے اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔

میرے آنے کی خبر پا کر عارج خود ڈیوڑھی تک آیا اور مجھے اندر لے گیا۔ میرا محافظ دستہ حسب معمول باہر ہی رکا رہا۔ اندر پہنچ کر مسند پر بیٹھتے ہی میں نے عارج کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر انتہائی پریشانی کے آثار تھے۔

''اے عارج! تجھے کیا ہوا؟..... تو اس قدر فکر مند کیوں دکھائی دیتا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

جواب میں عارج نے وہ سب کچھ بتا دیا جو پہلے ہی مجھے معلوم تھا۔

''اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ اورنگزیب دہری چال چل رہا ہے۔'' میں بولی۔'' ایک طرف وہ عوام کی نظروں میں بھلا بن رہا ہے' دوسری جانب اس بہانے وہ مراد بخش کو اپنی راہ سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔''

''ہاں اے دینار! میں بھی اس نتیجے پر پہنچا ہوں..... لیکن اب بھی ایک موقع ہے' زیادہ مایوسی کی ضرورت نہیں۔'' عارج نے کہا۔'' بتا تیرے دماغ میں کیا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

عارج کے ذہن میں جو کچھ تھا' اس نے مجھے بتا دیا۔

''نہیں۔'' میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''اس میں خطرہ ہے۔ میں تجھے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔''

''وہ کیوں اے دینار؟'' عارج نے سوال کیا۔

''اس لئے اے عارج کہ تو شاید اب تک اورنگزیب کو سمجھ نہیں سکا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اورنگ زیب ابھی تک مراد بخش کو سلیم گڑھ کے قلعے سے فرار کرانے کی سازش کو بھولا نہیں ہوگا۔ اسے اندازہ ہے کہ کچھ نامعلوم لوگ' مراد بخش کو رہائی دلانا چاہتے ہیں۔ اس آگہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مراد بخش کے ان نامعلوم ہمدردوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دے۔''

''تیرا کہنا ٹھیک ہے اے دینار' مگر مراد بخش کو قاضی القضاء کی عدالت میں پیش تو کیا ہی جائے گا۔'' عارج کہنے لگا۔

''اس کے لئے اسے بہرحال گوالیار سے شاہ جہاں آباد لایا جائے گا اور یہی وہ موقع ہوگا کہ.....''

''میں سمجھ گئی کہ تو کیا کہنا چاہتا ہے۔'' میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔ ''ابھی چوتھے سال کے جشن جلوس میں ایک ماہ باقی ہے۔ تیرے منصب کے پیش نظر ظاہر ہے کہ تجھے بھی جشن میں شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ میں تجھے جشن میں شرکت سے نہیں روکتی' میرا مقصد محض یہ ہے کہ تو کوئی خطرہ مول نہ لے۔ تو یہ جانتا ہوگا کہ اورنگ زیب کو تجھ پر ذرا سا بھی شبہ ہوگیا تو وہ تجھے معاف نہیں کرے گا۔''

''تو مطمئن رہ اے دینار! میں کوئی غیر محتاط قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اورنگ زیب میری طرف سے بدگمان ہوا تو مجھے یہ جسم ہمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑے گا۔ اللہ نے چاہا تو اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' عارج نے یقین دہانی کرائی۔

پھر میں کچھ نہیں بولی۔ جس مقصد سے میں' عارج کے پاس آئی تھی وہ پورا ہوگیا تھا۔

ایک ماہ بعد اورنگ زیب کے دوسرے امراء کی طرح عارج کو بھی صالح کی حیثیت سے تخت نشینی کے جشن میں شرکت کی دعوت ملی۔ وہ مجھ سے مل کر رخصت ہوگیا۔ اس کے باوجود میں نے اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔

عارج تخت نشینی کے جشن میں شریک ہوا۔ قدرت نے اسے شاہجہاں آباد آنے کا جو موقع فراہم کیا تھا' وہ اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا لیکن میری پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ عارج کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا۔

قاضی القضاء (چیف جسٹس) عبدالوہاب کی عدالت میں قتل کا وہ مشہور مقدمہ زیر

سماعت تھا۔ تاریخیں پڑ رہی تھیں اور عینی شاہدوں کے بیانات قلم بند کئے جا رہے تھے۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ مراد بخش کو خفیہ طور پر عدالت میں پیش کیا جائے گا' کسی کو علم نہ تھا۔ عارج اس خبر کی تصدیق میں لگا ہوا تھا۔ تصدیق کے بعد ہی وہ مناسب منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ اس خبر کے علاوہ دوسری خبریں اور افواہیں بھی دارالحکومت میں گشت کر رہی تھیں۔ عارج ان سے بھی آگاہ تھا۔

کچھ امراء کا خیال یہ تھا کہ مراد کا بیان صفائی گوالیار کے قلعے ہی میں قلم بند کیا جائے گا۔ ان کے پاس یہ جواز تھا کہ اورنگ زیب' مراد بخش کو شاہجہاں آباد بلوانے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ خود میں بھی ان امراء کے اس جواز سے متفق تھی۔

جن خواجہ سراؤں کے سامنے مراد بخش نے علی نقی کو برچھی ماری تھی اور جنہوں نے مراد کے حکم پر علی نقی کو قتل کیا تھا' وہ سب بھی زیر حراست تھے۔ اس مقدمے میں اورنگ زیب کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے عارج کی راہیں مسدود ہوگئیں اور وہ ناکام اکبرآباد لوٹا۔ وہ اور اس کے آدمی نہ تو عینی شاہدوں سے مل سکے اور نہ مراد بیگ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

یہ مقدمہ کئی ماہ چلتا رہا۔ اس عرصے میں عارج صرف اتنا کر سکا کہ اس نے گوالیار بھی اپنے خاص آدمی بھیج دیئے۔ ان آدمیوں کو وہاں بھیجنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ مراد کے متعلق ہر خبر بھیجتے رہیں۔ اگر مراد کو گوالیار سے شاہجہاں آباد لایا جاتا تو عارج اسے رہا کرانے کی آخری کوشش ضرور کرتا مگر اورنگ زیب نے ایسا نہ کیا۔ اس نے قاضی القضاء عبدالوہاب کو حکم دیا کہ وہ خود گوالیار جا کر مراد بخش کا بیان صفائی لے۔

اسی حکم کی بنا پر شاہجہاں آباد سے یہ خبر ملی کہ قاضی القضاء گوالیار روانہ ہو چکا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ملزم کا بیان لینے کی غرض سے خود قاضی القضاء کو زنداں کا رخ کرنا پڑا تھا۔

قاضی القضاء جب گوالیار پہنچ کر وہاں کے قلعے میں قید مراد بخش سے ملا تو مراد اسے خاطر میں نہ لایا۔ اس نے اپنے بیان میں اورنگ زیب پر بھی الزامات عائد کیے کہ وہ اپنے عہد سے پھر گیا ہے۔ مراد کے اس بیان کی تشہیر نہیں کی گئی اور اسے اخفا میں رکھا گیا۔ مخبروں نے لکھا کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مراد کو اب بھی یقین ہے کہ اورنگ زیب اسے رہا کر دے گا۔

گوالیار سے قاضی القضاء عبدالوہاب شاہجہاں آباد واپس آ گیا اور کچھ دن بعد اس نے مقدمے کا فیصلہ توثیق کے لئے اورنگ زیب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بالآخر اورنگ زیب نے اس فیصلے کی توثیق کر دی۔ فیصلہ اس کی مرضی کے مطابق تھا۔ حکم ہوا کہ قتل ثابت

ہو چکا ہے اس لئے قاضی القضاء عبدالوہاب مقتول علی نقی کے وارث مردان بیگ کو ساتھ لے کر مجرم مراد بخش کے پاس گوالیار جائے اور اثبات خون کا اظہار کر کے۔ قاضی القضاء کا فرض ہے کہ وہ حکم شرع کے مطابق قصاص دلوائے۔

تعمیل حکم میں عبدالوہاب، مردان بیگ کے ساتھ گوالیار پہنچ گیا۔

اس وقت سارے ملک میں عجیب عجیب خبریں گرم تھیں۔ کوئی کہتا کہ مردان بیگ، مراد بخش کی بیٹی آسائش بانو، یعنی میرے انسانی قالب سے قصاص میں ایک بڑی دولت قبول کر لے گا اور مراد کو قتل نہ کیا جائے گا۔ کچھ صاف گو اور انصاف پسند لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ مقدمہ دراصل بھائی کے خلاف اورنگ زیب کی سازش ہے۔ اسی کے اشارے پر مردان بیگ نے دعویٰ دائر کیا ہے۔ کوئی اڑاتا کہ مراد بخش کے وفادار امیر آخر وقت میں گوالیار کے قلعے پر یلغار کر کے اسے نکال لے جائیں گے۔ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ ایک گروہ ایسا تھا جو اب بھی اورنگ زیب کو حق پر سمجھتا تھا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے نہ صرف برسر دربار بلکہ باہر بھی مراد بخش کو مجرم کہتا تھا۔ یہ گروہ اورنگ زیب کی طرف داری میں تمام الزامات کی تردید کرتا۔ اورنگزیب کا رعب و دبدبہ اتنا تھا کہ لوگ کھلے عام ایسی گفتگو سے گریز کرتے جو مراد بخش کے حق میں ہوتی۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ بادشاہ وقت کے خلاف زبان کھولنے کے جرم میں ان کی کھالیں بھی کھنچوائی جاسکتی ہیں۔ انہیں کوئی بھیانک سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

ادھر گوالیار میں تو مراد بخش کو قتل کرنے کے سامان ہو رہے تھے اور ادھر اکبر آباد کے قلعے پر سوگ طاری تھا۔ شاہجہاں آباد سے خبر پہنچ چکی تھی کہ اورنگ زیب نے کیا حکم دیا ہے۔ مزید یہ کہ موت کے ہرکارے گوالیار روانہ ہو چکے ہیں۔ مجھے جب یہ خبریں ملیں تو میں عارج کے ساتھ اس عماری کے سامنے کھڑی تھی جو مراد بخش کی یادگار تھی۔

آسائش بانو کی درخواست پر اورنگ زیب نے مجھی یہ حکم دیا تھا کہ وہ عماری، آسائش بانو کے محل میں رکھوا دی جائے۔ یہ عماری اس تیموری شہزادے مراد بخش کی بہادری کا منہ بولتا ثبوت تھی جسے میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے مرنے کی آرزو تھی۔ اس عماری میں اب بھی بے شمار تیر پیوست تھے۔ اس عماری پر سوار ہو کر کبھی وہ شخص، اورنگ زیب کے شانہ بشانہ لڑا تھا جسے اب قتل کی سزا سنائی جا چکی تھی اور جو گوالیار کے قلعے میں موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔

ماہ ربیع الثانی 1072 ہجری میں مراد بخش کو قتل کر دیا گیا۔

اس اندوہناک واقعے کو اب پانچ سال گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں شاہجہاں بھی

سفر آخرت پر روانہ ہو چکا تھا۔ گزشتہ سال شاہجہاں کا انتقال ہوا تھا۔ مروارید کے ہم رنگ دانوں والی قیمتی تسبیح آخر وقت تک اس کے پاس رہی مگر سفر آخرت میں اس تسبیح نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اس سفر میں تو شاہ و گدا سبھی خالی ہاتھ جاتے ہیں۔ سو شاہجہاں بھی خالی ہاتھ گیا۔

اورنگ زیب چند روز اکبر آباد میں ٹھہرا۔ اس عرصے میں داروغہ تخت کو حکم ہوا کہ تخت مرصع (تخت طاؤس) کو نویں جشن جلوس کیلئے دارالحکومت شاہجہاں آباد (دہلی) پہنچا دیا جائے۔ اسی کے ساتھ محلات شاہی کی بعض خواتین کو بھی شاہجہاں آباد بھجوا دیا گیا۔ انہی خواتین میں میرا انسانی قالب بھی شامل تھا۔ عارج اور میں نے جن انسانی پیکروں میں پناہ لی تھی، وہ اس سے قبل بھی جدا ہو چکے تھے۔ میں، اکبر آباد سے شاہجہاں آباد آ گئی تو عارج تنہا رہ گیا۔

یہ بہر حال ممکن نہیں تھا کہ طویل عرصے تک مجھ سے جدا رہ سکتا۔ وہ نویں جشن جلوس میں شرکت کرنے شاہجہاں آباد آیا تو اسی شہر میں مستقل سکونت کی سبیل نکال لی۔ مجھ سے خلوت میں ملنے کی خاطر ایک رات وقتی طور پر اس نے صالح کے جسم کو چھوڑ دیا۔ نصف شب کے قریب جب میں سو چکی تھی تو اس نے مجھے آ کر جگا دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ تجھے مجھ سے ملے بغیر چین نہیں آئے گا۔ میں دھیرے سے ہنس کر بولی۔

''سن اے دینارا! میں تجھ سے دور نہیں رہ سکتا۔'' عارج نے کہا۔ ''میں نے اس شہر میں رہنے کی ایک تدبیر ڈھونڈ لی ہے۔''

میرے استفسار پر عارج نے تدبیر بتائی تو میں بولی۔ ''تجھے یقین ہے کہ اورنگ زیب مان جائے گا؟'' میں نے یہ سوال اس لئے کیا کہ عارج کا انسانی قالب صالح ایک بڑا منصب دار تھا۔ یہ صاحب حیثیت افراد بادشاہ وقت کی اجازت کے بغیر اپنی مرضی سے کسی بھی شہر میں نہیں رہ سکتے۔ عارج کو بھی یہی مسئلہ درپیش تھا۔

''میرے انسانی قالب کا شمار اورنگ زیب کے جاں نثاروں میں ہوتا ہے۔ کم ہی اس نے اس انسانی پیکر کی کوئی بات رد کی ہے۔'' میرے سوال کا عارج نے جواب دیا۔ اس کے لہجے سے یقین کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر عارج کا یقین غلط ثابت نہیں ہوا۔ اس نے اورنگ زیب سے درخواست کی اب وہ اکبر آباد سے شاہجہاں آباد آنے کا آرزومند ہے۔ درخواست قبول کر لی گئی اور یوں عارج بھی شاہجہاں آباد آ گیا۔

اورنگ زیب اپنی بھتیجی، یعنی میرے انسانی قالب آسائش بانو کو اولاد کی طرح سمجھتا

تھا۔ اپنی بڑی بیوی سے اسے معلوم ہوا تھا کہ آسائش بانو شادی کرنا نہیں چاہتی۔ اورنگ زیب کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ جب تک میں اکبرآباد میں تھی اور شاہجہاں آباد نہیں آئی تھی، اورنگ زیب کو یہ خیال نہیں تھا۔ اس سلسلے میں اورنگ زیب نے اپنی بڑی بیوی سے جو کچھ کہا۔ وہ میرے علم میں بھی آیا۔

''بانو سے کہو کہ اس کا یہ عمل شرع کے خلاف ہے۔ ہم اس کی شادی کسی کم رتبہ شخص سے نہیں بلکہ شہزادہ محمد سلطان سے کرنا چاہتے ہیں۔ یوں وہ اپنے ہی گھر میں رہے گی۔'' اورنگ زیب نے کہا تھا۔

میرے وہم دگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کبھی ایسی نوبت آ سکتی ہے۔ میں اس لئے فکر مند ہو گئی۔ اورنگ زیب ایک ضدی شخص تھا اور اسے انکار سننے کی عادت نہ تھی۔ جب میں نے عارج کو اس معاملے سے آگاہ کیا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔

''وہ ملعون شہزادہ تجھ سے شادی کرے گا۔'' عارج نے غصیلی آواز میں کہا۔

''جذباتی نہ ہو، وہ مجھ سے نہیں آسائش بانو سے شادی کرے گا۔'' مجھے عارج کے غصے پر پیار آنے لگا۔

''تو کیا تو اس انسانی قالب کو چھوڑ دے گی اے دینار؟'' عارج نے پوچھا۔

''یہ بھی ممکن ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسی تدبیر نکل آئے جو مجھے یہ جسم نہ چھوڑنا پڑے۔''

''سن! اورنگ زیب یہی تو چاہتا ہے کہ تو شرع کے خلاف عمل نہ کرے اور شادی پر راضی ہو جائے؟'' عارج نے سوال کیا۔ ''بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس میں شہزادہ محمد سلطان ہی سے شادی کی شرط نہیں۔''

''تو پھر اے دینار! تو مجھ سے شادی کر لے۔'' عارج بول اٹھا۔ ''یہ تو نے کیا بکواس شروع کر دی!۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''یہ بکواس نہیں بلکہ وہ تدبیر ہے جس پر عمل کر کے تو شہزادہ محمد سلطان کی بیوی بننے سے بچ سکتی ہے۔ کیا تو بھول گئی کہ بغداد میں ہم طویل عرصے تک میاں بیوی کی حیثیت سے رہ چکے ہیں۔'' عارج سنجیدہ نظر آنے لگا۔

میں نے بھی عارج کی بات پر غور کیا تو اس میں وزن نظر آیا۔ میرے انسانی قالب آسائش بانو کی خالہ اور اورنگ زیب کی بڑی بیوی اپنی بھانجی کو بہت چاہتی تھی۔ اسی نے مجھے اورنگ زیب کے الفاظ سے آگاہ کیا تھا۔ میں نے موقع دیکھتے ہی اسے عارج کے انسانی پیکر

صالح کے ساتھ شادی پر اپنی آمادگی سے مطلع کر دیا۔

اورنگ زیب کو جب اپنی بیوی سے یہ خبر ہوئی کہ میں اس کے ایک دیرینہ جاں نثار صالح سے شادی کرنے پر راضی ہو سکتی ہوں اور اب انکار نہیں کروں گی تو وہ خوش ہو گیا۔ اس نے یہ اصرار نہیں کیا کہ میں، شہزادہ محمد سلطان ہی سے شادی کروں۔ صالح کا تعلق یوں بھی ایران کے شاہی خاندان سے تھا اور یہ بات اورنگ زیب کے علم میں بھی تھی۔ اس لئے یہ رشتہ ہو سکتا تھا۔ جب اشاروں کنایوں میں آسائش بانو کی خالہ نے مجھے باور کرا دیا کہ اورنگ زیب کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تو میرے سر سے جیسے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔ مجھے خبر تھی کہ چودہ سال قبل آغاز جوانی میں جس شخص کے لئے پہلی بار آسائش بانو کا دل جذبات محبت سے دھڑک اٹھا تھا، وہی شخص، وہی صالح اب اس کی عزت و ناموس کا امین ہونے والا تھا۔ عارج اور میں اگر ان انسانی قالبوں کو چھوڑ کر چلے بھی جاتے تو ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہوتی۔

میرے انسانی پیکر آسائش بانو کا شباب عروج پر تھا۔ وہ اپنی عمر کی تیسری دہائی کا سفر ختم کر رہی تھی اور عارج کا انسانی قالب صالح چوتھائی دہائی کا نصف حصہ طے کر چکا تھا۔

دوسری جمادی الثانی 1082 ہجری کو میرے اور عارج کے انسانی قالب رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ ہمارا نکاح پڑھانے والا قاضی القضاء عبدالوہاب ہی تھا۔ یہ وہی قاضی تھا جس نے تقریباً دس سال پہلے آسائش بانو کے باپ مراد بخش کو قتل کی سزا سنائی تھی۔

اورنگ زیب نے مجھے جو جہیز دیا، اس سے زیادہ خود اپنی بیٹوں کو بھی نہیں دیا تھا۔ جہیز میں اس نے عارج کو ایک عربی النسل گھوڑا دیا۔ ایک ہاتھی بھی عارج کو ملا جس کے اوپر سونے کی عماری تھی اس کے علاوہ شاہجہاں آباد کے قریب ایک معقول جاگیر بھی ملی اور منصب میں بھی ایک ہزار کا اضافہ ہوا۔ اب وہ پنج ہزاری منصب دار تھا۔

عارج کی حویلی میں وہ میری پہلی رات تھی اور میں دلہن بنی ہوئی تھی۔

خلوت میسر آتے ہی عارج نے مجھے چھیڑا۔ ''اب تو شرعاً میری بیوی بن چکی ہے اس لئے۔''

☆.....☆.....☆

"بکواس نہ کر!" میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔ "قاضی نے میرا اور تیرا نکاح نہیں، آسائش بانو اور صالح کا نکاح پڑھایا ہے۔"

اے دینار! میں جب بھی کسی بہانے تجھے اپنی بیوی بناتا ہوں تو مجھ سے دور دور رہنے کی کوئی راہ نکال لیتی ہے۔ بتا تو سہی کہ مجھے یوں......"

"فضول باتیں چھوڑ اور سونے دے مجھے!" میں نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

"عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا اور میں نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

جلوس کے سولہویں سال کے آخر میں اورنگزیب نے تو سیاسی مصلحتوں اور بغاوت کے فرد کرنے کی خاطر کابل کا رخ کیا اور ادھر شاہجہان آباد میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ لوگوں کیلئے یہ واقعہ عجیب ہو تو ہو، امیر الامراء ذوالفقار خان کیلئے عجیب نہ تھا۔ اورنگزیب شاہجہان آباد میں شہزادہ محمد سلطان کو اپنا جانشین مقرر کر گیا تھا اور امیر الامراء کو بھی شہزادے کے ساتھ ہی چھوڑ دیا تھا۔

اس سے تقریباً 9 سال پہلے اورنگزیب نے مراد بخش کے قتل کے بعد امیر الامراء کو ایک خدمت سپرد کی تھی۔ امیر الامراء اور اورنگزیب کے سوا کسی کو علم نہ تھا کہ تخلیے میں ان دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں اور امیر الامراء کو کیا خدمت سپرد ہوئی۔ موجودہ واقعہ اسی کا ردعمل تھا۔ ان تمام باتوں کے بارے میں مجھے اس وقت علم ہوا جب مراد بخش کو قتل کیا جا چکا تھا۔

ہوا یہ کہ جب مردان بیگ نے اپنے باپ کے خون کا قصاص لے لیا، مراد بخش کی گردن مار دی گئی تو وہ شاہجہان آباد لوٹ آیا۔ مردان بیگ کے بڑے بھائی عرفان بیگ اور دوسرے ہمدردوں نے اسے مشورہ دیا کہ تم روپوش ہو جاؤ ورنہ مار ڈالے جاؤ گے۔ مردان بیگ نے باپ کی محبت میں نہیں بلکہ دولت کی ہوس میں مراد بخش پر خون کا دعویٰ کیا تھا۔ پھر وہ دولت لئے بغیر شاہجہان آباد سے کیسے ٹل جاتا! امیر الامراء ذوالفقار خان سے وعدے کی

نصف رقم اسے دعویٰ دائر کرتے ہی مل چکی تھی اور نصف ابھی باقی تھی۔ وہ شاہجہان آباد رکا تو لوگوں نے اسے پھر سمجھایا اور نصیحت کی کہ تم ابھی نادان ہو، بادشاہوں کا مزاج نہیں سمجھتے۔ تم جیسے لوگوں کی حیثیت محض مہروں کی ہوتی ہے اور ایسے لوگ کسی بھی صورت زندہ نہیں چھوڑے جاتے۔ مردان بیگ کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ اس نے ایک شب خاموشی سے اپنی ساری دولت سمیٹی اور ایران بھاگ گیا، امیر الامراء سے ملنے والی نصف رقم بھی اتنی تھی کہ وہ ساری زندگی عیش کے ساتھ بسر کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ رقم امیر الامراء ذوالفقار علی خان نے اپنی جیب سے ادا نہیں کی ہوگی۔ اسے یہ رقم فراہم کرنے والا اورنگزیب ہی ہوگا جس کا مقصد اپنے بھائی مراد بخش کو راستے سے ہٹانا تھا۔ اورنگزیب نے اس معاملے میں خود سامنے نہ آ کر امیر الامراء کو آگے کر دیا تھا۔

گیارہ سال کے عرصے ہی میں مردان بیگ نے ساری دولت اڑا دی جو اسے امیر الامراء سے ملی تھی۔ وہ لا پنی کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا تو اسے شاہجہان آباد یاد آیا اور امیر الامراء کا وعدہ بھی! امیر الامراء نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ مراد بخش کو قتل کئے جانے کے بعد بقیہ نصف رقم بھی ادا کر دی جائے گی۔ ادھر امیر الامراء کے آدمی اسے سارے ہندوستان میں ڈھونڈتے پھرے تھے مگر وہ انہیں کہیں بھی نہیں ملا تھا۔ دراصل لوگوں نے مردان بیگ کو اتنا خوف زدہ کر دیا تھا کہ اس نے فرار ہونے سے قبل اپنے بڑے بھائی عرفان بیگ، یہاں تک کہ اپنی بیوی کو بھی نہیں بتایا کہاں جا رہا ہے! اس لئے بچارہ مگر اس کی قضاء اسے پھر شاہجہان آباد کھینچ لائی۔ شاہجہان آباد آتے ہی وہ امیر الامراء ذوالفقار علی خان سے ملا۔

"ارے تم کہاں تھے!" ذوالفقار علی خان نے مردان بیگ کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ "تم نے تو وعدے کے مطابق ہم سے بقیہ نصف رقم بھی وصول نہیں کی۔ ہمارے آدمی اس غرض سے ہندوستان بھر میں تمہیں تلاش کرتے پھرے۔"

امیر الامراء سے یہ سن کر مردان بیگ کھل اٹھا۔ وہ بولا "خادم ہندوستان میں ہوتا تو حضور کے آدمیوں کو ملتا۔"

"تو پھر؟" ذوالفقار علی خان کے سوالیہ لہجے میں اب بھی حیرت تھی۔

"حضور کا خادم ایران چلا گیا تھا۔" مردان بیگ نے جواب دیا۔

اس پر امیر الامراء نے طویل سانس لیا اور کہا "اب تو تم یہیں آ گئے ہو!" اس کا انداز تصدیق طلب تھا۔

"جی ہاں حضور!" مردان بیگ نے بتایا، پھر خوشامدی لہجے میں بولا "خادم کو خوشی ہے

کہ برسوں گزر جانے کے باوجود حضور کو اپنا وعدہ یاد ہے۔"

امیر الامراء کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ "ہم تو عرصہ دراز سے تمہاری تلاش میں تھے۔ اچھا ہوا کہ تم خود ہی آ گئے بہت جلد ہم تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کریں گے۔ تمہیں اس کی اطلاع مل جائے گی۔"

"بڑی نوازش حضور، بڑی عنایت!" مردان بیگ نے شکریہ ادا کیا۔

اس وقت مردان بیگ کے ذہن سے لوگوں کی ساری نصیحتیں نکل گئی تھیں۔ لوگوں نے اس سے کہا تھا کہ جن کی حیثیت محض مہروں کی ہوتی ہے وہ زندہ نہیں چھوڑے جاتے۔

یہ بات درست ثابت ہوئی۔ شاہجہان آباد میں مردان بیگ کی وہ پہلی ہی رات تھی جب اپنے کہنے کے مطابق امیر الامراء نے "وعدہ" پورا کر دیا۔ مردان بیگ کا قصہ پاک ہو گیا۔

اس واقعہ کا پس منظر لوگوں کے علم میں نہ تھا۔ اس لئے انہیں یہ واقعہ عجیب لگا۔ میرے لئے البتہ اس میں کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ مجھے پہلے یہ سب کچھ معلوم تھا۔ لوگوں کو البتہ بس اتنی خبر ہوئی کہ علی نقی کا بیٹا مردان بیگ بھی اس ہتھیار سے مارا گیا جس سے اس کے باپ کو مراد بخش نے قتل کیا تھا۔ کسی نے سوتے میں مردان بیگ کے سینے میں برچھی اتار دی تھی۔ قاتل کو صرف مردان بیگ ہی دیکھ سکا تھا۔ وہ امیر الامراء ذوالفقار علی خان کا ایک خواجہ سرا تھا لیکن یہ بات بھی لوگوں کے علم میں نہ آ سکی۔ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ مردان بیگ کو کس نے اور کیوں قتل کر دیا! ہاں اس موقع پر مردان بیگ کے بڑے بھائی عرفان بیگ کو وہ نقاب پوش ضرور یاد آیا جو کبھی اس کی حویلی میں گھس آیا تھا اور اسے مراد بخش پر خون کا دعویٰ کرنے سے روک دیا تھا۔ یہ بات سچ تھی کہ اورنگزیب کا ایک ہندو امیر عرفان بیگ سے ملا تھا اور اسے مراد پر اپنے باپ کے خون کا دعویٰ کرنے کیلئے آمادہ کر لیا تھا۔ بعد میں جب عارج اس سے ملا تو عرفان بیگ نے ہندو امیر کو حقیقت سے آگاہ کئے بغیر دعویٰ دائر کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اورنگزیب کے اشارے پر امیر الامراء ذوالفقار علی خان نے علی نقی کے چھوٹے بیٹے مردان بیگ پر جال پھینکا اور وہ لالچی اس جال میں پھنس گیا۔

چند روز تک قلعے اور شہر میں مردان بیگ کا قتل لوگوں کا موضوع گفتگو بنا رہا اور پھر کچھ ہی دن میں وہ اس واقعہ کو بھول گئے۔ میں اور عارج شاہجہان آباد کے قلعے کی ایک وسیع و عریض حویلی میں سکونت پذیر تھے۔ ہماری زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی کہ میں نے عارج کے معمولات میں تبدیلی محسوس کی، اس پر صالح کے قالب کی فطرف صفات حاوی آتی

جا رہی تھیں۔ انہیں صفات میں عیش کوشی اور مے نوشی بھی شامل تھیں۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ عارج خوبصورت کنیزوں کے جھرمٹ میں راجا اندر بنا بیٹھا رہتا ہے اور جام مے بھی گردش میں ہوتا ہے۔ ان کنیزوں میں میری ہی ایک کنیز بہار سرفہرست تھی۔

ایک حد تک میں نے عارج کی بے راہ روی کو برداشت کیا پھر اس پر پہلی بار پابندی عائد کر دی کہ وہ جب نشے میں ہو تو مجھ سے نہ ملے۔ حویلی کے ایک حصے کو میں نے اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ اس حصے میں عارج کو بحالت نشہ داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ جب عارج کو پہلی دفعہ میری خلوت میں آنے سے روکا گیا تو اسے میرا حکم گراں گزرا۔ خدمت گاروں نے ڈرتے ڈرتے عارج کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد عارج کے شوق آوارگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

مجبوراً مجھے اپنی خلوت سے نکلنا پڑا۔ میں عارج کو بے راہ ہوتے مزید نہیں دیکھ سکتی تھی وہ بہرحال میرا محبوب تھا۔ میں اسے محفل دلبراں سے اٹھا کر لے جانے کا حق رکھتی تھی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

اس وقت بھی عارج نشے میں تھا مگر نشہ اتنا زیادہ نہ تھا کہ وہ میری باتیں نہ سمجھ پاتا۔

"دیکھ اے عارج اگر تو نے اپنے معمولات نہ بدلے تو میں تجھے اسی زمانے میں چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤں گی!" میں نے کہا۔

میری اس دھمکی کا عارج پر خاطر خواہ اثر ہوا، بولا "نہیں اے دینار! اگر تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا، ذرا یہ بھی تو سوچ کہ مجھے اس حال پر پہنچانے میں تیرا بھی تو ہاتھ ہے۔ تو نے مجھ سے ملنے پر پابندی لگا دی اور ..... اور تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میری بے راہ روی کا اصل سبب میرا انسانی قالب ہے۔ میں کیا کروں کہ اس قالب کی فطرف صفات مجھ پر غالب آنے لگتی ہیں!"

"میں جانتی ہوں تیری مجبوری!" میں بولی "تجھے اس کے باوجود ان بری صفات پر قابو پانا ہوگا!"

"کوشش کروں گا میں اے دینار کہ تجھے آئندہ مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔" عارج نے وعدہ کیا۔

یوں گویا میرے اور عارج کے درمیان مصالحت ہو گئی۔ حالات معمول پر آ گئے تو عارج یہ سمجھا کہ اب میں شاید اس کی سب سے پسندیدہ کنیز بہار کو برداشت کر لوں گی۔ سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ اورنگزیب کابل سے لوٹ کر شاہجہان آباد آ گیا۔ اس کی آمد کا بڑا سبب

شہزادہ محمد سلطان کی شدید اور طویل علالت تھی۔ اس علالت اور طبیبوں کی ہدایت کے باوجود شہزادے نے مے نوشی ترک نہیں کی تھی۔ اورنگزیب کا خیال تھا کہ شہزادہ اس کی موجودگی میں مے نوشی کی جسارت نہیں کرے گا، اس کا یہ خیال غلط ثابت نہ ہوا، لیکن اورنگزیب کو شاہجہان آباد آنے میں دیر ہو چکی تھی۔ طبیبوں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ شہزادے کا ترک مے نوشی کے باوجود اب زیادہ عرصے زندہ رہنا مشکل ہے۔ انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ اچانک سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی۔

میری آنکھ کھلنے کا سبب سینے میں اٹھنے والا شدید درد تھا۔ اس سے پہلے کہ طبیب آتے، میں درد کی شدت سے بے ہوش ہو گئی۔ میرا سارا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہوش آیا تو طبیب میرا معائنہ کر چکے تھے۔ انہوں نے میری مرض کی تشخیص کر دی تھی۔ میرا مرض بلند فشار خون تھا۔ علاج شروع ہو گیا۔ کچھ دنوں تک عارج میری نگہداشت میں لگا رہا پھر اس نے میرے بستر پر پڑ جانے سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ اپنے انسانی قالب کی بیماری میرے لئے تشویشناک تھی۔

عارج کو بہار کم ہی فرصت دیتی تھی کہ وہ میری عیادت یا مزاج پرسی کو آ سکے۔ اسے کچھ ہوش ہی نہ ہوتا جس دن طویل بیماری کے بعد شہزادہ محمد سلطان کا انتقال ہوا اور یہ خبر عارج کو ملی تو نشے کے سبب اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ بیماری کے باوجود عارج کی نقل و حرکت پر میں پوری نظر رکھتی تھی۔

نشے میں ہونے کے سبب عارج، اورنگزیب سے دور ہی دور رہا کیونکہ شراب نوشی پر پابندی لگ چکی تھی۔ ان دنوں امور شرعی اور ان کے نفاذ پر اورنگزیب کا زور تھا۔ وہ ان امور سے سیاسی فوائد اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ اس طرح کا ایک اقدام ایک مشت ڈاڑھی تھا۔ اورنگزیب کی طرف سے حکم جاری ہوا کہ ایک مٹھی برابر داڑھی رکھی جائے اور اس سے زائد بال کاٹ دیئے جائیں۔ دراصل یہ سکھوں کے خلاف ایک سیاسی اقدام تھا۔ اس طرح وہ سکھ جاسوس پکڑے جاتے جو مسلمانوں کے بھیس میں جاسوسی کرتے تھے۔ سکھوں کے عقیدے میں سر یا داڑھی کے بال کاٹنا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ داڑھی کاٹے جانے کے خوف سے انہیں اقرار کرنا پڑتا کہ وہ سکھ ہیں۔ اورنگزیب موسیقی کے فن کو بھی خلاف شرعی سمجھتا تھا۔ سو اس نے موسیقی پر بھی پابندی لگا دی، اس فن سے وابستہ افراد کو نہ صرف مایوس ہونا پڑا بلکہ ان پر معاش کے دروازے بھی بند ہو گئے۔ مغلیہ دربار میں موسیقاروں اور گویوں کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہوتے تھے۔ مسلمان حکمرانوں میں یہ روایت صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ میں اپنی سرگزشت

میں اس سے پہلے ابراہیم موصلی کا ذکر کر چکی ہوں جو شاعر بھی تھا اور اپنے عہد کا سب سے بڑا موسیقار بھی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے دس ہزار درہم ماہانہ اس کا وظیفہ مقرر کیا تھا۔ مسلمان اپنے ابتدائی ادوار ہی سے فنون لطیفہ کی سرپرستی کرتے آئے تھے اس ضمن میں اورنگزیب نے پہلی مرتبہ تنگ نظری اور انتہا پسندی کا ثبوت دیا۔ اس نے دربار سے وابستہ شاعروں کو بھی نکال باہر کیا۔ یوں گویا دو اہم فنون سرکاری سرپرستی سے محروم ہو گئے۔ ایک مطلق العنان اور اورنگزیب جیسے سخت گیر حکمران کے سامنے کون زبان کھولتا!

بادشاہ کے دیدار عام کی ممانعت اور زائچۂ نجوم پر بندش شریعت کے نفاذ ہی کی گویا کڑیاں تھیں۔ قانونی طور پر ''السلام علیکم'' کا حکم، بادشاہ کیخلاف استغاثے کا قانون، ہندوؤں اور دیگر مذہب کے لوگوں سے جزیے کی وصول یابی، بھی کچھ شرع کے نفاذ کی خاطر ہو رہا تھا مگر بالا! اندر سے نہ امراء بدلے تھے نہ عوام، چوری ہر کام ہوتا، عارج بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھا اس لئے اس کی رنگ رلیاں جاری تھیں۔

انہیں دنوں راجپوتوں نے شورش برپا کر دی اور اورنگزیب کی توجہ اس طرف ہو گئی۔

عارج نے اپنی اور میری شدید علالت کا عذر پیش کر کے جان بچائی ورنہ خبریں یہ تھی کہ اس بار اورنگزیب اسے بھی اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' عارج اسی پر عمل کر رہا تھا اور بہار اس کی معاون تھی۔

عملی طور پر اب میرے بجائے عارج کی حویلی میں بہار کا حکم چلتا تھا۔

بہار کو اس کے ظرف سے زیادہ ملا تو چھلک اٹھی۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا۔ ذرا ذرا سی باتوں پر وہ کنیزوں اور خدمت گاروں کو سخت سزائیں دیتی۔ اقتدار اور شراب کے نشے میں وہ بہکی بہکی پھرتی۔ اب وہ اعلانیہ اپنے باغیانہ خیالات کے اظہار میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتی۔ وہ خود کو شہزادی بھی کہلوانے لگی تھی۔ عارج کے علاوہ جن لوگوں سے اس کی آشنائی رہ چکی تھی وہ بھی حویلی میں آنے جانے لگے تھے۔ بہار اب مجھے بھی خاطر میں نہ لاتی۔ وقت نے آخر اپنی طنابیں کھینچ لیں۔ بہار رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔

اب عارج کو ہوش آ گیا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ بہار کی وجہ سے وہ کس قدر بے عزت ہو چکا ہے!

بہار کو جب عارج کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ نشے میں تھی اور اس پر باغیانہ خیالات کا غلبہ تھا۔ عارج نے اس سے جواب طلبی کی تو وہ بولی ''تم کون ہو مجھ پر پہرے بٹھانے والے! مجھ میں اور تم میں فرق ہی کیا ہے!...... میں تم سے کمتر نہیں ہوں۔ کیا بادشاہ اور کیا فقیر

سب برابر ہیں۔ کوئی کسی سے کم ہے نہ زیادہ!......"

دیر تک بہار اسی طرح کی باتیں کرتی رہی، یہاں تک کہ عارج کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ چیخ اٹھا "اسی وقت اور اسی حال میں میری حویلی سے نکل جا! ایسا نہ ہو کہ میں تجھے قتل کر دوں!....."

جواباً بہار گستاخانہ انداز میں زور زور سے ہنسنے لگی۔

"لے جاؤ..... اسے لے جاؤ!" عارج غصے میں چیخنے لگا۔

خدمت گار اس آدم زادی کو وہاں سے کھینچتے ہوئے لے گئے جس نے ایک جن زاد عارج کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ ابھی میں اپنی چشم تصور سے یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ اچانک میرے انسانی قالب کا دل انتہائی تیزی سے دھڑکنے لگا پھر چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میں نے دل میں درد محسوس کیا۔ اب تک دو مرتبہ میرے دل میں شدید درد ہو چکا تھا اور میں ہوش کھو بیٹھی تھی۔

طبیبوں کا کہنا یہ تھا کہ اگر تیسری بار اس طرح کا درد اٹھا تو میرے لئے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ اب میں آسائش بانو کے انسانی قالب سے نکل آتی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اسی کے ساتھ آسائش بانو پر جاں کنی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ دیکھ کر ایک کنیز، عارج کو یہ خبر دینے دوڑ گئی۔

پھر جب تک عارج وہاں پہنچا اور طبیب آئے آسائش بانو ہمیشہ کیلئے گہری نیند سو چکی تھی۔ عارج کی آمد سے قبل ہی میں نے اندھیرے کی چادر اوڑھ لی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ عارج مجھے نہ دیکھ سکے۔ میں کیونکہ وہاں موجود تھی اس لئے عارج میری خوشبو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے شدید الجھن کے آثار نظر آئے۔ اس الجھن کا سبب عارج کی لاعلمی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ شہزادی آسائش بانو کی موت سے پہلے میں نے اس کا جسم چھوڑ دیا تھا یا نہیں! آسائش بانو کے جسم سے نہ نکلنے کا مطلب میری بھی یقینی موت تھا۔ میرے وجود کی مخصوص خوشبو اسی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ میں وہیں ہوں۔ نظر نہ آنے سے عارج وہی نتیجہ اخذ کرتا جو میں چاہتی تھی۔

"نہیں!" عارج بڑبڑایا۔ "دینار مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی!..... ایسا نہیں ہو سکتا!" شدید الجھن کے ساتھ ہی اب عارج کے چہرے سے فکرمندی بھی جھلک رہی تھی، آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ چند لمحے توقف کے بعد عارج کی بھرائی ہوئی آواز پھر ابھری۔ "اے

دینار! آنکھیں تو کھول!..... کیا تو اپنے گنہگار کا پشیمان چہرہ نہیں دیکھے گی!"

عارج کے ان الفاظ سے یہی ظاہر تھا کہ اسے میری موت کا یقین آ چکا ہے۔

معاً عارج کے چہرے پر مجھے وحشت کے آثار نظر آئے۔ اس سے پہلے کہ اسے کوئی روک سکتا اس نے دیوار سے اپنا سر ٹکرا دیا۔

"جب تو نہیں رہی تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔" عارج کہنے لگا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ دیوار سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ کنیزیں اور خدمت گار اسے ایسا کرنے سے روکنے لگے، مگر وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یہی دیکھنا تھا کہ عارج کے وجود میں اب بھی میرے عشق کا شعلہ بھڑک رہا ہے یا نہیں! میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ اگر عارج کو روکا نہ گیا تو وہ جان دے دے گا۔ یہ کام کنیزوں اور خدمت گاروں کے بس کا نہیں تھا۔

"اے عارج! رک جا اور جان نہ دے کہ تیری دینار زندہ ہے۔" میں نے عارج کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی اور پھر اس پر ظاہر ہو گئی۔ میری آواز صرف عارج ہی سننے کا اہل تھا، اس لئے کسی اور کو کچھ معلوم نہ ہوا۔

"اب تو بھی اپنے انسانی قالب سے نکل آ!" میں نے عارج سے کہا۔

دوسرے لمحے صالح کے انسانی پیکر سے عارج باہر آ گیا۔ عارج کو ساتھ لئے میں اس حویلی سے نکل آئی۔

"کہاں چل رہی ہے؟" عارج نے میرے ساتھ ساتھ پرواز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"آدم زادوں کی اس بستی سے کہیں دور!" میں نے جواب دیا۔

چند ہی لمحوں میں ہم شاہجہان آباد سے باہر آ گئے۔ یہ رات کا وقت تھا۔ ہم ایک گھنے جنگل میں اتر گئے۔

"میں تجھے یہاں اس لئے لے کر آئی ہوں کہ آئندہ کیلئے کوئی فیصلہ کر سکوں۔" میں نے عارج کو بتایا۔

"یہ باتیں تو خیر ہوتی ہی رہیں گی لیکن..... اس کا جواب دے کہ تو نے اپنی موت کا سوانگ رچا کر مجھے بے وقوف کیوں بنایا؟ معلوم ہے تجھے کہ مجھ پر کیا گزری تھی!..... اے دینار، تو نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔" عارج کہنے لگا۔

"تو نے حرکتیں بھی تو ایسی شروع کر دی تھیں کہ تجھے سزا دینا ضروری ہو گیا تھا۔" میں

بولی۔

''تجھے بخوبی علم ہے کہ قصور میرا نہیں اس انسانی قالب کا تھا جو میں نے اپنایا تھا۔'' عارج نے اپنی صفائی پیش کی۔

''میں نے اسی لئے تو تجھے معاف کردیا ورنہ سر پھوڑ کے مر جانے دیتی۔'' میں ہنس دی۔

''اچھا بتا تو کس فیصلے کی بات کر رہی تھی؟'' عارج نے پوچھا۔

''فیصلہ یہ کرنا ہے کہ ہم اسی زمانے میں رہیں یا واپس بغداد چلیں!'' میں نے جواب دیا۔

''ایک تیسری صورت بھی تو ہے اے دینار!'' عارج نے کہا۔ ''وہ یہ کہ ابھی بغداد واپس جانے کے بجائے ہم کسی اور زمانے کی سیر کو نکل چلیں۔ تو شاید یہ بھول گئی ہے کہ ہم خود عراق سے ہندوستان نہیں آئے بلکہ عالم سوما نے ہمیں عراق چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ابھی ہم مزید کچھ عرصے عراق کی طرف نہ پلٹیں۔''

عارج ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے اس کا مشورہ قبول کرلیا۔ کافی دیر بحث مباحثے کے بعد ہمارے درمیان یہ طے پایا کہ ہم فی الحال ہندوستان ہی میں رہیں گے البتہ زمانہ کوئی اور ہوگا۔ کسی ایسے ہی مطلوبہ زمانے کو تلاش کرتے ہوئے ہم اورنگزیب کے عہد سے ماضی کی طرف پلٹے۔

☆.....☆.....☆

یہ 12 ربیع الاول 952 ہجری کی ایک اداس شام تھی۔

ادھر اسے قلعہ کالنجر کے فتح ہونے کی خوشخبری ملی۔ ادھر اس کا طائر روح عالم بالا کی طرف پرواز کرگیا۔ مرنے والے کا نام فرید خان اور لقب شیر شاہ تھا۔ وہ سہسرام کا ایک معمولی جاگیردار تھا۔ اس نے فاتح مغلوں کو شکست دے کر ہندوستان کی سرحدوں سے نکال دیا تھا اور ایک مضبوط نظام حکومت کی بنیاد رکھی تھی۔ جب تک وہ زندہ رہا مغلوں کو ہمت نہیں ہوئی کہ ہندوستان کا رخ کرتے۔ اس نے 4 سال، 4 ماہ اور 15 روز حکومت کی مگر اس کے عہد حکومت کا یہ مختصر دور بلاشبہ مغلوں کے صدیوں طویل دور حکومت پر بھاری نظر آتا ہے۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں شیر شاہ سوری کو بادشاہی ملی تھی۔ وہ خود کہتا تھا۔ ''افسوس مجھے اس وقت بادشاہی ملی جب میری زندگی کی شام ہوچکی تھی۔'' 74 سال 8 ماہ چند دن اس نے عالم آب و گل میں گزارے تھے۔

اس عہد میں کچھ عرصے قیام کی غرض سے میں تمام ضروری معلومات حاصل کررہی تھی۔ ان معلومات کے بعد ہی میں کسی آدم زادی کے جسم میں اترنا چاہتی تھی۔ مختلف زمانوں میں سفر کرکے مجھے متوقع خطرات کا اندازہ ہوچکا تھا۔

شیر شاہ سوری نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے عادل خان کو ولی عہد مقرر کردیا تھا۔ جب شیر شاہ سوری کا انتقال ہوا تو عادل خان قلعہ رنتھمبور میں مقیم تھا۔ قطب خان اور عیسیٰ خان دربار سوری کے معتبر امیروں میں سے تھے۔ انہوں نے باہم مشورہ کرکے کہ کہیں شیر شاہ کے انتقال سے کوئی فتنہ کھڑا نہ ہوجائے شیر شاہ کے چھوٹے بیٹے جلال خان کو بلوالیا۔ جلال خان اس وقت پٹنہ کے قریب ٹھہرا ہوا تھا۔ ان دونوں بااثر امیروں نے دوسرے امیروں کو بھی اپنا ہمنوا بنالیا اور جلال خان کو فوری طور پر تخت نشین کردیا۔ جلال خان کا خطاب اسلام شاہ رکھا گیا جو پٹھانوں کی زبان پر سلیم شاہ سے بدل گیا۔

سلیم شاہ سوری نے تخت نشین ہوتے ہی قطب خان کو افواج کا سپہ سالار بنادیا تھا کیونکہ قطب خان کی کوشش ہی سے اسے بادشاہت ملی تھی۔ سلیم شاہ سوری اس کا ممنون احسان تھا۔ فی الحال تمام سیاہ و سفید کا مالک قطب خان تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر عادل خان برسر اقتدار آگیا تو اسے ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ وہ اسی لئے اب یہ چاہتا تھا کہ شیر شاہ سوری کا چھوٹا بیٹا ہی تخت نشین رہے مگر تخت و تاج کا اصل دعویدار ابھی زندہ تھا اور اسے زیر دام لانا ضروری تھا۔ وہ اسی لئے خلوت میں سلیم شاہ سوری سے ملا اور اس کے سامنے ایک ایسا منصوبہ پیش کیا کہ بڑے بھائی کا کانٹا درمیان سے نکل جائے۔

سلیم شاہ سوری اس پر راضی ہوگیا۔

پھر قطب خان کے ایما پر ہی سلیم شاہ سوری نے بڑے بھائی عادل خان کو معذرت آمیز خط لکھا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔ ''امرائے دربار نے مجھے صرف اس لئے تخت پر بٹھا دیا کہ آپ ایک دور دراز مقام پر تھے۔ میں نے بھی ان کی یہ تجویز بحالت مجبوری قبول کرلی۔ اب آپ جلد از جلد تشریف لائیں اور مجھے اپنا فرمانبردار سمجھئے۔''

مندرجہ بالا خط لکھ کر قطب خان کے مشورے پر سلیم شاہ سوری، آگرہ پہنچ گیا اور وہاں سے بھی بھائی کو ایک خط روانہ کیا اور لکھا کہ میں آپ کی تشریف آوری کا بے چینی سے منتظر ہوں۔

قطب خان کا منصوبہ یہ تھا کہ عادل خان کو کسی طرح آگرہ بلا کے گرفتار کرلیا جائے۔ سلیم شاہ سوری کے خطوط ملے تو جواب میں عادل خان نے قطب خان کو ایک خط لکھا اور

دریافت کیا۔ "مجھے آپ لوگ آخر کس مصلحت کی بنا پر بلا رہے ہیں؟" عادل خان نے اس کے ساتھ چھوٹے بھائی سلیم شاہ سوری کو بھی پیغام دیا۔ "جو شکوک و شبہات میرے دل میں پیدا ہوگئے ہیں وہ اسی صورت میں دور ہوسکتے ہیں کہ دربار کے دو چار معتبر امیر آکر مجھے اطمینان دلا دیں اور اپنے ساتھ لے جائیں۔"

سلیم شاہ سوری سے قطب خان نے کہا کہ حضور یہ شرط تسلیم کرلیں۔ اسی طرح وہ شاہین زیر دام آسکتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ دربار سے چار امیروں کو عادل خان کے پاس بھیج دیا گیا۔ ان امیروں نے عادل خان سے عہد و پیماں کئے۔ دراصل ان امیروں کو بھی اصل سازش سے لاعلم رکھا گیا تھا۔ انہوں نے عادل خان کو یقین دلا دیا کہ آگرہ پہنچتے ہی آپ کو تخت نشین کردیا جائے گا اور دوسرے ہی دن سلیم شاہ وہاں سے روانہ ہوجائے گا۔ سلیم شاہ جس علاقے کو بھی پسند کرے گا وہاں کی جاگیر کا پروانہ اسے دے دیا جائے گا۔ عادل خان نے ان امیروں کی باتوں پر اعتبار کرلیا اور آگرہ کیلئے روانہ ہوگیا۔ عادل خان کے آنے کی خبر سلیم شاہ کو مل چکی تھی۔ وہ بظاہر عادل خان کا استقبال کرنے شہر سے ایک منزل پر آکے ٹھہر گیا۔

دونوں بھائیوں کی ملاقات سرراہ ہوئی۔ سلیم شاہ اپنے بڑے بھائی سے انتہائی تپاک کے ساتھ ملا، عذر معذرت کی اور معافیاں طلب کیں۔ جب اس نے بڑے بھائی کو اپنی طرف سے کچھ مطمئن دیکھا تو درخواست کی کہ آپ تکلیف کرکے آگرہ تک تشریف لے چلئے۔

قطب خان نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ سلیم شاہ جب بھائی کو بہلا پھسلا کر کسی طرح آگرہ چلنے پر آمادہ کرلے اور جب وہ چلنے پر تیار ہوجائے تو شہر میں داخل ہوتے وقت کچھ ایسا انتظام کیا جائے کہ عادل خان کے ساتھ دو چار آدمی سے زیادہ اندر نہ آنے پائیں۔ اس طرح آسانی کے ساتھ عادل خان کو گرفتار کیا جاسکتا تھا۔

عادل خان آخرکار اپنے چھوٹے بھائی کی باتوں میں آکر آگرہ چلنے پر تیار ہوگیا لیکن قطب خان کا منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا۔ عادل خان کے بہت سے آدمی بھی دھکا پیل کرکے شہر میں داخل ہوگئے۔ یہ صورتحال غیر متوقع تھی۔

دروازہ شہر پر روک ٹوک سے عادل خان اپنے بھائی کی طرف سے بدگمان ہوگیا تھا۔ بھائی کی بدگمانی کو رفع کرنے اور اسے پوری طرح مطمئن کرنے کیلئے سلیم شاہ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور خوشامدانہ باتیں کیں۔

قطب خان کے اشارے پر سلیم شاہ نے بڑے بھائی سے کہا "میں بڑا مجبور ہوگیا تھا ورنہ کبھی تخت پر نہ بیٹھتا۔ ان پٹھانوں کو میں بمشکل قابو میں کرکے اب تک تخت و تاج کی

حفاظت کررہا ہوں۔ اب آپ آگئے ہیں تو یہ آپ کا حق ہے۔ تخت اور لشکر اب آپ سنبھالئے اور مجھے اس ذمے داری سے سبکدوش کردیجئے۔" یہ کہہ کر اس نے عادل خان کا ہاتھ پکڑا اور اسے زبردستی تخت پر بٹھا دیا۔

عادل خان آرام طلب اور بے جوہر آدمی تھا۔ اس کے علاوہ اپنے چھوٹے بھائی کی سازش کو بھی بھانپ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس وقت میں نے بادشاہت قبول کرلی تو یہ صرف چند روزہ ہوگی کیونکہ امرائے دربار بہرحال سلیم شاہ کے وفادار ہیں۔ وہ اسی لئے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا اور سلیم شاہ کو تخت پر بٹھا کر پہلے خود اسے تعظیم اور مبارکباد دی۔ اس کے بعد تمام امراء بھی عادل خان کے کہنے پر مراسم اطاعت بجالائے۔ اس موقع پر عیسیٰ خان اور خواص خان نے سلیم شاہ کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی کہ عادل خان کو ایک جاگیر دے دی جائے۔

یہ عرضداشت سلیم شاہ نے منظور کرلی۔

قطب خان کو یہ بھی منظور نہ تھا۔ اس کی سازشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرکار دونوں بھائیوں میں ٹھن گئی۔ ان کی فوجیں لڑنے کیلئے آمنے سامنے آگئیں۔ سلیم شاہ کی فوج کا سپہ سالار قطب خان تھا۔ یہی قطب خان تھا کہ جس کی بیٹی مہرالنساء کے جسم میں اترنے کا میں فیصلہ کرچکی تھی۔

اپنے لئے انسانی قالب منتخب کرنے کے ساتھ ساتھ عارج کی خاطر بھی میں نے ایک پناہ گاہ ڈھونڈ لی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہم دونوں ایک ساتھ رہ سکیں۔ یہ وہ درمیانی زمانہ تھا جب شیر شاہ سوری کی موت کے بعد اقتدار کی کشمکش جاری تھی۔ دونوں بھائیوں یعنی شیر شاہ سوری کے بیٹوں عادل خان اور سلیم شاہ کی تعداد افواج میں نمایاں فرق تھا۔ ان کی فوجیں مقابل آئیں تو یہ فرق مزید واضح ہوگیا۔ آخرکار وہ لمحہ آ ہی گیا جب جنگ چھڑ گئی۔ عادل خان کی فوج تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے شروع ہی میں حوصلہ ہار بیٹھی۔ قطب خان جو سلیم شاہ کی فوجوں کا سپہ سالار تھا اس نے کثرت تعداد اور موقع سے فائدہ اٹھایا۔ جلد ہی عادل خان کی فوج کے پیر اکھڑ گئے۔ اسے شکست ہوئی۔ صورتحال دیکھ کر عادل خان پہلے ہی سے راہ فرار کا بندوبست کرچکا تھا۔

شکست کھا کر عادل خان پٹنہ کی طرف بھاگ گیا اور پھر اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ عادل خان کے کئی امیر اس سے باغی ہوکر سلیم شاہ سے آملے تھے۔ سلیم شاہ نے ان باغی امراء کو انعام و اکرام سے نوازا اور قطب خان کے عہدے میں مزید اضافہ کردیا۔ اب قطب خان

نائب السلطنت ہوگیا تھا۔ سلیم شاہ کے اس اعلان پر سب سے زیادہ خوشی عیسیٰ خان کو ہوئی تھی۔ وہ قطب خان کا انتہائی قریبی دوست تھا۔ قطب خان کے حامی امراء میں عیسیٰ خان سرفہرست تھا۔ دوسری جانب سلیم شاہ کے اس فیصلے نے خواص خان کو فکرمند کردیا تھا۔ قطب خان اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔

شیر شاہ سوری کی موت کے بعد سلیم شاہ کو تخت نشین کرنے کے سلسلے میں قطب خان اور خواص خان وقتی طور پر ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے، مگر ان کے اختلافات بہت پرانے تھے۔ خواص خان کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ سلیم شاہ کی تخت نشینی اور عادل خان کی گمشدگی کے بعد قطب خان کس قدر طاقتور ہو چکا ہے۔ قطب خان بظاہر تو نائب السلطنت تھا مگر عملاً اقتدار اعلیٰ اسی کے پاس تھا۔ سلیم شاہ سوری اس کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ خواص خان کو قطب خان کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ اسے ضرور نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ خواص خان نے اسی لئے آج عیسیٰ خان کی دعوت کی تھی کہ عیسیٰ خان، قطب خان کا دست راست اور دوست تھا۔ اسے یقین تھا کہ عیسیٰ خان اسے قطب خان کے دست انتقام سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ عیسیٰ خان سے اس کی دوستی بھی بہت پرانی تھی۔

میں عارج کے ساتھ اس وقت خواص خان کی حویلی ہی میں تھی۔ کسی انسانی قالب میں اترنے سے پہلے میں سلطنت سے وابستہ تمام اہم امراء کے حالات کا جائزہ لے لینا چاہتی تھی۔ خواص خان بھی انہی امراء میں سے ایک تھا۔

اسی دوران میں عارج نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اے دینار! جب تو قطب خان کی بیٹی مہرالنساء کے جسم میں اترنے کا فیصلہ کر ہی چکی ہے تو پھر کیوں ادھر ادھر بھٹکتی پھر رہی ہے اور مجھے بھی بھٹکا رہی ہے!“

اس پر میں ہنس کر بولی۔ ”جہاں تک تیرے بھٹکنے کا سوال ہے، تو مختلف زمانوں کا سفر کرکے خاصا بھٹک چکا ہے۔ تیرے اندر اب مزید بھٹکنے کی گنجائش نہیں رہی۔۔۔ اب رہا فیصلہ تو اسے بدلا بھی جاسکتا ہے۔“

”یعنی تو قطب خان کی بیٹی کا انسانی قالب نہیں اپنائے گی؟“ عارج نے سوال کیا۔

”ضروری نہیں کہ میں اسی کے جسم میں اتروں۔“ میں نے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

کھانے کے بعد دونوں دوست خواص خان اور عیسیٰ خان حویلی کے وسیع و عریض

پائیں باغ میں آبیٹھے اور ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہوگئے۔ نیزہ بردار خدام پائیں باغ کے چاروں طرف چوکس کھڑے تھے۔ باغ میں جابجا مشعلیں روشن تھیں۔

اسے حسن اتفاق ہی کہا جائے گا کہ ایک دوسرے کو ناپسند کرنے والے دو امیروں کی بیٹیاں ہم نام تھیں۔ ہاں عمروں میں فرق ضرور تھا۔ قطب خان کی بیٹی مہرالنساء خواص خان کی بیٹی سے کئی سال بڑی تھی۔

اس وقت میزبان امیر خواص خان کی کمسن لڑکی مہرالنساء عیسیٰ خان کے نوعمر بیٹے شہباز کے ساتھ باغ کے ایک گوشے میں کھیل رہی تھی۔ خواص خان بہت دیر تک محویت کے عالم میں دونوں بچوں کو کھیلتے دیکھتا رہا، پھر وہ عیسیٰ خان کی طرف دیکھ کر کسی قدر تذبذب سے بولا۔ ”میرے دوست! میں چاہتا ہوں کہ ہماری دوستی مزید پختہ ہوجائے اور ہماری اگلی نسل تک برقرار رہے۔

”وہ کیسے خواص خان؟“ عیسیٰ خان نے استفہامیہ نگاہوں سے اپنے میزبان دوست کو دیکھا۔

خواص خان نے ایک بار پھر باغ کے گوشے میں کھیلتے ہوئے بچوں کی جانب دیکھا اور کہنے لگا ”ان دونوں کو دیکھ رہے ہو عیسیٰ خان! کیسی محبت ہے ان دونوں کے درمیان! میں چاہتا ہوں کہ ہم ان کا نکاح کردیں تاکہ ہماری دوستی رشتے داری میں بدل جائے اور اس طرح یہ دوستی مزید گہری اور پائیدار ہوجائے۔“

عیسیٰ خان نے محبت بھری نگاہ سے خواص خان کی کمسن بیٹی کی طرف دیکھا۔ مہرالنساء اسے بہت اچھی لگی تھی۔ سیاہ گھنے بالوں اور سرخ و سفید رنگت والی اس بچی کے نقوش میں ایسی جاذبیت و کشش تھی کہ ہر دیکھنے والا بے اختیار اسے پیار کرنے پر مجبور ہوجائے۔ گو اس کی عمر 8 برس سے زیادہ نہیں تھی مگر اس کی غیر معمولی اٹھان کو دیکھ کر اندازہ ہوجاتا تھا کہ بہت جلد وہ ایک قیامت خیز حسن کی مالک بن جائے گی۔ عیسیٰ خان کے بیٹے شہباز کی عمر 11 برس کے لگ بھگ تھی۔

اپنے میزبان کی تجویز پر عیسیٰ خان نے چند لمحے غور کیا اور پھر رضامندی ظاہر کردی۔

یہی وہ لمحہ تھا جب عارج بول اٹھا۔ ”اے دینار! یہ بہت اچھا ہوا۔“

کیوں اے عارج؟..... تیرے لئے اس میں خوشی کا کیا پہلو ہے؟“

”ہم اگر ان دونوں کے انسانی قالبوں کو اپنالیں تو عرصہ دراز تک ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکیں گے۔“ عارج نے جواب دیا۔ ”یوں بھی ان دونوں کی شادی ہوجائے گی اور یہ

میاں بیوی بن جائیں گے۔"

"بس تیرا سارا زور میاں بننے پر رہتا ہے! کبھی کچھ اور بھی سوچ لیا کر!" میں بولی۔

ہر چند کہ فوری طور پر میں نے عارج کی تجویز قبول نہیں کی لیکن اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں تھا۔ قطب خان کی بیٹی کے بجائے میں خواص خان کی کمسن بیٹی کا جسم بھی اپنا سکتی تھی۔ شہباز کے جسم میں عارج پناہ لے سکتا تھا۔

چند ہی روز کے بعد خواص خان کی حویلی میں جب ایک رنگا رنگ تقریب منعقد ہو رہی تھی تو عارج میرے پیچھے پڑ گیا۔ بولا "اے دینار! اب تو مان جا کہ مہر النساء اور شہباز کا نکاح ہونے والا ہے۔"

"یہ بھی تو ابھی دیکھنا ہے کہ ہم دونوں کو ان کے انسانی پیکر راس بھی آتے ہیں یا نہیں! کیا خبر کہ ہمارے وجود ان کے جسموں میں قرار نہ پاسکیں!" میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔ یہ اندیشہ درست بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

"تو پھر دیکھ لیتے ہیں نا، ان کے جسموں میں اتر کے!" عارج نے جلدی سے کہا۔

مہر النساء اور شہباز کی عمریں کیونکہ زیادہ نہیں تھیں اس لئے میں نے ان کے ماضی کے بارے میں کچھ معلوم کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ میرا یہ اندیشہ غلط نکلا تھا کہ مجھے اور عارج کو وہ انسانی قالب راس نہیں آئیں گے۔ اب عارج کو تو شہباز کے جسم میں قرار آ چکا تھا اور میں مہر النساء کے جسم کو اپنا چکی تھی۔ اس کے کچھ دیر بعد مہر النساء کا نکاح شہباز سے ہو گیا۔

خواص خان یہ رشتہ کر کے بہت مطمئن ہو گیا تھا۔ اسے اب یقین آ چکا تھا کہ کم از کم اس کی زندگی قطب خان کے ہاتھوں سے محفوظ رہے گی۔ مہر النساء کے جسم میں اترنے کے باوجود حالات پر میری پوری نظر تھی۔ اس کیلئے میں بوقت ضرورت اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لاتی رہتی تھی۔ مجھے اسی سبب یہ پتا چلا کہ خواص خان شدید غلط فہمی کا شکار ہے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ قطب خان مسلسل اس کی مصروفیات پر نگاہ رکھے ہوئے تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔

انسانی قالب اپنانے کے بعد عارج اور میں عموماً رات کے وقت ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ اس کیلئے ہمیں اپنے قالبوں سے باہر آنا پڑتا تھا۔ ہم دونوں دہلی میں ہی تھے مگر الگ الگ حویلیوں میں۔ عارج، عیسیٰ خان کی حویلی میں اور میں خواص خان کی حویلی میں تھی۔ ظاہر ہے کہ نکاح کے باوجود میرے انسانی قالب کی عمر اتنی نہیں تھی کہ اسے رخصت کر دیا جاتا۔ عارج کو یقیناً ایسی کسی صورتحال کا اندازہ نہیں تھا۔ اس لئے مجھ سے الگ رہنے پر جھنجھلایا

ہوا سا رہتا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے کہتا "کوئی ایسی تدبیر نکال اے دینار کہ ہم ایک ساتھ رہ سکیں۔"

میں جواب میں کہہ دیتی کہ خدا کا شکر ادا کر، ہم ایک ہی شہر میں ہیں۔

ممکن ہے عارج کو اور مجھے عرصہ دراز تک الگ رہنا پڑتا مگر حالات کی ایک نئی گردش نے ہمیں ملا دیا۔

مہر النساء اور شہباز کی شادی کو ابھی ایک ماہ گزرا تھا کہ ایک رات قطب خان کے ہرکارے، خواص خان کی حویلی پہنچ گئے۔ وہ قطب خان کے حکم پر اسے گرفتار کرنے آئے تھے۔ یہ حکم نائب السلطنت قطب خان کا تھا۔ خواص خان بخوبی جانتا تھا کہ لیت و لعل یا مزاحمت کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ خاموشی کے ساتھ ان ہرکاروں کے جلو میں زندان کی طرف چل دیا۔ اس نے صرف اتنا کیا تھا کہ حویلی سے چلتے وقت اپنے ایک خادم کو امیر عیسیٰ خان کے پاس روانہ کر دیا تھا کہ وہ اسے اس واقعہ کی فوراً اطلاع دے دے۔

اس رات خواص خان کی گرفتاری کے فوراً بعد ہی میں، مہر النساء کے قالب سے نکل آئی اور اسے سلا دیا۔ میں یہ پتا لگانے کیلئے بے چین تھی کہ خواص خان کی قسمت کا کیا فیصلہ ہوتا ہے! مزید یہ کہ اس سلسلے میں عیسیٰ خان نے کیا قدم اٹھایا ہے!

عیسیٰ خان کو جیسے ہی اس واقعہ کی خبر ملی، وہ فوراً نائب السلطنت کے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ قطب خان کے محل پہنچ کر عیسیٰ خان نے اندر خبر کرائی کہ فوری طور پر ملنے کا خواہش مند ہوں۔ میں بھی اس کے ساتھ تھی مگر وہ اس سے لاعلم تھا۔ قطب خان جب عیسیٰ خان سے ملا تو تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے۔

عیسیٰ خان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی قطب خان بول اٹھا۔

"کیا تمہیں نہیں معلوم کہ یہ میرے آرام کا وقت ہے؟"

"جانتا ہوں۔" عیسیٰ خان نے نرمی اختیار کی اور مزید بولا "معاملہ ہی دراصل کچھ ایسا تھا کہ مجھے اس وقت آنا پڑا۔" یہ کہہ کر اس نے خواص خان کی رہائی کے بارے میں درخواست کی۔

"یہ ناممکن ہے عیسیٰ خان!" قطب خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ خواص خان ہمیشہ ہماری مخالفت کرتا رہا ہے۔ مرحوم شاہ کے زمانے ہی سے اس کا شمار ہمارے مخالفین میں ہوتا ہے۔"

"لیکن اب تو وہ آپ کے وفاداروں میں شامل ہے۔" عیسیٰ خان اپنے دوست کی وکالت کرنے لگا۔ "آپ کے علم میں ہے کہ وہ میرا دوست ہونے کے علاوہ اب رشتے دار بھی بن چکا ہے۔ ایسی صورت میں بھلا وہ کس طرح آپ کی مخالفت کر سکتا ہے! اسے میرے اور

آپ کے مراسم و تعلقات کا بھی اچھی طرح اندازہ ہے۔"

"تمہیں بہت سی باتوں کا علم نہیں ہے۔ عیسیٰ خان!" قطب خان طویل سانس لے کر بولا "کیا تم یقین کرو گے کہ خواص خان میرے خلاف سلیم شاہ کو اکسا تا رہا ہے! وہ اس کوشش میں ہے کہ مجھے معزول کرا کے خود نائب السلطنت بن جائے۔ دشمن ہر حال میں دشمن ہوتا ہے۔ دوست نہیں بن سکتا۔ اسے زندہ چھوڑ دینا خود اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دینے کے مترادف ہے۔ میں یہ غلطی کرنا نہیں چاہتا۔ خواص خان کو تہ تیغ کرنا ہی میری سلامتی کی ضمانت ہے۔"

میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ قطب خان، خواص خان کی جان ہی کے در پے ہو جائے گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ قطب خان کو ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ دوسری جانب عیسیٰ خان نے بھی طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے قدیمی دوست اور رشتے دار خواص خان کی زندگی نہ بچا سکا تو خود بھی قطب خان کی دوستی ترک کر دے گا۔ رات گئے تک وہ قطب خان کے محل میں موجود رہا اور مسلسل اسے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

اسی موقع پر میں نے مداخلت کی اور قطب خان کو اپنے اثر میں لے کے عیسیٰ خان کی بات ماننے پر مجبور کر دیا۔ میں اگر ایسا نہ کرتی تو خواص خان مارا جاتا۔ قطب خان بظاہر بہت سمجھانے بجھانے پر آخر کار خواص خان کی جاں بخشی پر رضامند تو ہو گیا مگر اس نے عیسیٰ خان پر واضح کر دیا کہ خواص خان اب دہلی میں نہیں رہ سکتا۔ اسے ہر حال میں سات دن کے اندر اندر اس شہر کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہنا پڑے گا۔ میں اگر چاہتی تو قطب خان یہ شرط بھی نہ لگاتا لیکن مجھے تو عارج کے ساتھ رہنے کی ایک اور ہی تدبیر سوجھ گئی تھی۔ اس تدبیر پر عملدرآمد کی خاطر مجھے عیسیٰ خان کو بھی اپنے اثر میں لینا ہو گا۔ مجھے اس کا احساس تھا۔

رات کے تیسرے پہر عیسیٰ خان اپنے دوست خواص خان کی رہائی کا پروانہ لے کر خود زنداں میں پہنچا۔ وہ خواص خان کی رہائی کے بعد اسے اس کی حویلی تک چھوڑنے گیا۔ راستے میں اس نے خواص خان پر واضح کر دیا کہ اسے سات دن کے اندر اندر دہلی سے نکل جانا ہو گا۔

خواص خان اپنی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ اس نے جواباً عیسیٰ خان سے کہا "میں جلد ہی اپنے آبائی شہر سہسرام چلا جاؤں گا اور مناسب وقت کا انتظار کروں گا کہ دوبارہ دہلی لوٹ کر آ سکوں۔"

خواص خان اچھی طرح جانتا تھا کہ اقتدار کی دھوپ چھاؤں کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اسے یقین تھا کہ قطب خان کے اقتدار کا سورج جو اس وقت نصف النہار پر ہے جلد ہی ڈھل جائے گا۔ کوئی بھی بادشاہ کسی ایسے بااثر و بااقتدار امیر کو زیادہ عرصے تک برداشت نہیں

کرتا جو کسی بھی وقت خود اس کے اقتدار کیلئے خطرہ بن سکتا ہے۔

جس روز خواص خان کو دہلی سے روانہ ہونا تھا میں اس سے پہلے ہی عیسیٰ خان کو اپنے اثر میں لے کر ایک بات اس کے دماغ میں بٹھا چکی تھی۔ عیسیٰ خان اپنے بیٹے شہباز کے ہمراہ آخری بار اپنے دوست سے ملنے آیا۔ شہباز ہی کے جسم پر عارج نے قبضہ کر رکھا تھا۔

الوداعی کلمات کے بعد عیسیٰ خان نے وہ بات کہہ ہی دی جو میں نے اسے سمجھائی تھی۔ اس نے کہا "میرے دوست! میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ تمہارے لئے نہایت مشکل مرحلہ ہے مگر میں تم سے اپنی بیٹی مہرالنساء کو مانگنے آیا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ اب وہ تمہارے پاس میری امانت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ بھی تمہارے ساتھ در در کی ٹھوکریں کھائے۔"

میرا خیال تھا کہ خواص خان اس پر تیار نہیں ہو گا اور مجھے اسے بھی اپنے اثر میں لینا پڑے گا مگر اس کی ضرورت خلاف توقع پیش نہیں آئی۔ خواص خان فوراً اس پر آمادہ ہو گیا۔ میرا مقصد یہی تھا اس لئے میں نے خواص خان کے رویے پر توجہ نہیں دی۔ اس نے مجھے بلا کر میرا ہاتھ عیسیٰ خان کے ہاتھ میں دے دیا اور روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ خواص خان کے چہرے سے رنج و ملال کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ اپنی کمسن بیٹی کی جدائی پر وہ غمزدہ نظر نہیں آ تا تھا۔ اس کی بیوی یعنی مہرالنساء کی ماں البتہ مجھ سے جدا ہوتے وقت بہت روئی اور دیر تک مجھے سینے سے چمٹائے پیار کرتی رہی۔ پھر ان کی روانگی کا وقت ہو گیا۔ وہ مجھے عیسیٰ خان کے حوالے کر کے دہلی سے رخصت ہو گئے۔

میرے لئے عیسیٰ خان کی حویلی کا ماحول بالکل نیا تھا مگر رفتہ رفتہ میں اس نئے ماحول سے مانوس ہو گئی۔ عارج حویلی میں میری آمد سے بہت خوش تھا۔ اب تک میں نے آدم زادوں کے درمیان رہ کر بہت کچھ سیکھا تھا۔ آدم زاد کس بات سے خوش کس سے ناخوش ہوتے ہیں انہیں کیا باتیں متاثر کرتی ہیں یہ سارے گر مجھے خوب آتے تھے۔ میں اسی لئے اب عیسیٰ خان کو "بابا" کہہ کر پکارتی تھی اور اس سے اس طرح ضد کرتی تھی جیسے کوئی بیٹی اپنے باپ سے ضد کرتی ہے۔ عیسیٰ خان بھی مجھے اپنی بیٹی کی طرح عزیز رکھتا تھا اور میری ہر ضد پوری کرتا تھا۔ وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ دن مہینوں میں ڈھلے اور مہینے سال بن گئے۔ میرا انسانی قالب اب عمر کے گیارہویں سال میں قدم رکھ چکا تھا اور آغاز شباب کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ میرے قالب کا قد اب پہلے سے کافی لمبا ہو چکا تھا۔ لمبے سیاہ بالوں میں گھرے ہوئے سرخ و سفید چہرے میں ایک غیر معمولی کشش تھی۔ عیسیٰ خان جب بھی میری طرف دیکھتا تھا مجھے اس

کی آنکھوں میں خوف سا دکھائی دیتا۔ وہ شاید اندازہ کر رہا تھا کہ اس کی بہو بہت جلد ایک قیامت خیز حسینہ بن جائے گی جو بھی اسے دیکھے گا اس کے سحر انگیز حسن کا اسیر ہو کے رہ جائے گا۔ عیسیٰ خان کے خوف کو میں بخوبی سمجھتی تھی۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھ پر کسی کی نظر پڑے۔ اس نے اسی لئے ایک روز مجھے اپنے پاس بلایا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا

''بیٹی! میں نے تمہیں مردانہ لباس پہنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں بیٹوں کی طرح تمہاری پرورش کرنا چاہتا ہوں بولو، میرے اس فیصلے سے تم خوش تو ہو؟''

''جی..... جی بابا!'' میں نے عیسیٰ خان کی توقع کے مطابق بہت خوشی کا اظہار کیا اور بلا تامل اس نے جو بھی کہا تھا اس پر تیار ہوگئی۔

پھر میں نے مردانہ لباس پہننا شروع کر دیا۔ سر کے لابنے بالوں کو میں نے پگڑی میں چھپا لیا تھا۔

نیا لباس پہن کر خود کو میں نے آئینے میں دیکھا تو عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ میں بالکل ایک نوعمر لڑکا معلوم ہو رہی تھی۔

مجھے مختلف زمانوں میں جا کر شمشیر زنی، نیزہ بازی، تیر اندازی اور گھڑ سواری سبھی کچھ آ گیا تھا۔ اس کے باوجود وقت کا تقاضا بھی میرے پیش نظر تھا۔ اسی کو ملحوظ رکھ کر میں نے عیسیٰ خان سے فنون حرب سیکھنے کیلئے خواہش کی۔

عیسیٰ خان پہلے ہی یہ طے کر چکا تھا کہ وہ میری پرورش بیٹوں کی طرح کرے گا۔ اس لئے فوراً رضامند ہوگیا۔ چاہتا تو وہ یہ تھا کہ یہ سب مردانہ شوق اس کے اپنے بیٹے شہباز کے دل میں پیدا ہوں مگر اسے ان چیزوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ میں نے عارج کو سمجھایا تھا کہ ہر زمانے میں اپنی صلاحیتوں کا جواز پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اس نے میری بات ٹال دی تھی۔ وہ میری طرح فنون حرب سیکھنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ اس انکار میں عارج کے انسانی قالب کے فطری تقاضوں کو بھی دخل ہے۔ میں یہ جانتی تھی۔ اسی وجہ سے میں نے اصرار نہیں کیا تھا۔ عیسیٰ خان نے اپنی یہ دلی خواہش کہ اس کا بیٹا فنون حرب سیکھے، اس طرح پوری کر لی کہ فن حرب کے بہترین استاد میری تربیت کیلئے مقرر کر دیئے۔ یہ تمام فنون مجھے پہلے سے آتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ میرے انسانی قالب مہر النساء کی ماں قمر النساء بھی ان فنون میں طاق تھی۔ قمر النساء کا تعلق ایک ترکان قبیلے سے تھا جہاں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی ان جنگی فنون کی تربیت دی جاتی تھی۔ چند ہی برسوں میں، میں نے یہ ظاہر کر دیا کہ تمام مطلوبہ فنون حاصل کر چکی ہوں۔

مجھے اب عیسیٰ خان کی حویلی میں رہتے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ میرا انسانی قالب اپنی عمر کے چودھویں سال میں تھا۔ اپنے دراز قد اور قدرتی بڑھوار کی وجہ سے اب میں جوان معلوم ہوتی تھی۔

☆..... ☆ ..... ☆

یوں تو عارج کا انسانی پیکر شہباز بھی اب سترہ برس کا ہو چکا تھا مگر وہ اتنا دبلا پتلا اور نازک اندام تھا کہ مجھ سے چھوٹا لگتا تھا۔ اس میں جوان مردوں کی سی کوئی بات نہیں تھی۔ فطرتاً وہ بزدل تھا۔ اسی لئے فنون حرب سے بھی بھاگتا تھا۔ عارج کے انسانی قالب کے فطری تقاضے اس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے میں ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھی۔ مجھے اس کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ شاہم بیگ اور صالح کے انسانی قالبوں کی فطری صفات عارج پر غالب آ گئی تھیں۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ اس میں عارج کا کوئی قصور نہیں کچھ ایسی ہی صورتحال اس زمانے میں بھی پیش آ رہی تھی۔

عارج کا انسانی قالب شہباز دیکھنے میں حسین و پرکشش تھا۔ حویلی کی کنیزوں اور خادماؤں نے اسے بگاڑ دیا تھا۔ اتنی سی عمر میں وہ شاہد و شراب کا رسیا ہوگیا تھا۔ کثرت شراب نوشی پر اسے عیسیٰ خان بھی کئی بار ڈانٹ چکا تھا مگر وہ باز نہیں آتا تھا۔ اس کے اکثر دوست بھی اسی کی طرح تھے وہ اور اس کے دوست شادی کرنے کو پاؤں کی زنجیر کہتے تھے۔ کنیزوں اور خوبصورت خادماؤں کے ہجوم میں رہ کر وہ مجھ سے کچھ کٹا کٹا سا رہتا۔ یوں بھی میں اس کے انسانی قالب کی فطری کمزوریوں کو سمجھ چکی تھی۔ اس لئے اسے نظر انداز کر جاتی۔ اس کے علاوہ میں مردانہ لباس میں رہتی تھی اور کبھی بناؤ سنگار بھی نہیں کرتی تھی۔ عارج کو کسی کے ناز اٹھانے کے بجائے خود اپنے ناز اٹھوانے کی عادت ہوگئی تھی۔ موقع ملنے پر ایک بار میں نے خلوت میں عارج کو سمجھایا:

''اے عارج! مجھے خبر ہے کہ تیری عادات بد کی ذمے داری صرف تجھ پر عائد نہیں ہوتی۔'' میں بولی ''اس کے باوجود میں تجھے تاکید کرتی ہوں کہ خود کو سنبھال! اے نوشی اور آوارگی پر قابو پانے کی کوشش کر!''

''تو ٹھیک کہتی ہے اے دینار!'' عارج نے تسلیم کیا۔ ''مجھے خود بھی اپنے انسانی قالب کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر شرمندگی ہے، مگر..... مگر میں کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ معلوم نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے کہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ تیری تاکید پر عمل کر سکوں۔''

پہلے پہل تو مجھے کسی نے یہ احساس نہیں دلایا تھا کہ میں، شہباز کی منکوحہ ہوں، لیکن اب

ایسا نہیں تھا۔ کنیزیں اور خادمائیں مجھے احساس دلانے لگی تھیں کہ میں شادی شدہ ہوں۔ انہوں نے بھی یہ بات محسوس کرلی تھی کہ عارج کا انسانی پیکر شہباز مجھ سے کھنچا کھنچا سا رہتا ہے۔

عیسیٰ خاں کی بیوی، شہباز کے بچپن ہی میں مرگئی تھی اور اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ شہباز اس بنا پر بھی بچپن سے بگڑ گیا تھا۔ عیسیٰ خان اس پر زیادہ توجہ نہ دے سکا تھا، پھر فطرتاً بھی وہ اپنے باپ سے قطعی مختلف تھا۔

ادھر اس عرصے میں اقتدار کے ایوانوں میں کئی تبدیلیاں رونما ہوچکی تھیں۔ میں ان کی طرف سے بھی بے خبر نہیں تھی۔ خواص خاں کا اندازہ درست ثابت ہونے لگا تھا۔ قطب خاں کے اقتدار و اختیار کا زوال شروع ہوچکا تھا۔ سلیم شاہ سوری جو اب مسند شاہی پر پوری طرح اپنے قدم جما چکا تھا۔ اپنے نائب السلطنت سے بدظن ہوگیا تھا۔

قطب خاں کے بیشتر حامی امرا کو سلیم شاہ سوری گرفتار کرا کے داخل زنداں کر چکا تھا۔ گو ابھی اس نے قطب خاں پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا لیکن قطب خاں اچھی طرح جانتا تھا کہ جلد یا بدیر یہ مرحلہ آنے والا ہے۔

ایک شب قطب خاں نے انہی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے عیسیٰ خان کو اپنے محل میں بلوایا۔ جب اسے اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ کوئی ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سن سکتا تو اس نے رازدارانہ لہجے میں عیسیٰ خان سے کہا "میرے دوست! تم نے یقینی طور پر اندازہ لگالیا ہوگا کہ حالات اب ہمارے لئے ناموافق ہوتے جارہے ہیں۔ شیر شاہ سوری کا وہ بیٹا سلیم شاہ سوری جسے خود ہم نے تخت پر بٹھایا ہمارے دوستوں اور بہی خواہوں کو راہ سے ہٹا چکا ہے۔ اب صرف تم اور میں باقی بچے ہیں۔ کسی بھی وقت ہم دونوں کی باری آسکتی ہے۔"

"اس سے بچنے کی کوئی صورت آپ کے ذہن میں ہے؟" عیسیٰ خان نے فکرمندی سے پوچھا۔

قطب خاں چند لمحے خلا میں دیکھتے ہوئے کچھ سوچتا رہا، پھر دھیمی آواز میں بولا "ہاں عیسیٰ خاں! میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کل ہم دونوں بادشاہ کے پاس جائیں اور اس سے حج پر جانے کی اجازت طلب کریں۔ جب ہمیں اجازت مل جائے تو بلاتاخیر یہاں سے نکل جائیں۔ جب حالات ہمارے حق میں بہتر ہوجائیں گے تو ہم واپس دہلی آجائیں گے۔"

عیسیٰ خان نے قطب خاں کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ان دونوں کی جان بچنے کی یہی ایک صورت تھی۔ عیسیٰ خاں کا بھی یہی خیال تھا کہ سلیم شاہ سوری حج پر جانے سے نہیں روکے گا۔

اگلے ہی روز وہ دونوں شاہی دربار میں گئے اور سلیم شاہ سوری سے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔

سلیم شاہ سوری معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر اس نے قدرے توقف سے آخرکار کہا "یہ معاملہ ایسا ہے کہ ہم اس میں انکار کرکے آخرت کا گناہ مول لینا نہیں چاہتے۔ ہماری جانب سے تم دونوں کو حج پر جانے کی اجازت ہے۔ ہم اس کے ساتھ یہ بھی کہیں گے کہ وہاں ہمارے لئے بھی دعائے خیر کرنا۔"

بظاہر تو سلیم شاہ سوری نے انہیں اجازت دے دی مگر صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ ان کے حج پر جانے سے رضامند نہیں ہے۔ درباریوں کی موجودگی میں اس نے مصلحت کے پیش نظر انہیں حج پر جانے کی اجازت دی تھی۔

عیسیٰ خاں اور قطب خاں کے چہروں پر رونق آگئی۔ وہ دونوں خوش خوش دربار سے لوٹے اور سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔

اسی رات سلیم شاہ سوری نے عیسیٰ خاں کو اپنے محل میں طلب کرلیا تو ایک بار پھر وہ اندیشوں میں گھر گیا۔ وہ دل ہی دل میں خیریت کی دعائیں مانگتا ہوا شاہی محل کی طرف چل دیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

شاہی محل پہنچ کر عیسیٰ خاں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس اطمینان کا سبب سلیم شاہ سوری کا رویہ تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے عیسیٰ خاں کا استقبال کیا تھا۔ تخلیے میں پہنچ کر سلیم شاہ سوری نے نہایت اپنائیت سے اپنا ہاتھ عیسیٰ خاں کے شانے پر رکھا اور معنی خیز لہجے میں بولا "ہمیں معلوم ہے عیسیٰ خاں کہ تم اور قطب خاں کیوں حج پر جانا چاہتے ہو! مگر اطمینان رکھو ہمیں کم از کم تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم تم سے بہت خوش ہیں اور بہت جلد تمہیں ایک اہم ذمے داری سونپنے والے ہیں۔ ہمیں پوری امید ہے کہ تم ہماری توقعات پر پورے اترو گے اور تمہاری طرف سے مایوسی نہیں ہوگی۔"

"آپ حکم فرمائیں شاہ عالی وقار! میں آپ کے حکم کی تعمیل میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔" عیسیٰ خاں نے مودب لہجے میں کہا۔

سلیم شاہ سوری نے یہ سن کر گہری نظروں سے عیسیٰ خاں کے چہرے کا جائزہ لیا جیسے اس کے چہرے سے جھوٹ اور سچ کا اندازہ لگا رہا ہو۔ پھر وہ رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

"سنو عیسیٰ خاں! تم قطب خاں کے دوست ہو، مگر تمہیں شاید اس کی اصلیت کا علم نہیں ہے۔ قطب خاں ایک سازشی آدمی ہے اور بددیانت بھی! اس کے مقرر کردہ افسر مال غازی خاں نے شاہی خزانے اور سرکاری مال میں بڑے پیمانے پر خورد برد کی ہے۔ تفتیش سے یہ بات پایہ

ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ خورد برد کیے جانے والے مال کا بڑا حصہ قطب خاں کی تحویل میں جا چکا ہے۔ اب تمہی یہ فیصلہ کرو کہ کیا ایسے بددیانت آدمی پر کسی بھی معاملے میں بھروسا کیا جا سکتا ہے؟...... اور یہ کہ ایسے شخص کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟''

سلیم شاہ سوری کی بات سن کر عیسیٰ خاں حیران رہ گیا۔ وہ بہر حال بددیانت شخص نہیں تھا۔ اس کا دامن صاف تھا۔

جواب میں بولا ''اے شاہ عالی وقار! جو شخص بھی خیانت کا مرتکب ہو وہ چاہے کسی عہدے اور منصب پر ہو یقیناً سخت سے سخت سزا کا مستحق ہے۔ مجھے اس پر شرمندگی ہے کہ میں اس کا دوست ہوں مگر اب ...... اب نہیں رہا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ حضور نے مجھے اس کی اصلیت سے آگاہ کر دیا ورنہ ہو سکتا تھا کہ میں بھی اس کے سبب کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔''

عیسیٰ خاں کا جواب سنا تو سلیم شاہ سوری کی آنکھوں میں آسودہ سی ایک چمک ابھری۔ اس نے گرم جوشی سے عیسیٰ خاں کا شانہ تھپکا اور کہا ''عیسیٰ خاں! ہم سمجھ رہے تھے کہ تم یہی جواب دو گے۔ تم جیسے ایماندار شخص سے ہمیں ایسے ہی جواب کی امید تھی۔ تم اس بات سے بھی خوب آگاہ ہو کہاس مرحلے پر اگر ہم قطب خاں کو گرفتار کر لیں تو کئی مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس وقت دارالحکومت میں کوئی فتنہ برپا ہو۔ تم یقیناً ہماری بات سے اختلاف نہیں کرو گے۔''

''پھر حضور کا کیا ارادہ ہے؟'' عیسیٰ خاں نے دریافت کیا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ تم دونوں طے شدہ نظام العمل کے مطابق حج پر روانہ ہو جاؤ مگر جب دارالحکومت سے دور نکل جاؤ تو تمہاری یہ ذمے داری ہوگی کہ قطب خاں کو گرفتار کر لو۔'' سلیم شاہ سوری نے اپنا مدعا ظاہر کیا۔ ''تم قطب خاں کو اپنے ساتھ آگرہ لے جا کر قید میں ڈال دو۔ ہمارے خیال میں اس طرح انصاف کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں گے اور ہم کسی ممکنہ خطرے سے بھی بچ جائیں گے۔''

''حضور کے حکم کی تعمیل ہوگی۔'' عیسیٰ خاں نے سلیم شاہ سوری کو یقین دلایا۔ پھر وہ دل ہی دل میں مستقبل کے منصوبے باندھتا شاہی محل سے واپس آ گیا۔ میری توجہ اس کے ذہن ہی پر تھی۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق عیسیٰ خاں اور قطب خاں دو دن کے بعد حج کے لئے دارالحکومت سے روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنی چشم تصور کا دائرہ وسیع کر لیا تھا اور سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ دہلی سے نکلنے کے بعد انہوں نے پہلی منزل پر قیام کیا تو شام ہو چکی تھی۔ سفر کی تھکن

کے سبب قطب خاں جلد ہی اپنے خیمے میں جا کر سو گیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد عیسیٰ خاں خاموشی کے ساتھ اپنے خیمے سے باہر نکل آیا اور شاہی سپاہیوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

رات گئے بادشاہ کے مسلح سپاہی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے نہایت آسانی سے قطب خاں کو گرفتار کر لیا۔

قطب خاں نے حیرت اور بے یقینی سے پہلے سپاہیوں کی طرف اور پھر عیسیٰ خاں کی جانب دیکھا۔ عیسیٰ خاں سپاہیوں کے ساتھ کسی کے روبرو کھڑا ہوا تھا۔ قطب خاں کی تجربے کار نگاہیں فوراً ہی معاملے کی تہ تک پہنچ گئیں۔ اسے احساس ہو گیا کہ اب سلیم شاہ سوری کے غضب سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی آخری امید کے طور پر اس نے عیسیٰ خاں سے درخواست کی۔ ''میرے دوست! مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں، یہ تقدیر کا کھیل ہے۔ کبھی عروج کبھی زوال! تقدیر کے اس کھیل کو نہ میں روک سکتا ہوں نہ تم! مگر پرانی دوستی کے ناطے میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں مجھے امید ہے کہ تم میری درخواست رد نہیں کرو گے۔''

عیسیٰ خاں نے سوالیہ نظروں سے قطب خاں کی طرف دیکھا۔

قطب خاں نے سر جھکا لیا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''تم جانتے ہو میرے دوست کہ اب سلیم شاہ سوری مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میری دلی خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے میں حج کی سعادت ضرور حاصل کر لوں۔ ہم دونوں اسی ارادے کے ساتھ گھر سے نکلے تھے۔ میری درخواست ہے کہ تم مجھے اپنے ہمراہ حج پر ضرور لے جاؤ۔ میں یقین دلاتا ہوں تمہیں کہ ہرگز فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ تمہارے مزید اطمینان کی خاطر اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ تم مجھے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر لے چلو تاکہ میں چاہوں بھی تو نہ بھاگ سکوں۔''

چند لمحے عیسیٰ خاں نے کچھ سوچا اور پھر اس پر رضامند ہو گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ خود اس کے دل میں بھی حج کرنے کی آرزو تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ ابھی اسے سلیم شاہ سوری کی بات پر پوری طرح یقین نہیں آیا تھا۔ سلیم شاہ سوری نے جو الزام اپنے نائب السلطنت قطب خاں پر لگایا تھا وہ محض الزام بھی ہو سکتا تھا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔

بہ دستور سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کرنے کے بعد عیسیٰ خاں نے سلیم شاہ سوری کے نام ایک خط لکھا۔ خط میں اس نے تمام صورتحال لکھ کر سپاہیوں کو واپس دارالحکومت بھیج دیا، پھر وہ قطب خاں کو پابہ جولاں کر کے حج پر روانہ ہو گیا۔

سلیم شاہ سوری کو عیسیٰ خاں کا خط ملا تو وہ بہت برہم ہوا۔ اس نے اسی وقت عیسیٰ خاں

کو اس کے عہدے سے معزول کر دیا۔ عیسیٰ خاں کی جگہ اس نے ایک اور امیر کو دے دی تھی۔ اب وہ عیسیٰ خاں اور قطب خاں کی حج سے واپسی کا منتظر تھا۔ اسے یہ ملال بھی تھا کہ عیسیٰ خاں پر اعتماد کیوں کر لیا! اب وہ کوئی قدم اسی وقت اٹھاتا جب دونوں امیر حج سے لوٹ آتے۔

میرے انسانی قالب مہر النساء کا باپ خواص خاں ابھی تک اپنے آبائی شہر سہسرام ہی میں مقیم تھا۔ اسے قطب خاں کے زوال کی خبر ملی تو بہت خوش ہوا۔ اس کے خیال میں اب دہلی جانے کا صحیح وقت تھا۔ خطرہ ٹل چکا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے رختِ سفر باندھنے کو کہا۔ چند ہی روز بعد وہ خفیہ طور پر دہلی میں داخل ہو گیا۔

خواص خاں کا خیال تھا کہ عیسیٰ خاں سے پرانی دوستی اور رشتے داری کے سبب اسے بادشاہِ وقت کی قربت اور خوشنودی حاصل ہو جائے گی۔ اسے یہ علم تھا کہ سلیم شاہ سوری حکم عدولی کی بنا پر عیسیٰ خاں کو برطرف کر چکا ہے۔

مہر النساء کی ماں جس نے پانچ برس سے اپنی بیٹی کی صورت نہیں دیکھی تھی، مجھ سے ملنے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔ دہلی پہنچتے ہی اس نے اپنے خاوند سے ضد کی کہ وہ اسے لے کر فوراً عیسیٰ خاں کی حویلی میں چلے۔ خواص خاں کا خیال تھا کہ ابھی یہ قدم اٹھانا مصلحت کیخلاف ہے۔ اس کے باوجود بیوی کی ضد سے مجبور ہو کر اسے عیسیٰ خاں کی حویلی میں جانے کی اجازت دے دی۔ وہ خود اپنے ایک دیرینہ دوست کے گھر مقیم رہا۔ وہ کوئی غیر معروف آدمی نہیں تھا۔ اس لئے ابھی دہلی والوں کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔

قمر النساء جب عیسیٰ خاں کی حویلی میں پہنچی تو میں اس وقت پائیں باغ میں شمشیر زنی کی مشق کر رہی تھی۔ میرے جسم پر حسبِ معمول مردانہ لباس تھا۔ ایک دراز قد وجیہہ نوجوان مجھے تلوار کے داؤ سکھا رہا تھا۔ اس نوجوان کا نام اسحاق تھا جو عیسیٰ خاں کا ایک ماتحت کماں دار تھا۔ عیسیٰ خاں ہی کے حکم پر روزانہ وہ مجھے شمشیر زنی کی مشق کرانے آتا تھا۔ قمر النساء نے فوراً ہی مجھے اپنی بیٹی مہر النساء کی حیثیت سے پہچان لیا اور تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

میری نظر قمر النساء پر پڑی تو میں نے اسحاق کو رخصت کر دیا اور دوڑ کر قمر النساء کے سینے سے لگ گئی۔ میرا یہ فعل غیر ارادی تھا۔ اس کی وجہ مجھے معلوم تھی۔ رفتہ رفتہ میرے انسانی قالب کی فطری صفات مجھ پر غالب آتی جا رہی تھیں۔ انہی صفات کی بنا پر میرے دل میں انجانے جذبوں اور ارمانوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ میرا انسانی قالب جیسے خود بخود عارج کے انسانی پیکر شہباز کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ میرے لئے یہ احساس بہت عجیب اور حیرت زدہ کر دینے والا تھا کہ اگر کبھی حویلی کی طویل راہداریوں میں عارج سے سامنا ہو جاتا تو مجھے

حجاب آنے لگتا۔ عارج اپنی ہی دھن میں اپنے قالب کی فطری صفات کے زیرِ اثر مجھے نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ اس کے انداز میں ایک عجیب سی لاتعلقی تھی۔ کبھی کبھی تو میں، عارج کی طرف سے فکر مند ہو جاتی اور سوچتی کہ کہیں عارج نے میرے عشق کو بھلا تو نہیں دیا!''

اپنے قالب سے قمر النساء کے تعلق ہی کی وجہ سے میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ کافی دیر تک میں اور قمر النساء اسی عالم میں کھڑے رہے۔ پھر میں ہی اس کے سینے سے الگ ہوئی اور پوچھا ''ماں! کیا آپ یہاں تنہا آئی ہیں؟ بابا آپ کے ساتھ دہلی نہیں آئے؟''

قمر النساء کی آنکھوں میں اداسی کی ایک پرچھائیں سی لہرائی اور وہ ٹھنڈا سانس لے کر کہنے لگی۔ ''تمہارے بابا بھی دہلی آئے ہیں، مگر بیٹی ابھی ان کا یہاں آنا مصلحت کیخلاف تھا۔ ابھی وہ دہلی میں اپنی آمد کو راز میں رکھنا چاہتے ہیں۔ تم تو جانتی ہو کہ...... کہ دہلی شہر میں ان کے داخلے پر پابندی تھی۔ ابھی وہ حکم واپس نہیں لیا گیا۔''

''رہنے دیں اماں! آپ خواہ مخواہ بابا کی پردہ پوشی کرتی رہتی ہیں۔'' میں بول اٹھی۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا تھا جب برسوں پہلے خواص خاں نے میرا ہاتھ عیسیٰ خاں کے ہاتھ میں دیا تھا۔

''ایسی بات نہیں بیٹی! وہ...... تیرے بابا بھی تجھ سے محبت کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے قمر النساء چور سی نظر آنے لگی۔

''اگر انہیں مجھ سے محبت ہوتی تو جس طرح آپ آئی ہیں وہ بھی یہاں آ سکتے تھے۔'' میں نے کہا۔ یہی بات میرے دل میں بھی تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں مزید بولی۔ ''میں جانتی ہوں انہیں مجھ سے کبھی محبت نہیں رہی۔ وہ ہمیشہ مجھ سے لاتعلق ہی رہے۔ انہوں نے کبھی مجھے اپنی بیٹی سمجھا ہی نہیں ورنہ شاید وہ مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر نہ جاتے۔'' میرے لہجے میں تلخی آ گئی اور قمر النساء کا ہاتھ تھام کر حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگی۔ اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر میں نے انواع و اقسام کے میووں اور مشروبات سے قمر النساء کی تواضع کی۔ میں اگر چاہتی تو خواص خاں کی بے اعتنائی کا سبب بہ آسانی جان سکتی تھی۔ اس کے لئے مجھے قمر النساء کے دماغ کا جائزہ لینا پڑتا۔ بلاضرورت میں کبھی اپنی پراسرار قوتوں کو استعمال نہیں کرتی تھی۔ میں نے اسی لئے قمر النساء سے سوال کیا۔ ''اماں! آج میں آپ سے پوچھ کر ہی رہوں گی کہ بابا مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتے؟ مجھے سچ سچ بتائیں۔ کیا میں ان کی بیٹی، ان کا خون نہیں ہوں؟''

قمر النساء حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس نے میری تیز نگاہوں کی تاب نہ لا کر سر جھکا لیا اور دھیمی آواز میں بولی ''میں چاہتی تھی میری بچی کہ...... کہ اس راز کو اپنے

سینے ہی میں لے کر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں مگر..... مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ اب تم ..... تم سے اس بات کو چھپانا مجھے بہت دشوار محسوس ہوتا ہے۔ میں..... میں تمہیں سب کچھ بتادوں گی میری بچی!''

کچھ دیر قمر النساء خاموش رہی، مگر میں نے اسے مخاطب نہیں کیا اور دوبارہ اس کے بولنے کی منتظر رہی۔

قمر النساء خلا میں دیکھتے ہوئے شکست خوردہ سے لہجے میں کہنے لگی۔ ''میں اب سے تیس بتیس برس پہلے ایک مغل سردار کی بیٹی تھی جو ترکستان سے ہندوستان آیا تھا۔ میں جب جوان ہوگئی تو میرے باپ نے میری شادی ایک نوجوان مغل کماں دار یوسف خاں سے کردی۔ یوسف خاں درشت مزاج اور بہت جنگجو شخص تھا۔ شادی کے چند ہفتوں کے بعد ہی یوسف خاں نے مجھ سے کہا کہ ہمارا بچہ لازماً بیٹا ہونا چاہئے۔ اگر تو نے بیٹی کو جنم دیا تو پیدا ہوتے ہی میں اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کردوں گا۔ میں اپنے شوہر سے یہ بات سن کر بہت گھبرائی اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ماں بننے والی تھی۔ میں یہ بھی اچھی طرح جان گئی تھی کہ یوسف خاں جو کہتا تھا اس پر عمل کرتا تھا۔ سخت گیر ہونے کے باوجود وہ زبان کا بہت سچا تھا۔'' قمر النساء نے طویل سانس لیا۔

اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ بولنا شروع کردیتی میں نے پوچھا۔ ''آپ نے اپنے والد سے ان کی شکایت نہیں کی؟''

''کی تھی شکایت کہ وہ یوسف کو سمجھائیں، مگر انہوں نے میری بات پر کان نہیں دھرا۔'' قمر النساء نے جواب دیا۔ ''میں سوچنے لگی کہ آنے والے وقت سے کس طرح بچا جائے؟ جیسے جیسے دن گزرتے جارہے تھے۔ میرا خوف بڑھتا جارہا تھا۔ نہ جانے کیوں یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ میرے وجود میں لڑکے کے بجائے لڑکی پرورش پارہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں! انہی دنوں آگرہ میں تاجروں کا ایک قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ قافلہ سامان تجارت لے کر پٹنہ کی طرف جارہا تھا۔ اس قافلے کا سردار ایک عمر رسیدہ شخص تھا جو بظاہر بہت نیک دل معلوم ہوتا تھا۔ ایک رات میں خاموشی کے ساتھ اپنے گھر سے نکلی اور اس قافلے سے جاملی۔ میرا خیال تھا کہ قافلے کے ساتھ کچھ عرصہ دوسرے شہروں میں گزارلوں اور جب ماں بن جاؤں تو حالات کا جائزہ لے کر پھر واپس اپنے گھر آجاؤں۔ اس وقت مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ قافلے کا سردار جو بظاہر نیک سیرت شخص معلوم ہوتا تھا دراصل ایک بردہ فروش تھا۔ قافلے میں میرے شامل ہوتے ہی اس نے کوچ کردیا اور پٹنہ کی طرف روانہ ہوگیا۔''

قمر النساء کی روداد حیات بہت سنسنی خیز اور دلچسپ تھی۔ میں پوری توجہ سے سنتی رہی۔

''میرے علاوہ بھی قافلے میں کئی اور لڑکیاں تھیں جنہیں وہ بیچنے کے لئے اپنے ساتھ لے جارہا تھا۔'' قمر النساء کی آپ بیتی جاری تھی۔ ''ہمارا قافلہ سہسرام پہنچا تو شہر کے شوقین مزاج امرا اور رؤسا وہاں پہنچ گئے۔ انہی میں خواص خاں کو بھی میں نے پہلی بار دیکھا۔ قافلے کے لالچی سردار نے بہت مہنگے داموں مجھے خواص خاں کے ہاتھ فروخت کردیا۔ اس نے پہلے ہی محسوس کرلیا تھا کہ خواص خاں مجھ میں دلچسپی لے رہا تھا۔ خواص خاں عمر میں مجھ سے دگنا تھا، مگر فطرتاً وہ ایک اچھا انسان تھا۔ اس نے مجھے خرید کر پہلے تو آزاد کردیا اور پھر مجھ سے باقاعدہ شادی کرلی۔''

''آپ نے انہیں اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''بتایا تھا..... میں نے.....''

''تو پھر؟'' میں بول اٹھی۔

''خواص خاں کی شرافت نے مجھے متاثر کیا تھا۔'' قمر النساء بتانے لگی۔ ''کوئی بات میں نے خواص خاں سے نہیں چھپائی اور اسے بلاکم وکاست اپنی سرگزشت سنادی۔ خواص خاں کو میرے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ اس نے اس بات پر کسی ناگواری کا اظہار کیا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ اس کا یہ احساس کیا کم تھا کہ اس نے کسی دوسرے کی اولاد کو اپنی اولاد کی طرح پالنے کا وعدہ کرلیا تھا۔ پھر اس نے جو کچھ کہا تھا اس پر عمل کرکے دکھایا۔ اگر میں اپنے آبائی شہر میں ہوتی تو آج یقیناً تم میرے سامنے زندہ نہ ہوتیں۔'' آخری الفاظ اس نے معنی خیز انداز میں ادا کیے۔

میں نے قمر النساء کی پوری بپتا سن کر ٹھنڈا سانس بھرا اور بولی ''تو میرا باپ ایک ظالم مغل ہے۔ کاش میں زندگی میں کبھی اسے دیکھ سکوں اور بتا سکوں کہ دیکھو میں تمہاری بیٹی ہوں اور تمہارے سامنے ہوں۔ کاش میں اسے بتا سکوں کہ خدائی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ موت اور زندگی کا اختیار صرف اور صرف خدا کو ہے۔''

قمر النساء کے چہرے پر مجھے خوف کے آثار نظر آنے لگے۔ میری بات سن کر وہ سہم سی گئی اور پھر ڈری ڈری آواز میں کہا ''نہیں..... نہیں میری بچی! خدا وہ وقت نہ لائے کہ کبھی تیرا اور اس کا سامنا ہو۔''

''لیکن کیوں ماں؟''

''اس لئے میری بچی کہ یوسف خاں کو تو نہیں جانتی۔'' قمر النساء نے جواب دیا۔

''میں جانتی ہوں کہ...... کہ وہ کس قدر ظالم اور بے رحم شخص ہے! میری دعا ہے کہ تجھ پر اس کا سایہ بھی نہ پڑے۔''

قمرالنساء کو پریشان اور خوفزدہ دیکھ کر میں نے اسے تسلی دی۔ ''اگر تمہارا یہ کہنا ہے ماں! تم نہیں چاہتیں کہ میں کبھی اپنے باپ سے ملوں تو اس ظالم کا خیال میں اپنے دل سے نکال دوں گی۔''

کہنے کو تو میں نے یہ کہہ دیا مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ میرے دل میں گرہ سی پڑ گئی تھی۔

ابھی میں اور قمرالنساء محو گفتگو تھے کہ ایک خادمہ تیزی سے تقریباً دوڑتی ہوئی خواب گاہ کے اندر آ گئی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے خادمہ کو دیکھا۔ ''کیا بات ہے، تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟'' میں نے خادمہ سے پوچھا۔

''معلوم نہیں کیوں شاہی سپاہی تیزی سے حویلی کی طرف بڑھ رہے ہیں!'' خادمہ نے اپنے چڑھتے ہوئے سانسوں پر قابو پا کر بتایا۔

''تم نے شہباز کو یہ اطلاع دی؟'' میں نے معلوم کیا۔ میرا اشارہ عارج کی طرف تھا۔

''جی ہاں۔'' خادمہ نے جواب دیا۔ ''مگر وہ ہوش میں نہیں ہیں۔ انہوں نے آج بھی زیادہ پی لی ہے۔''

خادمہ ابھی یہی کہہ پائی تھی کہ ایک کنیز دوڑتی ہوئی وہاں آ گئی۔

''کہو، تم کیا خبر لائی ہو؟'' میں نے کنیز کو مخاطب کیا۔

''شاہی سپاہیوں نے حویلی کو گھیرے میں لینا شروع کر دیا ہے۔'' کنیز نے کہا۔

یہ خبر میرے لئے تشویش کا سبب تھی۔ وقتی طور پر میں اسی لئے پریشان ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شاہی سپاہیوں نے کس لئے حویلی کو گھیرے میں لیا ہے!''

ان لمحات میں اگر میری جگہ کوئی مرد بھی ہوتا تو گھبرا جاتا، مگر جلد ہی میں نے خود پر قابو پا لیا۔

معاً میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔ میں اس حقیقت تک پہنچ گئی تھی کہ حویلی کو کس لئے گھیرے میں لیا گیا ہے۔

ان حالات میں جن سے میں گزر رہی تھی، حویلی کے گھیر لئے جانے کی ایک ہی وجہ میرے نزدیک ممکن تھی، میں نے سوچا کہیں مہرالنساء کے سوتیلے باپ خواص خاں کی دہلی میں موجودگی کا راز تو نہیں کھل گیا؟ یہ خیال آتے ہی میں قمرالنساء کی طرف سے فکرمند ہو گئی، ایسی

صورت میں قمرالنساء کو حویلی میں نہیں ہونا چاہئے تھا، قمرالنساء خواص خاں کے دوست کے ایک ملازم کو ساتھ لے کر آئی تھی، وہ ملازم مردانے میں موجود تھا، پھر میں نے دیر نہیں کی، میں نے حویلی کے ایک خفیہ راستے سے قمرالنساء کو اس ملازم کے ساتھ روانہ کر دیا۔

کچھ ہی دیر میں یہ عقدہ کھل گیا کہ شاہی سپاہی، خواص خاں ہی کی تلاش میں آئے تھے، خواص خاں پر اب بھی یہ پابندی عائد تھی کہ وہ دہلی میں داخل نہیں ہو سکتا، نہ وہاں قیام کرنا اس کے لئے ممکن ہے۔

اس روز خواص خاں کو معلوم ہو گیا کہ شاہی سپاہی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اسے اپنے دوست کے ذریعے یہ خبر بھی لگ گئی کہ عیسٰی خاں کو حج سے واپس آنے کے بعد سلیم سوری کے عتاب کا سامنا کرنا پڑے گا، اس صورت حال میں خواص خاں کا اب دہلی میں ٹھہرنا خطرناک تھا وہ اسی لئے خاموشی کے ساتھ جس طرح دہلی میں داخل ہوا تھا اسی طرح وہاں سے اپنی بیوی قمرالنساء کے ساتھ سہسرام کی طرف لوٹ گیا۔

میرا انسانی قالب اب عمر کی اس منزل میں پہنچ چکا تھا کہ آدم زاد مردوں کی نظریں انہیں تو نظرانداز نہ کر سکیں، اب یہ قالب تقریباً سولہ برس کا ہو گیا تھا، مگر عارج کے انسانی پیکر کو اس کا احساس نہیں تھا، وہ میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا، ہرچند کہ مجھے اس بے رخی کی وجہ معلوم تھی پھر بھی جانے کیوں خود کو تنہا محسوس کرتی اور اداس ہو جاتی۔

عارج بھی اسی حویلی میں رہتا تھا مگر اس طرح کہ وہاں نہ رہتا ہو، اس کے شب و روز اس کی مصروفیات اور مشاغل قطعی مختلف تھے، اکثر مجھ سے اس کی مڈبھیڑ ہو جاتی مگر مجھے کبھی اس کی آنکھوں میں محبت کا کوئی جذبہ جھلکتا نظر نہ آتا، ہاں میرے خوب رو اتالیق اسحاق کی نظریں مجھ سے بہت کچھ کہتی تھیں، یہ ''خاموش زبان'' سمجھنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔

ہرچند کہ اسحاق نے کبھی برملا مجھ سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا مگر وہ جتنی دیر حویلی میں رہتا، اس کی پرشوق نگاہیں والہانہ انداز میں میرے حسین سراپا کا طواف کرتی رہتیں، ان نگاہوں میں محبت و معصومیت تھی، ہوس نہیں، اگر میں ہوس کا شائبہ تک محسوس کر لیتی تو اسحاق کو میرے سامنے نظریں اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی۔

میں نے اس دوران میں پہلی بار ایک حیران کن بات محسوس کی۔ یقیناً مہرالنساء کے انسانی قالب ہی کا اثر تھا کہ میں نے پہلی بار کسی آدم زاد کے لئے اپنے دل میں جگہ محسوس کی، جب اسحاق میرے قریب ہوتا تو خود میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو جاتا تھا، اس کے باوجود میں کبھی یہ نہیں بھولتی تھی کہ ایک جن زادی ہوں اور میرا محبوب عارج ہے، اس کے

ساتھ یہ بھی کہ وہ نوجوان آدم زاد اسحاق رتبے میں بھی مجھ سے کم ہے اور عیسیٰ خاں کا ایک ادنیٰ ماتحت ہے، یہی وجہ تھی کہ میں اسحاق کے سامنے اپنا رویہ اتنا محتاط رکھتی تھی کہ اسحاق کو کبھی حد سے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی، پراسرار قوتیں حاصل ہونے کے سبب میرے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ اسحاق کے دل ودماغ سے اپنی محبت کے نقوش قطعی طور پر مٹا دیتی، لیکن ایسا کرنا بے رحمی محسوس ہوا، اسحاق کی معصوم نجت میرے عزائم کی راہ میں حائل نہیں تھی۔ عارج کے متعلق حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود بھی کبھی اس بات پر ضرور کڑھتی تھی کہ اسے مجھ سے اب کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ خوبصورت کنیزوں کے ہجوم سے نکل کر حویلی میں میری موجودگی محسوس نہیں کرتا، وہ ہمیشہ اپنی ہی سرگرمیوں میں مگن رہتا تھا، کنیزوں کے علاوہ عارج اپنے دوستوں کی صحبت میں جام ومینا سے دل بہلاتا تھا، اس کے کئی آدم زاد دوست حویلی میں آتے جاتے تھے اور وہ بھی بہتر کردار کے مالک نہیں تھے۔

عارج کے انہی دوستوں میں ایک آدم زاد بہرام خاں بھی تھا، قوی ہیکل اور کھردرے سے خدوخال والے اس آدم زاد کی عمر کم از کم چالیس برس تھی، وہ شاہی افواج کا ایک اعلیٰ عہدیدار تھا، میں کیوں کہ عارج کی نقل وحرکت پر نظر رکھتی تھی اس لئے مجھ سے کچھ چھپا نہ تھا، عارج کے سبھی آدم زاد دوستوں سے میں واقف تھی۔

اسحاق کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ شیر شاہ سوری کے زمانے میں بہرام خاں ایک معمولی کماں دار تھا مگر اب بادشاہ وقت سلیم شاہ سوری کے عہد میں اسکی بن آئی تھی۔ سلیم شاہ سوری اسے اپنے وفاداروں میں شمار کرتا تھا مجھے یہ بدوضع آدم زاد سخت ناپسند تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکی غلیظ آنکھوں میں ہر وقت ہوس ناچتی رہتی تھی۔

معمول کے مطابق میں ایک شام حویلی کے باغیچے میں اپنے اتالیق اسحاق کے ساتھ شمشیرزنی کی مشق کر رہی تھی کہ بہرام خاں حویلی میں داخل ہوا، وہ اپنے دوست عارج کی خواب گاہ کی طرف جا رہا تھا، مجھ پر اس کی نظر پڑی تو رک گیا اور پھر آہستہ آہستہ قریب آ گیا، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

''بہت خوب حسینہ!'' بہرام خاں نے مجھ سے کہا، اس کی آواز بھی چہرے کی طرح بھونڈی تھی اور لہجے میں سفلا پن تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا ''حیرت ہے کہ تم نے تو اسحاق جیسے ماہر شمشیرزن کے چھکے چھڑا دیے۔''

میں نے ہاتھ روکا اور بہرام خاں کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی ''اطمینان رکھو، میں اسی طرح تمہارے بھی چھکے چھڑا سکتی ہوں۔''

''ارے نہیں'' بہرام خاں نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری اور تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ نازک دست وبازو قدرت نے اس مقصد کے لئے نہیں بنائے کہ ان سے شمشیرزنی یا تیر اندازی کی جائے، یہ تو اس لئے بنائے گئے ہیں کہ....''

''اگر تم مجھے اتنا نازک سمجھ رہے ہو تو آؤ اور اپنا ارمان بھی پورا کر کے دیکھ لو!'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا، مجھے سچ مچ اس کی گستاخانہ گفتگو پر غصہ آ گیا تھا۔

بہرام خاں نے میری بات سن کر قہقہہ لگایا پھر کہنے لگا ''میرے ارمان بھی کسی نہ کسی روز پورے ہو ہی جائیں گے دراصل میں جلد بازی کا قائل نہیں ہوں'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور تیزی کے ساتھ عارج کی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔

میں غصے میں پیچ وتاب کھا کے رہ گئی، اسحاق کو بھی بہرام خاں کی یاوہ گوئی پر بہت طیش آیا تھا، مگر اس نے خود پر قابو پالیا اور خاموش رہا، اس کے غصے کا اندازہ چہرے کے تاثرات سے ہوا، اس کی خاموشی کا سبب بہرام خاں سے واقفیت تھی وہ جانتا تھا کہ بہرام خاں ایک اعلیٰ عہدے دار اور بادشاہ کا منہ چڑھا ہے جب کہ وہ شاہی فوج میں ایک معمولی کماں دار تھا۔ بہرام خاں کے جاتے ہی میں نے پھر شمشیرزنی کی مشق شروع کر دی لیکن میری طبیعت مکدر ہو چکی تھی اسی بنا پر میں نے جلد ہی اسحاق کو رخصت کی اجازت دیدی اور اپنی خلوت گاہ میں آ گئی۔

اس واقعے کے بعد میں نے سوچا کہ مجھے عارج کی طرف سے قطعی لاتعلق نہیں رہنا چاہئے، کسی حد تک میں اب یہ بھی سمجھ چکی تھی کہ عارج مجھے مردانہ لباس میں دیکھنا پسند نہیں کرتا، میں نے سوچا، عارج بہرحال میرا محبوب ہے، مجھے اس کی خوشنودی کا خیال کرنا چاہئے اگر وہ اپنے انسانی قالب کی فطری صفات کے سبب میری طرف متوجہ نہیں ہو رہا تو مجھے یہ کوشش کرنی چاہئے۔

دوسرے روز شام کو میں نے اسحاق کی آمد کا انتظار نہیں کیا اور اپنی خواہ گاہ میں آ گئی، خواب گاہ میں آ کر میں نے مردانہ لباس اتار دیا اور اپنا بہترین لباس زیب تن کیا، پھر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی مجھے خود اپنا ہی انسانی قالب اجنبی اجنبی سا لگا پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں اس جسم میں اتر کر واقعی بے حد حسین لگ رہی ہوں، کسی آرائش اور سنگار کے بغیر ہی میرا چہرہ بڑا پرکشش اور دل آویز معلوم ہو رہا تھا، مجھے حجاب سا محسوس ہوا، یہ احساس بھی میرے لئے نیا اور عجیب تھا، حجاب کا یہ رنگ میرے چہرے پر بھی نظر آیا جس نے میرے پیکر کو اور بھی دلکش بنا دیا میں سوچ رہی تھی کہ عارج مجھے دیکھے گا تو دیکھتا رہ جائے گا پھر میں عارج کی خلوت گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔

عارج کی خلوت گاہ میں بے دھڑک داخل ہوگئی، یہ پہلا موقع تھا کہ میں شام کے وقت ادھر آئی تھی، عارج کی خلوت گاہ میں اس وقت دو خوبصورت کنیزیں تھیں ان میں سے ایک کنیز عارج کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی، دوسری کنیز صراحی سے شراب انڈیل رہی تھی، خلاف توقع میری آمد سے عارج اور کنیزیں سب ٹھٹک سے گئے۔

میں نے بھی ان کے ردعمل کو محسوس کرلیا۔ کنیزوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ جو کنیز، عارج کے بالکل پہلو سے لگی بیٹھی تھی، کھسک کر دور ہوگئی۔ دوسری کنیز جو ساغر میں شراب انڈیل رہی تھی، اس سے شراب چھلک گئی۔

''ارے ظالم! یہ کیا کرتی ہے۔'' عارج نشے سے بوجھل آواز میں کہنے لگا۔ ''یوں نہ چھلکا ابھی سے کہ ہم تو طلوع بھی نہیں ہوئے۔''

پھر اچانک شاید عارج کو میرا خیال آگیا۔ اس کی نظریں میری طرف اٹھیں اور وہ کچھ سہم سا گیا۔

''تم دونوں یہاں سے جاسکتی ہو۔'' میں نے دونوں کنیزوں کو مخاطب کیا۔ میری آواز میں حکم تھا۔

کنیزیں اٹھیں اور فوراً کمرے سے نکل گئیں۔ عارج نے انہیں نہیں روکا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آرہے تھے۔ میں آگے بڑھ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ مجھے عارج کے خوف پر حیرت تھی۔ وہ شاید میری اچانک آمد سے ڈر گیا تھا۔ ''عارج! میں چاہتی ہوں آج ہم دونوں سیر کو چلیں۔'' میں نے نرم آواز میں کہا، پھر بولی۔ ''مجھے خبر ہے کہ تو ہر وقت مجھے مردانہ لباس میں دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ میں نے اسی لئے محض تیری خاطر مردانہ لباس نہیں پہنا۔'' مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ عارج پر میرے انسانی پیکر کے حسن کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں نے اپنے گلے میں پڑے ہوئے موتیوں کے ہار سے کھیلتے ہوئے ذرا جھجک کر عارج سے پوچھ ہی لیا۔ ''میں اس لباس میں تجھے کیسی لگ رہی ہوں اے عارج؟''

☆.....☆.....☆

عارج کے چہرے سے کسی جذبے کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے سرسری نظر سے میری طرف دیکھا اور سپاٹ سے لہجے میں بولا۔ ''ہاں..... ہاں اے دینار' تو ٹھیک لگ رہی ہے۔''

یہ جواب سن کر میرے جذبات پر جیسے اوس پڑ گئی۔ یہ جذبات درحقیقت میرے انسانی قالب کی فطری صفات کا نتیجہ تھے۔ ایک جن زادی کی حیثیت سے میں کبھی اتنی جذباتی نہیں ہوتی تھی بلکہ معاملہ برعکس تھا۔ عارج ہی جذبات سے مغلوب ہو جاتا تھا۔ عارج کے غیر جذباتی ہونے پر اسے میں نے حیرت سے دیکھا' پھر کہا۔ ''تو میرے ساتھ سیر کو تو چل رہا ہے؟''

''تو کہہ رہی ہے تو ..... اے دینار' چلنا ہی پڑے گا۔''

عارج اس طرح بولا جیسے میرا حکم ٹالنا اس کیلئے ممکن نہ ہو۔

میں پہلے ہی تمام تیاریاں مکمل کر چکی تھی۔ عارج کو ساتھ لیے میں باہر آگئی۔ باغیچے میں ایک خادم ہمارے لئے دو گھوڑوں کی لگامیں تھامے کھڑا تھا۔ اسے ہماری آمد ہی کا انتظار تھا۔ عارج کے ہمراہ میں گھوڑوں کی طرف بڑھی تو اسی لمحے اپنے اتالیق اسحاق کو دیکھا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار حویلی کے صدر دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔ اسحاق کو دیکھ کر میں رک گئی اور اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی۔

قریب آکر اسحاق اپنے گھوڑے سے اترا اور مبہوت سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ آج سے پہلے اس نے مجھے کبھی اس لباس میں نہیں دیکھا تھا۔

میں نے اسحاق کی تحسین آمیز نگاہوں کو محسوس کرلیا اور قدرے محجوب سی ہو کر بولی۔ ''آج میں' شہباز کے ساتھ دریا کی طرف جا رہی ہوں اس لیے شمشیرزنی کی مشق ممکن نہیں۔ کل میں تمہیں یہ بتانا بھول گئی تھی۔''

اسحاق اب بھی اسی طرح مبہوت وسحر زدہ سا کھڑا تھا اور والہانہ نگاہوں سے میری

طرف دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے خود پر قابو پالیا اور خواب آلودی آواز میں کہنے لگا۔
''میں اگر آج نہ آتا تو بدقسمت ہوتا۔''

میں نے اس کے الفاظ میں چھپے ہوئے مفہوم کو سمجھ لیا تھا۔ یہ بھی عجیب سی بات ہی تھی کہ مجھے اپنے انسانی پیکر کے حسن کی تعریف سن کر خوشی ہوئی تھی جبکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ میرے اصل وجود پر انسانی جذبے غالب تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے حیا محسوس ہوئی اور بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اپنی مسکراہٹ چھپانے کیلئے میں جلدی سے مڑی اور بہ عجلت گھوڑے پر سوار ہو کر عارج کے ہمراہ حویلی کے دروازے سے باہر نکل آئی۔ اسحاق اسی جگہ کھڑا رہا۔ کافی دور پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا تو اسحاق کو اسی طرف متوجہ پایا۔ وہ شاید اس وقت تک مجھے دیکھنا چاہتا تھا جب تک میں اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ میرے لیے کسی آدم زاد کی چاہت ایک انوکھا اور نیا تجربہ تھی۔

حویلی سے دریا زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ دریا کے کنارے پہنچ کر عارج اور میں گھوڑوں سے اترے اور انہیں ایک پیڑ سے باندھ دیا۔ وہاں سے ٹہلتے ہوئے ہم دور نکل آئے۔ آج مجھے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ عارج مجھ سے بہت سی باتیں کرے، میرے حسن کی تعریف کرے اور مستقبل کیلئے اپنے ارادوں کے بارے میں کچھ بتائے مگر وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ مجھے وہ کسی قدر فکرمند بھی نظر آ رہا تھا۔ میں چاہتی تو اس کے ذہن پر توجہ دے کر اس فکرمندی کی وجہ جان سکتی تھی مگر ان لمحات میں یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ میرے نزدیک یہ لمحات محبت تھے۔

سورج رفتہ رفتہ مغرب کی طرف جھکتے جھکتے پوری طرح چھپ گیا۔ شفق کی سرخی نے دریا کے نیلگوں پانی کو بھی سرخ کر دیا تھا۔ ان گنت پرندے دریا کے کنارے اونچے درختوں پر غل مچانے لگے تھے۔ کچھ ہی دیر میں رات کی سیاہی شام کے ملگجے اجالے میں گھلنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے فضا سرد ہو گئی۔

میں نے تیزی سے پھیلتی ہوئی تاریکی کو محسوس کر لیا اور عارج کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تیرا کیا خیال ہے، واپس چلیں؟ تجھے یہاں ڈر تو نہیں لگ رہا ہے؟'' یہ سوال میں نے اس لئے کیا کہ عارج کا انسانی پیکر فطرتاً بزدل تھا۔

اپنی چوری پکڑے جانے پر عارج چونک اٹھا۔ اس کے چہرے پر واقعی خوف کے آثار تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنی بہادری ظاہر کرنے کیلئے بولا۔ ''کیسا ڈر!..... میں..... میں تو نہیں ڈر رہا۔ ابھی زیادہ اندھیرا تو نہیں ہوا۔ کچھ دیر اور سیر کر کے چلیں گے۔'' اس کے لہجے

میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

عارج کے لہجے میں چھپے ہوئے خوف و اضطراب کو میں نے محسوس کر لیا اور تیزی سے بولی۔ ''کیا بات ہے، اے عارج! تو کچھ پریشان سا لگ رہا ہے!''

میری بات سن کر عارج نے چونک کر مجھے دیکھا اور گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''نن..... نہیں تو..... میں..... میں پریشان تو نہیں ہوں۔''

عارج کو پریشان دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو دور مجھے کچھ گرد سی اڑتی نظر آئی۔ میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''معلوم نہیں کون لوگ ادھر آ رہے ہیں!..... شاید کچھ گھڑسوار ہیں۔ تو غالباً انہی کو ادھر آتے دیکھ کر فکرمند ہے۔ کیا خبر وہ لوگ کس ارادے سے ادھر آ رہے ہیں۔ میں قیمتی زیورات پہنے ہوں اور میرے پاس اس وقت تلوار بھی نہیں ہے۔''

اس پر عارج فوراً بول اٹھا۔ ''اے دینار! تو ناحق خوف کھا رہی ہے۔ کس کی مجال ہے کہ ہمیں کوئی گزند پہنچانے کی سوچ بھی سکے۔ ہم عیسیٰ خان کے بیٹے اور بہو کے انسانی قالبوں میں ہیں۔ پھر تمہارے پاس تلوار نہ سہی میرے پاس تو تلوار ہے؟'' عارج کے لہجے میں شیخی اور حماقت کا عنصر شامل تھا۔ اس کے انسانی قالب کی بزدلی اس پر غالب تھی، اس کے باوجود وہ خواہ مخواہ بہادر بن رہا تھا۔

''اے عارج! تیرے پاس تلوار چلانے کا کوئی جواز نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تو نے اس زمانے میں تلوار چلانی سیکھی ہی نہیں۔ ایسی صورت میں تیرا تلوار چلانا آدم زادوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دے گا۔''

میں چپ ہوئی ہی تھی کہ چند ثانیوں میں چار گھڑسوار ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر میں چونک اٹھی کہ ان سب کے چہرے سیاہ نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے چاروں طرف سے مجھے اور عارج کو گھیر لیا۔ پھر ان میں سے ایک کڑک کر عارج سے مخاطب ہوا۔ ''اے نوجوان! تو اگر اپنی زندگی چاہتا ہے تو چپ چاپ کسی حیل و حجت کے بغیر اپنی تلوار نیام سے نکال کر زمین پر پھینک دے اور اس ماہ رو دوشیزہ سے دور ہٹ جا!''

مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے یہ آواز پہلے بھی کہیں سنی ہے مگر کہاں، یاد نہ آ سکا۔ وہ یقیناً آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ادھر اس قوی ہیکل نقاب پوش کے الفاظ ختم ہوئے ادھر عارج نے کانپتے ہاتھوں کو تلوار کے قبضے کی طرف بڑھایا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ شیخی

بگھار رہا تھا اور اب انتہائی خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ عارج اب نیام سے اپنی تلوار نکال کر اسے زمین پر پھینکنے کیلئے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ میں نے اسی لمحے برق رفتاری کا ثبوت دیا تھا۔ عارج کی تلوار زمین پر نہیں گری تھی بلکہ اسے میں نے تیزی سے جھپٹ کر درمیان ہی سے اچک لیا تھا۔

یہ صورتحال یقیناً ان نقاب پوشوں کیلئے غیر متوقع تھی۔ پھر جب تک وہ لمحہ حیرت سے نکلتے میں قضا بن کر ان میں سے ایک کی طرف جھپٹی۔ نقاب پوش گھڑ سوار گھبرا کر ذرا پیچھے ہٹا اور اپنی نیام سے تلوار نکالنے لگا۔ اگر وہ فوری طور پر گھبرا کر پیچھے نہ ہٹ گیا ہوتا تو شاید ہمیشہ کیلئے اپنی دائیں ٹانگ سے محروم ہو جاتا۔ تلوار کی ضرب گھوڑے کی گردن پر پڑی۔ گھوڑا ہنہنا کر الف ہو گیا اور سوار کو نیچے گرا دیا۔ گھوڑے کی گردن سے خوف بہہ رہا تھا۔ سوار گھوڑے سے گرتے ہی لنگڑاتا ہوا بھاگ اٹھا۔

اسی وقت بقیہ تینوں نقاب پوش اپنے اپنے گھوڑوں سے کود کر تلواریں سونتے میرے مقابلے پر آ گئے۔ میں بہرحال ایک جن زادی تھی اس لئے اپنی پراسرار قوتیں استعمال کرتی تو وہ تین آدم زاد کیا' تین سو بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے مگر آدم زادی کی حیثیت سے بھی مجھ پر ان کا قابو ممکن نہیں تھا۔ اسی بنا پر میں نے ان کے خلاف اپنی جناتی صفات استعمال نہیں کیں۔ یوں بھی میں کسی اور زمانے میں جا کر مصلحتاً ان صفات کے استعمال سے دانستہ گریز کرتی تھی۔ اس کا سبب اپنے پیچھے کوئی ایسی نشانی نہ چھوڑنا تھا کہ عفریت دہموش کو ہمارا کوئی سراغ مل جاتا۔ دوسری وجہ وہ خطرناک آدم زاد تھے جو جنات کی تلاش میں رہتے تھے تاکہ انہیں اپنا غلام بنا لیں۔ ان حالات میں بہتر یہی تھا کہ میں حتی الامکان اپنی جناتی صفات استعمال نہ کرتی اور آدم زادوں کے درمیان رہ کر آدم زادی ہی بنی رہتی۔ میں اسی پر عمل پیرا تھی۔

عارج پر ان کا انسانی قالب غالب تھا۔ وہ اسی لئے ایک طرف کھڑا ہوا کانپ رہا تھا۔ اگر اس میں ہمت ہوتی تو کب کا وہاں سے بھاگ جاتا۔ وہ اگر یہ کوشش بھی کرتا تو شاید چند قدم بھاگ کر ہی زمین پر گر پڑتا۔

ذرا سی دیر میں ان تینوں کو میں نے یہ احساس دلا دیا کہ وہ میرے سامنے طفلِ مکتب ہیں۔ ان میں سے پہلے قوی ہیکل نقاب پوش کے ہاتھ سے تلوار گری۔ اگر بقیہ دو نقاب پوش فوراً ہی بیک وقت مجھ پر حملہ نہ کر دیتے تو میں قوی ہیکل نقاب پوش کا کام تمام کر دیتی۔ مجھے فوری طور پر حملہ آور نقاب پوشوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا کہ ان کے وار سے بچ سکوں۔ اس کے باوجود بھی قوی ہیکل نقاب پوش زخمی ہونے سے نہ بچ سکا۔ تلوار کا ایک چرکا اس کے بائیں

بازو پر لگا تھا جس سے فوراً خون بہنے لگا تھا۔

میں نے ان دونوں حملہ آوروں کے وار اپنی تلوار پر روکے اور پھر انہیں مہلت نہیں دی کہ وہ دوبارہ حملہ کر سکیں۔ میرے انسانی پیکر پر اب تک معمولی سا چرکا بھی نہیں لگا تھا۔ پھر ان دونوں میں سے شاید ایک کی قضا آ گئی تھی کہ وہ جوش میں ہوش کھو بیٹھا۔ دراصل اسے مجھ پر غصہ آ گیا تھا۔ میں اسے کئی زخم لگا چکی تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھی سے الجھے دیکھ کر یہ گمان کیا کہ میں اس کی طرف سے غافل ہوں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ جیسے ہی اس نے میرے سر پر سیدھا وار کرنے کیلئے ہاتھ بلند کیا' میں تیزی سے دائیں جانب مڑی اور پھر حملہ آور کا ہاتھ فضا میں بلند ہی رہ گیا۔ میری تلوار نے اس کا سینہ چھید دیا تھا۔ وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ اپنے ساتھی کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھ کر دوسرا نقاب پوش ہمت ہار بیٹھا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور پھر چشم زدن میں ہوا ہو گیا۔ اس دوران میں زخمی اور قوی ہیکل نقاب پوش بھی کا فرار ہو چکا تھا۔

میدان خالی دیکھ کر میں خون آلود تلوار لئے عارج کی طرف بڑھی۔ اس وقت عارج کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ تلوار سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ میں نے عارج کے قریب پہنچ کر تلوار اس کی طرف بڑھا دی۔

''لے' اب اسے نیام میں رکھ لے!'' میں نے عارج سے کہا۔ ''بزدل بھاگ گئے۔''

عارج ہکلایا۔ ''مم...... مگر اس...... اس پر تو خون...... خون لگا ہوا ہے۔''

میں عارج کی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہی تھی۔ اس لئے کچھ کہے بغیر پلٹی اور مرنے والے نقاب پوش کے لباس سے خون آلود تلوار صاف کرنے لگی۔ عارج کی نگاہیں مجھی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ حیرت اور خوف سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

میں لوٹ کر دوبارہ عارج کے قریب آئی تو دیکھا کہ اس کے دونوں پیر کانپ رہے تھے۔

''اے عارج! تیرے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں' اب تک وہ بزدل فرار ہو چکے ہیں۔ اگر پلٹ کر آئے بھی تو منہ کی کھائیں گے۔'' میں پرسکون آواز میں بولی' پھر اسے سمجھانے لگی۔ ''میں اچھی طرح جانتی ہوں اے عارج کہ تو بزدل نہیں ہے بلکہ تیرے انسانی قالب کی فطری صفات تجھ پر غالب آ گئی ہیں۔ تو کوشش کر کہ تجھ پر یہ منفی صفات غالب نہ آ سکیں۔ اس کا واحد ذریعہ قوت ارادی ہے۔ تو اپنی قوت ارادی کو کام میں لا!''

''میں...... میں پوری کوشش کروں گا اے دینار!'' اس نے لرزتی آواز میں وعدہ کیا۔

"درحقیقت تیرے ہاتھوں اس آدم زاد نقاب پوش کو قتل ہوتے دیکھ کر میں ڈر گیا تھا ورنہ تو......"
وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

مجھے پہلے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ عارج کے انسانی قالب میں ایسی کوئی کمزوری ہو گی مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب نئے انسانی قالبوں کو اپنانے کے بعد عارج اور مجھے کیا نئی مشکلات پیش آتیں' کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اس پر مجھے بہرحال رنج ضرور تھا کہ عارج کے حصے میں ایک ایسا انسانی قالب آیا تھا جو فطری طور پر بزدل تھا۔

میں نے ہی سہارا دے کر عارج کو گھوڑے پر سوار کرایا اور اس کے ساتھ میں آبادی کی طرف لوٹی۔

اس واقعے کے دوسرے روز میں نے بہرام خاں کو عارج کے خلوت کدے کی طرف جاتے دیکھا تو چونک اٹھی۔ بہرام خان کی گردن میں ریشمی پٹی پڑی تھی اور اس کا بایاں ہاتھ اس میں پڑا تھا۔

میں سوچنے لگی کہ کہیں بہرام خاں ہی تو وہ قوی ہیکل نقاب پوش نہیں جو میرے ہاتھوں کل شام زخمی ہوا تھا؟ اس خیال کے آتے ہی اور بہت سے سوال میرے ذہن میں پیدا ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ میری سماعت میں بہرام خاں کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے ارمان بھی کسی نہ کسی روز پورے ہو جائیں گے۔ یہ الفاظ واضح طور پر دھمکی تھے جنہیں اس وقت میں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ عارج کی سرگرمیوں پر میری نظر تو تھی مگر کبھی بھی میں نے وہ باتیں سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جو دوستوں کے درمیان ہوتی تھیں۔ میرے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لا کر میں عارج کے خلوت کدے میں ہونے والی گفتگو سن لیتی یا وہاں جو کچھ ہو رہا تھا مجھے نظر آ جاتا لیکن میری دانست میں اس کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔ اسی وجہ سے میرے قدم عارج کے خلوت کدے کی طرف اٹھنے لگے۔ دور ہی سے میں نے دیکھ لیا تھا کہ دو خوب رو کنیزوں کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہو چکا تھا۔

جب عارج کا کوئی دوست اس کے ساتھ ہوتا تھا تو کسی خادم کو وہاں جانے کی اجازت تھی۔ مجھے یہ بات معلوم تھی۔ دروازہ بند دیکھ کر میں دریچے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مجھے دیکھنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوئی بھی خادم آس پاس مجھے نظر نہیں آیا۔

دریچہ بھی مجھے بند ملا تو میں نے اندر ہونے والی گفتگو سننے کیلئے اپنا کان دونوں پٹوں

کی خفیف سی جھری سے لگا دیا۔

☆......☆......☆

چند روز بعد قطب خان کو ساتھ لئے عیسیٰ خان حج کر کے واپس آ گیا۔ بادشاہ وقت سلیم شاہ سوری کے حکم کی تعمیل میں اس نے قطب خاں کو آگرہ کے زنداں میں مقید کرا دیا اور خود دہلی پہنچ گیا۔ یہاں آنے ہی پر اسے اندازہ ہوا کہ حالات کس قدر بدل چکے ہیں۔ اس کا ثبوت عیسیٰ خان کو ملنے میں دیر نہیں لگی۔

اگلے ہی روز سلیم شاہ سوری کے حکم پر عیسیٰ خاں کو گرفتار کر کے دہلی کے زنداں میں ڈال دیا گیا۔

بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے میں بہت فکر مند تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی جناتی صفات بروئے کار نہ لا کے عیسیٰ خان کی رہائی اور اس کے ساتھ سابقہ منصب پر بحالی کیلئے کیا کروں۔ میرا خیال تھا کہ عارج عیسیٰ خاں کی جاں بخشی کی خاطر ضرور کچھ کرے گا۔ عیسیٰ خاں بہرحال اس کے انسانی قالب، شہباز کا باپ تھا مگر اسے تو جیسے کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔

میں نے جس روز سے عارج اور بہرام خاں کی گفتگو چھپ کر سنی تھی' اس روز سے کبھی عارج کے خلوت کدے کی طرف نہیں گئی تھی لیکن جب عیسیٰ خاں کو گرفتار ہوئے تین دن ہو گئے اور عارج نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا تو میں مجبوراً اس کے خلوت کدے میں چلی گئی۔

اس وقت اتفاق سے عارج کا کوئی دوست اس کے ساتھ نہیں تھا۔ صرف ایک کنیز اس کی خدمت میں تھی۔

میں نے وہاں پہنچتے ہی کنیز کو باہر نکال دیا۔

عارج بستر پر نیم دراز تھا۔ مجھے اپنے سامنے دیکھتے ہی وہ گھبرا کر بستر سے اٹھ گیا۔

"عیسیٰ خاں کی رہائی کیلئے تجھے کچھ کرنا چاہئے اے عارج!" میں اس کے قریب بستر پر بیٹھ گئی۔ "اس سے قطع نظر کہ ہم اسی کی حویلی میں رہ رہے ہیں' تیرے انسانی قالب سے اس کا قریبی رشتہ ہے۔ اگر تو چپ رہا اور کچھ نہ کیا تو لوگ تجھ پر انگلیاں اٹھائیں گے۔"

"م...مگر میں......میں کر بھی......کیا کر سکتا ہوں میں؟" عارج بولا۔ "ویسے اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گا' تو فکر نہ کر اے دینار!"

"تو کیسے کہہ سکتا ہے یہ بات؟" میں نے سوال کیا۔

عارج کے چہرے کا تاثر بدل سا گیا۔ اس کے دو ہی روپ تھے یا تو وہ بزدل بن جاتا تھا یا پھر شیخی بگھارنے لگتا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر فخریہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''میرا دوست بہرام خاں بادشاہ کا مقرب خاص ہے۔ تجھے شاید پتہ نہیں بہرام خاں سے میرے کتنے گہرے مراسم ہیں!''

''ہاں میں جانتی ہوں۔'' میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔ ''تم دونوں ہی کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تو آج کل اس کی حویلی کے چکر کیوں کاٹنے لگا ہے۔ اس نے کئی خوبصورت کنیزیں خریدی ہیں۔ وہ تجھے اور جواباً تو اسے عیش مہیا کرتا ہے۔''

عارج نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر قدرے سنجیدہ آواز میں بولا۔ ''تجھے یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ کیا تو میری ٹوہ میں لگی رہتی ہے اے دینار؟''

''مجھے تو اور بھی بہت کچھ معلوم ہے اے عارج!'' میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

حیرت اور بے یقینی کے عالم میں عارج مجھے دیکھتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے طویل سانس لیا اور شکست خوردہ آواز میں کہا۔ ''جب تجھے سب کچھ معلوم ہے تو پھر حیرت کیوں کر رہی ہے!... بہر حال تو اطمینان رکھ عیسیٰ خاں زیادہ دن قید میں نہیں رہے گا۔ لوگوں کو مجھ پر انگلیاں اٹھانے کی مہلت نہیں ملے گی۔ جلد ہی عیسیٰ خاں کو رہا کر دیا جائے گا اور یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہوگا۔''

''میری وجہ سے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں' تیری وجہ سے اے دینار!'' عارج نے پرسکون آواز میں جواب دیا پھر تفصیل بتانے لگا۔ ''دراصل میں نے بہرام خاں کو بتا دیا تھا کہ عیسیٰ خاں کی گرفتاری کے سبب تو بھی بہت فکر مند و پریشان ہے۔ تجھے شاید یہ معلوم نہ ہو کہ وہ میری بڑی عزت اور قدر کرتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تو اس کے دوست یعنی میری بیوی ہے۔ چاہے یہ حقیقت نہ ہو مگر دوسرے آدم زادوں کی طرح بہرام خاں بھی تجھے میری بیوی ہی سمجھتا ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر تجھے عیسیٰ خاں کی گرفتاری سے رنج ہوا ہے تو پھر جلد ہی وہ عیسیٰ خاں کو رہا کرا دے گا۔ اس نے مجھ سے وعدہ بھی کیا ہے کہ رہائی کے بعد عیسیٰ خاں کو پٹنہ کا نائب حاکم بنا کر بھیج دیا جائے گا۔''

''مگر اس معاملے سے میرا کیا تعلق؟ تو نے آخر اس سے میرا نام کیوں لیا؟ میری خوشی اور ناخوشی سے بہرام خاں کا کیا واسطہ؟'' میں زہر آلود لہجے میں بولی۔ مجھے یہ بات قطعی پسند نہیں آئی تھی۔

''بہرام خاں کہتا ہے کہ اسے تیری ناخوشی منظور نہیں' وہ مجھے ملول نہیں دیکھ سکتا۔''

''اس کم اصل سے...... اس بدذات سے میرا کیا واسطہ! وہ ہوتا کون ہے میرا!'' میں طیش میں آ کر بولی۔ عارج کی باتیں سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

عارج نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ''بہرام خاں میرا دوست ہے اور مجھ سے اخلاص رکھتا ہے۔ تجھے میری بیوی سمجھنے کی وجہ سے تیرا بھی خیال رکھتا ہے۔ تجھے تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ تیری خاطر وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے۔''

میں نے حقارت سے عارج کو دیکھ کر کہا۔ ''کہہ دیجو اپنے اسے چہیتے دوست سے آئندہ وہ میری خاطر کوئی تکلیف نہ اٹھائے اور نہ ہی اب کبھی اپنی ناپاک زبان پر میرا نام لائے۔ میں اس بدبخت و بدذات کی صورت پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔'' یہ کہہ میں عارج کی خلوت گاہ سے نکلی اور تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

دوسرے دن خلاف توقع عیسیٰ خاں کو رہا کر دیا گیا اور فوراً ہی اسے پٹنہ جانے کا حکم ملا۔ زنداں سے حویلی آتے ہی عیسیٰ خاں نے مجھے اپنے خلوت کدے میں بلوایا۔ میں جب اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میری بچی! مجھے تم پر فخر ہے۔ تم نے میری خاطر وہ کام کیا جو شاید میرا بیٹا شہباز بھی نہیں کر سکتا تھا۔''

میں عیسیٰ خاں کی بات سمجھ نہ سکی۔ میں نے حیرت سے عیسیٰ خاں کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''مگر بابا میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔''

عیسیٰ خان نے مجھے اپنے قریب بٹھایا اور محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے میری بچی! میں جانتا ہوں کہ تم اپنی زبان سے اس بات کا اقرار کر کے مجھے زیر بار احسان کرنا نہیں چاہتیں مگر بہرام خاں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''کیا بتایا ہے اس نے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''یہی کہ میری وجہ سے تم خود اس کی حویلی میں گئی تھیں اور اس سے میری رہائی کیلئے درخواست کی تھی۔'' عیسیٰ خان نے بتایا۔ میں یہ سن کر دنگ رہ گئی۔ یہ بات قطعی جھوٹ تھی لیکن میں عیسیٰ خاں کو حقیقت سے بھی آگاہ نہیں کر سکتی تھی۔ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ بہرام خاں کی نیت میرے بارے میں ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بوالہوس اس طرح مجھ پر ڈورے ڈالنا چاہتا ہے۔ عارج پر بھی مجھے غصہ آ رہا تھا۔ وہ ایک ایسے بدنیت شخص سے مراسم رکھتا تھا جو مجھ پر بری نظر رکھتا تھا۔ میں جو اس کی محبت تھی مگر شاید کہ اس زمانے میں آ کر سب کچھ بھول گیا

تھا۔ عارج اس قدر بے وقوف اور احمق تھا کہ غالباً اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ بہرام خاں کا مقصد و منشا کیا ہے ورنہ وہ لاکھ بزدل سہی' یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود میں نے عیسیٰ خاں سے ان باتوں کا اظہار نہیں کیا۔

اگلے ہی روز عیسیٰ خاں کے ساتھ میں بھی دہلی سے پٹنہ جانا چاہتی تھی کہ اب عارج کو میں اس ماحول سے نکالنا چاہتی تھی۔ پٹنہ پہنچ کر خواص خاں اور قمر النسا سے ملاقات کی صورت بھی پیدا ہو سکتی تھی۔ میرے انسانی قالب کا بہرحال ان دونوں سے گہرا تعلق تھا۔ خواص خاں پر صرف دہلی میں داخلے پر پابندی تھی کسی اور شہر میں نہیں۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار عیسیٰ خاں سے کیا بھی تھا۔ جواباً عیسیٰ خاں نے مجھے سمجھایا تھا کہ ابھی چند روز تم یہیں رہو' پٹنہ میں معقول قیام گاہ کا بندوبست ہوتے ہی تمہیں وہاں بلوا لوں گا۔ تمہارا شوہر بھی کچھ ضروری کام کی وجہ سے فی الحال دہلی ہی میں رہنے پر مجبور ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے شوہر کے قریب ہی موجود رہنا چاہیے۔

میں بخوبی جانتی تھی کہ عارج کو دہلی میں کیا ضروری کام ہے اور وہ کیوں دہلی چھوڑنا نہیں چاہتا۔ دہلی میں اس کے بدقماش دوست تھے اور یہاں بہرام خاں بھی تھا جو اس کی عیاشیوں میں برابر کا شریک تھا۔ انہی وجوہ کی بنا پر عارج یہاں رہنے پر مجبور تھا۔

پٹنہ جاتے ہوئے عیسیٰ خاں حویلی کے بیشتر ملازموں اور کنیزوں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اب دہلی کی حویلی میں میرے اور عارج کے علاوہ چند خدام تھے اور کنیزیں تھیں جو عارج کی خدمت پر مامور تھیں۔ ان میں میری خاص کنیز نسترن بھی تھی۔

اسی شب عارج نے ایک خادم کے ذریعے مجھے اپنے خلوت کدے میں بلوایا تو میرے جی میں آئی کہ انکار کر دوں۔ پھر جب میرے دریافت کرنے پر خادم سے پتہ چلا کہ عارج اپنے کمرے میں تنہا ہے تو میں وہاں جانے پر راضی ہو گئی۔ میں بے دلی سے اٹھی اور اس حصے کی طرف چل دی جو عارج کیلئے مخصوص تھا۔

میں جب عارج کے خلوت کدے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ عارج اپنے سامنے ساغر و مینا سجائے بیٹھا تھا۔

''آ.... آ اے دینار! مجھے تیرا ہی انتظار تھا۔'' عارج نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

میں اس کے قریب مسند پر بیٹھ گئی پھر اس سے پوچھا۔ ''تو نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''آج رات تو ساقی بنے گی۔'' عارج مسکرا کر بولا۔ ''میں تیرے ہاتھ سے پینا چاہتا ہوں۔''

''میں شراب نوشی کو حرام سمجھتی ہوں۔'' میں سخت لہجے میں بولی۔ ''تجھے شراب پلانا تو کجا میں شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔ یہ نہ بھول کہ میں تیری کوئی کنیز نہیں ہوں جو تیرے اشاروں پر ناچنے لگوں۔''

''مگر بی.... بیوی...... دنیا کی نظر ہی میں سہی بیوی تو ہے اور بیوی پر شوہر کا پورا حق ہوتا ہے۔ فضول باتیں چھوڑ اور میری بات مان لے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج...... ابھی کچھ ہی دیر میں بہرام خاں بھی یہاں آنے والا ہے۔ یقین کر کہ جب میں اس کی حویلی میں جاتا ہوں تو اس کی بیوی بھی ساقی بن جاتی ہے اور اپنے ہاتھ سے ہم دونوں کیلئے جام......''

''لعنت ہو تجھ پر اور تیرے دوست بہرام خاں پر! میں جا رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے نزدیک اب عارج سمجھانے بجھانے کی حد سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ میں نے اسی لئے یہ کوشش نہیں کی۔

''ٹھہر اے دینار! میں چاہتا ہوں کہ آج جب بہرام خاں آئے تو میرے ساتھ تو بھی اس کی پذیرائی کیلئے یہاں موجود ہو۔'' یہ کہہ کر عارج ایک لمحے کو رکا پھر نرمی سے بولا۔ ''دیکھ اے دینار! تو اچھی طرح جانتی ہے کہ عیسیٰ خاں کی رہائی محض بہرام خاں کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔ وہ ہمارا محسن ہے۔ اس کی عزت و توقیر کرنا ہم پر فرض ہے۔ اس کے علاوہ وہ بادشاہ کا مقرب خاص بھی ہے۔ تجھے اس کے اختیار و اقتدار کا شاید صحیح اندازہ....''

''میں اس کے اختیار و اقتدار سے نہیں ڈرتی!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔ ''میں اس کی لونڈی یا کنیز نہیں ہوں کہ اس کی خدمت کروں۔ تو اگر مجھ سے اس کی پذیرائی کیلئے کہہ رہا ہے تو بے غیرت' بزدل اور بے وقوف ہے!'' میں طیش کے عالم میں کہہ گئی۔ اب سے پہلے میں نے عارج کو کبھی اتنا برا بھلا نہیں کہا تھا مگر عارج نے تو جیسے میری کوئی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہیں ہوا تھا۔

عارج بدستور پرسکون لہجے میں کہنے لگا۔ ''دیکھ ضد نہ کر اور اپنا یہ مردانہ لباس بدل کر آ جا' تیرے جسم پر زنانہ لباس ہی بھلا لگتا ہے.... جلدی کر کہ بہرام خاں اب آتا ہی ہو گا۔''

ابھی عارج کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ ایک خادم دروازے پر نظر آیا۔ اس نے بہرام خاں کی آمد کے بارے میں بتایا۔

''انہیں یہیں لے کر آ جاؤ!'' عارج نے خادم سے کہا۔ خادم کے جاتے ہی وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''جا' اب مزید وقت ضائع نہ کر' جلدی سے لباس تبدیل کر کے آ جا!'' اس بار

عارج کی آواز میں تختی آ گئی تھی۔

''میں جا رہی ہوں لیکن کان کھول کر سن لے میں اس کمینے کی خواہش ہرگز پوری نہیں کروں گی۔ مجھے معلوم ہے اس نے اسی وجہ سے اپنی بیوی کے ہاتھوں سے تیرے لئے جام بنوائے ہوں گے کہ جواباً تو بھی ایسا کرے۔ سن لے کہ اب میں لوٹ کر نہیں آؤں گی۔''

پھر میں وہاں رکی نہیں اور اپنے خلوت کدے میں آ کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ مجھے عارج کی بے غیرتی پر بہت رنج تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کوئی عاشق اس حد تک احمق ہو سکتا ہے کہ اپنی محبوبہ کو کسی دوسرے کی خدمت و پذیرائی پر آمادہ کرنے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے فوراً تندی سے پوچھا ''کون ہے؟''

''میں ہوں' دروازہ کھولو!'' باہر سے عارج کی آواز سنائی دی۔

میں سمجھ گئی کہ عیسیٰ خاں کے دہلی سے چلے جانے کے سبب بہرام خاں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے۔ وہ یقیناً اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اس نے اسی لئے عارج کو بھی شیشے میں اتار لیا ہے اور عارج اتنا بے وقوف ہے کہ کچھ سمجھ ہی نہیں رہا۔ جواب میں جب میں کچھ نہ بولی تو عارج نے ایک بار پھر دروازہ کھولنے کو کہا۔

باہر سے آنے والی آوازوں سے میں اندازہ کر چکی تھی کہ بہرام خاں بھی عارج کے ساتھ ہے۔ میں نے اسی کے پیش نظر دانستہ بلند آواز میں کہا۔ ''جب تک تمہارا ملعون و بدذات دوست اس حویلی سے چلا نہیں جائے گا میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔''

''میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ دروازہ کھول دو ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔'' عارج کی غصیلی آواز پھر سنائی دی۔

اس مرتبہ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہر چند کہ بہرام خاں سے نمٹنا میرے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا مگر ایک تو میں بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی' دوسرے اس طرح رسوائی کا خطرہ بھی تھا۔

دروازے کے باہر سے کچھ سرگوشیاں سی سنائی دیں' پھر خاموشی چھا گئی۔ میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ چلو اچھا ہوا بلا ٹل گئی مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ اس وقت مجھے خبر نہ تھی کہ بہرام خاں اپنے منصوبے کے مطابق عارج کے ساتھ خلوت کدے میں مصروف مے نوشی تھا۔ اس نے عارج کو یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ خود برائے نام پی رہا تھا اور عارج کو پلائے جا رہا تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے بعد میں پتہ چلیں۔

اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے بہرام خاں نے حویلی کی ایک کنیز کو بھی انعام کا لالچ دے کر ہموار کر لیا تھا۔ یہ کنیز نسترن تھی۔

میرا معمول تھا کہ میں رات کے وقت سونے سے پہلے دودھ ضرور پیتی تھی اور تاریخی کتب کا مطالعہ بھی کرتی تھی۔ اس شب بھی میری خاص کنیز نسترن ایک نقشین کٹورے میں میرے لئے دودھ لے کر آئی اور مسہری کے قریب رکھ کر چلی گئی۔ جاتے ہوئے نسترن دروازہ بھی بھیڑ گئی تھی۔ میں نے کتاب پڑھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر دودھ کا کٹورا اٹھایا اور چند لمحوں میں اسے خالی کر دیا۔ پھر میں مطالعے میں محو ہو گئی مگر خلاف توقع اچانک میرے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

میں فوری طور پر اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے کیلئے اٹھی مگر مجھے محسوس ہوا جیسے میرے اعضاء یکلخت بے جان ہو گئے ہیں۔ در و دیوار مجھے گھومتے محسوس ہوئے۔ میں وہیں فرش پر بیٹھ گئی کہ کہیں چکرا کے نہ گر پڑوں۔ چند لمحوں بعد میں ہوش کھو بیٹھی تھی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی کمرے میں' ایک اجنبی بستر پر پایا۔ مجھے یہاں کون لے کر آیا اور کیوں؟ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور بگولے سے رقص کر رہے تھے۔

میں نے اپنے ذہن پر زور دیا تو مجھے یاد آ گیا کہ سونے سے پہلے دودھ پیا تھا۔ دودھ پینے کے کچھ ہی دیر بعد مجھ پر مدہوشی طاری ہو گئی تھی۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ دودھ میں بیہوشی کی دوا ملا دی گئی ہو گی۔ مجھے حیرت تھی کہ میری پرانی خادمہ کس طرح دشمن کی آلۂ کار بن گئی تھی۔ ابھی میں انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔

دروازہ کھلتے ہی جو شخص اندر آیا تھا اس پر نظر پڑتے ہی میرا خون کھول اٹھا تھا۔ آنے والا بہرام خاں تھا۔ اس کے بھدے اور موٹے ہونٹوں پر بڑی کراہت انگیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

''آخر کو تم زیر دام آ ہی گئیں' بہت ہوشیار سمجھتی تھیں اپنے آپ کو!'' بہرام خاں نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں مجھ سے کہا۔

میں ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی اور غصے میں بولی۔

''کیا تو سمجھتا ہے کہ اس طرح مجھ پر قابو پا لے گا؟''

''قابو تو خیر میں پا ہی چکا ہوں۔'' وہ ہنس کر کہنے لگا۔ پھر قدم بہ قدم میری طرف بڑھنے لگا۔

میں چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور سخت لہجے میں کہا۔ "وہیں ٹھہر جا اے بدبخت! میرے قریب آنے کی جرأت نہ کرنا!"

"یہ قدم جب ایک بار اٹھ جائیں تو پھر رکتے نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اپنی سرکشی اور ضد چھوڑ دو!"

"شاید تو مجھے نہتا دیکھ کر اتنا شیر ہو رہا ہے۔" میں دانت پیس کر بولی۔ "مگر میں خالی ہاتھوں بھی تیرا خون پی سکتی ہوں کمینے!" یہ کہہ کر میں ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور بہرام خان کے نزدیک آنے کا انتظار کرنے لگی۔ پھر جیسے ہی بہرام خاں مجھ سے ایک قدم کے فاصلہ پہ پہنچا' میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

بہرام خاں بہرحال ایک سپاہی تھا۔ وہ میری توقع سے بڑھ کر طاقتور اور چوکنا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور پھر کسی پھول کی طرح مجھے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔

اس کے باوجود کہ میں شدید طیش کے عالم میں تھی' ہوش کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ میں دیکھ چکی تھی کہ بہرام خاں کی کمر سے تلوار بندھی ہوئی تھی۔ اچانک میں مچھلی کی طرح تڑپ کر بہرام خاں کی گرفت سے نکل گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ میرے قدم فرش ٹکتے میں انتہائی پھرتی سے بہرام خاں کی تلوار اس کی نیام سے نکال چکی تھی۔

☆......☆......☆

ایک دم بازی پلٹ جائے گی اس کا اندازہ یقیناً بہرام خاں کو نہیں ہوگا۔ وہ اسی لئے بھونچکا رہ گیا لیکن جلد ہی اسے صورتحال کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ اس کا یقین مجھے بہرام خان کے چہرے پر پھیلتی زردی سے ہوا جو خوف کی علامت تھی۔ میرے تیور بہت جارحانہ تھے' میں شمشیر براں لئے مضبوط قدموں سے بہرام خاں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ موت کو سامنے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھی۔

تیزی سے آگے بڑھ کر میں نے تلوار کی نوک بہرام خاں کے سینے پر رکھ دی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "بتا اے رذیل انسان! کیا دریا کے کنارے تو ہی تھا جس نے مجھے اغوا کرنا چاہا تھا؟ بول کیا تو میرے ہی ہاتھوں زخمی ہوا تھا؟ سن لے کہ اگر تو نے جھوٹ بولا تو میں یہ تلوار تیرے سینے میں اتار دوں گی!"

فطرتاً بہرام خان کم ہمت اور بزدل آدمی تھا۔ وہ میری جرأت اور مہارت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ جھوٹ بولنے کا نہ تو موقع تھا نہ گنجائش' وہ ہکلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "ہاں...... وہ...... وہ میں ہی تھا مگر...... مگر میری بات پر یقین کرو کہ...... کہ میرا کوئی...... برا

ارادہ نہیں تھا مجھے تم...... تم سے محبت ہے اور...... اور میں تم سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔"

"کیا تجھے یہ خبر نہیں تھی کہ میں شادی شدہ ہوں؟" میں اس پر برس پڑی۔

بہرام خاں نے سہم کر میری طرف دیکھا اور لرزتی آواز میں بولا۔ "م...... میں نے تمہارے شوہر شہباز کو آمادہ کر لیا تھا کہ...... کہ وہ...... وہ تمہیں طلاق دے دے گا...... ظاہر ہے کہ طلاق کے بعد......" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تو اس سازش میں شہباز بھی شامل تھا۔" میں نے بے یقینی سے کہا' مجھے اس بات پہ دکھ ہوا تھا۔

"نہیں" بہرام خان بول اٹھا۔ "شہباز کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں تمہیں اغوا کرنے والا ہوں اور...... اور آج رات بھی وہ میرے ارادہ سے بے خبر تھا دراصل وہ...... وہ تمہیں پسند نہیں کرتا۔ اس نے مجھ سے یہ اعتراف کر لیا تھا' مجھے جب اس کی زبان سے یہ بات معلوم ہوئی تو میں نے اس سے بات کر لی کہ وہ تمہیں طلاق دے دے...... اور وہ راضی ہو گیا۔"

"لیکن تمہیں اور شہباز کو یہ حق کس نے دیا کہ تم میری تقدیر کا فیصلہ کرو۔ میں انسان ہوں کوئی بھیڑ بکری نہیں اور نہ شہباز کی کوئی زرخرید لونڈی ہوں کہ وہ جسے چاہے اس کی خدمت میں پیش کر دے۔" مجھے اب بہرام خان سے بھی زیادہ غصہ عارج پر آ رہا تھا۔ اگر وہ بہرام خان کی ہمت افزائی نہ کرتا تو بہرام خان کی کبھی یہ جرأت نہ ہوتی کہ مجھے اغوا کر لیتا۔ میں نے تلوار کی نوک بہرام خاں کے سینے میں چبھوئی اور قہر آلود لہجے میں بولی۔ "تم محبت کا جھوٹا ڈھونگ رچا کر مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ میں تم جیسے لوگوں' تم جیسے ابوالہوسوں کی محبت کو خوب جانتی ہوں۔ کان کھول کر سن لو کہ مجھے تم سے شدید نفرت ہے۔"

پھر میرے استفسار پر بہرام خاں نے یہ بھی بتا دیا کہ عارج کو اس نے ایک خوبصورت کنیز کا لالچ دیا تھا جو اس کے تصرف میں تھی۔

"تو اس طرح تم نے میرا سودا کر لیا تھا۔" میں غرائی' پھر بولی۔ "تم نے آج میرے ساتھ جو ناشائستہ اور مجرمانہ حرکت کی ہے اس کے جرم میں بطور سزا......" میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور تلوار کی نوک کا دباؤ بڑھا دیا۔

موت کے خوف سے بہرام خان کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ گھگھیاتے ہوئے کہنے لگا۔ "مجھے معاف کر دو مہر النسا!...... میں اپنے جرم پر شرمندہ ہوں اور تم سے سچے دل کے ساتھ نہایت خلوص سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھوں گا۔"

میں بہر حال سنگ دل نہیں تھی۔ پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ بہرام خاں اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ میری عزت و آبرو محفوظ تھی۔ اسی سبب مجھے بہرام خاں پر رحم آ گیا۔ میں نے بہرام خاں کے سینے سے تلوار ہٹالی مگر اس کے باوجود تلوار اپنے ہاتھ ہی میں رکھی اور الٹے قدموں کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ پھر میں نے جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھولا دو مسلح پہرے دار میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ میرے لئے یہ خلاف توقع صورتحال تھی۔

عین اسی وقت بہرام خاں چیخ اٹھا۔ ''اسے گرفتار کرلو! اسے پکڑ لو! اس حرافہ کو یہ بچ کر نہ جانے پائے۔''

دونوں پہریداروں نے پیچھے ہٹ کر اپنی تلواریں نکال لیں اور پھر مجھ پر جھپٹ پڑے۔

میں پہلے ہی چوکنا ہو چکی تھی۔ ان دونوں کے وار میں نے اپنی تلوار پر روک لئے اور بہرام خاں سے مخاطب ہوئی۔ ''اے مکار شخص! اپنی چھوٹی بہن کو حرافہ کہہ رہا ہے' ابھی چند لمحے پہلے کہے ہوئے الفاظ تو بھول گیا۔''

جواب میں بہرام خاں بے حیائی سے قہقہے لگاتا ہوا دروازے سے باہر آ گیا اور کہنے لگا۔ ''تو بھی کس قدر بھولی ہے مہر النسا کہ تجھے نہیں معلوم منہ سے بہن کہہ دینے سے کوئی عورت بہن نہیں بن جاتی۔''

میں کچھ نہ بولی۔ میری تمام تر توجہ پہریداروں کی طرف تھی۔ میں پہریداروں سے بھڑی ہوئی تھی۔ آن کی آن میں ایک پہریدار کا دایاں ہاتھ کٹ کر دور جا گرا اور دوسرے پہریدار کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں بہرام خاں پر جھپٹتی وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ عمارت کے اندرونی حصے کی طرف تھا۔ اس کے پیروں میں جیسے پر لگ گئے تھے۔ میں اسے چھوڑ کر بیرونی دروازے کی طرف لپکی۔

بیرونی دروازے کے قریب ہی مجھے اصطبل نظر آیا۔ میں اس میں گھس گئی اور جھپٹ کر ایک گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ پھر صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ صدر دروازے پر جو پہریدار مقرر تھا وہ میرے ہاتھ میں خون آلود تلوار دیکھ کر پہلے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اگلے ہی لمحے اس عمارت سے باہر آ گئی۔

اس وقت نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی اس لئے تمام راستے سنسان تھے۔ ہر

طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میرے بجائے اگر کوئی آدم زادی ہوتی تو اس وقت گھر سے باہر نکلنے کا تصور بھی نہ کرتی مگر میں ایک غیر معمولی وجود یعنی جن زادی تھی۔ میں تیزی سے گھوڑا دوڑاتی ہوئی اپنی حویلی کی طرف بڑھتی رہی۔ میرے گھوڑے کی ٹاپیں دور تک گونج رہی تھیں۔

جب میں حویلی پہنچی تو عارج کے خلوت کدے کا رخ کیا۔ مجھے وہ نشے میں دھت پڑا ہوا ملا۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کر جگانا چاہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ عارج کے کمرے سے نکل کر میں نسترن کو تلاش کرنے لگی۔ یہی وہ خادمہ تھی جس نے مجھے دودھ میں بیہوشی کی دوا ملا کر دی تھی۔ ساری حویلی میں اسے تلاش کر کے میں مایوس ہو گئی۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ تھا کہ نسترن نے مجھے حویلی میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہو گا۔ میرے ہاتھ میں خون آلود تلوار دیکھ کر غالباً وہ سمجھ گئی تھی کہ اب خیر نہیں ہے' اس لئے وہ فرار ہو گئی تھی۔

نسترن میرے نزدیک اتنی اہم نہیں تھی کہ اسے بہرحال تلاش کرنا ضروری ہوتا اور میں اس کیلئے اپنی پراسرار قوتیں استعمال کرتی' میں نے اس لئے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

اس رات بڑی دیر تک میں بستر پر کروٹیں بدلتی رہی اور مجھے نیند نہیں آئی' پھر معلوم نہیں کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

صبح بیدار ہوتے ہی میں نے عارج کی خلوت گاہ کا رخ کیا۔ وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگا دیا۔ آنکھ کھولتے ہی عارج کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ گھبرا سا گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس وقت بھی میرے ہاتھ میں رات والی خون آلود تلوار تھی جسے میں دانستہ اپنے ساتھ لائی تھی۔

میں نے حقارت آمیز آواز میں عارج کو مخاطب کیا۔ ''اے عارج! پڑھ کہ اس تلوار پر خون سے کیا تحریر لکھی ہے؟''

عارج نے سہمی ہوئی نظروں سے خون آلود تلوار کو دیکھا' جس پر خون جم چکا تھا۔ پھر وہ ہکلاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''اے...... دی...... دینار!...... کک...... کیا تو...... تو نے بہرام خاں کو مار ڈالا؟''

''یقیناً مار ڈالتی مگر وہ بزدل رات کو کسی چوہے کی طرح چھپ گیا۔ پھر مجبوراً مجھے اس کی حویلی سے اسے قتل کیے بغیر ہی واپس آنا پڑا لیکن اب وہ میرے انتقام سے نہیں بچ سکتا۔''

''تو...... یہ...... یہ تل...... تلوار تو اپنے ہاتھ سے رکھ دے۔'' عارج ایک بار پھر ہکلایا۔

''کیوں؟...... کیا تجھے ڈر لگ رہا ہے تلوار سے؟'' میرا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

''ہاں...... ہاں مجھے ایسی...... ایسی باتوں سے ڈر لگتا ہے۔'' عارج بستر سے اٹھ کر

پیچھے کھسکتے ہوئے کہنے لگا۔

عارج پر اس کا انسانی قالب پوری طرح غالب تھا۔ پھر بھی مجھے اس پر ترس نہیں آیا اور قہر آلود لہجے میں بولی۔ ''تجھے تلوار سے تو خوف آتا ہے مگر خدا سے ڈر نہیں لگتا!...... یہ لے۔'' میں نے تلوار ہاتھ سے پھینک دی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تو نے بہرام خاں کے ساتھ میرا جو سودا کیا تھا اس کے بارے میں مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچ چکی ہوں کہ تو میری محبت کا مستحق نہیں ہے۔ تیرے ساتھ میں نے بہت رعایت کر لی۔ اب مزید رعایت میرے بس میں نہیں تو یقیناً اس قابل بھی نہیں کہ میرا شوہر کہلائے۔'' یہ کہہ میں ایک لمحے کو رکی پھر دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ ''اچھی طرح سن لے اگر اب وہ تیرا ذلیل دوست اس حویلی میں داخل ہوا تو میں نہ صرف اس کا خون کر دوں گی بلکہ تو بھی......'' میں غصے میں مزید کچھ کہنے سے باز رہی اور اپنی خفگی کا ہدف بہرام خاں ہی کو بنائے رہی۔ ''اپنے اس چہیتے دوست بہرام خاں سے کہہ دینا کہ اگر اسے اپنی زندگی عزیز ہے تو آئندہ یہاں اپنے ناپاک قدم نہ رکھے۔'' یہ کہہ کر میں مزید وہاں نہیں رکی۔

بہرام خاں نے اس دن کے بعد سے حویلی میں آنے کی ہمت نہیں کی۔ عارج نے اس تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اب مجھ سے عارج بھی کترانے لگا تھا۔ جب کبھی نادانستہ مجھ سے اس کا سامنا ہو جاتا تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوفزدہ نظر آنے لگتا۔

میں بہت محتاط ہو چکی تھی۔ کھانے پینے کی اشیاء اب میں پہلے خادموں یا کنیزوں کو چکھاتی پھر خود استعمال کرتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بہرام خاں اپنے مطلب نکالنے کیلئے کسی بھی کنیز یا خادم کو خرید سکتا ہے۔ پہلے بھی ایک بار ایسا کر چکا تھا ایسی صورت میں یہ کام اور بھی آسان تھا کہ عارج بہرام خاں سے ملا ہوا تھا۔

حویلی میں بہرام خاں کا آنا جانا بند ہو گیا تو عارج غائب رہنے لگا۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ عارج کا بیشتر وقت کہاں گزرتا ہے۔ اکثر عارج راتوں کو بھی اب بہرام خاں کی حویلی میں رہ جاتا تھا۔

ان حالات میں اب میں کچھ اور ہی سوچنے لگی تھی۔ عارج پر غصے سے قطع نظر بار بار یہ حقیقت سامنے آ جاتی کہ قصوروار اس کا انسانی قالب ہے وہ خود نہیں۔ میں سنجیدگی سے اس امکان پر غور کرنے لگی کہ عارج اب مزید اس انسانی قالب میں نہ رہے۔ تو پھر؟ یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگا اور ایک دن میں جواب تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

مستقبل کا واضح نظام العمل ابھی پوری طرح میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر

عارج شہباز کے جسم میں نہ رہتا تو مجھے بہر حال اس سے علیحدگی اختیار کرنی پڑتی۔ ظاہر ہے کہ میں اس آوارہ و بدکردار آدم زاد شہباز کی بیوی بن کر تو نہیں رہ سکتی تھی۔ میں اکثر یہ بھی سوچتی تھی کہ شہباز سے علیحدگی اختیار کر کے کہاں جاؤں گی؟

مجھے اپنے انسانی پیکر مہر النسا کے سوتیلے باپ خواص خاں کے پاس سسرام جانے کا بھی خیال آیا۔ پھر انہی دنوں مجھے مہر النسا کی ماں قمر النساء کے انتقال کی خبر مل گئی۔ اس خبر سے مجھے رنج ہوا اور اپنے انسانی قالب کی بنا پر قمر النسا سے میرا گہرا تعلق تھا۔ وہ مہر النسا کی ماں تھی اس خبر کے بعد میں نے سسرام جانے کا خیال بھی دل سے نکال دیا۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ خواص خاں کو مجھ سے قطعی محبت نہیں ہے۔

مستقبل کا جو خاکہ میں نے اپنے ذہن میں مرتب کیا تھا اس کا دارومدار میرے خوبرو اور وجیہہ اتالیق اسحاق پر تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اسحاق کے دل میں میری محبت پوشیدہ ہے۔ خود میرے دل میں بھی اسحاق کیلئے جگہ تھی۔ اس کے باوجود میں اسحاق کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ عارج کے انسانی قالب کیلئے میں نے اسحاق ہی کو منتخب کر لیا تھا لیکن اس پر عملدرآمد فوری طور پر بوجوہ ممکن نہیں تھا۔ پہلا مرحلہ تو میرے نزدیک اسحاق کی رضامندی تھی اس کے علاوہ یہ کہ اسحاق بہر حال ایک معمولی کماں دار تھا وہ بھلا عیسیٰ خاں اور بہرام خاں کی مخالفت مول لے کر مجھے کس طرح اپنا سکتا تھا۔ عارج کے انسانی پیکر شہباز سے میری علیحدگی کا مطلب عیسیٰ خاں کی مخالفت مول لینا بھی ہوتا۔ عیسیٰ خاں اپنی یہ بے عزتی کس طرح برداشت کر لیتا کہ اس کے بیٹے کی بیوی اس کے گھر کی عزت ایک ادنیٰ کماں دار سے شادی کر لے۔

انہی خیالوں اور وسوسوں میں کچھ دن اور گزر گئے۔ اسحاق معمول کے مطابق ہر شام شمشیر زنی کی مشق کرانے حویلی میں آتا تھا۔ میری پریشانی اس سے چھپی نہ رہ سکی کیونکہ اب میں مشق میں پہلے جیسی دلچسپی نہیں لیتی تھی اور چپ چپ سی بھی رہتی تھی۔

ایک دن ہمت کر کے اسحاق نے مجھ سے میری پریشانی کا سبب پوچھ ہی لیا۔

اسحاق کے لہجے میں کچھ ایسی محبت تھی، ایسا خلوص تھا کہ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اچانک اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے بعد وہ جذبات سے مرتعش آواز میں مجھ سے کہنے لگا۔ ''بخدا......وہ......وہ شخص شہباز بہت ہی بدقسمت ہے۔ کاش......کاش میں آپ کیلئے کچھ کر سکتا۔''

میں نے ایک بار اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر اسحاق نے ہلکا سا دباؤ اور بڑھا دیا۔

اسحاق کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے اس بے بسی آواز میں کہا۔ ''اسحاق! میں بہت پریشان ہوں' خدا کیلئے کچھ کرو۔''

اسحاق کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ میں نے آج پہلی بار اس پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ اسے اپنا سمجھ کر کچھ کہا تھا' اس روز اندھیر پھیلنے تک میں پائیں باغ کے پرسکون گوشے میں اسحاق سے راز و نیاز کرتی رہی۔ عارج حسب معمول بہرام خاں کی حویلی میں تھا اور خدام اندرونی حصے میں تھے۔ یوں بھی جب میں شمشیرزنی کی مشق کر رہی ہوتی تو ملازمین ادھر نہیں آتے تھے۔

معاً اسحاق مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''بس ایک ہی صورت ہے کہ..... کہ کسی طرح آپ شہباز سے علیحدگی اختیار کر لیں۔''

''تمہارا مطلب یقیناً طلاق لینے سے ہے مگر وہ..... وہ مجھے طلاق نہیں دے گا..... اس کے علاوہ یہ کہ اگر اس نے مجھے طلاق دے بھی دی تو..... تو پھر..... پھر میں کہاں جاؤں گی؟''

میں نے دانستہ اور مصلحتاً یہ الفاظ استعمال کیے۔

''مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہیں مگر.....'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

کچھ دیر میں اس کے بولنے کی منتظر رہی' پھر پوچھا۔ ''مگر کیا؟''

''یہ..... یہ کہ..... میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔''

اسحاق نے جواب دیا۔ ''میری شادی ہو چکی ہے اور..... اور میں ایک بچے کا باپ ہوں..... آپ یقیناً ایسی صورت میں مجھے قبول نہیں کریں گی۔''

مجھے یہ سن کر دھچکا سا لگا کہ اسحاق شادی شدہ تھا مگر یہ صرف وقتی ردعمل تھا' جلد ہی میں پرسکون ہو گئی اور بولی۔ ''لیکن شادی شدہ تو میں بھی ہوں..... اور..... اور پھر تم دوسری شادی بھی تو کر سکتے ہو۔ تمہاری بیوی کو اس پر کوئی اعتراض.....''

''وہ تو کئی سال پہلے مر چکی ہے۔ میرے بیٹے الیاس کو جنم دیتے ہی وہ چل بسی تھی۔'' اسحاق بول اٹھا۔

میں نے یہ سن کر طویل سانس لیا۔ پھر میرے استفسار پر اسحاق نے اپنے بارے میں سب کچھ بیان کر دیا۔

اسحاق اور میں دیر تک موجودہ صورتحال سے نکلنے کی ترکیبوں پر غور کرتے رہے مگر ہمیں کوئی تدبیر قابل عمل نظر نہیں آئی۔

''یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دونوں یہ ملک چھوڑ دیں' کہیں کسی اور ملک میں جا بسیں۔'' آخرکار اسحاق نے ایک راہ نکالی۔

میں نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور بولی۔ ''یہ راہ بدنامی کی ہے جو مجھے پسند نہیں کیونکہ نہ ہم اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کریں۔ شہباز کی بدکرداریوں کے کئی ثبوت عدالت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے قاضی علیحدگی کی اجازت دے دے گا۔''

''یہ آپ کا خیال خام ہے۔'' اسحاق نے بے تکلفی سے کہا۔ ''کیا آپ نہیں جانتیں کہ بہرام خاں کتنا بااثر امیر ہے' فیصلہ ہمارے خلاف ہوگا۔''

میں سوچ میں پڑ گئی۔ عارج کے انسانی قالب شہباز سے شرعی طور پر علیحدگی اختیار کیے بغیر یہ ممکن نہیں تھا کہ میں کسی اور شخص کو اپنا لیتی۔ کچھ دن اسحاق اور میرے درمیان اس مسئلے پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخرکار مجھے سحاق کی ایک تجویز قبول کرنی ہی پڑی۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ جلد از جلد دہلی سے نکل کر آگرہ چلے جائیں گے۔ آگرہ میں اسحاق کے والدین' رشتے دار اور کچھ مخلص دوست تھے اسحاق کو یقین تھا کہ وہ سب اس کیلئے ہر معاملے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

میں ہر قدم بہت محتاط انداز سے اٹھا رہی تھی تاکہ میرا دشمن بہرام خاں چوکنا نہ ہو جائے۔ بہرام خاں کو ابھی میں اندھیرے ہی میں رکھنا چاہتی تھی اس لئے عارج کے انسانی قالب شہباز سے دانستہ طلاق نہیں لی۔

دو تین روز تک اسحاق اور میں رازداری کے ساتھ ضروری تیاریوں میں مصروف رہے۔

اب عارج سے فیصلہ کن بات کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ ایک شام جب وہ تیار ہو کر بہرام خاں کی حویلی جانے والا تھا تو میں نے اس کا راستہ روک لیا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا وہ سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''اپنے خلوت کدے میں واپس چل اے عارج! مجھے تجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

عارج کچھ کہے بغیر واپسی کیلئے مڑ گیا۔ اندر پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا۔ ''اے دینار! مجھے خبر ہے کہ تو مجھ سے بہت خفا ہے اور..... اور میں اس کی وجہ بھی جانتا ہوں مگر..... مگر تو ہی بتا کہ میں کیا کروں؟..... قصور اس انسانی قالب کا ہے اور سزا مجھے بھگتنی پڑ رہی ہے۔ میں..... میں تجھ سے سخت شرمندہ ہوں۔''

"میں تیری مجبوری سمجھتی ہوں اے عارج!" میں پرسکون آواز میں بولی۔ "میں تیری اس مجبوری کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیسے اے دینار!" عارج نے حیران کن آواز میں پوچھا۔

"اس کی ایک ہی تدبیر ہے کہ تو یہ جسم چھوڑ دے...... بدکردار شہباز کے انسانی قالب سے نکل آ۔" میں نے اسے بتایا۔

"تو کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں کسی انسانی قالب میں نہ رہوں؟...... مگر اس طرح کیا میرے لئے خطرہ......"

"تیرے لئے میں نے ایک اور انسانی قالب تلاش کر لیا ہے۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"کون ہے وہ؟" عارج نے سوال کیا۔

جواب میں عارج کو میں نے سب کچھ تفصیل کے ساتھ بتا دیا۔ عارج نے میری توقع کے مطابق آمادگی کا اظہار کر دیا۔

"اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ مجھے اسحاق کے قالب میں قرار بھی آتا ہے یا نہیں۔" عارج کہنے لگا۔

عارج کی یہ تشویش بھی اسی رات ختم ہو گئی۔ میرے ایما پر اس نے شہباز کا قالب چھوڑ دیا اور اسحاق کے جسم میں اتر گیا۔

پھر اسی رات ہم دونوں چپ چاپ دہلی سے نکل گئے اور آگرہ جا پہنچے۔ اسحاق کا جسم اپنا کر عارج بہت خوش تھا۔

تقدیر ہم پر مہربان تھی آگرہ پہنچنے کے چند روز بعد ہمیں ایک ایسی اطلاع ملی کہ دونوں خوش ہو گئے۔

ہوا یوں کہ جس رات ہم دہلی سے نکلے اس رات بادشاہ سلیم شاہ سوری کے حکم پر شاہی افواج کے سپہ سالار امیر احمد خان کو برطرف کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس کے خلاف یہ الزام تھا کہ وہ ہندوستان سے فرار ہو جانے والے مغل تاجدار ہمایوں سے خط و کتابت کرتا ہے اور ہمایوں کو اس نے دوبارہ ہندوستان آنے کی دعوت دی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ واقعی سپہ سالار اس سازش میں ملوث تھا یا اس کے بدخواہوں نے اسے پھنسوا دیا تھا۔

گزشتہ مقتول سپہ سالار امیر احمد خان کی جگہ ایک ایسا شخص عطا محمد افواج شاہی کا نیا سربراہ بنا جو عیسیٰ خاں کے علاوہ بہرام خاں کا بھی پرانا دشمن تھا۔ اس نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی

عیسیٰ خاں کو پٹنہ میں گرفتار کروا کر زنداں میں ڈلوا دیا۔ دہلی میں جن امراء کی گرفتاریاں نئے سپہ سالار عطا محمد کے حکم پر عمل میں آئی ان میں بہرام خاں بھی شامل تھا۔ یہ تمام ہی بدقماش امراء سابق سپہ سالار امیر احمد خاں کے مقربین میں شامل تھے۔

عارج نے جب یہ خبر مجھے سنائی تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ "تو کیوں اتنا خوش ہے اے عارج؟" میں نے جان کر انجان بن کے پوچھا۔

"کیا مجھے اس پر خوش نہیں ہونا چاہیے کہ ایک بار پھر تو میری بیوی بن جائے گی اے دینار!...... تو بھول گئی کیا؟...... تو نے ہی تو کہا تھا کہ میرے اس نئے انسانی پیکر اسحاق سے شادی کر لے گی۔"

"لیکن مجھے ابھی تیرے پچھلے انسانی قالب شہباز سے نجات تو نہیں ملی...... جب تک شرعی طور پر اس سے میری علیحدگی نہ ہو جائے' میں تجھ سے کس طرح شادی کر سکتی ہوں؟...... نکاح پر نکاح تو ممکن نہیں۔" میں نے عارج کو سمجھایا۔

"میں اس کا حل بھی سوچ چکا ہوں اے دینار!" عارج نے کہا۔

"وہ کیا...... مجھے بھی تو بتا۔" میں بولی۔

"تو عدالت میں شہباز کے خلاف دعویٰ دائر کر دے اے دینار!" عارج نے بتایا۔

"مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا تو یہی کہے گا۔" میں مسکرا دی۔

اگلے ہی روز میں نے آگرہ کی عدالت میں شہباز کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ عدالتوں پر اب عیسیٰ خاں کا کوئی اثر نہیں رہا تھا نہ بہرام خاں کا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے شہباز سے آزادی حاصل ہو گئی۔ اس فیصلے کے چند روز بعد مصلحتاً میں اور عارج ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔ شادی کی تقریب بہت سادہ تھی۔ تقریب میں اسحاق کے دوست اور صرف اس کے والدین شریک تھے۔

میرے لئے اس زمانے میں گویا یہ ایک نئی زندگی تھی۔ عارج کے پہلے انسانی قالب شہباز کی وجہ سے میں جس ذہنی اذیت کا شکار تھی وہ ختم ہو گئی۔ میرے شب و روز اتنے حسین' اتنے سہانے ہو گئے تھے کہ دہلی میں گزرے ہوئے دن اب بھولا بسرا خواب محسوس ہوتے تھے۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک روز اسحاق کے والدین ہمارے گھر آئے۔ ان کے ساتھ ہی اسحاق کا چار سالہ معصوم بیٹا الیاس بھی تھا۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ اسحاق کی ماں اب اکثر بیمار رہنے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ الیاس کی پرورش اب میں کروں۔ بڑی بی کا یہ کہنا کچھ

خلط بھی نہیں تھا۔ انسانی قالب کے ناطے میں بہر حال الیاس کی سوتیلی ماں تھی۔

الیاس مجھے بہت بھولا بھالا اور پیارا سا بچہ لگا۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر اب تک میں نے ماں کا کردار نہیں کیا تھا سو الیاس کی وجہ سے یہ کمی بھی پوری ہو گئی۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ عارج بھی الیاس سے محبت کرنے لگا غالباً یہ اس کے انسانی پیکر کا فطری تقاضا تھا۔ گھر میں الیاس کی آمد سے جیسے بہار سی آ گئی۔

اسحاق آگرہ کے حاکم کی محافظ سپاہ کا کماں دار تھا۔ ایک طرح سے اب بھی وہ بادشاہ سلیم شاہ سوری کے ملازموں میں شامل تھا۔ اس اسحاق کا جسم اب عارج کے تصرف میں تھا۔ فطری طور پر اسحاق ایک نیک آدم زاد تھا اس لئے عارج کی عادات سے مجھے اب کوئی شکایت نہیں تھی۔ حالات سے اب میں پوری طرح مطمئن تھی پھر بھی دارالحکومت دہلی سے غافل نہیں رہتی تھی۔

دہلی سے انہی دنوں ایک خبر آئی کہ سلیم شاہ سوری سخت بیمار ہو گیا۔ چند ہی روز بعد اس کے انتقال کی خبر بھی آگرہ پہنچ گئی۔

اپنی زندگی میں سلیم شاہ سوری اکثر اپنی بیوی بی بی بائی سے کہا کرتا تھا اگر تجھے اپنے بیٹے فیروز خاں کی جان پیاری ہے تو مجھے اجازت دے کہ میں تیرے بھائی مبارز خاں کا کام تمام کر دوں۔ اگر بھائی کی محبت غالب ہے تو تیری مرضی جو کچھ ہوتا ہے تیرے سامنے آئے گا۔

بی بی بائی کا بھائی مبارز خاں شیر شاہ سوری کا بھتیجا ہوتا تھا۔ اس کے انداز بتاتے تھے کہ وہ سلطنت کا خواہش مند ہے۔ سلیم شاہ سوری سے بھی یہ بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔ بی بی بائی ان باتوں کو بدگمانی پر محمول کر کے اپنے بھائی کی پاس داری کرتی رہتی تھی۔

جب سلیم شاہ سوری کا انتقال ہو گیا تو امیروں نے فیروز خاں کو تخت پر بٹھا دیا کیونکہ یہ جانشین اور ولی عہد تھا۔ فیروز خاں کی تخت نشینی کے تیسرے دن مبارز خاں اپنے آدمیوں کو لے کر فیروز خاں کے قتل کا ارادہ کر کے محل میں گھس آیا۔

فیروز خاں کی ماں بی بی بائی کو جب یہ معلوم ہوا تو دوڑتی ہوئی بھائی کے پاس آئی اور روتے ہوئے اپنے بیٹے کی جان بخشی کیلئے فریاد کرنے لگی۔ اس نے مبارز خاں سے کہا۔ ''مجھے اور میرے بیٹے فیروز خاں کو تم کسی دور دراز ملک چلا جانے دو یا پھر قید خانے میں ڈلوا دو۔''

مبارز خان ان سنگدل آدم زادوں میں سے تھا جن کے نزدیک کوئی رشتہ محترم نہیں ہوتا۔ اس پر بہن کی التجاؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بی بی بائی اس قدر روئی کہ ظالم مبارز خاں کا

دامن آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ اسے اپنے مرحوم شوہر سلیم شاہ سوری کی باتیں یاد آ رہی تھیں جو مبارز خاں کو ناپسند کرتا تھا اور مستقبل کیلئے خطرہ سمجھتا تھا۔

''میرا دامن چھوڑ دے بی بی بائی!'' مبارز خاں نے سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھٹکا دیا۔

بی بی بائی دور جا گری۔ اسی وقت مبارز خاں کے آدمی فیروز خاں کو پکڑ لائے۔ پھر مبارز خاں نے دیر نہیں کی اور اپنے سگے بھانجے کا سر قلم کر دیا۔ بیٹے کے اس انجام کو بی بی بائی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جیسے پتھر کی ہو گئی۔

اس واقعے کے بعد مبارز خاں محمد شاہ عادل کے خطاب سے تخت دہلی پر بیٹھ گیا۔ دہلی کے عوام نے اس کے خطاب عادل کو بدل کر عدلی شاہ کر دیا کیونکہ کسی عادل سے بے گناہ خون ممکن نہیں۔ مبارز خاں اسی نام سے مشہور ہوا۔

عارج اور میرے لئے اقتدار کی اس تبدیلی میں ایک بات تشویشناک تھی۔ عدلی شاہ نے برسر اقتدار آتے ہی جن امراء کو زنداں سے نکال کر اپنی مجلس مشاورت میں شامل کیا تھا اور انہیں مختلف ذمہ داریاں سونپی تھیں ان میں عیسیٰ خاں اور بہرام خاں بھی تھے۔ بہرام خاں کا دوبارہ اقتدار میں آ جانا عارج اور میرے لئے باعث تشویش تھا۔

اب ہمیں ہر لحہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ بہرام خاں ہمارے خلاف کوئی انتقامی کارروائی ضرور کرے گا مگر خلاف توقع ایسا نہیں ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد ہم دونوں یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ بہرام خاں ہمیں بھول چکا ہوگا۔

عدلی شاہ کو عنان حکومت سنبھالے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ جو فتنے دب گئے تھے از سر نو اٹھ کھڑے ہوئے۔ شیر شاہ سوری کے بیٹے عادل خاں کے برادر نسبتی ابراہیم خاں نے بھی بغاوت کر دی۔ وہ لشکر فراہم کر کے بیانہ کی طرف چلا گیا۔ بیانہ پر اس کی موروثی حکومت تھی اس لئے بیانہ کو اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا اور اطراف میں لوٹ مار کرنے لگا۔ اس اطلاع پر عدلی شاہ نے ہیموں کی سرکردگی میں ایک لشکر بیانہ روانہ کیا۔

عارج کے انسانی پیکر اسحاق کیلئے بھی حکم ہوا کہ وہ شاہی سپاہ کے ساتھ جائے۔ جب عارج نے مجھے یہ خبر دی تو میں فکرمند ہو گئی۔ جنگ بہر حال جنگ ہوتی ہے' عارج کو کوئی بھی خطرہ پیش آ سکتا تھا' ماضی میں بھی ایسی صورت پیش آ چکی تھی۔

''میری مان اے عارج!'' تو کچھ عرصے کیلئے اس جسم سے نکل آ'' میں نے مشورہ دیا۔

"اے دینار! تو بلاوجہ گھبرا رہی ہے۔" عارج کہنے لگا۔ "کوئی خطرہ دیکھا تو میں اسحاق کے انسانی قالب کو چھوڑ دوں گا۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ مجھے تیری اور الیاس کی بہت یاد آئے گی۔" عارج کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ...... کہ میں ... الیاس کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں؟"

میں نے بے یقینی اور حیرت سے عارج کو دیکھا اور بولی۔ "میدان جنگ میں بھلا بچوں کا کیا کام؟"

عارج نے جواباً کہا۔ "تو فکرمند نہ ہو اے دینار! میں الیاس کا پورا خیال رکھوں گا۔ تجھے خبر ہے کہ میں اسے کتنا چاہتا ہوں۔ الیاس میرے پاس ہو گا تو مجھے تیرا فراق بھی گراں نہیں گزرے گا۔" پھر عارج نے مجھے یقین دلایا۔ "میں اپنی جان سے بڑھ کر الیاس کی خبرگیری رکھوں گا' خادموں کی نگرانی میں الیاس خیمے کے اندر رہے گا' اسے میدان جنگ میں نہیں لے جاؤں گا۔"

میں دل سے اس بات پر آمادہ نہیں تھی مگر مجھے عارج کے انسانی قالب اسحاق اور الیاس کے رشتے کا بھی علم تھا۔ یہ محبت فطری تھی جس پر پابندی لگانا مجھے بے رحمی محسوس ہوا۔ خود میں بھی الیاس کی عادی سی ہو گئی تھی پھر بھی دل پر پتھر رکھ کر اس کی جدائی سہنے کو تیار ہو گئی جس دن الیاس کی پیشانی پر بوسہ دے کر میں اسے رخصت کر رہی تھی تو میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

آخری بار میں نے عارج کو منع کیا کہ الیاس کو اپنے ساتھ نہ لے جائے مگر وہ نہیں مانا۔ اس نے مجھے دلاسا دیا اور رخصت ہو گیا۔ میں بالائی منزل پر کھڑی نم آلود آنکھوں سے عارج اور الیاس کو دور تک جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ میں اس وقت تک وہیں کھڑی رہی جب تک ان کے گھوڑوں کی گرد بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ عارج کے ساتھ اس کے خادم بھی تھے۔

آنے والے دن میرے لئے بہت کٹھن اور اداس تھے۔ میں شب و روز عارج اور الیاس کی سلامتی کیلئے دعائیں مانگتی اور بے تابی سے ان کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ میں دانستہ اپنے تصور کی قوت کو بروئے کار نہیں لا رہی تھی۔ میں اگر ایسا کرتی تو میری بے چینی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

کچھ دن بعد خبر آئی کہ شاہی فوجوں نے باغیوں کو شکست دے دی اور ابراہیم خاں مقابلے سے فرار ہو گیا۔ اس خبر سے مجھے اطمینان ہوا۔ پھر بھی ایک عجیب سی بے چینی تھی جو

ہمہ وقت میرے دل و دماغ کو پریشان کیے رہتی تھی۔

میں ہر روز چھت پر چڑھ کر دور سے آنے والے قافلوں کی راہ تکا کرتی تھی لیکن کافی دن گزر جانے کے بعد بھی عارج اور الیاس لوٹ کر نہ آئے۔ مجبوراً مجھے اپنے تصور کی قوت استعمال کرنی پڑی اور اس پر بہت پچھتائی۔ میں نے عارج کے انسانی قالب اسحاق کا پہلے تصور کیا' خلاف توقع مجھے اس میں ناکامی ہوئی۔ میری چشم تصور اسے نہ دیکھ سکی۔ پھر آنکھیں دوبارہ بند کر کے میں نے الیاس کے خدوخال اپنے ذہن میں تشکیل دیئے۔ اس بار بھی سناٹا اور اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا تو میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

میرے تصور کی قوت ناکام ہونے کا ایک ہی سبب ممکن تھا کہ میں جن کو دیکھنا چاہتی ہوں وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یہ سوچنا بھی میرے لئے بہت روح فرسا تھا۔ ہو سکتا ہے میرے تصور کی پراسرار قوت کسی وجہ سے کام نہ کر رہی ہو' میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

میں اسی بے چینی کے عالم میں تھی کہ آخر ایک روز عارج کے ساتھ جانے والے دونوں خادم زخمی حالت میں واپس آ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں ننگے پاؤں چھت سے دوڑتی ہوئی نیچے آئی اور ان خادموں کے سامنے پہنچ گئی۔

"تمہارا آقا کہاں ہے؟" میں نے پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان ان سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟...... اور الیاس...... وہ کہاں ہے؟"

خادموں نے سر جھکا لیا۔ ان میں سے ایک کا نام رحمان تھا۔ وہ غمزدہ آواز میں بولا۔ "ہمیں افسوس ہے مالکہ کہ......"

مجھ پر یہ سنتے ہی سکتہ طاری ہو گیا۔ میں دیر تک وحشت کے عالم میں خادموں کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر جانے کیسے یہ الفاظ میری زبان پر آ سکے۔ "کیا وہ جنگ میں......"

خادموں نے نفی میں سر ہلا دیا اور نگاہیں جھکا لیں۔

آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کو میں نے بمشکل روکا اور چیختے ہوئی بولی۔ "پھر کیا ہوا؟ کس نے مارا انہیں؟...... مجھے بتاؤ کہ کس بدبخت نے انہیں مجھ سے چھین لیا؟"

غم سے بوجھل آواز میں خادموں نے جو واقعہ بیان کیا وہ یہ تھا کہ فتح کے بعد جب ایک رات جشن منا کر شاہی سپاہ بے خبر سو رہی تھی۔ خادموں نے عارج کے خیمے سے کسی کے چیخنے کی آواز سنی۔ وہ فوراً اٹھ کر عارج کے خیمے میں پہنچے تو دیکھا کہ کچھ مسلح افراد ان کے آقا کو زمین پر گرا کر ذبح کر رہے تھے۔ کمسن الیاس عارج کو بچانے کیلئے اس سے لپٹ گیا تو ظالموں نے اس کو بھی برچھیوں سے چھید دیا۔ خادموں نے مقابلے کی کوشش کی مگر حملہ آور تعداد میں

بہت زیادہ تھے' وہ اپنے آقا اور آقازادے کو نہ بچا سکے۔ حملہ آور جن میں سے بیشتر اپنے چہروں پر نقاب چڑھائے ہوئے تھے' رات کے اندھیرے میں فرار ہو گئے۔ خادموں نے یہ بھی بتایا کہ وہ ان حملہ آوروں کو پہچانتے ہیں وہ سب بہرام خاں کے دستے کے سپاہی تھے۔

☆......☆......☆

بہرام خاں کا نام سنتے ہی میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''بہرام خاں! اب تو مجھ سے نہیں بچ سکے گا!...... میں تجھ سے انتقام ضرور لوں گی اور تجھے اپنے ہاتھوں سے ذبح کروں گی۔''

کچھ دیر سے مجھے ایک آشنا و مانوس مخصوص خوشبو اپنے قریب محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے کئی بار جھٹک دیا کیونکہ میرے نزدیک ایسا ممکن نہیں تھا۔ پھر جب نوجوان خادم رحمان نے مجھے ایک اشارہ کیا تو میں نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ اشاروں کی یہ زبان عارج اور میری ہی وضع کردہ تھی۔ کوئی تیسری ہستی اس سے واقف نہیں تھی۔ جب عارج اور میں عفریت وہموش کی قید میں تھے تو ہم نے اشاروں کی یہی زبان استعمال کی تھی۔

پھر دوسرے خادم کو تو میں نے رخصت کر دیا اور نوجوان رحمان کو روک لیا اب نشست گاہ میں اس کے اور میرے سوا کوئی نہیں تھا۔

''خدا کا شکر ہے اے عارج کہ تو زندہ ہے۔'' میں نے نوجوان رحمان کو مخاطب کیا۔ ''مجھے تیرے وجود کی مخصوص خوشبو خاصی دیر سے محسوس ہو رہی تھی مگر میں اسے اپنا وہم سمجھ رہی تھی...... یہ بتا کہ تو نے اشارہ کرنے میں اتنی دیر کیوں کی؟''

''مجھے پورا یقین تھا اے دینار کہ تو میرے وجود کی خوشبو پہچان لے گی۔ جب ایسا نہیں ہوا تو مجبوراً میں نے اشاروں کی زبان استعمال کی۔ تو شاید شدید صدمے کے اثر میں تھی۔'' عارج نے کہا جو اب نوجوان خادم رحمان کے جسم میں تھا پھر اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتی عارج اداس آواز میں کہنے لگا۔ ''مجھے بڑا رنج ہے اے دینار کہ اپنی جان بچاتے ہوئے میں معصوم الیاس کو نہ بچا سکا۔''

''ہوا کیا تھا؟ مجھے تفصیل سے بتا۔'' میں بولی۔

''اے دینار! اس واقعے کے بعد ایک بات تو واضح ہو چکی ہے کہ ہم غلط فہمی کا شکار تھے۔'' عارج نے کہا۔ ''ہم اپنے دشمن بہرام خاں کی طرف سے غافل ہو گئے لیکن وہ ہمیں

نہیں بھولا۔ اس نے ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھی اور موقع ملتے ہی وار کر دیا' خیر...... اب اس نے ہمیں اپنی جانب سے چوکنا کر دیا ہے...... اس رات جو کچھ ہوا اس کی وجہ بے خبری تھی' خدا کو میری زندگی بچانی تھی اس لئے میں خفیف سے کھٹکے سے بیدار ہو گیا ورنہ خیمے کے اندر گھس آنے والے مسلح افراد نیند کی حالت ہی میں مجھے ذبح کر دیتے۔ آنکھ کھلتے ہی میری نظر حملہ آوروں پر پڑی تو میں اچھل کر کھڑا ہو گیا مگر انہوں نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ چاروں طرف سے مجھے گھیر کر انہوں نے زمین پر گرا لیا' وہ مجھے ذبح کرنا چاہتے تھے۔ یہی وہ سنسنی خیز لمحات تھے کہ جب میں نے اسحاق کے انسانی قالب کو چھوڑ دیا۔ اسحاق کے جسم سے نکلتے ہی میری پہلی نظر خیمے میں داخل ہونے والے خادموں پر پڑی۔ فوری طور پر میں نوجوان خادم رحمان کے جسم میں اتر گیا۔ اسی دوران میں حملہ آوروں نے الیاس اور اسحاق دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ مجھے رحمان کے جسم میں قرار آ گیا تو میں نے اسی کے اندر رہنے کا فیصلہ کر لیا۔''

عارج خاموش ہوا تو میں بولی۔ ''بہرام خاں اپنی چال چل چکا اور اب میری باری ہے۔''

''تو کیا کرے گی اے دینار؟'' عارج نے دریافت کیا۔

''تجھے خود معلوم ہو جائے گا۔'' نے جواب دیا۔

☆......☆......☆

ہر طرف سکوت اور اندھیرے کا راج تھا۔ میرے جسم پر سیاہ لباس تھا جو اندھیرے کا حصہ بنا ہوا تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ بہرام خاں کی حویلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ حویلی کے عقب میں پہنچ کر میں نے عقبی دیوار کے ایک کنگورے پر کمند ڈالی۔ میں پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہو گئی اور پھر کمند کی مدد سے اوپر چڑھنے لگی۔ چھت پر پہنچ کر میں ایک زینے کے ذریعے نچلی منزل پر آ گئی۔ میں بہت چوکنا اور مستعد تھی' اب میں نے نیام سے تلوار بھی نکال کر ہاتھ میں لے لی تھی۔

ستونوں کی آڑ لیتی ہوئی میں آگے ہی بڑھتی رہی۔ وہاں مجھے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ حویلی کے پہریدار غالباً عمارت سے باہر تھے اور شاید خواب غفلت میں تھے۔ میں ایک دروازے پر پہنچ کر رک گئی اور سن گن لینے لگی۔ اندر سے مدھم سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں اور روشنی تھی۔ میں کان لگا کر یہ سرگوشیاں سننے لگی۔

''خدا کیلئے مجھے چھوڑ دیجئے۔'' یہ ایک نسوانی آواز تھی۔ ''مجھ پر رحم کیجئے۔'' اس آواز میں خوف بھی تھا اور التجا بھی۔

جواب میں مجھے جانی پہچانی ہنسی کی آواز سنائی دی' پھر کہا گیا۔ ''جتنی چاہو چیخو چلاؤ' تمہیں یہاں بچانے کوئی نہیں آئے گا۔''

میں نے اسی وقت دروازے پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں قریبی دریچے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ دریچے میں تھوڑی سی جھری تھی' اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ میں ایک ہی جست میں دریچے پر چڑھ گئی اور پھر اندر کودنے میں دیر نہیں کی۔ اندر کا منظر دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا' وہاں میں نے سہمی ہوئی ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا' یقیناً یہ وہی تھی' میں نے جس کی التجا آمیز سرگوشیاں سنی تھیں۔ میں کمرے میں کودی تو بہرام خاں تیزی سے میری طرف مڑا۔

''کون...... کون ہو تم؟'' بہرام خاں بمشکل بولا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اسے میرے ہاتھ میں شمشیر برہنہ نظر آ گئی تھی' اس کی نظریں تلوار پر جمی ہوئی تھیں۔

''میں تمہاری موت ہوں بہرام خاں۔'' میری آواز میں بلا کی تلخی تھی۔

''مہرالنسا!'' بہرام خاں میری آواز پہچان کر چیخ اٹھا۔ میرا چہرہ نقاب کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

''ہاں مہرالنسا!...... تمہاری موت!...... مگر میں تمہیں آسانی سے نہیں مرنے دوں گی' تڑپا تڑپا کر ماروں گی۔ تمہارے جسم کا میں ایک ایک عضو کاٹوں گی' وہ بھی ایک ساتھ یا ایک وقت میں نہیں۔''

''نہیں'' بہرام خاں مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر ہاتھ اٹھا کے چیخا۔ ''خدا کیلئے میری جان بخش دو۔''

''ابھی یہ مظلوم لڑکی بھی تم سے رحم کی التجا کر رہی تھی' تمہیں خدا کا واسطہ دے رہی تھی' کیا تم نے اس کی آواز پر کان دھرے۔'' میری آواز میں بڑی چبھن تھی' اب بھی میں قدم قدم بہرام خاں کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''میں اس لڑکی کو رہا...... آزاد کر دوں گا مگر تم...... تم میری دشمن کیوں بن گئی ہو۔''

''یہ سوال اپنے آپ سے کر بزدل شخص!'' میں اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ''سن میں تجھ سے معصوم الیاس اور بیگناہ اسحاق کا انتقام لینے آئی ہوں جنہیں ایک رات تو نے اپنے سپاہیوں سے قتل کرا دیا تھا۔''

''تمہیں...... مہرالنسا...... تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے' میں...... میں نے انہیں قتل نہیں کیا۔''

"جھوٹ بولتا ہے کمینے!" میں بولی۔ اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ بلند ہوا اور بہرام خاں چیخ اٹھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ تلوار کی ضرب سے بچنے کیلئے بلند کر دیئے' اگر میرے ارادوں کا علم ہوتا تو شاید ایسا نہ کرتا۔

پھر چشم زدن میں بہرام خاں کا بایاں ہاتھ کٹ کر الگ جا گرا۔ اس کے بازو سے خون کا فوارہ چھوٹنے لگا۔

بہرام خاں چیخ مار کر گرا اور بیہوش ہو گیا' نوجوان لڑکی اب تک سہمی ہوئی اور دہشت زدہ سی ایک طرف کھڑی تھی۔ میں نے تلوار نیام میں رکھی اور لڑکی سے مخاطب ہوئی۔ "ادھر آؤ..... خود کو سنبھالو' تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

ابھی میری بات ختم ہوئی تھی کہ بہت سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگی۔ وہ آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ یہ اس حویلی کے پہریدار ہی ہو سکتے تھے۔

پہریداروں نے یقیناً بہرام خاں کی تیز چیخ سن لی تھی۔

اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس حواس باختہ لڑکی کے قریب آنے کا انتظار کرتی۔ میں نے اس کے پیر کانپتے دیکھ لئے تھے' اس نے اپنی جگہ سے ذرا سی حرکت بھی نہیں کی تھی۔

اس لڑکی کو نظر انداز کر کے میں تیزی سے دریچے کی طرف لپکی اور دوسری طرف کود گئی۔

باہر آتے ہی مجھے ایک طرف سے بہت سے پہریدار آتے دکھائی دیئے' ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں اور وہ سب مسلح تھے' زینے تک پہنچنا اب ممکن نہیں تھا۔ میں انتہائی سرعت سے ایک ستون کی آڑ میں ہو گئی پھر جب پہریدار بھاگتے ہوئے میرے قریب سے گزر گئے تو میں ستون کی آڑ سے نکلی اور تیزی سے اس جانب لپکی جدھر زینہ تھا۔

میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میرے قدموں کی چاپ سنائی نہ دے پھر بھی نہ جانے کیسے کسی نے مجھے دیکھ لیا۔

"وہ ادھر کوئی بھاگ رہا ہے۔" مجھے دیکھنے والا پہریدار چیخا۔

اس پہریدار کے الفاظ سنتے ہی میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اب پہریدار میرا تعاقب کر رہے تھے۔ میں پوری قوت سے زینے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ پہریداروں کے اپنے قریب آنے تک میں زینے تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔

پھر جب تک پہریدار مجھ تک پہنچتے میں زینے تک پہنچ گئی۔ زینے کی سیڑھیاں چڑھ

کر میں نے چھت پر پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ اوپر پہنچتے ہی میں نے نہایت ہوشیاری سے زینے کے دونوں پٹ بھیڑ کر زنجیر لگا دی۔ اس کے بعد میں دوڑتی ہوئی اس دیوار کے اس کنگورے تک پہنچی جس پر کمند ڈالی تھی۔

اب مجھے اس حویلی کے پہریداروں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ زینے کا دروازہ بہت مضبوط تھا۔ اسے توڑنا آسان نہ تھا۔ میں بہت اطمینان سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ میں نے بہرام خاں سے انتقام کی پہلی قسط وصول کر لی تھی۔

میں اچھی طرح جانتی تھی کہ بہرام خاں جوابی کارروائی ضرور کرے گا۔ اس بنا پر میں نے اسحاق کے گھر کو ایک روز پہلے ہی خیر باد کہہ دیا تھا۔ عارج نے مجھے بالکل صحیح مشورہ دیا تھا۔ وہ میرے ایک وفادار نوجوان خادم رحمان کے انسانی قالب میں پناہ لے چکا تھا۔ جب میں نے اس سے اسحاق کے گھر میں خطرے کا اظہار کیا تو وہ بولا۔ "اے دینار! تیری سکونت کیلئے اب میرے انسانی قالب رحمان کا گھر مناسب و محفوظ رہے گا اور یوں میں تیرے ساتھ بھی رہ سکوں گا۔"

"تیرا مشورہ درست ہے اے عارج!" میں راضی ہو گئی۔

دوسرے ہی دن مجھے یہ خبر مل گئی کہ بہرام خاں کے سپاہیوں نے اسحاق کے مکان پر دھاوا بول دیا تھا۔ وہاں سے میں ہر قیمتی شے ہٹا چکی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ سپاہیوں نے میری تلاش میں ناکام ہونے پر مکان کو آگ لگا دی تھی۔ اس سے شاید ان کا مقصد یہ تھا کہ میرے لئے کوئی جائے پناہ نہ رہے' پھر وہ بآسانی مجھے ختم کر سکیں۔

بہرام خاں عدلی شاہ کے معتبر امیروں میں سے ایک تھا اس لئے مجھے سرکاری طور پر مفرور ملزمہ قرار دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ یہ اعلان بھی کرایا گیا کہ جو بھی مجھے گرفتار کرائے گا یا میرے بارے میں کوئی اطلاع دے گا اسے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ یہ انعام اتنا غیر معمولی اور بڑی رقم کا تھا کہ کوئی بھی شخص لالچ میں آ سکتا تھا مگر میرے خادم نمک حرام نہیں تھے۔ انہوں نے حق نمک ادا کیا اور میری مدد کرتے رہے۔ انہی کے ذریعے مجھے بہرام خاں کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اب میں آگرہ سے دہلی آ چکی تھی۔

چند ہفتوں کے بعد مجھے خبر ملی کہ بہرام خاں صحت یاب ہو چکا ہے گو وہ ایک ہاتھ سے محروم ہو چکا تھا مگر حسب معمول پھر دربار میں جانے لگا ہے۔ مجھے جب یہ اطلاع ملی تو میں نے خلوت میسر آتے ہی عارج سے کہا۔ "اب وقت آ گیا ہے اے عارج کہ میں بہرام خاں سے اپنے انتقام کی دوسری قسط وصول کروں۔" یہ کہہ کر میں رازدارانہ لہجے میں عارج کو مختلف

ہدایات دینے لگی۔

''ایسے معاملات میں تیرا دماغ بہت چلتا ہے اے دینار!'' عارج کہنے لگا۔

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے گلے سے ایک ہار اتارا اور عارج کے حوالے کر دیا۔ اس ہار میں بہت قیمتی موتی جڑے ہوئے تھے۔ میری ہدایات کے مطابق عارج اسی روز بہرام خاں کی حویلی کے محافظ اعلیٰ سے ملا۔ مجھے پتہ تھا کہ اب میں دوبارہ بآسانی بہرام خاں کی حویلی میں داخل نہیں ہو سکتی اس لئے ضروری تھا کہ حویلی کے نگران کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔

حسب توقع نگران ایک لالچی آدم زاد نکلا۔ میرا ہار اتنا کم قیمت نہ تھا کہ وہ اسے نظر انداز کر دیتا۔ میں نے عارج کو وہ ہار اسی غرض سے دیا تھا۔ عارج نے واپس آ کر مجھے کامیابی کی نوید دی۔

یہ اسی رات کا واقعہ ہے۔ رات گئے اچانک بہرام خاں کی حویلی کے بائیں باغ میں چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق حویلی کا نگران تمام محافظوں کو اپنے ساتھ لے کر اس طرف چلا گیا

ہنگامہ کرنے والے میرے ہی بھیجے ہوئے خدام تھے جو محافظوں کو ادھر آتا دیکھ کر فرار ہو گئے۔

یہی وہ وقت تھا جب میں خاموشی سے بہرام خاں کی حویلی میں داخل ہو گئی۔ میں وہاں پہلے سے موجود تھی اور اسی وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ حویلی کے اندر کوئی محافظ نہیں۔ یہ اطمینان میرے لئے کافی تھا۔ میں تیزی کے ساتھ بہرام خاں کی خوابگاہ کی طرف بڑھی۔ مجھے توقع تھی کہ بائیں باغ میں ہونے والی چیخ و پکار اور ہنگامے سے بہرام خاں کی آنکھ بھی کھل گئی ہو گی۔ حویلی کے نگران سے عارج کو پتہ چلا تھا کہ بہرام خاں اب اپنی خواب گاہ کے سارے دریچے اور دروازے بند کر کے سوتا ہے خواب گاہ سے اس کے باہر آنے کی دو ہی صورتیں ممکن تھا۔ ایک صورت یہ کہ وہ خود حقیقت حال جاننے کی خاطر خواب گاہ کا دروازہ کھول کر باہر آ جاتا۔ دوسری صورت یہ کہ خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی جاتی ایسی صورت میں بھی وہ دروازہ ضرور کھولتا کہ دیکھے دستک دینے والا کون ہے۔

مجھے بہر حال دستک دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بہرام خاں خود ہی تجسس سے مجبور ہو گیا اور دروازہ کھول کے باہر آ گیا۔ میں قریب ہی ایک ستون کی آڑ میں چھپی ہوئی تھی۔ جیسے ہی بہرام خاں باہر آیا میں ستون کی اوٹ سے نکلی اور اس پر جھپٹ پڑی۔ میرا حملہ

بہرام خاں کیلئے اتنا غیر متوقع تھا کہ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ حواس باختہ ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ آج رات بھی میرے جسم پر سیاہ لباس تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک آب دار خنجر چمک رہا تھا۔

''آج میں تجھ سے انتقام کی دوسری قسط وصول کرنے آئی ہوں بہرام خاں!'' میں نے بلند آواز سے کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ بہرام خاں میرا اندازہ بھانپتا میں نے چشم زدن میں خنجر اس کی آنکھ میں اتار دیا۔ بہرام خاں چیخ مار کر فرش پر گر گیا اور کرب اور اذیت سے تڑپنے لگا۔ میں نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور زینے کی سمت بڑھتے ہوئے اونچی آواز میں بولی۔ ''میں پھر آؤں گی بہرام خاں! میرا انتظار کرنا۔''

حویلی کے عقب میں عارج میرے لئے کمند ڈال چکا تھا۔ منصوبے کے مطابق اب حویلی کا نگراں محافظوں کو ساتھ لئے حویلی کے اندر چلا آیا تھا۔ اس نے محافظوں سے کہا تھا کہ شاید حملہ آور حویلی کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ اس نے بہرام خاں کی چیخ سن کر یقیناً یہ اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میں اپنا کام کر چکی ہوں۔ محافظوں کو بھی اس نے بہرام خاں کی چیخ کی طرف متوجہ کیا تھا۔ جب حویلی کا نگراں اور محافظ بہرام خاں کی خواب گاہ کی جانب دوڑ رہے تھے تو میں حویلی کی چھت پر پہنچنے کے لئے زینہ پر چڑھ رہی تھی۔ بہرام خاں کی حویلی سے نکلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ حویلی سے نکل کر میں تیزی سے اپنی خفیہ پناہ گاہ کی جانب روانہ ہو گئی۔

حویلی کے نگران کے ذریعے میں اپنے دشمن بہرام خاں کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ عارج اس سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ اور ایک آنکھ سے محروم ہونے کے بعد بہرام خاں کے دل میں میری دہشت بیٹھ چکی تھی۔ وہ اچھی طرح جان چکا تھا کہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ بچاؤ کی صورت اسے یہی نظر آ رہی تھی کہ کچھ عرصے کیلئے روپوش ہو جائے۔

''میں نے پتہ لگانے کی کوشش کی ہے اے دینار کہ بہرام خاں دہلی سے کہاں جانے والا ہے مگر ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہوا۔''

میرے استفسار پر عارج نے مجھے بتایا۔ پھر مزید یہ کہا۔ ''بہرام خاں اپنے نگران پر بڑا بھروسہ کرتا ہے لیکن اسے بھی ابھی کچھ نہیں بتایا۔''

''اے عارج! اگر وہ کہیں روپوش ہو گیا تو اسے تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ میں اسے تلاش کرنے کیلئے اپنی جناتی صفات استعمال کرنا نہیں چاہتی۔ تو جانتا ہے کہ اس طرح

بوڑھا عفریت دھوش میری راہ پر لگ سکتا ہے۔'' میں بولی۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ ایک رات بہرام خاں خاموشی کے ساتھ دہلی سے نکل گیا۔ دوسرے دن اس کی حویلی خالی پائی گئی۔ اس کے بارے میں کسی کو خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں گیا ہے۔

بہرام خاں کی روپوشی کے متعلق مجھے عارج ہی نے بتایا تو میں نے کہا۔ ''میں تو اس کی صحت یابی کا انتظار کر رہی تھی تا کہ اس سے اپنے انتقام کی تیسری قسط وصول کر سکوں اور وہ فرار ہو گیا۔'' میری آواز میں تاسف تھا۔ ''دیکھتی ہوں کہ وہ مجھ سے کہاں بھاگ کر جائے گا۔ میں نے بھی طے کر رکھا ہے کہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔''

پھر میں نے اپنے تمام خادموں کو اس کام پر مامور کر دیا کہ وہ بہرام خاں کے موجودہ ٹھکانے کا سراغ لگائیں۔ اس کے علاوہ میں خود بھی بھیس بدل کر بہرام خاں کے جاننے والوں سے اس بات کی ٹوہ لیتی رہی کہ وہ بزدل شخص کہاں روپوش ہوا ہے۔ میں ہر قیمت پر بہرام خاں کا سراغ لگانا چاہتی تھی۔ وہ بہر حال اسحاق اور معصوم الیاس کا قاتل تھا۔

کئی مہینوں کی صبر آزما دوڑ دھوپ کے بعد مجھے علم ہو گیا کہ بہرام خاں میرے انتقام سے ڈر کر ہندوستان کے ایک دور دراز علاقے کی طرف فرار ہوا ہے۔ ایک دو مرتبہ مجھے یہ خیال آیا کہ میں انتقام کا ارادہ ترک کر دوں لیکن اسحاق اور کمسن الیاس کی خون میں ڈوبی ہوئی تصویریں میرے تصور میں آ موجود ہوتیں اور میرا جذبۂ انتقام پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔

آخر کار میں نے عارج کو بہرام خاں کے تعاقب میں سندھ کی جانب روانہ کر دیا۔ بہرام خاں کے بارے میں بھی خبر ملی تھی کہ وہ سندھ گیا ہے۔ عارج کو روانہ کر کے خود بھی طویل سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔

اسی دوران میں مجھے اپنے انسانی قالب مہرالنسا کے سوتیلے باپ خواص خاں کے انتقال کی خبر ملی۔ میں بہ وجوہ سسرام روانہ ہو گئی۔ مہرالنسا کے سوا خواص خاں کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اس نے تمام تر جائیداد مہرالنسا کے نام کی تھی۔

سسرام پہنچ کر میں نے خواص خاں کی ساری جائیداد، زمین اور باغات فروخت کر دیئے پھر دہلی واپس آ گئی۔ اب میرے پاس اتنی دولت جمع ہو چکی تھی کہ میں بڑی سہولت کے ساتھ ایک مدت دراز تک نہ صرف عیش و عشرت سے اپنی زندگی بسر کر سکتی تھی بلکہ بہرام خاں کے تعاقب میں دور دراز علاقوں کا سفر بھی میرے لئے ممکن تھا۔

کچھ عرصے کے بعد عارج بھی سندھ سے واپس آ گیا جسے میں نے بہرام خاں کے تعاقب میں روانہ کیا تھا۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی کہ عارج ناکام نہیں لوٹا تھا۔ عارج نے مجھے بتایا کہ بہرام خاں سندھ کے ایک ساحلی شہر بھنبھور میں چھپا ہوا ہے۔ عارج کو یہ سراغ لگانے میں یوں بھی آسانی ہوئی تھی کہ اس چھوٹی سی بستی میں بہرام خاں ہی باہر کا آدمی تھا۔ بہرام خاں دہلی سے اپنے ساتھ بہت مال و متاع اور خادموں کی بڑی تعداد کو لے کر سندھ گیا تھا۔ سندھ کے باشندے اسی لئے اسے کوئی جلاوطن شہزادہ سمجھتے تھے۔

میں نے عارج کی گفتگو سن کر اطمینان کا سانس لیا اور پرعزم لہجے میں کہا۔ ''شاید اس بدبخت کو یہ گمان ہو گا کہ میں دور دراز بستی تک نہیں پہنچ سکوں گی۔ میں بھی دیکھوں گی کہ وہ کب تک اور کہاں تک اپنی موت سے بھاگتا ہے۔''

اگلے ہی روز میں نے عارج اور تین چار جاں نثار خادموں کو ساتھ لیا اور دہلی سے روانہ ہو گئی۔ میرے جسم پر مردانہ لباس ہی تھا۔ مجھے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ میں ایک نوجوان ہوں جس کی مسیں ابھی بھیگ رہی ہیں۔ یہ لباس میں نے اس لئے بھی پہنا تھا کہ راستے میں ابوالہوس طالع آزماؤں کے دست برد سے محفوظ رہوں۔

دور دراز کا وہ پر مصائب سفر ایک عرصے تک جاری رہا۔ سفر میں مجھے اتنی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں کہ میری جگہ اگر کوئی آدم زادی ہوتی تو ہمت ہار جاتی مگر میں ایک جن زادی تھی۔ میرے سینے میں انتقام کا الاؤ روشن تھا۔ یہی روشن الاؤ مجھے راہ کی صعوبتیں برداشت کرنے اور پیہم آگے بڑھتے رہنے پر اکساتا رہتا۔

میں آخر کار سندھ کی اس ساحلی بستی بھنبور تک پہنچ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ بہرام خاں اب میرے انتقام سے نہیں بچ سکے گا۔

اگرچہ بھنبور سندھ کی ایک چھوٹی سی بستی تھی مگر تاجروں کی آمد و رفت کی وجہ سے وہاں رونق رہتی تھی۔ عرب، فارس، روم اور مشرق بعید سے ہندوستان کی بیشتر تجارت اسی راستے سے ہوتی تھی۔ میں بھی وہاں ایک تاجر کے بھیس میں وارد ہوئی تھی مگر مجھے یہ جان کر بہت مایوسی ہوئی کہ بہرام خاں وہاں میری آمد سے پہلے ہی کہیں فرار ہو چکا تھا شاید اسے کسی طرح میری آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ پھر بھی میں نے حوصلہ رکھا اور مایوسی کو غالب نہ آنے دیا۔

معلوم نہیں کیوں مجھے یہ گمان تھا کہ بہرام خاں وقتی طور پر اس بستی سے فرار ہوا ہے اور دوبارہ یہاں آئے گا۔ اس گمان کی وجہ وہ بڑی عمارت تھی جہاں بہرام خاں رہتا تھا۔ وہ اس عمارت کو بیچ کر نہیں گیا تھا اس کی وجہ یہ بھی ممکن تھی کہ اسے عمارت فروخت کرنے کا وقت

ہی نہ ملا ہو۔ بہرام خاں کے معاملے سے قطع نظر مجھے کہیں نہ کہیں تو قیام کرنا ہی تھا اس کیلئے مجھے سندھ کی وہ ساحلی بستی پسند آئی۔ عارج نے بھی میرے خیال سے اتفاق کیا۔ میں نے اسی لئے بھنبھور میں ایک عالیشان مکان خرید لیا اور عارج کے ساتھ ساتھ اپنے خادموں کو ہندوستان کے اندرونی شہروں کی طرف روانہ کر دیا کہ وہ بہرام خاں کو تلاش کریں۔ اس کے علاوہ میں نے عارج کے مشورے پر زرو جواہر کے عوض کئی مقامی افراد کی خدمات بھی حاصل کر لی تھیں اور انہیں بہرام خاں کا مکمل حلیہ بتا کر ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیا تھا۔

میری کوششیں بالآخر بارآور ثابت ہوئیں۔ چند ہی روز کے بعد عارج واپس آ گیا۔ وہ اندرون سندھ گیا ہوا تھا۔ عارج ہی نے اطلاع دی کہ بہرام خاں ملتان میں ہے۔ (ملتان اس زمانے میں سندھ ہی کا حصہ تھا (مصنف)

عارج ہی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بہرام خاں نے بھیس بدل لیا ہے۔ اب اس کے جسم پر فقیروں اور درویشوں کا سا لباس رہتا ہے۔ اس کے خادم اور محافظ بھی فقیرانہ لباس میں مگر مسلح اس کے اطراف منڈلاتے رہتے تھے۔

''مگر وہ تجھے نظر کہاں آیا تھا؟'' میں نے بے تابی کے ساتھ عارج سے پوچھا۔

''ملتان میں ایک بہت بڑے بزرگ شاہ رکن عالمؒ کا مزار ہے اے دینار!'' عارج نے جواب دیا۔ ''بہرام خاں اپنے وفاداروں کے ساتھ اس مقبرے کے قریب ایک سرائے میں قیام پذیر ہے۔''

میں یہ سن کر سوچ میں ڈوب گئی۔ عارج کے علاوہ میرے بقیہ جاں نثار خادم بھی سندھ سے واپس آ گئے۔ وہ میرے اگلے اقدام کے منتظر تھے۔ یہی جاننے کیلئے اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ انہیں بھی میں آگاہ کر چکی تھی کہ بہرام خاں کا سراغ مل گیا ہے اور وہ ملتان میں ہے۔

''میں تنہا ملتان جاؤں گی اور تم سب یہیں رہو گے۔'' میں نے دھیمی آواز میں ان سے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے میری نقل و حرکت پر بہرام خاں کی نظر ہے ورنہ وہ یوں اچانک بھنبھور سے فرار نہ ہوتا تم لوگ یہیں پڑاؤ ڈالے رہو گے تو اس کے جاسوس اسی دھوکے میں رہیں گے کہ میرا قیام ابھی یہیں ہے۔ میں آج ہی رات یہاں سے خاموشی کے ساتھ نکل جاؤں گی۔''

''مگر ہمیں آپ کی خبر کیسے ملے گی؟'' عارج نے وہاں خادموں کی موجودگی کے سبب مؤدب زبان و الفاظ میں مجھ سے پوچھا۔

''تم لوگ یہاں سے دو ہفتے بعد ملتان کیلئے روانہ ہو جانا۔ میں تمہیں انہی بزرگ شاہ

رکن عالمؒ کے مزار پر ملوں گی۔'' میں یہ کہہ کر عارج اور خادموں کو ضروری ہدایات دینے لگی اور پھر سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔

تنہائی ملتے ہی عارج مجھ سے بولا۔ ''اے دینار! تو کم سے کم مجھے تو اپنے ساتھ لے چل کیا' کیا خبر تجھے وہاں کیا خطرہ پیش آ جائے۔''

''نہیں'' میں نے انکار کر دیا۔ ''کیا اپنے کیا پرائے سب جانتے ہیں کہ تو میرا خاص وفادار خادم ہے' دشمن کے جاسوسوں کو دھوکے میں رکھنے کیلئے تیری یہاں موجودگی ضروری ہے۔''

میری دلیل میں وزن تھا اس لئے عارج نے مزید کچھ نہیں کہا۔

اسی رات اندھیرا پھیلتے ہی میں نہایت خاموشی سے تن تنہا ملتان روانہ ہو گئی۔ بھنبھور سے نکلتے ہی میں نے فقیرانہ لباس پہن لیا تھا۔ اب میرے سر پر پگڑی اور حسین و نازک جسم پر ڈھیلا ڈھالا گیروے رنگ کا لبادہ نظر آ رہا تھا۔ ہاتھوں میں آہنی کڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں ایک گھوڑے پر سوار' کاندھے سے چمڑے کی تھیلی لٹکائے تیزی کے ساتھ چلی جا رہی تھی' اپنی تلوار' تیر کمان اور خنجر میں نے اسی چمڑے کی تھیلی میں چھپا لئے تھے۔ رکے بغیر میں رات بھر سفر کرتی رہی۔ صبح کے وقت ایک منزل پر میں نے گھڑی بھر کو آرام کیا اور پھر آگے روانہ ہو گئی۔

تیسرے روز شام کے وقت میں ملتان کے قریب پہنچ چکی تھی۔ شہر ابھی آٹھ فرسخ دور تھا مگر دور ہی سے مجھے ایک بلند اور عظیم الشان گنبد چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شاید یہی حضرت شاہ رکن عالمؒ کا مزار تھا۔ یہیں میرا بزدل دشمن چھپا ہوا تھا۔ میں نے کچھ فاصلہ اور طے کیا تو مجھے مزار کے ستون بھی دکھائی دینے لگے۔

میں جب شہر میں داخل ہوئی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ شفق کے پس منظر میں شہر کے حسین و جمیل مقابر' خانقاہوں کے فلک بوس قبے اور بلند و بالا مینار عجیب پر جلال منظر پیش کر رہے تھے۔ پہلی نظر میں مجھے اس شہر کی عظمت نے متاثر کر لیا۔

مقبرہ کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ گرد و پیش مسافروں کیلئے سرائیں بنی ہوئی تھیں۔ میں سمجھ گئی کہ انہی سراؤں میں کہیں بہرام خاں مقیم ہوگا۔ اگر میں طویل سفر کی وجہ سے بہت زیادہ تھکی نہ ہوتی تو شاید اسی وقت اپنے دشمن کی تلاش شروع کر دیتی۔ میں نے بھی ایک سرائے میں قیام کیا اور کھانا کھا کے گہری نیند سو گئی۔

اگلے روز منہ اندھیرے میری آنکھ کھل گئی۔ آرام کے بعد میں نے خود کو تر و تازہ

محسوس کیا۔

میں اپنی کوٹھڑی سے نکلی تو بہت سے فقیر اور ملنگ مزار کی طرف جا رہے تھے۔ فقیروں اور ملنگوں کے علاوہ دوسرے زائرین بھی تھے۔ میں بھی ان آدم زادوں کے ہمراہ مزار پر پہنچی' فاتحہ پڑھی اور مزار کے احاطے میں ان فقیروں کی طرف بڑھ گئی جو ایک حلقے کی صورت میں گردش کر رہے تھے۔ وہ ''الا اللہ'' کی صدائیں لگا رہے تھے۔ میں ان کے قریب پہنچی تو ایک فقیر کو دیکھ کر چونک اٹھی۔ اس یک چشم اور ایک ہاتھ سے محروم شخص کو میں ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ میں بھی اس حلقے میں شامل ہو گئی اور اس ایک آنکھ والے کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگی۔ اپنے دشمن کو آخر میں نے ڈھونڈ ہی لیا تھا۔

اچانک اسی لمحے مجھے اپنے دل کی کیفیت بدلی محسوس ہوئی۔ نقارے پر پڑنے والی ضرب کے ساتھ جب ''الا اللہ'' کی صدائیں بلند ہوتی تو مجھے یوں لگتا جیسے میرا وجود اس انسانی قالب کے پنجرے سے آزاد ہو کر کسی غیر ارضی وادی کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ چند ہی لمحوں میں خود میں بھی ان فقیروں کی طرح گردن کو دائیں بائیں جھٹک کر ''الا اللہ'' کی صدائیں لگا رہی تھی۔ ایک عجیب سا کیف میری نس نس میں سما گیا تھا۔ دنیا کی ساری نفرتیں' سب منتقمانہ جذبے میرے ذہن سے محو ہو چکے تھے۔

بہت دیر کے بعد جب معاً نقارہ خاموش ہوا تو میں اس کیفیت سے نکلی' حلقہ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے بہرام خاں کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا مگر میرا دشمن نہ جانے کب وہاں سے جا چکا تھا۔ میں فوراً مزار کے احاطے کی طرف نکل آئی اور سرائے کی کوٹھڑیوں کی طرف چل دی۔ پھر دن بھر میں ان کوٹھڑیوں کے آس پاس منڈلاتی رہی لیکن بہرام خاں مجھے دوبارہ نظر نہ آیا۔

جب سارے فقیر لنگر حاصل کرنے مزار کی جانب جا رہے تھے تو بس اچانک ہی مجھے بہرام خاں دکھائی دے گیا۔ وہ دو تین فقیروں کے ہمراہ ایک کوٹھڑی سے نکل رہا تھا۔ میں ایک ستون کی آڑ میں چھپ گئی اور ان کی طرف دیکھنے لگی۔

بہرام خاں کے ساتھ جو فقیر تھے وہ یقیناً اس کے جان نثار محافظ تھے۔ وہ بہرام خاں کو حلقے میں لئے چوکنا نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ اگر مجھے دیکھ بھی لیں تو پہچان نہیں پائیں گے۔ میں ان لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ جب وہ سب مزار کے احاطے میں چلے گئے تو میں اس کوٹھڑی کی طرف بڑھ گئی جس سے بہرام خاں نکلا تھا۔

اس کوٹھڑی کا دروازہ مقفل تھا۔ میں ایک لمبا چکر کاٹ کر کوٹھڑی کے عقب میں پہنچی

اور پھر مجھے جو توقع تھی پوری ہو گئی۔ کوٹھڑی میں ہوا کے گزر کی غرض سے عقبی سمت ایک دریچہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ ایسا ہی دریچہ اس کوٹھڑی میں بھی تھا جہاں خود میں ٹھہری ہوئی تھی۔ عقبی دریچے کا خیال مجھے اس لئے آیا تھا۔

وہ دریچہ ذرا چھوٹا تھا اس لئے میں بڑی دقت سے اس کے ذریعے کوٹھڑی کے اندر کودنے میں کامیاب ہوئی۔ اس کوشش میں میرے بازو اور کہنیاں بھی چھل گئیں مگر اس وقت مجھے تکلیف کا معاً احساس نہیں تھا۔

کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ میں ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھی پھر جب میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں تو میں کوٹھڑی کے ایک گوشے میں پڑے ہوئے سامان کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی۔ اپنے ڈھیلے ڈھالے لبادے میں چھپی ہوئی تلوار نکال کر میں نے ہاتھ میں تھام لی اور بہرام خاں کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

بہرام خاں کچھ ہی دیر میں واپس آ گیا مگر مجھے یہی محسوس ہوا کہ وہ جیسے بہت دیر میں لوٹا ہو۔

کوٹھڑی کا دروازہ کھلتے ہی مجھے بہرام خاں کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ مہر النسا بھنبھور سے غائب ہو چکی ہے؟...... حیرت ہے کہ وہ کب وہاں سے نکل گئی۔''

''حضور! میں نے جو کچھ عرض کیا ہے' قطعی درست ہے اور مجھے اس پر پورا یقین ہے۔'' جواب میں دوسری آواز آئی۔ ''وہ دن بھر اپنے مکان سے نہیں نکلی تو مجھے شبہ ہوا۔ پھر رات کے وقت میں خود اس کے مکان میں داخل ہو گیا وہاں صرف مہر النساء کے خادم تھے اور خود وہاں موجود نہیں تھی۔ پھر جب میں نے چھپ کر خادموں کی گفتگو سنی تو مجھ پر سارا بھید کھل گیا۔''

پھر بہرام خاں کی آواز ابھری تو اس سے بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔

''کیسا بھید؟ جلدی بتاؤ!'' بہرام خاں نے پوچھا۔ وہ کوٹھڑی کے دروازے پر کھڑا ہوا کسی سے دھیمی آواز میں گفتگو کر رہا تھا۔

''ان خادموں کی گفتگو سے مجھے یہ معلوم ہوا حضور کہ مہر النسا تن تنہا ایک رات پہلے ملتان کیلئے روانہ ہو چکی ہے۔ بس یہ سنتے ہی میں وہاں سے نکلا اور حضور کو خبر دینے کی خاطر ملتان روانہ ہو گیا۔ میں نے صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔'' خادم نے بتایا۔

میں سمجھ گئی کہ یہ ان خادموں میں سے ایک ہو گا بہرام خاں جنہیں بھنبھور میں میری

نگرانی کیلئے چھوڑ گیا تھا۔

"یہ..... یہ تو بہت برا ہوا' ہمیں آج ہی رات یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" بہرام خاں کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "مگر حضور! وہ اکیلی ہے آخر ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے۔" خادم بولا۔

"اگر تم اسے اچھی طرح جانتے تو ایسا نہ کہتے احمق آدمی! جاؤ اور جلد از جلد یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ اپنے تمام ساتھیوں کو بھی مطلع کر دو کہ ہم آج ہی رات یہاں سے لاہور کیلئے روانہ ہو رہے ہیں۔ اب یہاں ایک رات بھی گزارنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

بہرام خاں نے خادم کو حکم دیا۔ "تم سے جو کہا جائے اسی پر عمل کرو۔"

"بہتر حضور!"

پھر میں نے دور ہوتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ اس کے بعد بہرام خاں نے کوٹھڑی میں داخل ہو کر تیزی سے دروازے کی زنجیر چڑھا دی۔ اب کوٹھڑی میں گہری تاریکی چھا گئی تھی۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کوٹھڑی میں مدھم سی روشنی پھیل گئی۔ بہرام خاں نے طاقچے میں رکھا ہوا چراغ روشن کر دیا تھا' اس کی پشت میری طرف تھی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر بہرام خاں جیسے ہی مڑا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی اور بے ساختہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ بدلے ہوئے حلیے کے باوجود وہ مجھے قریب سے دیکھ کر پہچان گیا تھا۔ میرے ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

"بزدل! دیکھ لے کہ میں تری قضا بن کر تجھ تک پہنچ گئی۔" میں نے آگے بڑھ کر تضحیک آمیز لہجے میں بہرام خاں سے کہا۔ "بول اے بزدل شخص! کیا کوئی اپنی موت سے بھاگ سکتا ہے جو تو اس کوشش میں ہے۔"

بہرام خاں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ "مجھ پر رحم کرو مہر النسا! مجھے قتل کر کے تمہیں کیا مل جائے گا۔"

"اطمینان رکھو بہرام خاں! میں تمہیں ابھی قتل نہیں کروں گی۔ آج تو میں تمہیں صرف لنگڑا کرنے آئی ہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں" بہرام خاں خوفزدہ آواز میں چیخ اٹھا۔

مجھ پر اس کے چیخنے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پرسکون آواز میں بولی۔ "کیا تو بھول گیا میں نے کہا تھا کہ تیرا ایک ایک عضو کاٹ کر تجھے ہلاک کروں گی۔ ابھی تو تیرے مکروہ اور ناپاک جسم کے کئی عضو سلامت ہیں۔"

"خدا کیلئے مجھ پر رحم کرو مہر النسا!..... کیا تمہیں یاد نہیں کہ میں... میں تم... تم کو اپنی چھوٹی بہن بنا چکا ہوں..... کیا تمہیں اس کا بھی پاس نہیں۔" بہرام خاں گڑگڑانے لگا۔

"مجھے تو سب یاد ہے..... سب کچھ یاد ہے' اے عیار شخص! ہاں تو یہ بھول گیا ہے کہ تو نے مجھے بہن کہہ کر میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور کیا کہا تھا..... یاد کر کہ تو نے کہا تھا کسی عورت کو بہن کہہ دینے سے وہ بہن نہیں بن جاتی۔ اب تو پھر اس بات کو دہرا رہا ہے' شرم آنی چاہیے تجھے یہ کہتے ہوئے۔ تجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ بہن کہنے کے چند ہی لمحے بعد تو نے اپنے محافظوں سے مجھے گرفتار کرنے کیلئے کہا تھا۔" یہ کہہ میں دانت پیستی ہوئی آگے بڑھی اور قہر آلود لہجے میں بولی۔ "تو قابل رحم ہرگز نہیں ہے کمینے!"

پھر میں برق بے اماں کی طرح تڑپ کر ایک ہی جست میں بہرام خاں کے سر پر پہنچ گئی۔ دوسرے ہی لمحے میری تلوار کا بھرپور وار بہرام خاں کی بائیں ٹانگ کو گھٹنے کے قریب سے کاٹ گیا۔ بہرام خاں چیختا ہوا منہ کے بل زمین پر گرا اور بری طرح تڑپنے لگا۔ اسی وقت باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ لوگ کوٹھڑی کی طرف ہی دوڑ رہے تھے۔

میں جھپٹ کر دروازے کی طرف بڑھی اور زنجیر کھول کر باہر تاریکی میں گم ہو گئی۔

اس واقعے کے بعد میں بہت دنوں تک ملتان میں مقیم رہی۔ اس دوران میں میرے خادم بھی جھنجھور سے آ کر مجھ سے آ ملے۔ ان کے ساتھ عارج بھی تھا۔ میں نے ملتان میں بھی چھوٹا سا ایک مکان خرید لیا تھا۔

دن بھر میں ملتان کی سیر کرتی اور بزرگان دین کے مزاروں پر حاضری دیتی۔ میرے خادم بہرام خاں کی نگرانی میں مصروف رہتے۔ بہرام خاں اس قدر بیمار پڑ گیا تھا کہ کئی ہفتوں تک بستر ہی سے نہ اٹھ سکا۔ میرے خادم اس کی طرف سے کسی قدر مطمئن اور بے فکر ہو چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بہرام خاں اس حالت میں کہیں فرار نہیں ہو سکے گا لیکن وہ اس بار بھی انہیں جل دینے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک رات وہ چپکے سے اپنے خادموں کے ساتھ سرائے سے نکلا اور کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں اپنے شکار کو نظر میں رکھنا چاہتی تھی کہ کہیں ایک بار پھر اسے تلاش نہ کرنا پڑے لیکن اپنے خدام کی بے پروائی سے اس مقصد میں ناکام رہی۔ زیادہ شکایت مجھے عارج سے تھی اسے اور خدام کو میں نے بہت برا بھلا کہا مگر اب سانپ نکل چکا تھا اور لکیر پیٹنا لا حاصل تھا۔ میں بہت دنوں تک بہرام خاں کی تلاش میں رہی' بہت جدوجہد کے بعد یہ معلوم ہو سکا کہ

بہرام خاں ملتان سے فرار ہو کر لاہور پہنچ گیا ہے۔ میں نے بھی رختِ سفر باندھا اور عارج کے ساتھ اپنے خادموں کو بھی لے کر لاہور پہنچ گئی۔

بھنبھور اور ملتان کی طرح میں نے لاہور میں بھی ایک مکان خریدا اور شہر بھر میں بہرام خاں کی تلاش شروع کر دی۔ مختلف شہروں میں مکان خریدنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آئندہ کبھی ان شہروں میں آنا ہو تو قیام کیلئے دشواری نہ ہو۔ کئی روز کی دوڑ دھوپ کے باوجود مجھے اور میرے خادموں کو کامیابی نہ ہو سکی۔ ایسا لگتا تھا کہ بہرام خاں میری آمد سے پہلے ہی لاہور سے فرار ہو چکا ہے۔

ایک روز میں داتا صاحب کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھ کر واپس آ رہی تھی کہ اچانک پشت سے کسی نے مجھ پر خنجر سے حملہ کیا' میں لڑکھڑا کر گری مگر فوراً ہی سنبھل گئی اور خود ہی اپنے شانے میں پیوست خنجر نکالنے لگی۔ اس دوران میں عارج اور میرے خدام نے جو مجھ سے چند قدم پیچھے چلے آ رہے تھے' دوڑ کر حملہ آور کو پکڑ لیا۔ پھر راہگیروں کے ہمراہ میں' عارج اور خدام اپنے مکان تک پہنچ گئے۔ راہگیروں کا اصرار تھا کہ ہم ابھی کوتوال شہر کے پاس جائیں اور اس بدبخت حملہ آور کو داخل زنداں کرا دیں۔

میں نے بمشکل ان راہگیروں کو سمجھا بجھا کر رخصت کیا اور پھر عارج کی مدد سے اپنے زخم کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔

مرہم پٹی سے فارغ ہو کر میں نے حملہ آور کو بلوایا جسے خدام نے مکان کے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ جب خدام اس شخص کو میرے پاس لے کر آئے تو میں اسے دیکھتے ہی پہچان گئی۔ میں اسے بہت پہلے بہرام خاں کی حویلی میں دیکھ چکی تھی۔

''سنو! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے کہ تم بہرام خاں کے خادم ہو۔'' میں نے حملہ آور کو مخاطب کیا۔ ''تمہاری جان بخشی کی اب ایک ہی صورت ہے کہ تم اپنے بزدل آقا کے ٹھکانے کا پتہ بتا دو' ہر چند کہ تم نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا مگر میں تمہیں قصوروار نہیں سمجھتی۔ میں اس پر خوش ہوں کہ تم اپنے بزدل آقا کے وفادار ہو۔ اگر تم نے سب کچھ ٹھیک ٹھاک بتا دیا تو تمہیں انعام سے بھی نوازا جائے گا۔ بولو تم اس پر تیار ہو یا میں اپنے خادموں کو تمہاری گردن اڑانے کا حکم دے دوں۔''

بہرام خاں کا خادم مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دشمنوں کیلئے میں کس قدر سفاک اور بے رحم ہوں۔ اس نے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر مجھے اپنے آقا کے بارے میں مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔ خادم کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ بہرام خاں میری آمد سے پہلے

ہی لاہور چھوڑ چکا تھا۔ لاہور سے فرار ہو کر وہ شیر شاہ سوری کے بنوائے ہوئے قلعے رہتاس میں پناہ لے چکا تھا۔ رہتاس کا قلعہ دار نعمت اللہ بہرام خاں کا پرانا دوست تھا۔ بہرام خاں نے اس خادم کو میرے قتل پر مقرر کیا تھا کیونکہ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ میرے قتل کے بعد اس خادم کو بھی رہتاس ہی پہنچنا تھا۔

میں نے اس خادم سے قلعے کا تمام محل وقوع معلوم کیا اور اسے ذہن نشین کر لیا۔ وہ خادم ایک بار پہلے بھی بہرام خاں کے ساتھ اس قلعے میں جا چکا تھا۔ پھر میں نے اس خادم کی خواہش پر اسے اپنے ایک خادم کی نگرانی میں دہلی جانے کی اجازت دے دی۔ حسب وعدہ میں نے خادم کی جاں بخشی کر دی تھی مگر اس کی نگرانی ضروری تھی کہ وہ بہرام خاں کے پاس نہ جا سکے۔

اگلے ہی روز میں' عارج اور اپنے باقی ماندہ خادموں کو ساتھ لے کر رہتاس کی طرف روانہ ہو گئی۔

میں جانتی تھی کہ بہرام خاں قلعہ رہتاس میں مطمئن اور بے فکر ہو گا۔ اسے یقین ہو گا کہ جس خادم کو اس نے لاہور میں میرے قتل کیلئے چھوڑا ہے وہ مجھے زندہ نہیں رہنے دے گا۔ وہ خادم میرے قتل کی خبر لے کر رہتاس پہنچنے ہی والا ہو گا۔

یہ علم مجھے بعد میں ہوا کہ بہرام خاں نے اپنے دوست قلعہ دار نعمت اللہ کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ بہرام خاں نے اس کے سامنے میرے حسن کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ ادھیڑ عمر قلعہ دار بھی میرا نادیدہ پرستار ہو گیا تھا۔

''خدا کرے بہرام خاں کہ مہرالنسا تمہاری تلاش میں یہاں تک آ پہنچے۔'' قلعہ دار نعمت اللہ نے بے تابی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا تھا۔

''خدانخواستہ اگر وہ یہاں آ گئی تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔'' بہرام خاں کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

نعمت اللہ نے اس کی حالت دیکھ کر قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''تم تو خوامخواہ ڈر رہے ہو' بے فکر ہو جاؤ کہ تم اب اپنے دوست نعمت اللہ کی پناہ میں ہو۔ وہ اگر یہاں آئی تو اسے ہر قیمت پر گرفتار کر لیا جائے گا اور...... پھر میں اس سے نکاح کر لوں گا۔''

بہرام خاں اس کے بعد کچھ نہ بولا مگر میرا خوف اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔

راستے میں کہیں رکے بغیر میں رہتاس پہنچ گئی۔ قلعے تک پہنچنا میرے لئے چنداں

مشکل ثابت نہیں ہوا۔ عارج اور اپنے خادموں کے ساتھ قلعہ سے کچھ دیر بنی ہوئی ایک سرائے میں مقیم تھی اور قلعے کے اندر داخل ہونے کی ترکیبوں پر غور کر رہی تھی کہ میں شام ہوتے ہوتے وہاں پہنچی تھی۔ نصف شب کے قریب میں جاگ اٹھی اور عارج کو بھی جگا دیا۔ ''سن اے عارج! جو حالات پیش آنے والے ہیں ان کی بابت پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' میں نے عارج سے کہا۔ ''تجھے میں یہ تاکید کرنا چاہتی ہوں کہ کچھ بھی ہو جائے تو اپنی جناتی صفات استعمال نہیں کرے گا کہ اس میں خطرہ ہے۔ اگر کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو میں ہی خود اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لاؤں گی۔''

عارج نے یقین دہانی کرائی۔ ''اے دینار! میں وہی کروں گا جو تو کہے گی۔''

پھر عارج اور خادموں کو ساتھ لئے ہوئے میں سرائے سے نکل آئی۔ اس کے بعد بہت جلد میں قلعے کی جنوبی دیوار کے نیچے پہنچ گئی۔ خادموں اور عارج کو وہیں رکنے اور انتظار کرنے کا حکم دے کر میں نے فصیل پر ماہرانہ انداز میں کمند ڈالی۔ میں رات کی تاریکی میں کمند کے ذریعے قلعے کی دیوار پر چڑھنے لگی۔ اس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ قلعہ دار نعمت اللہ کے حکم پر قلعے کے سپاہی ہر لحہ کس قدر چوکنا اور مستعد رہتے ہیں' انہیں کسی ایسے ہی موقع کیلئے پہلے سے تیار رہنے کی ہدایات مل چکی تھیں۔

جیسے ہی میں اوپر پہنچی خلاف توقع مجھے ایک طرف مشعل کی روشنی نظر آئی پھر یکے بعد دیگرے اندھیرے میں کئی اور مشعلیں نمودار ہو گئیں۔ مجھے یوں لگا گویا سپاہی میرے ہی منتظر تھے۔

میں تذبذب کا شکار ہو گئی اور فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ اس دوران میں مشعل بردار سپاہی قریب آ گئے پھر سپاہیوں نے دیر نہیں کی اور تلواریں سونت کر مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔ تعداد میں وہ چار تھے اور بیک وقت مجھ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ میں نے پھرتی سے جھکائی دے کر ان کے وار کو روکا اور چشم زدن میں اپنی تلوار ایک سپاہی کے سینے میں اتار دی۔ وہ سپاہی لڑکھڑایا اور چیختا ہوا فصیل سے نیچے جا گرا۔ باقی سپاہی سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔

☆......☆......☆

میں تلوار لہراتی ہوئی تیزی سے ان تینوں سپاہیوں کی طرف بڑھی مگر اس وقت سپاہیوں کا ایک غول فصیل پر پہنچ گیا۔ شاید وہ نیچے گرنے والے سپاہی کی چیخ سن چکے تھے۔ ان سپاہیوں کے غول نے چاروں طرف سے بڑھ کر ایک حلقہ بنا لیا اور اپنی تلواریں سونت کر قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگے۔ میری نظریں انہی پر جمی ہوئی تھیں۔

''اپنے ہاتھ سے تلوار پھینک دو اے اجنبی!'' ایک قوی ہیکل سپاہی نے مجھے مخاطب کیا۔

میں کسی خوف کا اظہار کیے بغیر بولی۔ ''میں اسی صورت میں اپنے ہاتھ سے تلوار پھینکوں گی جب تم میں سے کوئی مجھے زیر کر لے گا۔ اگر تم میں ہمت ہے تو مقابلے پر آ جاؤ۔''

قوی ہیکل سپاہی میری نسوانی آواز سن کر اچھل پڑا۔ میرے جسم پر کیونکہ حسب معمول مردانہ لباس تھا اس لئے وہ مجھے کوئی مرد ہی سمجھ رہا تھا۔ قلعہ دار نعمت اللہ کیونکہ مجھ سے نکاح کا خواہش مند تھا اس لئے سپاہیوں کو تاکید تھی کہ اگر کوئی عورت مردانہ لباس میں قلعے کے اندر داخل ہو تو کسی صورت اسے ہلاک نہ کیا جائے اور ہر قیمت پر اسے زندہ ہی گرفتار کیا جائے۔ گرفتاری کے بعد فوراً اس عورت کو اس کے حضور پیش کر دیا جائے۔ قلعہ دار کی اس تاکید کا علم بھی مجھے بعد میں ہوا۔

وہ سپاہی جو مجھے گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت میں چونک اٹھی جب مجھے حلقے کے سپاہیوں کے ہاتھوں میں رسی کے پھندے نظر آئے۔ یہ سپاہی پھندا پھینکنے میں ماہر تھے۔

میری دعوت مبارزت کا قوی ہیکل سپاہی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

پھر میں نے اپنی طرف پھینکے جانے والے ان پھندوں سے بچنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ رسی کا ایک پھندا میرے بازوؤں کے پاس آ کر سخت ہو ہی گیا اور میں بالکل بے بس ہو کر رہ گئی۔

اگلے ہی لمحے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ اس کے بعد وہ سپاہی مجھے قلعے میں لے گئے۔ قوی ہیکل سپاہی مجھے فوراً قلعہ دار نعمت اللہ کے روبرو پیش کرنا چاہتا تھا مگر نیچے پہنچ کر معلوم ہوا کہ قلعہ دار اس وقت قلعے کے کماں دار کے ساتھ مشاورت میں مصروف ہے۔ اس نے اسی لئے مجھے قلعے کے اندر بنے ہوئے زنداں میں لے جا کر ڈال دیا۔

ایک سپاہی نے اجلاس کے دوران ہی میں قلعہ دار نعمت اللہ کے کان میں میری گرفتاری کے متعلق بتایا۔ قلعہ دار نے سپاہی کو جھڑک دیا اور دوبارہ کماں داروں سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

قلعہ دار اس وقت ایسی صورتحال سے دوچار تھا کہ کسی دوسرے مسئلے کے بارے میں اسے سوچنے کی مہلت نہ تھی۔ مجھے بھی ان واقعات کا بہت بعد میں پتہ چلا۔ دراصل قلعہ دار

کے جاسوسوں نے اطلاع دی تھی کہ مغل بادشاہ ہمایوں طویل عرصے کے بعد ہندوستان میں داخل ہو چکا ہے اور پنجاب پہنچنے ہی والا ہے۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ ہمایوں پنجاب میں داخل ہو کر اب کوئی دم میں قلعہ رہتاس پر حملہ کرنے والا ہے۔ یہ 962 ہجری کا واقعہ ہے۔

ہمایوں کی آمد کا شہرہ ہر طرف پہلے ہی تھا۔ ہمایوں کے آنے کی خبر سے ہندوستان کا سارا نقشہ درہم برہم ہو گیا تھا۔ اب کوئی شیر شاہ سوری نہیں تھا جو مغل تاجدار کے مقابلے پر آ سکتا' ہر طرف فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ پنجاب کے حاکم احمد خاں سوری نے بھی خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ عدلی شاہ کا بہنوئی تھا۔ اس نے سکندر شاہ سوری کے لقب سے اپنی علیحدہ بادشاہت قائم کر لی تھی اور دس ہزار سواروں کا لشکر لے کر لاہور سے آگرہ کی تسخیر کیلئے روانہ ہو گیا تھا۔

بنگال کا حاکم محمد خاں سوری بھی ملک گیری کا دعویٰ لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس نے عدلی شاہ پر حملہ کر دیا تھا۔ اس خبر کے ملتے ہی عدلی شاہ کا سپہ سالار ہیموں جو بیانہ میں تھا محمد خاں سوری کے مقابلے پر چلا گیا تھا۔

یہ صورتحال قلعہ دار نعمت اللہ کیلئے تشویشناک تھی۔ قلعہ دار اپنے کماں داروں کو اس خطرناک وقت میں ہمایوں کے متوقع حملے سے نمٹنے کیلئے ہدایات دے رہا تھا اور جنگی حکمت عملی کی ترتیب میں مصروف تھا۔

دوسری جانب میں قلعے کے زنداں کی ایک کوٹھری میں قید تھی اور بہرام خاں کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت تک مجھے ہندوستان میں ہمایوں کی آمد کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ مجھے یہ دلچسپی بھی نہیں تھی کہ برسر اقتدار کون ہے کون نہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ بہرام خاں اسی قلعے میں مجھ سے کچھ ہی دور موجود ہے اب تک یقیناً اسے میری گرفتاری کا علم ہو جانا چاہئے تھا لیکن بہت دیر گزر جانے کے باوجود بھی کوئی میری کوٹھڑی کی طرف نہیں آیا۔ رات کے تیسرے پہر کے قریب آخر کار میری آنکھ لگ گئی۔

اچانک زوردار دھماکوں کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی' باہر دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ہر طرف بارود کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ مسلسل دھماکوں کے ساتھ لوگوں کے ادھر ادھر دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

ہر دھماکے کے ساتھ قلعے کی دیواریں لرز اٹھتیں اور بارود کی تیز بو نتھنوں میں گھسنے لگتی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ قلعے پر حملہ ہو چکا ہے اور باہر گھمسان کی جنگ جاری ہے۔ میں نے کوٹھڑی کی سلاخوں کے باہر دوڑتے ہوئے سپاہیوں سے حقیقت حال کے بارے میں

پوچھنے کی کوشش کی مگر کسی کے پاس میری بات سننے کی فرصت نہ تھی۔

مغل بادشاہ ہمایوں کے سپہ سالار بیرم خاں کے ساتھ سپاہیوں کی زیادہ تعداد نہیں تھی مگر اس نے قلعہ رہتاس کا محاصرہ کرنے کے بعد ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ قلعے کے محافظ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکے' قلعہ دار نعمت اللہ فرار ہو گیا۔ دوپہر ہونے سے پہلے پہلے قلعے پر قبضہ ہو چکا تھا۔ رہتاس سے ایک منزل دور ہمایوں بقیہ فوجیں لئے مستعد کھڑا تھا کہ اگر کمک کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ خود رہتاس پہنچ جائے' خود بیرم خاں کی درخواست پر ہمایوں نے اسے چند ہزار فوج کے ساتھ آگے بھیج دیا تھا۔ ہمایوں کے پاس کل فوج تقریباً 15 ہزار تھی۔ اس میں سے نصف کو بیرم خاں ہمایوں کے پاس چھوڑ گیا تھا۔

بیرم خاں اور دوسرے مغل سردار انہی نشستوں پر براجمان تھے جہاں گزشتہ رات قلعہ دار نعمت اللہ اپنے کماں داروں کے ساتھ مشاورت میں مصروف تھا۔ اس وقت قلعے کے محافظ پا بہ زنجیر بیرم خاں کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔ بیرم خاں کے ساتھ ہی قریبی نشست پر اس کا قدیمی دوست اور مغل فوج کا ایک سردار یوسف خاں بیٹھا ہوا تھا۔

یوسف خاں اور دوسرے مغل سرداروں کے مشورے سے قلعے کے نگران اعلیٰ تاتار خاں اور دوسرے قیدیوں کو زنداں میں ڈالنے کا حکم دے دیا گیا۔ پہلے سے اسیر افراد کو رہا کرنے اور انہیں اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم بھی بیرم خاں نے اسی کے ساتھ دیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد مغل سپاہیوں نے قلعے کے زنداں میں موجود تمام قیدیوں کو بیرم خاں کے روبرو پیش کر دیا۔

قید کے دوران میں مجھے پہننے کیلئے زنانہ لباس دے دیا گیا تھا۔ دوسرے قیدیوں کے ساتھ جب میں بیرم خاں کے سامنے پہنچی تو قیدیوں میں واحد عورت تھی۔ بیرم خاں مجھے دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔

"اس عورت کو میرے قریب لاؤ۔" بیرم خاں نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

سپاہیوں نے فوراً تعمیل حکم کی اور مجھے بیرم خاں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی جانے کیوں بیرم خاں کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ میرے انسانی قالب کے خدوخال بڑی حد تک مغل عورتوں سے ملتے جلتے تھے۔

"شائستہ..... شائستہ بیگم!" معاً بیرم خاں کے ہونٹ حرکت کرنے لگے۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ "مگر یہ..... یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ مرنے والے واپس تو نہیں آتے۔"

بیرم خاں کی بڑبڑاہٹ سے میں اتنا تو سمجھ گئی کہ میرا چہرہ کسی شائستہ بیگم سے ملتا ہے جو مر چکی ہے مرنے والی سے بیرم خاں کا کیا تعلق تھا فوری طور پر میں نہ جان سکی۔

میں سخت حیران تھی کہ مغل سپہ سالار بیرم خاں مجھے سحرزدگی کے عالم میں کیوں دیکھے جا رہا ہے۔

مجھے سپاہیوں کی زبانی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ قلعہ رہتاس کا قلعہ دار نعمت اللہ شکست کھا کر فرار ہو چکا ہے اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس وقت بیرم خاں کے سامنے کھڑی ہوں۔

کچھ دیر بعد آخرکار بیرم خاں نے سکوت توڑا اور بہت نرمی کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

''اے عورت! کون ہے تو؟''

میں نے فوراً جواب دیا۔ ''میں ایک مظلوم عورت ہوں اور مجھے ناحق قید میں ڈالا گیا تھا۔''

بیرم خاں نے حکم دیا کہ مجھے نہایت عزت و احترام کے ساتھ قلعے میں موجود اس محل میں رکھا جائے جو پہلے قلعہ دار کے تصرف میں تھا۔ مجھ سے تفصیلی گفتگو کر کے بیرم خاں میرا حال جاننا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں کوئی مغل عورت ہوں جسے قلعہ دار نے اغوا کر کے قید میں ڈال رکھا تھا۔

اسی روز شام کو مغل بادشاہ ہمایوں لشکر رہتاس کے قلعے میں پہنچ گیا۔ اس دوران میں بیرم خاں محل میں آ کر مجھ سے ملا اور بولا۔ ''میں تجھے اس محل سے ایک حویلی میں منتقل کر رہا ہوں جو میرے تصرف میں آ چکی ہے۔ محل میں اب ظل الٰہی بادشاہ سلامت قیام فرمائیں گے۔ وہ جلد ہی یہاں تشریف لانے والے ہیں۔''

میں اب تک اس تجسس میں تھی کہ آخر بیرم خاں میرے ساتھ اتنا حسن سلوک کیوں کر رہا ہے؟ اس کے علاوہ یہ کہ شائستہ بیگم کون ہے؟ ابھی میں اس ضمن میں کچھ کہنے والی تھی کہ بیرم خاں بول اٹھا۔ ''اس وقت میں بہت مصروف ہوں' تجھ سے تفصیلی ملاقات رات کو ہوگی۔''

''آپ سے ایک گزارش تھی۔'' میں جلدی بولی۔

''ہاں بول۔'' بیرم خاں نے معلوم کیا۔

''میرے خادم رہتاس کی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ میری طرف سے فکرمند ہوں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ انہیں بھی یہیں قلعے میں بلوا......''

''ٹھیک ہے۔'' بیرم خاں نے میری بات کاٹ دی۔ ''میں اپنے ملازمین سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ تیرے حکم کی تعمیل کریں۔''

میں نے بیرم خاں کا شکریہ ادا کیا۔ اسے واقعی جانے کی جلدی تھی اس لئے فوراً چلا گیا۔

بیرم خاں کے جاتے ہی اس کے ملازمین آ گئے۔ مجھے انہوں نے اس حویلی میں پہنچا دیا جہاں بیرم خاں کا قیام تھا۔ بیرم خاں کے ایک خادم کو میں نے رہتاس کی سرائے بھیج دیا۔ اسے عارج اور میرے خادموں کو ساتھ لے کر حویلی آنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ گزشتہ رات کو میری واپسی کا انتظار کر کے عارج اور خادم واپس سرائے چلے گئے ہوں گے۔ انہیں سرائے ہی میں ہونا چاہئے تھا۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ قلعے پر مغل فوج کا حملہ ہوتے ہی عارج خادموں کو لے کر وہاں سے نکل گیا۔ بیرم خاں کا خادم بآسانی عارج اور میرے خدام کو سرائے میں تلاش کر لیا' اس کیلئے اسے میں نے عارج کے انسانی قالب کا نام رحمان بتا دیا تھا۔

رہتاس کی سرائے سے بیرم خان کا خام واپس آیا تو اس کے ساتھ عارج اور میرے خادم بھی تھے۔ ان کے قیام کا بندوبست بھی میرے ایما پر حویلی کے ایک حصہ میں کر دیا گیا۔ میں محسوس کر چکی تھی کہ عارج مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسی لئے کچھ دیر بعد ہی ایک خادم کے ذریعے عارج کو بلوا لیا۔ پھر خادم کو رخصت کر دیا۔

اس کمرے میں عارج اب میرے ساتھ اکیلا تھا۔ میرے استفسار پر پہلے عارج نے قلعے سے سرائے واپس جانے کے بارے میں بتایا' پھر کہنے لگا۔ ''اے دینار! یقین کر کہ ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ اگر تو نے تاکید نہ کی ہوتی کہ میں اپنی جناتی صفات استعمال نہ کروں تو یقیناً تجھے تلاش کرنے کیلئے میں ایسا ہی کرتا۔ خیر...... ان باتوں کو چھوڑ اور یہ بتا کہ تجھ پر کیا گزری؟''

میں نے مختصر ساری روداد بیان کر دی۔

ابتدا میں عارج کے انسانی چہرے پر اطمینان نظر آیا مگر جب اس روداد میں بیرم خان کا ذکر آیا تو وہ قدرے فکرمند دکھائی دیا۔ جب میں خاموش ہو گئی تو عارج نے کہا۔ ''تیرے ساتھ اس آدم زاد بیرم خاں کا سلوک میری سمجھ میں نہیں آیا اے دینار!''

''حیران تو میں بھی ہوں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''آج رات وہ مجھ سے تفصیلی گفتگو کرے گا تو سب کچھ پتہ چل جائے گا۔'' یہ کہہ کر میں نے عارج کو رخصت کر دیا۔ وہ بہرحال میرے ایک خادم رحمان کے جسم میں تھا۔ بیرم خاں کے خادموں کو میں کسی قسم کے شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

رات ہونے تک مجھے بیرم خاں کے خادموں کی گفتگو سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بیرم

خاں کو اب ہمایوں قلعہ رہتاس فتح ہو جانے کے بعد دیپال پور بھیجنا چاہتا ہے۔ اسی شب بیرم خاں مجھ سے ملا۔

"کیا تیرا کوئی تعلق مغلوں سے ہے؟" بیرم خاں نے سوال کیا۔

میں بلا جھجک بولی۔ "ہاں میری رگوں میں ایک مغل سپاہی کا ہی خون دوڑ رہا ہے مگر حضور سے یہ میری درخواست ہے کہ فی الحال اس بات کو راز میں رکھا جائے' جب تک میں اپنے باپ کو تلاش نہ کرلوں۔"

بیرم خاں نے دریافت کیا۔ "تیری درخواست تو قبول کر لیتا ہوں لیکن مجھے اپنے باپ کا نام بتا دے۔ ممکن ہے میں اسے جانتا ہوں۔"

میں نے اپنے انسانی قالب مہرالنسا کی ماں قمرالنسا سے جو کچھ اس ضمن میں سنا تھا' بیرم خاں کو بتا دیا۔

"اگر تیری ماں کی شادی آگرہ ہی میں ہوئی تھی اور وہ اس وقت کماں دار تھا تو یقیناً وہ میرا دوست اور مغل سردار یوسف خاں ہے تو یقیناً اس کی بیٹی ہے مگر اس کے اہل دعیال میں تو میں نے تجھے کبھی نہیں دیکھا۔" بیرم خاں بولا۔

"مجھے تو خود میرے باپ نے بھی کبھی نہیں دیکھا' پھر آپ مجھ کو کیسے دیکھ سکتے تھے۔"

میں نے پھر بیرم خاں کے استفسار پر مہرالنسا کی ساری روداد بیان کر دی' وہ روداد جو میں نے قمرالنسا سے سنی تھی اور وہ بھی جو بعد میں گزری تھی۔

بیرم خاں کو میرے عزم و حوصلے پر بڑی حیرانی ہوئی۔ مہرالنسا کی سرگزشت میری زبانی سن کر کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر نرمی سے کہنے لگا۔ "تو اپنے باپ سے ملنا چاہتی ہے؟"

"نہیں ابھی نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "میں پہلے بہرام خاں سے انتقام لینا چاہتی ہوں۔"

"یقیناً تجھے اس ملعون سے انتقام لینا چاہیے۔" بیرم خاں بولا۔ "تو نے بتایا تھا کہ وہ قلعہ دار نعمت اللہ کے ساتھ اس قلعے میں مقیم تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ابھی قیدیوں میں شامل ہوگا۔ میں تیرے ساتھ خود زنداں تک چلتا ہوں۔ اگر وہ وہاں موجود ہوا تو بلاشبہ تو اس سے اپنا حساب بے باک کرلیجیو مگر میں چاہتا ہوں کہ اب اس معاملے کو زیادہ طول دینے کے بجائے تو اپنے انتقام کی ساری قسطیں بیک وقت وصول کر لے۔" یہ کہہ کر بیرم خاں نے میرا بازو تھاما اور مجھے قلعے کے زنداں کی طرف لے گیا۔

پھر بہت دیر تک ہم قلعے کے زنداں کی ایک ایک کوٹھڑی کا جائزہ لیتے مگر بہرام خاں

ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔ قلعہ دار نعمت اللہ کے بیٹے کا نام احمد اللہ تھا۔ وہ بھی قیدیوں میں شامل تھا۔ اسی کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ بہرام خان صبح سویرے ہی قلعے سے نکل گیا تھا۔ اسے میری گرفتاری کا علم ہو گیا تھا اور یہ بھی پتہ چل چکا تھا کہ ہمایوں قلعے پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس نے احمد اللہ کو بتایا تھا کہ وہ دہلی جا رہا ہے۔

میں یہ جان کر قدرے مایوس ہو گئی اور پھر بیرم خاں کے ساتھ واپس اس کی حویلی میں آ گئی۔

حویلی پہنچتے ہی بیرم خاں نے مجھ سے پوچھا۔ "مہرالنسا! کیا تجھے یہ دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی کہ جب تجھے میرے سامنے پیش کیا گیا تو میں تجھ کو دیکھتا رہ گیا۔ تو اس کی وجہ یقیناً نہیں سمجھ سکی ہو گی۔"

"جی حضور! میں نہیں سمجھ سکی تھی۔" میں نے اعتراف کیا۔

"سن مہرالنسا کہ تجھ پر نظر پڑتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میری مرحومہ بیوی شائستہ بیگم قبر سے اٹھ کر میرے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ تیری صورت میری مرحومہ بیوی سے بہت مشابہ ہے جس سے مجھے بے پناہ محبت تھی۔"

بیرم خاں کے یہ الفاظ سن کر میرے لئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہ ہوا کہ وہ مجھے کن نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس خیال سے میرے چہرے پر حجاب سا آ گیا اور میرا سر جیسے خود بخود جھک گیا۔

کچھ ہی دیر میں اپنی مرحومہ بیوی کا ذکر کرتے ہوئے بیرم خاں نے مجھ سے شادی کی پیشکش کر دی۔

بیرم خاں نے کچھ اس طرح اپنی مرحومہ بیوی کا تذکرہ کیا تھا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اسی لمحے میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوند گیا تھا کہ بیرم خاں کے جسم میں عارج بھی پناہ لے سکتا ہے۔ بیرم خاں یقیناً اپنی مرحومہ بیوی سے بہت محبت کرتا تھا اور اسی محبت کے سبب وہ مجھے اپنانا چاہتا تھا۔ اگر عارج اس کے جسم پر قبضہ کر لیتا تو یہ سودا مہنگا نہ تھا۔ بیرم خاں کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ وہ مغل افواج کا سربراہ تھا۔ ہمایوں سے پہلے وہ بابر کے ساتھ رہ چکا تھا۔ مغلوں میں اس کی بڑی عزت تھی۔ پھر ذاتی طور پر بھی وہ باکردار' ذہن اور بہادر شخص تھا۔

ہر چند کہ میرے انسانی قالب اور بیرم خاں کی عمر میں خاصا فرق تھا مگر میں اس سے متاثر ہو چکی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ بیرم خاں دوسرے مغلوں کے برعکس عیاش و آوارہ

مزاج نہیں۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ عارج اس کے جسم کو اپنا لے گا۔ ایسی صورت میں بیرم خاں کی پیشکش قبول کی جاسکتی تھی۔

ابھی میں نے ایک حتمی فیصلہ کیا ہی تھا کہ بیرم خاں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''سن مہرالنسا کہ میں محبت میں کسی جبر یا زبردستی کا قائل نہیں۔ تجھے میں یہ اختیار دیتا ہوں کہ تو چاہے تو میری پیشکش رد کر دے۔''

یقیناً یہ الفاظ بیرم خاں کی اعلیٰ ظرفی اور شرافت نفس کا ثبوت تھے۔ بااختیار ہو کر کسی کمزور و بے اختیار سے اپنی بات زبردستی نہ منوانا یا اپنا اختیار استعمال نہ کرنا لازماً بڑائی ہے۔ میں اسی بنا پر بیرم خاں کی پیشکش رد نہ کر سکی لیکن اس سے یہ بھی صاف صاف کہہ دیا کہ پہلے بہرام خاں کو تلاش کر کے انتقام لینا چاہتی ہوں۔

بیرم خاں اس پر رضامند ہو گیا۔ اس نے اگلے ہی روز میری دہلی روانگی کا بندوبست کر دیا۔ موقع نکال کر میں نے عارج کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو اس کی فطری شوخی عود کر آئی اور وہ بولا۔ ''اے دینار! یہ بتا کہ سچ سچ تک تو میری بیوی کب تک بن سکے گی؟...... مجھے معلوم ہے کہ آدم زادوں کے شوق آوارگی سے بچنے کی خاطر تو مجھے اپنا شوہر بنا لیتی ہے۔''

''بکواس نہ کر!...... چلنے کی تیاری کر!...... ہمیں یہاں سے دہلی جانا ہے۔'' میں نے یہ کہہ کر عارج کو تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

دراصل بیرم خاں نے اپنے محافظ دستے سے بہترین سپاہیوں کو منتخب کیا تھا۔ ان منتخب سپاہیوں کو ایک دستے کی صورت میں میرے ساتھ دہلی جانا تھا۔ انہی سپاہیوں کے ساتھ میں نے عارج کو بھی شامل کر دیا۔ اپنے خادموں کو میں نے رہتاس ہی میں چھوڑ دیا۔

منتخب سپاہیوں کے دستے کو جن میں عارج بھی تھا بیرم خاں نے میرے ساتھ دہلی روانہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''وہاں ہمارا انتظار کرنا' انشاء اللہ جلد مغل فوجیں دہلی میں داخل ہو جائیں گی۔''

میرے ساتھ مغل سپاہی' خدام' محافظ اور ملازمین کی صورت میں تھے۔ ان سب کے جسموں پر سادہ لباس تھا کیونکہ دہلی پر ابھی بہرحال مغلوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے بھی ایک بار پھر مردانہ لباس پہن لیا تھا۔ اس مرتبہ میں ایک تاجر کے بھیس میں دہلی جا رہی تھی۔ طویل سفر کے بعد جب میں دہلی میں پہنچی تو مجھے بہرام خاں کے بارے میں بآسانی معلوم ہو گیا۔ بہرام خاں کوئی غیر معروف آدمی نہیں تھا۔ لوگوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ جب بہرام خاں دہلی پہنچا تو اس کے چند ہی روز بعد اسے قید کر کے آگرہ کے زنداں میں منتقل کر دیا گیا

تھا کیونکہ دہلی پر اب عدلی شاہ حکومت نہیں رہی تھی۔

دہلی پر سکندر شاہ سوری کی حکومت تھی جو عدلی شاہ کا حریف تھا۔ بہرام خاں کیونکہ عدلی شاہ کے وفاداروں میں شمار ہوتا تھا اس لئے کچھ بااثر امیروں کے ایما پر دھر لیا گیا تھا۔ حقیقت حال جاننے کے بعد بہرام خاں دہلی سے فرار ہو جانا چاہتا تھا مگر اسے موقع نہیں مل سکا۔ عارج نے تو نہیں لیکن مغل سپاہیوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں بہرام خاں کا خیال ترک کر دوں اور واپس پنجاب چلوں یا دہلی میں رک کر مغل فوجوں کی آمد کا انتظار کروں۔

میں نے یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ سپاہیوں کو میں نے رخت سفر باندھنے کا حکم دیا اور پھر آگرہ روانہ ہو گئی۔ آگرہ پہنچ کر میں ابھی بہرام خاں تک پہنچنے کی ترکیبیں سوچ رہی تھی کہ قدرت کی طرف سے اس کا انتظام ہو گیا۔ ہوا یوں کہ میرے آگرہ پہنچنے سے پہلے ہی دہلی میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ عدلی شاہ اور سکندر شاہ کے حامی ایک دوسرے سے نبرد آزمائی کرنے لگے تھے۔ آناً فاناً یہ خبر آگرہ پہنچ گئی۔

آگرہ کے زنداں میں کچھ ایسے امراء بھی قید تھے جو اپنے نیک اعمال اور خدا ترسی کی وجہ سے عوام میں بہت مقبول تھے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ عوام نے ان امراء کی رہائی کیلئے زنداں پر ہلہ بول دیا۔

اس موقع سے میں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ان بلوائیوں میں اپنے سپاہیوں سمیت خود بھی شامل ہو گئی۔ قید خانے کے محافظ بلوائیوں کے سامنے نہ ٹک سکے۔ کچھ محافظ تو مارے گئے کچھ فرار ہو گئے۔ اسی افراتفری میں میں اس کوٹھڑی تک پہنچ گئی جہاں بہرام خاں تھا۔ وہ شاید یہ سوچ کر خوش دکھائی دے رہا تھا کہ اب وہ بھی دوسرے امراء کے ساتھ رہا ہو جائے گا یقیناً اسے بغاوت کا علم ہو گیا تھا ورنہ یوں خوش نہ ہوتا۔

یہی وجہ تھی کہ جب بہرام خاں کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تو وہ اپنی بیساکھی اٹھا کر چیخا۔ ''سنو! میں امیر بہرام خاں ہوں' میں بھاگ نہیں سکتا۔ مجھے سہارا دے کر یہاں سے نکال لے چلو۔''

بہرام خاں فوری طور پر یقیناً مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔ میں تلوار سیدھی کر کے اس کی طرف بڑھی اور سفاک لہجے میں بولی۔ ''ہاں اے بہرام خاں! مجھے معلوم ہے تو نہیں بھاگ سکتا۔ تو مجھ سے اپنی موت سے نہیں بھاگ سکتا۔''

میری آواز سنتے ہی بہرام خاں ایک قدم پیچھے ہٹا اور لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور موت کی زردی چہرے پر پھیل گئی۔ وہ حیرت اور

بے یقینی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ہی اس کے سامنے ہوں جسے وہ پنجاب کے قلعے رہتاس میں قید چھوڑ آیا تھا۔

میں قدم بہ قدم بہرام خاں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بہرام خاں نے ہاتھ اٹھا کر مجھ سے رحم کی درخواست کی۔ میں نے پہلا ہی وار اسی اٹھے ہوئے ہاتھ پر کیا' پھر دوسرے وار میں اس کی دوسری ٹانگ کاٹ دی۔ میرے محافظ مغل سپاہی چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ عارج بھی تھا مگر اس کے چہرے پر حیرانی نہیں تھی۔ درندگی وسفاکی میں مغل سپاہی خود بھی کم نہیں تھے مگر وہ شاید اس پر حیران تھے کہ ایک عورت ہونے کے باوجود ایسی بے رحمی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ بہرام خاں کے خون کے چھینٹے زنداں کی دیواروں پر پڑ رہے تھے۔ مجھ پر کچھ ایسی جنونی سی کیفیت طاری تھی کہ بہرام خاں کا جسم تڑپ تڑپ کر بے حرکت ہو گیا مگر میرا ہاتھ نہیں رکا۔ تلوار کی نوک سے میں نے بہرام خاں کی آنکھ نکالی اور اسے پیروں سے کچل دیا۔ اس کے بعد میں نے بہرام خاں کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ عارج کی آواز مجھے اسی دوران میں سنائی دی۔ وہ دبی دبی زبان میں مجھ سے واپس چلنے کو کہہ رہا تھا۔ اس وقت میری آنکھوں میں اسحاق اور اس کے معصوم بیٹے الیاس کے چہرے گھوم رہے تھے جنہیں بہرام خاں ہی نے قتل کرایا تھا۔

بہت دیر کے بعد جب میں اپنے محافظوں اور عارج کے ساتھ قید خانے سے نکلی تو میرے کپڑے خون آلود ہو رہے تھے مگر میں ایک نوع کی آسودگی سے سرشار تھی۔ میں نے بہرام خاں سے انتقام لے لیا تھا۔ بیرم خاں کے ایما پر میں نے انتقام کی بقیہ تمام قسطیں ایک ساتھ وصول کر لی تھیں۔ آگرہ میں اب مزید رکنا لاحاصل تھا' سو میں دہلی روانہ ہو گئی۔

دہلی آ کر میں نے بیرم خاں کا انتظار شروع کر دی۔

بیرم خاں نے جو کچھ کہا تھا سچ ثابت ہوا۔ مغل افواج اپنے حریفوں کو شکست دے کر فاتحانہ دہلی میں داخل ہو گئیں۔ یہ ماہ رمضان 992 ہجری کا واقعہ ہے۔ سکندر شاہ سوری مغلوں سے شکست کھا کر فرار ہو چکا تھا۔

کچھ ہی روز بعد بڑی دھوم دھام سے میری شادی خان خاناں بیرم خاں سے ہو گئی۔ میں اس سے قبل ہی عارج کو بیرم خاں کے جسم پر قبضہ کرنے کیلئے کہہ چکی تھی۔ ادھر بیرم خاں سے میرا نکاح ہوا ادھر میں نے عارج کی سرگوشی سنی۔ یہ سرگوشی کسی آدم زاد کو سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ عارج مجھ سے مخاطب تھا۔ ''اے دینار! میں تین بار اس آدم زاد بیرم خاں کے جسم میں اتر چکا ہوں مگر ہر بار مجھے باہر نکلنا پڑا۔ اس آدم زاد کے قالب میں میرے وجود کو قرار نہیں

آ رہا۔ مجھے اس کے اندر اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا ہے۔''

میرے لئے یہ صورتحال غیر متوقع اور انتہائی پریشان کن تھی۔ ظاہر ہے کہ میں بیرم خاں کی بیوی بن کر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس سے بچنے کا بس ایک ہی راستہ تھا کہ میں مہرالنسا کا قالب چھوڑ دیتی۔ پھر بھی میں نے اشاروں کی زبان میں عارج کو تاکید کی کہ وہ پھر کوشش کرے اور جلد گھبرا کر بیرم خاں کے جسم سے باہر نہ آ جائے۔

میرے انسانی قالب مہرالنسا کا باپ یوسف خاں بھی اس تقریب میں موجود تھا مگر اسے یہ خبر نہیں تھی کہ بیرم خاں کی شادی خود اسی کی بیٹی سے ہوئی ہے۔ شادی کی تقریب کے بعد بیرم خاں جب حجلۂ عروسی کی طرف چلا تو یوسف خاں کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ یوسف خاں اس بات پر حیران تھا کہ بیرم خاں اسے کیوں ساتھ لے جا رہا ہے۔

میں اس وقت سیج پر بیٹھی ہوئی تھی۔ عارج کو میں نے ایک بار پھر بیرم خاں کے جسم میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

اب وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ فیصلہ کن لمحات آ پہنچے تھے۔ اسی وقت مجھے بیرم خاں کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے دوست سے کہہ رہا تھا۔ ''یوسف خاں! دلہن کے قریب جاؤ' وہ تمہاری بیٹی ہے۔ اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دو۔''

''بیٹی؟'' یوسف خاں نے حیرانی سے کہا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

میں بھی گھونگھٹ میں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے پرسکون آواز میں کہا۔ ''ہاں بابا! میں تمہاری بیٹی مہرالنسا ہوں' تمہاری بیوی قمرالنسا کی کوکھ سے میں نے جنم لیا ہے۔ میں وہی ہوں جسے تم پیدا ہوتے ہی مار ڈالنا چاہتے تھے۔''

یوسف خاں کچھ دیر تک آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھتا رہا' پھر تیزی سے آگے بڑھا اور میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''مجھے معاف کر دو میری بچی!'' یوسف خاں کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے یقیناً اس نے اپنے لہو کی خوشبو کو پہچان لیا تھا۔ ''میں غلطی پر تھا۔'' یوسف خاں نے اعتراف کیا۔ پھر وہ مجھے دعائیں دیتا ہوا حجلۂ عروسی سے باہر چلا گیا۔

عارج کی وہ آخری کوشش بھی ناکام رہی اور وہ بیرم خاں کے جسم سے نکل آیا۔

مجھے پہلے سے اگر موجودہ صورتحال کا اندازہ ہوتا تو ہرگز بیرم خان سے شادی کی ہامی نہ بھرتی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک جن زاد اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ایک آدم زاد کے جسم کو اپنا ٹھکانا نہیں بنا سکا تھا۔

پھر مجھے مجبوراً اپنے انسانی قالب کو چھوڑنا پڑا۔ میں عارج کے ساتھ بیرم خاں کی حویلی سے باہر آ گئی۔

شہری آبادی سے نکل کر ہم ایک جگہ دریائے جمنا کے کنارے اتر گئے۔

''اے دینار!'' عارج مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ہمیں بغداد سے چلے عرصہ دراز ہو گیا ہے کیوں نہ اب واپس چلیں ...... اب تو بوڑھا عفریت وہوش بھی ہماری طرف سے مایوس ہو......''

''مجھے یہ خوش گمانی نہیں کہ اس عیار عفریت نے ہمیں بھلا دیا ہوگا۔'' میں بول اٹھی۔

''تو کیا ہم کبھی بغداد واپس نہیں جا سکیں گے اے دینار؟''

''میں نے یہ کب کہا'' میں بولی۔ ''پھر تو یہ بھی یاد رکھ اے عارج کہ ہم عالم سوما کے مشورے اور ایما پر عراق سے ہندوستان کے اس عہد میں آئے ہیں۔ مجھے بغداد واپس چلنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن کبھی کبھی ایک بات ضرور سوچتی ہوں۔ وہ یہ کہ ہمیں آدم زادوں کے درمیان ہی رہنا ہے تو کیا ضروری ہے بغداد یا عراق ہی کے کسی شہر میں رہیں۔''

''تیرا کہنا ٹھیک ہے اے دینار! مگر بغداد میں رہنے کی ایک وجہ ہے۔'' عارج کہنے لگا۔ ''بغداد سے بابل کے کھنڈرات زیادہ دور نہیں اور انہیں کھنڈرات میں ہم جنات کا قبیلہ آباد ہے۔ یوں سمجھ کہ عراق ہمارا وطن ہے۔ ہم وہیں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے ہیں۔''

''جہاں تک اپنے وطن یا جائے پیدائش و پرورش کا تعلق ہے' تیرے خیال سے مجھے اتفاق ہے لیکن تو اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہے کہ ہم جنات کیلئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔'' میں کہنے لگی۔ ''کہیں سے بھی کتنا ہی فاصلہ کیوں نہ ہو ہم دوسرے ہی لمحے بابل کے کھنڈرات تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہندوستان اور عراق دونوں ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر واقع ہیں پھر یہ کہ زمانہ بھی مختلف ہے مگر اس پر بھی کیا ہم پلک جھپکتے بابل نہیں پہنچ سکتے؟ ...... بول غلط کہہ رہی ہوں میں؟''

''تو غلط نہیں کہہ رہی پھر بھی جانے کیوں بغداد و بابل کی بہت یاد آتی ہے...... بتا کیا تو عراق کے صحراؤں کو بھلا سکتی ہے؟'' عارج بولا۔ عارج نے بڑے متاثر کن انداز میں یہ بات کہی۔ مجھے بھی یوں لگا جیسے صحرا پکار رہے ہوں اے دینار! کب واپس آئے گی۔ میں اسی بنا پر عراق واپس چلنے پر آمادہ ہو گئی۔

''ہم پہلے بابل کے کھنڈرات میں چل کر عالم سوما سے ملیں گے' اس کے بعد بغداد جائیں گے اے عارج!'' میں نے کہا۔

اس پر عارج راضی ہو گیا۔ وہ واپسی کے فیصلے سے خوش تھا۔

170 ہجری میں خلیفہ ہارون الرشید برسر اقتدار آیا تھا اور اسی سال ہم عراق کے شہر نجف سے چلے تھے۔ ہم پورے 20 برس کے بعد 170 ہجری کے زمانے میں واپس آئے۔

اس وقت تک خلیفہ ہارون الرشید کو حکومت کرتے ہوئے دو دہائیاں بیت چکی تھیں۔ گزشتہ بیس برس کے دوران میں کیا اہم واقعات پیش آئے یہ جاننا میرے اور عارج کیلئے ضروری تھا۔ ہمیں کیونکہ اب دارالحکومت بغداد ہی میں رہنا تھا اس لئے لاعلمی سے کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔

عراق کی حدود میں داخل ہوتے ہی ہم نے اپنی پراسرار قوتوں کو متحرک کر لیا۔ اب ہم کسی اور زمانے میں نہیں تھے جو ان قوتوں کو بروئے کار لانے میں احتیاط اور گریز سے کام لیتے۔

اقتدار میں آنے کے پانچ سال بعد 175 ہجری میں ہارون نے اپنے بیٹے امین کو ولی عہد مقرر کیا۔ خلیفہ کے حکم پر امین کے ہاتھ پر ولی عہدی کیلئے بیعت لی گئی۔ امین کی عمر اس وقت صرف پانچ سال تھی۔ پھر 182 ہجری میں ہارون نے اپنے ایک اور بیٹے عبداللہ کی ولی عہدی کی خاطر بیعت لی کہ امین کے بعد تخت خلافت کا یہ وارث ہوگا۔ ہارون نے عبداللہ کو المامون کا لقب عطا کیا۔

یہ واقعہ 186 ہجری کا ہے۔ خلیفہ ہارون نے انبار سے بہ قصد حج مکہ معظمہ کا سفر اختیار کیا۔ خلیفہ کے ساتھ محمد امین' عبداللہ مامون اور قاسم دونوں بیٹے تھے۔ اس نے روانگی سے قبل ولی عہدی کی تجدید کیلئے بیعت کر لی۔ سب سے پہلے امین کی بیعت لی گئی۔ ہارون نے امین کو عراق' شام اور بقیہ تمام عرب علاقوں کی حکومت عطا کی۔ اس کے بعد مامون کو ولی عہد مقرر کیا۔ مامون کو خراسان اور ہمدان کے صوبہ جات تا اقصائے مشرق دیئے۔ مامون کے بعد ہارون نے اپنے تیسرے بیٹے قاسم کی ولی عہدی کیلئے بیعت لی۔ قاسم کو اس نے موتمن کا لقب دیا۔ ہارون نے اسی کے ساتھ مامون کو یہ اختیار دیا تھا کہ قاسم کے نالائق ہونے کی صورت میں اسے معزول کر سکتا تھا۔ قاسم کو جزیرہ ثغور اور عواصم کی حکومت ملی۔

یوں خلیفہ ہارون نے اپنی زندگی ہی میں ولی عہدی کا معاملہ طے کر دیا۔ پہلے امین' پھر مامون اس کے بعد قاسم کو اقتدار سنبھالنا تھا لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ اپنی مخلوق کو خالق کل نے مکمل طور پر بااختیار نہیں بنایا۔ یہی سبب ہے کہ آئندہ حالات و واقعات اسی طرح پیش نہیں آئے جن کا اندازہ خلیفہ ہارون الرشید نے کیا تھا۔ ان واقعات کا تفصیلی ذکر میری

سرگزشت میں آگے آئے گا۔ فی الحال تو میں ہارون کے سفر حج کا ذکر کر رہی ہوں اور اس ذکر کی بھی ایک خاص وجہ ہے جس کا تعلق ولی عہدی کے عہد نامے سے ہے۔

مدینہ منورہ پہنچ کر خلیفہ ہارون الرشید نے اہل مدینہ کو انعامات دیئے اور مستحقین میں خیرات تقسیم کی۔ امین' مامون اور اپنی طرف سے ہارون نے ایک کروڑ 5 لاکھ دینار راہ خدا میں صرف کیے۔ اسی طرح مکہ معظمہ میں خلیفہ نے داد و ہش سے کام لیا۔ ہارون نے فقہاء' قضاۃ اور سرداران لشکر کو طلب کر کے دونوں خلیفہ زادوں کی طرف سے جدا جدا عہد نامے لکھوائے۔ ان میں سے ایک عہد نامہ امین کی طرف سے ماموں کے ساتھ وفا کرنے کا تھا۔ دوسرا عہد نامہ مامون کی جانب سے امین کے ساتھ ایفائے عہد کا تھا۔ ان دستاویزات کو شہادتوں سے مکمل کر کے خلیفہ نے خانہ کعبہ میں آویزاں کرا دیا۔

خلیفہ ہارون الرشید کے گزشتہ 20 برس کے دور حکومت میں سب سے اہم واقعہ خاندان برامکہ کا زوال ہے۔

خاندان برامکہ میں جو سب سے پہلے عہدہ وزارت پر فائز کیا گیا وہ خالد برمکی تھا۔ اس کے اجداد آتش کدہ نوبہار کے متولی تھے۔ اس آتش کدے کو بادشاہ فارس منوچہر نے ماہتاب کے نام پر بنوایا تھا۔ مشہور آتش کدوں میں یہ درجہ چہارم پر تھا۔ جب عہد خلافت حضرت عثمانؓ میں خراساں فتح ہوا اور اسلامی حکومت تمام اطراف میں پھیل گئی۔ اس وقت یہ آتش کدہ بھی جو عہد منوچہر سے آباد چلا آتا تھا' ویران ہو گیا اور خاندان برامکہ رنج و مصیبت میں پھنس گیا۔ پھر عہد خلافت ولید بن عبدالملک اموی میں قتیبہ بن مسلم' حجاج کی طرف سے خراسان کا عامل (گورنر) ہو کر خراسان پہنچا۔ اس نے ایک بڑی فوج مرتب کر کے مرو پر فوج کشی کر دی۔ اس لڑائی میں جہاں اور مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا وہاں عورتیں بھی گرفتار ہو کر آئی تھیں جنہیں لونڈیاں بنا لیا گیا تھا۔ ان میں ایک عورت برمک کی تھی۔ مال غنیمت کی تقسیم کے وقت یہ عورت عبداللہ بن مسلم (برادر قتیبہ) کے حصے میں آئی۔

چند روز کے بعد اہل بلخ سے صلح ہوئی تو قتیبہ کے حکم سے لونڈیاں واپس ہوئیں۔ مجبوراً عبداللہ نے اس برمکی عورت کو بھی برمک کے پاس واپس کر دیا۔ وہ عورت ماں بننے والی تھی۔ اسی بنا پر یہ شرط قرار پائی کہ اگر بیٹا پیدا ہوا تو ہمارا ہے۔ سو بیٹا ہی پیدا ہوا اور اسے مسلمانوں کے حوالے کر دیا گیا۔ اسی کا نام خالد رکھا گیا جو بعد میں خالد برمکی کہلایا۔

خالد برمکی کا عروج 132 ہجری عہد خلافت سفاح سے شروع ہوتا ہے۔ سفاح ہی نے اسے وزارت کا معزز عہدہ عطا کیا۔ سفاح کے مرنے تک خالد نے وزارت کی۔ خلیفہ المنصور

خلافت کی مسند پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے بھی خالد کو وزارت ہی کے عہدے پر رکھا۔ ایک سال ایک مہینے کے بعد ابو ایوب موریانی کی حکمت عملی سے خلیفہ منصور نے خالد کو بغاوت اکراد فرو کرنے کیلئے فارس بھیج دیا۔ خالد چلا گیا تو ابو ایوب موریانی کو قلمدان وزارت کا مالک بنا دیا گیا۔ اگرچہ پھر خالد کو عہدہ وزارت نصیب نہیں ہوا لیکن بڑی بڑی ذمہ داریوں کے کام اس کے سپرد رہے۔ زمانہ ولی عہدی میں وہ خلیفہ مہدی کا اتالیق بھی رہا۔ موصل کی حکومت اس کے سپرد کی گئی۔ غرض وہ جب تک زندہ رہتا ممتاز عہدوں سے سرفراز رہا۔ خالد ہی کا بیٹا یحییٰ برمکی تھا جس کا ذکر میری سرگزشت میں آ چکا ہے۔

☆......☆......☆

یحییٰ برمکی' ہشام بن عبدالمالک اموی کے زمانہ خلافت میں پیدا ہوا۔ جب اس کے شباب کا زمانہ آیا تو اس کا نامور باپ خالد برمکی دولت عباسیہ کے اراکین سلطنت میں شمار کیا جاتا تھا۔ خالد کی کارگزاریوں اور یحییٰ کی قابلیت پر نظر کر کے یحییٰ کو خلیفہ مہدی نے ہارون الرشید کا اتالیق مقرر کر دیا۔ ہارون نے اسی کی آغوش تربیت اور نگرانی میں تعلیم پائی۔ جب ہارون کو خلیفہ مہدی نے حدود مغرب' آذربائیجان اور ارمینیہ کا عامل بنایا تو منجملہ اور خاص خاص آدمیوں کے جو ہارون کے ہمراہ بھیجے گئے یحییٰ برمکی بھی تھا۔

جس وقت خلیفہ ہادی نے ہارون کو خلافت و سلطنت سے محروم کرنے کیلئے مختلف تدبیریں کی تھیں۔ یحییٰ نے ان تدبیروں کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس کی پاداش میں اسے سزائے قید جھیلنا پڑی تھی۔ یہ تفصیلی بیان پہلے آ چکا ہے۔

ہارون نے تخت خلافت پر متمکن ہوتے ہی یحییٰ برمکی کو امور سلطنت میں سیاہ و سفید کا اختیار دے دیا تھا۔

بیس برس کے اسی عرصے میں مادر ملکہ خیرزان (ہارون کی ماں) کا انتقال بھی ہو چکا تھا۔ خیرزان کی موت کے بعد یحییٰ برمکی کا قدم استقلال مزید مستحکم کے ساتھ سلطنت میں جم گیا۔ اس کا خاندان بہت بڑا تھا۔ حقیقی اور چچازاد نیز بھتیجے کثرت سے تھے۔ اس کے بیٹے جعفر' فضل اور محمد اپنے باپ کی طرح امور سلطنت میں دخیل تھے۔ خلیفہ کے ورثاء کا ان کو بہت بڑا حصہ ملا تھا۔ خلیفہ سے ان کو خاص نسبت تھی۔ فضل تو خلیفہ ہارون کا دودھ شریک بھائی تھا۔ فضل کی ماں نے ہارون کو اور ہارون کی ماں خیرزان نے فضل کو دودھ پلایا تھا چونکہ ہارون نے یحییٰ کی گود میں پرورش پائی تھی اس وجہ سے ادب کے ساتھ یحییٰ کو باپ کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ یحییٰ کے معمر ہو جانے پر فضل اور جعفر کو عہدہ وزارت پر سرفراز کیا تھا۔ مامون کی ولی عہدی کے بعد ہی جعفر برمکی کو اتالیقی کی خدمت سپرد کی گئی تھی۔ ان تمام مہمات' انتظامات اور ملکی خدمات کو اس خاندان کے افراد نے نہایت حسن و خوبی سے سرانجام دیا۔ رعایا سے خلیفہ تک سبھی ان کے

مداح تھے مگر ہمیشہ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ ہر عروج کو زوال ہے۔ یہی اس خاندان کے ساتھ ہوا۔

ہوا یہ کہ رفتہ رفتہ خاندان برامکہ کا اقتدار اور جاہ و جلال حکومت و سلطنت میں اس درجہ بڑھ گیا کہ خلیفہ کا نام ہی نام رہ گیا۔ امور سلطنت میں سیاہ و سفید کے یہی مالک تھے۔ اس بنا پر امرائے دولت کو اس خاندان کے افراد سے حسد پیدا ہوا اور وہ موقع پا کر خلیفہ سے ان کی شکایتیں کرنے لگے۔ کثرت سے شکایات کے سبب خلیفہ کو بھی اس امر کا احساس ہوا کہ برامکہ کے نام ہی کا ڈنکا ہر طرف سنائی دیتا ہے۔ خاص طور پر جعفر برمکی کی طرف سے خلیفہ ہارون قدرے خفا ہو گیا۔ اس خفگی کا اظہار اس طرح ہوا کہ ہارون چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور فروگزاشتوں کو ان آنکھوں سے دیکھنے لگا جن سے سنگین اور ناقابل معافی جرائم دیکھے جاتے تھے۔

خلیفہ ہارون کی برہمی کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس نے یحییٰ بن عبداللہ کو جعفر برمکی کی تحویل میں بغرض نظر بندی دیا تھا۔ جعفر برمکی نے خلیفہ کی اجازت و اطلاع کے بغیر رہا کر دیا۔ فضل بن ربیع نے خلیفہ کو اس واقعے سے مطلع کر دیا۔ اس پر خلیفہ نے جعفر سے استفسار کیا۔ جعفر نے اس خبر کی تصدیق کر دی۔

خلیفہ کو جعفر کی اس خودرائی اور ایسے باغی ملزم کے رہا کر دینے سے کشیدگی پیدا ہوئی۔ وقتاً فوقتاً لوگوں کی شکایتوں سے یہ کشیدگی بڑھتی گئی۔ نتیجہ یہ کہ خلیفہ صاف طور پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے لگا۔ بات بات پر اعتراض کرنے کو بھی خلیفہ نے اپنا وطیرہ بنا لیا۔

اسی عرصے میں ایک روز یحییٰ برمکی حسب دستور قدیم خلیفہ ہارون کی خدمت میں بلا اطلاع حاضر ہوا۔ اس وقت شاہی طبیب جبرئیل بن بخت یشوع بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ خلیفہ ہارون نے اسے مخاطب کیا۔ ''کیوں جبرئیل تمہارے گھر میں بھی یوں ہی بلا اطلاع لوگ آ جاتے ہیں؟''

عیسائی طبیب جبرئیل نے عرض کیا۔ ''اے امیر المومنین یہ کیونکر ممکن ہے۔''

یہ جواب سن کر خلیفہ ہارون یحییٰ برمکی کی طرف متوجہ ہوا۔ یحییٰ بولا۔ ''اے امیر المومنین! یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں ہمیشہ بلا اجازت ہی حاضر ہوتا تھا۔ اگر پہلے سے مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میری اس طرح حاضری مزاج ہمایوں کو ناگوار خاطر ہوتی ہے تو میں خود کو اسی طبقے میں رکھتا جس کے افراد اجازت کے پابند ہیں۔''

خلیفہ ہارون یہ سن کر شرمندہ سا ہو گیا۔ اس نے گردن جھکا کر کہا۔ ''تم اپنے دل میں

کچھ خیال نہ کرو میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی۔"

ہمیشہ کا دستور تھا کہ جب یحییٰ برمکی دربار خلافت میں آتا تو حاجب، دربان اور خدام اسے تعظیم دینے کی خاطر اٹھ کھڑے ہوتے تھے لیکن شکر رنجی کے بعد خلیفہ ہارون کے ایما پر اس کے خادم خاص مسرور نے یحییٰ برمکی کو تعظیم دینے کی ممانعت کر دی۔ جس وقت یحییٰ برمکی دربار خلافت میں حاضری کی غرض سے آتا تو دربان منہ پھیر لیتے تھے۔ اسی سبب یحییٰ نے دربار میں جانا کم کر دیا۔ یوں ہارون کو ایک اور بہانہ مل گیا۔

دراصل حکومت و اختیارات کے بارے میں برامکہ اپنا ایک الگ نقطہ نظر رکھتے تھے۔ اسی پر انہوں نے عمل کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر کسی کو کوئی عہدہ دے دیا جائے تو پھر اس سے جواب طلبی نہ ہو۔ کسی بھی سطح پر اس کے اختیارات میں مداخلت مناسب نہیں۔

یحییٰ برمکی کی عمر زیادہ ہو گئی تو اسی کے مشورے سے جعفر برمکی کو خلیفہ ہارون نے عہدہ وزارت پر مقرر کر دیا۔ جعفر برمکی بھی اپنے باپ کی طرح خود کو مختار کل سمجھتا تھا۔ وہ جو چاہتا کرتا اور خلیفہ ہارون کی اجازت یا مرضی معلوم کرنے کو ضروری نہ سمجھتا۔ اسی وجہ سے خلیفہ اور اس کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوتا گیا۔

بدخواہوں کو موقع مل گیا تو انہوں نے خلیفہ کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ امرائے دربار میں سے ایک نے خلیفہ ہارون سے قسم کھا کر بتایا کہ جعفر برمکی اب یہ کہنے لگا ہے کہ میں کسی کو بھی اپنے امور میں جواب دہ نہیں خواہ وہ امیر المومنین ہی کیوں نہ ہوں۔

جو کچھ کہا گیا حقیقت پر مبنی تھا۔ جعفر برمکی نے واقعی یہی کہا تھا۔ پھر سازشیوں نے ایسا بندوبست کیا کہ خلیفہ ہارون خود اپنے کانوں سے یہ الفاظ سن لے۔

ایک درباری کی کسی بات کے جواب میں جعفر برمکی نے برملا کہا" نہ صرف مجھے بلکہ خاندان برامکہ کے کسی بھی صاحب منصب کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے طور پر کوئی فیصلہ کر لے۔ اس کیلئے اسے امیر المومنین کی بھی اجازت کی ضرورت نہیں۔" یہ وہ الفاظ تھے جو گویا نشتر بن کر خلیفہ ہارون الرشید کی سماعت میں اتر گئے۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا۔

187 ہجری میں خاندان برامکہ زوال پذیر ہوا۔ اس وقت خلیفہ ہارون الرشید حج سے واپسی کے بعد انبار میں مقیم تھا۔ جعفر برمکی بھی اس کے ساتھ تھا جس رات خلیفہ نے چھپ کر جعفر برمکی کے باغیانہ الفاظ سنے اسی رات کو اس نے ایک سخت فیصلہ کر لیا۔ خلیفہ نے اپنے خادم خاص مسرور کو گرز برداروں کی ایک جماعت کے ساتھ طلب کیا اور حکم دیا۔

"اسی وقت جعفر کے خیمے میں جا اور اسے خیمے کے در پر بلا کر اس کا سر اتار لا۔"

مسرور یہ سن کر کانپ اٹھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے خلیفہ کی خدمت میں عرض کیا۔

"حضور امیر المومنین اپنے حکم پر نظر ثانی فرما لیں۔"

خلیفہ نے اپنے خادم خاص کو ڈانٹ دیا۔" تجھے ہمارے حکم کی تعمیل کرنی ہے جو سوچنا تھا ہم سوچ چکے۔"

مسرور تذبذب کا شکار رہے۔ اس کا سبب خاندان برامکہ کا اقتدار تھا۔ اسے حقیقت کا علم نہیں تھا کہ خلیفہ کیوں اس قدر برہم ہے۔" تو ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔" خلیفہ کا لہجہ اب جواب طلبی کا تھا۔" حکم کی تعمیل کرو ورنہ تیری خیر نہیں۔"

مسرور نے جب یہ دیکھا کہ خلیفہ ہارون کا غصہ لحہ بہ لحہ بڑھتا ہی جا رہا ہے تو تعمیل حکم ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ وہ گرز برداروں کو ساتھ لے گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد خلیفہ کے سامنے جعفر برمکی کا کٹا ہوا سر پیش کر دیا گیا۔ اسی شب ہارون نے فضل برمکی کو بھی گرفتار کرا کے قید میں ڈلوا دیا۔ اسی کے ساتھ یحییٰ برمکی اور خاندان کے دیگر تمام افراد کے بارے میں فرمان جاری کر دیا۔

فرمان کے مطابق اس خاندان کے تمام افراد کی جاگیریں، مکانات، خدام اور مال و اسباب ضبط کیا جانا تھا۔ یہ گشتی فرمان تمام ممالک میں بھیج دیا گیا۔ خاندان برامکہ کے سبھی چھوٹے بڑے پکڑے گئے۔ عتاب خلیفہ سے صرف محمد برامکی محفوظ رہا۔

اگلے دن جعفر برمکی کی لاش خلیفہ ہارون کے حکم سے بغداد روانہ کر دی گئی۔ خلیفہ کے حکم میں یہ الفاظ بھی شامل تھے کہ جعفر برمکی کی لاش کے دو ٹکڑے کر کے پل پر نصف نصف دونوں جانب آویزاں کر دیے جائیں۔ یہ وہ پل تھا جو عمال حکومت کیلئے مخصوص تھا۔

میں 190 ہجری میں عراق پہنچی تھی۔ چند روز قبل ہی شہر کوفہ کے زنداں میں یحییٰ برمکی کا انتقال ہوا تھا۔ یحییٰ کے زمانہ وزارت میں دربار خلافت اہل علم و اہل کمال سے بھرا رہتا تھا۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کے عربی ترجموں کو ترقی ہوئی۔ یحییٰ بہت فیاض، رحیم، کریم اور رقیق القلب آدم زاد تھا۔ اس کی معلومات وسیع تھیں۔ وہ شاعر بھی تھا اور علم نجوم میں اسے خاص مہارت حاصل تھی۔ اس کے آٹھ بیٹے تھے ان میں جعفر اور فضل زیادہ مشہور ہوئے۔ انہی دونوں کے اقتدار اور جاہ و جلال کے افسانے عہد خلافت ہارون الرشید میں ہر ایک کی زبان پر آئے۔

جعفر قتل کیا جا چکا تھا۔ یحییٰ کی وفات ہو گئی تھی۔ اب خاندان برامکہ کا محض ایک قابل ذکر شخص اور خلیفہ کا دودھ شریک بھائی فضل برمکی زندہ بچا تھا۔ وہ رقہ کے زنداں میں قید تھا۔

علوم وفنون کو ترقی دینے میں فضل برمکی کا بھی بڑا حصہ تھا۔ کاغذ بنانے کا کارخانہ اسی نے لگوایا تھا۔ ہارون کے بیٹے مامون کا اتالیق فضل برمکی ہی تھا۔

بیان کردہ واقعات کے علاوہ گزشتہ بیس برس کے ابتدائی ایام میں میری اور عارج کی نسبت سے ایک اور اہم واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ میں اور عارج قصر خلافت میں ایک عرصے تک رہے تھے۔ اس کیلئے ہم نے ایک آدم زادی جمیلہ اور ایک آدم زاد ایوب کے قالبوں کا سہارا لیا تھا۔ یہ دونوں ہی خلیفہ وقت کے خاص خادموں میں سے تھے۔

ان دونوں کے بارے میں پتہ یہ چلا تھا کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ایک دن پراسرار طور پر وہ اپنی قیام گاہ میں مردہ پائے گئے تھے۔ نجف سے بغداد آئے انہیں دوسرا ہی دن تھا۔ ایوب و جمیلہ کی موت کے متعلق یقینی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا البتہ قیاس اغلب یہی تھا کہ انہیں عفریت وہموش نے قتل کیا ہوگا۔ اس طرح وہ قصر خلافت میں ہمارے ٹھکانے ختم کرنا چاہتا ہوگا۔ اس سے وقتی طور ہی سہی ہم پریشان ضرور ہو گئے تھے۔ اب ہمیں نئے انسانی قالب تلاش کرنے پڑتے۔ ضروری نہیں تھا ہمیں ایسے انسانی پیکر مل جاتے کہ ہم ساتھ رہ سکتے۔

یہی سوال مجھ سے عارج نے بھی کر دیا تو میں نے جواب دیا۔ ''اللہ مالک ہے' وہی ہمارے لئے کوئی راہ نکال دے گا۔ پہلے تو ہمیں عالم سوما سے ملنا ہے' اس کے بعد ہی ہمارے لئے کوئی فیصلہ کرنا ممکن ہوگا۔''

یہ رات کا وقت تھا۔ عارج اور میں ریت کے ایک ٹیلے کے نیچے صحرا میں بیٹھے تھے۔ دراصل ہم اس وقت بابل کے کھنڈرات میں پہنچنا چاہتے تھے کہ فوری طور پر عالم سوما سے ہماری ملاقات ہو سکے۔ اس کیلئے عشاء کے بعد کا وقت ہی مناسب تھا۔ صحرا میں ٹھہر کر ہم یہی انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے اندازے کے مطابق جب وقت ہو چکا تو ہم وہاں سے بابل کیلئے چل پڑے۔ صحرا میں رکنے کا ایک مقصد گزشتہ بیس برسوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا بھی تھا۔

عارج کے ساتھ جب میں بابل کے کھنڈرات میں پہنچی تو صورتحال میری توقع کے خلاف تھی۔ ہم کھنڈرات کے اس حصے میں تھے جہاں عالم سوما سکونت پذیر تھا۔
میری پہلی نظر اپنے قبیلے کے طبیب ہامہ بن ہیم پر پڑی۔ پھر میں نے عالم سوما کو ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے پڑے دیکھا۔ وہ مجھے بے ہوش معلوم ہوا تو میں نے طبیب سے پوچھا۔ ''اے ہامہ! یہ عالم سوما کو کیا ہوا؟''

''کمزوری کی وجہ سے اس پر غفلت طاری ہوگئی ہے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں' میں نے اسے دوا سنگھا دی ہے مگر فوری طور پر یہ ہوش میں نہیں آئے گا' ممکن ہے ہوش میں آتے آتے نصف شب ہو جائے۔'' طبیب ہامہ نے بتایا۔

''لیکن اے طبیب! اسے بیماری کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''اے میری بچی! خود بڑھاپا ایک بیماری ہے۔'' طبیب ہامہ نے جواب دیا۔ ''سوما کو میں نے تاکید کی تھی کہ رات رات بھر عبادت کی مشقت نہ اٹھایا کرے کہ اب اس کا وجود اس کا متحمل نہیں رہا مگر وہ نہیں مانا۔ نتیجہ سامنے ہے' خیر..... تو بتا اے دینار! کہاں اور کس حال میں ہے؟ اور..... اور یہ عارج..... اس نے تو شاید مجھے بھلا ہی دیا ہے۔''

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی عارج بول اٹھا۔ ''اے ہامہ! یہ بھلا کس طرح ممکن ہے کہ میں تجھے بھول جاؤں۔''

''تو مجھے یاد رکھتا ہے اسی لئے تو برسوں گزر جانے پر بھی کبھی ملنے نہیں آتا۔'' ہامہ کی آواز میں چبھن تھی۔

''میں درحقیقت یہاں عراق میں نہیں تھا۔'' عارج اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''تم دونوں ساتھ ہی رہتے ہو تو شادی کیوں نہیں کر لیتے۔'' اس مرتبہ طبیب ہامہ مجھ سے بھی مخاطب تھا۔

''میں تو دینار سے کئی بار یہ کہہ چکا ہوں مگر.....'' عارج کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے میرے غصے کو محسوس کر لیا تھا۔

''اگر سردار اخضم کو راضی کرنا ہے تو میں اس سے بات.....''

''نہیں اے ہامہ!'' میں بول اٹھی۔ ''ابھی میں یہ ذمہ داری خود ہی قبول نہیں کرنا چاہتی۔''

''تیری مرضی'' ہامہ نے کہا اور پھر وہ نہیں رکا۔

ہامہ کے جاتے ہی میں نے عارج کی خبر لی۔ ''تو کیا کہہ رہا تھا ہامہ کے سامنے؟''

''تو نے کچھ کہنے کہاں دیا اے دینار!'' عارج حسرت بھرے لہجے میں بولا۔

''ہر ایک کے سامنے بکواس نہ کیا کر..... سن! میں اپنے ماں باپ اور بھائی سے مل کر آتی ہوں تو یہیں ٹھہر..... لگتا ہے عالم سوما کو جلد ہوش نہیں آئے گا۔ ہامہ نے کہا تھا کہ آدھی رات بھی ہو سکتی ہے۔'' میں یہ کہہ کر وہاں سے چل دی۔

اپنے بھائی یوسف سے تو میری ملاقات نہیں ہو سکی ہاں ماں باپ سے ضرور مل لی۔ ان

دونوں ہی نے مجھے چمٹالیا۔

''اب تو برسوں بعد ملنے آیا کرے گی اے دینار!'' ماں نے شکایت کی۔

''اے میری ماں! میں ہندوستان گئی ہوئی تھی۔''

''اور عارج'' میرے باپ نے سوال کیا۔

''وہ بھی میرے ساتھ تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

دیر تک میں اپنے ماں باپ سے باتیں کرتی رہی اور پھر عالم سوما کے پاس آ گئی۔ اسے ہوش آ چکا تھا۔ عارج کو میں نے اس سے باتیں کرتے دیکھا۔ میں پہنچی تو عالم سوما میری طرف متوجہ ہوگیا۔

''تو ٹھیک تو ہے اے دینار! اے میری بچی!'' عالم سوما کہنے لگا۔

''میں تو ٹھیک ہوں اے میرے باپ کے دوست! مگر تو ٹھیک نہیں لگتا۔''

''ہو جاؤں گا ٹھیک...... فکر نہ کر تو...... یہ عارج ابھی مجھے بتا رہا تھا کہ تیرا ارادہ اب دوبارہ بغداد میں رہنے کا ہے۔''

''ہاں اے عالم سوما! اس نے تجھ سے ٹھیک ہی کہا ہے۔'' میں بولی۔

''فی الحال تم دونوں کا بغداد میں رہنا قطعی ممکن نہیں۔'' عالم سوما نے کہا۔

''وہ کیوں اے سوما؟ ہم بغداد میں کیوں نہیں رہ سکتے؟...... کیا ابھی تک اس بوڑھے عفریت دہموش کا خطرہ ٹلا نہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''بیس برس پہلے تیرے ایما پر ہم اس عفریت کے خطرے کی وجہ سے عراق چھوڑ کر گئے تھے' کیا اب بھی یہاں ہمارے لئے خطرہ ہے؟''

''اب اس خطرے کی نوعیت بدل گئی ہے لیکن خطرہ بہرحال موجود ہے۔'' عالم سوما نے میرے سوال کا جواب دیا' پھر وضاحت کرنے لگا۔

''دراصل عفریت دہموش تمہیں بھولا نہیں ہے اور اسے یقین ہے کہ تم دونوں ایک نہ ایک دن لوٹ کر بغداد ضرور آ ؤ گی۔ نجف سے جب تمہارے انسانی قالب ایوب اور جمیلہ بغداد پہنچے تو دہموش کو معلوم ہوا کہ تم ان جسموں سے نکل کر راہ فرار اختیار کر چکے ہو' میں اس پر نظر رکھے ہوئے تھا' اس نے غصے اور جھنجلاہٹ میں ایوب اور جمیلہ کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ پھر وہ کافی عرصے تک تمہیں بغداد' نجف' موصل وغیرہ کے علاوہ عراق کے دوسرے شہروں میں بھی تلاش کرتا رہا۔ اسے تمہارا کہیں سراغ نہیں ملا تو بغداد میں سکونت اختیار کر لی۔ شمالی بغداد کے پہاڑوں میں اس کا ٹھکانہ تھا۔ وہی جگہ تھی یہ جہاں اس کی حبشی کنیز سارہ تجھے اغوا کر کے

لے گئی تھی اے دینار! یاد آیا تجھے؟''

''ہاں اے عالم سوما! مجھے یاد ہے۔'' میں نے تصدیق کی پھر بولی۔ ''تو تھک گیا ہوگا' کچھ ستا لے۔''

''میری فکر نہ کر اے دینار! میں ٹھیک ہوں۔'' عالم سوما نے یہ کہہ کر دوبارہ عفریت دہموش کا ذکر چھیڑ دیا۔ ''معلوم یہ ہوا کہ عراق کی طرح مصر اور زمین پر آباد دوسرے ملکوں میں بھی دہموش کے ٹھکانے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے کہ جب میں بیمار نہیں ہوا تھا' وہ عفریت بغداد سے مصر کے شہر قاہرہ چلا گیا۔ کچھ خبر نہیں کہ وہ وہاں کب تک رہے لیکن قیاس یہی ہے کہ جلد بغداد واپس نہیں آئے گا۔ یہ اندازہ میں نے اس مخصوص حصار سے لگایا جو صرف تمہارے اور عارج کیلئے بغداد کے گرداگرد کھینچا گیا ہے۔ عارج یا تو جیسے ہی اس حصار کو عبور کرے گی تو دہموش کی حبشی کنیز سارہ کو اس کا پتہ چل جائے گا اور پھر دہموش کو اس سے آگاہ کر دے گی۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے قبیلے کے کچھ کافر جنات کو بھی حصار کی نگرانی پر متعین کیا گیا ہے۔ یہ وہ کافر جنات ہیں جو تم دونوں کے وجود کی خوشبو سے تمہیں پہچان سکتے ہیں' انہی حالات کے پیش نظر میں نے کہا تھا کہ تم دونوں کا بغداد میں رہنا فی الحال قطعی ممکن نہیں۔''

''فی الحال!'' میں نے کہا۔ میرے نزدیک یہ لفظ بہت اہم تھا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ہم بغداد میں رہ سکتے ہیں۔''

''اے دینار! مجھے امید تھی کہ تو لفظ فی الحال کو نظرانداز نہیں کرے گی۔'' عالم سوما بولا۔ ''ہاں یہ پابندی عارضی ہے یعنی فی الحال...... صرف اس وقت تک کہ بغداد کے گرداگرد حصار کو میں توڑ نہ دوں' اس حصار کو توڑنے کیلئے مجھے چالیس دن تک ایک عمل کرنا پڑے گا' رہے کافر جنات تو انہیں مار بھگانا کون سا مشکل ہے۔''

''مگر اے سوما! کیا حصار کے توڑے جانے سے وہ عفریت چوکنا نہیں ہو جائے گا؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں' اسے حصار ٹوٹنے کا علم نہیں ہو سکے گا۔'' عالم سوما نے جواب دیا۔ ''مگر ابھی کیونکہ میں بیمار ہوں اس لئے مطلوبہ عمل کرنا......''

''میں سمجھتی ہوں اے میرے باپ کے دوست!'' میں بول اٹھی۔ ''تو آرام و علاج کر' جب صحت یاب ہو جائے تو حصار توڑنے کیلئے عمل کر لینا۔ اتنے میں عارج کو لے کر کچھ عرصے کیلئے کسی اور زمانے میں چلی جاتی ہوں۔''

''اس مرتبہ کی طرح لوٹنے میں بیس برس نہ لگا دیجیو' اے دینار!'' عالم سوما نے

کہا۔

”تجھ سے ایک بات اور پوچھنی تھی اے سوما!“ میں بولی۔ ”کسی اور زمانے میں جا کر کیا انسانی قالبوں میں ہمارا روپوش رہنا بھی ضروری ہے؟...... یہ عارج کوئی انسانی جسم اپنانے پر بہت بضد رہتا ہے۔“

”ضروری تو نہیں لیکن مزید احتیاط کے طور پر تم دونوں انسانی قالبوں ہی میں رہو تو بہتر ہے۔“ عالم سوما نے جواب دیا۔ میں نے یہ بات عالم سوما سے اس لئے بھی پوچھی تھی کہ کبھی کبھار انسانی قالبوں کی فطری صفات ہم پر غالب آنے لگتی تھیں۔ اس کا تلخ تجربہ عارج کے سلسلے میں مجھے دو مرتبہ ہو چکا تھا۔

وہ رات ہم نے بابل کے کھنڈرات ہی میں گزاری اور صبح دم ایک بار پھر عراق سے روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ بھی ہماری منزل ہندوستان ہی کی سرزمین تھی۔ ہندوستان کی آب و ہوا سے ہم خاصی حد تک مانوس ہو چکے تھے۔ عارج نے وہیں چلنے پر اصرار کیا تھا۔

190 ہجری سے ہم سینکڑوں صدیوں آگے نکل آئے۔ یہ مغل تاج دار، ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر کا عہد تھا۔ جہانگیر کو ہندوستان پر حکومت کرتے ہوئے 6 سال گزر چکے تھے، اب 1021 ہجری تھی، یوں گویا مستقبل میں ہم 831 سال آگے پہنچ گئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ بابر کی شجاعت، ہمایوں کی علم دوستی اور اکبر کا تدبر تیموری تخت پر جہانگیر کی شکل میں مجسم ہو گیا تھا مگر وہ ایک صاحب دل بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی عظیم الشان سلطنت حسن کے قدموں پر نچھاور کر دی۔ وہ ہندوستان کا شہنشاہ تھا لیکن اس کے دل پر ایک عورت حکمراں تھی جس کے اشارۂ چشم پر قسمتوں کے فیصلے ہوتے رہتے تھے۔ محبت اور سیاست کی اس آنکھ مچولی نے ہندوستان کو ہنستے بولتے زندگی گزارنے کا راز سکھایا۔

190 ہجری سے ہم 16 محرم 1021 ہجری میں پہنچے تھے۔ جلوس کا یہ ساتواں سال اور جشن نوروز تھا۔ اس سال کا یہ اہم واقعہ ہے کہ نوروز کے موقع پر ملکہ نور جہاں کی ماں کی خدمت میں عطر گلاب پیش کیا جو خود اس کی ایجاد تھی۔ بادشاہ نے اسے بہت پسند کیا اور اس کا نام ”عطر جہانگیری“ رکھا۔ نور جہاں کی ماں کو بادشاہ نے مروارید کا ایک ہار انعام میں عطا کیا۔ ہار کی قیمت 30 ہزار روپے تھی۔ یہ ایجاد واقعی حیرت انگیز تھی کہ کوئی خوشبو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی مہک اتنی مست کن تھی کہ آدم زاد تو آدم زاد ہم جنات کو بھی بے خود کر دے۔

ہم ہندوستان کے جس علاقے میں اترے پہلے اس کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کیں۔

حاصل معلومات یہ تھا جہانگیر نے ایام شہزادگی میں اپنے باپ اکبر کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اکبر کے نورتنوں میں سے ایک رتن شیخ ابوالفضل کو جہانگیر ہی نے قتل کرایا تھا، جو شخص ابوالفضل کا سر کاٹ کر لایا اور اسے جہانگیر کے قدموں میں ڈال دیا اس کا نام نرسنگھ راؤ تھا۔ اکبر کی وفات کے بعد جب جہانگیر ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تو اس نے نرسنگھ راؤ کو نظر انداز نہ کیا۔

شیخ ابوالفضل کے قاتل نرسنگھ راؤ کو مغلیہ دربار سے راجہ کا خطاب ملا اور گوالیار کے قریب ایک بڑا علاقہ بھی اس کی جاگیر میں شامل کر دیا گیا۔ نرسنگھ راؤ اسی علاقے کا تھا۔ یہ سارا علاقہ خاردار جنگلوں اور دشوار گزار گھاٹیوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس علاقے میں بسنے والے راجپوت بڑے جیالے اور عزت آن والے تھے۔ اکثریت راجپوتوں کی تھی اور مسلمان گھرانے برائے نام تھے۔ ان راجپوتوں کا پیشہ ایک زمانے سے سپہ گیری تھا۔ یہاں سے مغل فوج میں بھرتی ہونے والوں کی تعداد خاصی تھی۔ علاقے کا صدر مقام شاہ پور تھا۔

شاہ پور کے ایک بڑے اور معزز خاندان کا ایک فرد امر سنگھ بھی یہیں سے آگرہ گیا تھا۔ آگرہ اس وقت دارالحکومت تھا۔ یہ بات جہانگیر کے باپ اکبر کے زمانے کی ہے۔ اس زمانے میں شیخ سلیم الدین چشتی کی بہت شہرت تھی۔ امر سنگھ ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہو گیا۔ جب وہ شاہ پور لوٹ کر آیا تو اس کی بیوی اور بیٹوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تبھی سے وہ راجپوت خاندان دو حصوں میں بٹ گیا۔ امر سنگھ کا کوئی بھائی مسلمان نہ ہوا مگر خاندانی تعلق برقرار رہا۔ مسلمان ہو کر امر سنگھ نے اپنا نام حسن علی رکھ لیا تھا وہ پوتوں والا ہو کر مر گیا۔ اس نومسلم حسن علی کا ایک پوتا دلاور علی تھا۔

یہی وہ دلاور علی تھا کہ عارج نے اس کے جسم میں رہنا پسند کیا۔ اسے دلاور علی کے جسم میں اتر کر قرار آ گیا تھا۔

”اے عارج! تو بھی اس آدم زاد نوجوان دلاور علی کے جسم کو اپنا مستقبل ٹھانا نہ جان۔“ میں نے عارج کو تاکید کی۔

”وہ کیوں اے دینار؟“ عارج نے دریافت کیا۔

”میں پہلے اس آدم زاد کی فطری صفات کے بارے میں جان لینا چاہتی ہوں۔ اب میں گزشتہ تلخ تجربات کا اعادہ نہیں چاہتی۔ تیری قوت ارادی مضبوط نہیں اے عارج کہ تو کسی انسانی قالب کی فطری صفات کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دے۔“ میں نے جواب دیا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں اے دینار! تو اپنی تسلی کر لے۔“ عارج بولا اور دلاور علی کے

جسم سے باہر آ گیا۔

پھر میں نے دلاور کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں وہ اطمینان بخش ہی تھیں۔ اس کے کردار میں کجی نہیں تھی۔

بچپن ہی سے دلاور علی ذہین اور نڈر تھا۔ کیوں کہ دادا کے ہاتھوں اس کی تربیت ہوئی تھی اس لئے عقائد کے معاملے میں بھی وہ بہت مضبوط تھا۔ اسے بزرگان دین کی بڑی حکایتیں یاد تھیں۔

ہر جاگیر اور تعلقے کی طرح شاہ پور میں بھی ایک سالانہ جشن ہوتا۔ دلاور علی اس میں باقاعدگی سے حصہ لیتا تھا۔

منعقد ہونے والے سالانہ جشن میں جواں مردی اور بہادری کے مظاہرے کیے جاتے۔ راجا نرسنگھ راؤ جیتنے والے بہادروں کو انعامات دیتا۔ ان میں سب سے بڑا انعام دیر چکر تھا جسے بھی یہ اعزاز ملتا وہ سارے علاقے کا دیر (بہادر) کہلاتا۔ گزشتہ کئی برسوں سے یہ اعزاز کسی کو نہیں ملا تھا۔ اور اس کی وجہ تھی۔

دیر چکر کیلئے ہمیشہ دو نام سامنے آتے۔ پہلا نام راجہ نرسنگھ راؤ کے بیٹے جھجار سنگھ کا ہوتا اور دوسرا نام دلاور علی کا۔ دیر چکر حاصل کرنے کیلئے آخری مقابلہ انہی دونوں کے درمیان ہوتا۔ گھڑ سواری، نیزہ بازی، شمشیر زنی اور تیر اندازی میں وہ دونوں ہم پلہ ٹھہرتے اور مقابلہ برابر رہتا۔ دونوں کیونکہ ایک ہی اعزاز حاصل کرنے کی خاطر کئی سال سے لڑ رہے تھے اس لئے اندر اندر ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے تھے۔ جھجار سنگھ کو راجہ کا بیٹا ہونے پر ناز تھا تو دلاور علی کو اپنے معزز خاندان پر فخر تھا۔ دونوں ہی نوجوان تھے۔ ان کی عمریں اٹھارہ بیس سال سے زیادہ نہ تھیں۔ وہ اسی لئے بڑے پرجوش نظر آتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خاطر جدوجہد کرتے۔ بڑے بڑے بالوں والے وجیہہ و خوبصورت دلاور کو قدرت نے صرف بہادری کا جوہر ہی عطا نہیں کیا تھا بلکہ اس میں عشق کا جوہر بھی تھا۔ اس کی فطرت میں ہوس کا شائبہ تک نہ تھا۔

دلاور علی کی فطری صفات کو اچھی طرح پرکھ لینے کے بعد ہی عارج کو میں نے اس کا جسم اپنا لینے کی اجازت دی۔

اس دوران میں خود عارج نے بھی دلاور علی کے متعلق بہت سی باتیں معلوم کر لی تھیں۔ انہی کی روشنی میں عارج مجھ سے کہنے لگا۔ "اے دینار! اب تو پاربتی کے جسم میں اتر جا۔"

میں مسکرائی اور بولی۔ "یہ تو اس لئے کہہ رہا ہے کہ پاربتی تیرے انسانی قالب دلاور علی کی محبوبہ ہے لیکن تو کچھ باتیں بھول رہا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ابھی مجھے پاربتی کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ دوم یہ کہ ضروری نہیں مجھے اس کے جسم میں اتر کر قرار آ ہی جائے۔ سب سے اہم اور آخری بات یہ کہ وہ غیر مذہب کی ہے۔ کیا خبر دلاور اور پاربتی کا ملاپ ہو بھی سکے یا نہیں۔"

"تو پھر پاربتی کے متعلق معلوم کر اور دیر نہ لگا۔" عارج نے جلدی سے کہا۔ "تو کسی بھی زمانے میں چل، رہوں گا میں تیرے ساتھ ہی۔"

"بس رہنے دے، میں تجھے اچھی طرح جانتی ہوں تو بڑا ہی بے وفا ہے۔ جب میں تجھ سے گلہ کرتی ہوں تو الزام انسانی قالب پر لگا دیتا ہے...... خیر تو کہتا ہے تو اس پاربتی کو بھی دیکھے لیتی ہوں۔" میں نے عارج کو یقین دہانی کرائی۔

دلاور ہی کے خاندان کی دوسری شاخ سے پاربتی کا تعلق تھا۔ اسے گھر سے کم ہی نکلنے دیا جاتا تھا۔ اس کا سبب نوجوان دوشیزہ پاربتی کا بلاخیز حسن تھا۔ گھر والے اسے تنہا باہر بھیجتے ہوئے ڈرتے۔ اس کا حسن دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتا جس نے بھی اسے ایک بار دیکھا بھول نہ سکا۔ بڑے بوڑھے اسے دیکھ کر کہتے کہ صدیوں بعد اس علاقے میں ایسی حسین لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ دراز قد، چھریرا جسم، ہاتھ پاؤں اگرچہ کسی قدر چوڑے چکلے مگر موزونیت میں بے مثل، رنگ خوب کھلتا ہوا گندم گوں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی مستانہ آنکھیں، باریک اور نہایت خوبصورتی کے ساتھ بل کھاتی ہوئی بھنویں اور سیاہ لمبے گھنے بال، حسین رخساروں میں باریک باریک نیلی رگیں۔ یہ تھی وہ دوشیزہ پاربتی جو دلاور علی ہی نہیں عارج کو بھی پسند آ گئی تھی۔ میری نظر سے بھی ایسی آدم زادیاں کم ہی گزری تھیں۔ دلاور علی کو جانے کیوں یہ گمان تھا کہ مذہب کی دیوار پاربتی اور اس کے درمیان حائل نہیں ہوگی۔

بچپن ہی سے دلاور اور پاربتی ساتھ کھیلے کودے اور جوان ہوئے تھے۔ راجپوت اور مغل گھرانوں میں عورتیں اور لڑکیاں بھی باقاعدہ منجھے ہوئے استادوں سے فن حرب و ضرب سیکھتیں تاکہ وقت پڑنے پر اپنے مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ لڑ سکیں۔ سو پاربتی کو بھی بچپن سے یہ تربیت دی گئی۔ عورتیں اور لڑکیاں تربیت حاصل تو کر لیتیں مگر عموماً انہیں گھرداری میں زیادہ دلچسپی ہوتی۔ اسی وجہ سے سینکڑوں ہزاروں میں کوئی لڑکی یا عورت ایسی نکلتی جو اپنی تلوار کا لوہا مردوں سے بھی منوا لیتی۔ پاربتی بھی ایسی ہی لڑکیوں میں تھی۔ خاندان بھر میں دلاور کے سوا کوئی اس کے مقابل نہ ٹھہرتا اور کبھی کبھی تو وہ دلاور سے بھی کوڑی بلوا لیتی۔

ایسے وقت دلاور کی توجہ تلوار کے بجائے پاربتی کے چہرے پر ہوتی۔ وہ جیسے تلوار چلانا بھول جاتا۔

''بچو دلاور!'' پاربتی کہتی اور دلاور دانستہ تلوار پھینک دیتا۔

''تم ہار گئے۔'' وہ خوش ہوتی اور اس کا چہرہ گل و گلزار ہو جاتا۔

''ہاں میں ہار گیا پارو!'' دلاور کہتا۔ ''تم سے ہارنے میں بھی میری جیت ہے۔''

پاربتی جب دلاور کی ان باتوں کا مفہوم کچھ کچھ سمجھنے لگی تو اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑنے لگی۔ دلاور پیار میں اسے پاربتی کے بجائے پارو کہتا۔ دلاور کے سوا اسے کوئی اور پارو نہیں کہتا تھا۔ اس کی وجہ سے پاربتی کی زندگی میں کیا بڑی تبدیلی پیدا ہوئی میں یہ ذکر بعد میں کروں گی۔ پہلے میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ پاربتی کے جسم میں اتر کر مجھ پر کیا گزری۔

واقعہ یہ ہے کہ پاربتی کے جسم سے پہلے میں کبھی کسی کافر آدم زادی کے اندر نہیں اتری تھی۔

پاربتی کے جسم میں داخل ہوتے ہی مجھے گھپ اندھیرے اور گھٹن کا احساس ہوا۔ پھر بھی میں باہر نہیں نکلی اور اپنی قوت برداشت کا مظاہرہ کیا۔ کافی تگ و دو اور پوری کوشش و جدوجہد کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اس آدم زادی کے جسم میں ایک دن یا ایک رات سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔ مجھے اس کے جسم کو چھوڑنا پڑے گا۔ پھر دو چار گھڑی گزر جانے پر ہی میں دوبارہ پاربتی کے جسم کو اپنا سکتی ہوں۔ اس حقیقت سے میں نے عارج کو بھی بے خبر نہیں رکھا۔

''اے دینارا! تجھے اس طرح مستقل نہیں' عارضی ٹھکانہ تو مل ہی جائے گا۔'' عارج کہنے لگا۔

اس پر میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ میں نے سوچا تھا کہ اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہو گی۔ کسی انسانی قالب میں مستقل طور پر نہ رہنے کا تجربہ میں پہلے بھی کر چکی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب میں ہندوستان ہی کے ایک علاقے میں حبشی حمید خاں کی بیوی بن کر رہی تھی۔ رات کے وقت اکثر میں حمید خاں کی بیوی کا قالب بوجوہ چھوڑ دیتی تھی۔ انسانی قالب سے باہر رکھنے کی اس مدت میں اضافہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اس طرح میرے وجود کو کوئی خطرہ تو پیش نہیں آتا۔ اسی احساس کے پیش نظر میں نے عالم سوما کی رائے معلوم کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ کسی اور زمانے میں جا کر انسانی قالب کے اندر رہنا ضروری نہیں احتیاطاً البتہ یہ قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ دن کے وقت فی الحال پاربتی کے جسم میں رہا کروں گی۔ سو اسی روز میں پاربتی کے جسم میں اتر گئی۔

واقعہ اسی دن کا ہے راجہ کے بیٹے جھجار سنگھ نے مجھے پارو کہا۔ اس کے لہجے سے سفلے پن کا اظہار ہو رہا تھا جو مجھے گراں ہوا۔

دلاور علی کے انسانی قالب میں عارج بھی وہیں موجود تھا۔

جھجار سنگھ سے میں نے کہا۔ ''اب سے مجھے پارو نہ کہنا تم۔''

''کیوں؟'' جھجار سنگھ اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''بس کہہ دیا کہ نہ کہنا'' میں نے وجہ نہ بتائی کہ ایسا کہتے ہوئے وہ مجھے گھٹیا لگا تھا۔

اسی وقت عارج نے مجھے مخاطب کیا۔ ''چلو پارو! اب گھر چلتے ہیں۔''

''سمجھا!'' جھجار سنگھ نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا' پھر مزید بولا۔ ''پارو کہنے کا حق تم نے شاید دلاور کو دے رکھا ہے۔'' ''جھجار سنگھ!'' عارج نے مداخلت کی۔ ''اس سے پہلے کہ مجھے غصہ آ جائے تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

''برا مان گئے'' جھجار سنگھ بے حیائی سے ہنسا۔ پھر کہنے لگا۔ ''میں راجہ نرسنگھ راؤ کا بیٹا ہوں دلاور! یہ نہ بھولا کرو' میں نے اگر اسے پارو کہہ دیا ہے تو پھر اب سے یہ میرے لئے پارو ہی رہے گی۔ ہاں اگر میں چاہوں تو تم اسے پارو نہ کہہ سکو گے۔''

بات بڑھ جاتی مگر میں نے بیچ بچاؤ کرا دیا اور عارج کے ساتھ سیر کر کے گھر لوٹ آئی۔

عارج کو اور خود مجھے بھی خبر نہ تھی کہ جھجار سنگھ نے جو کہہ دیا ہے کر بھی دکھائے گا۔ ہم نے جھجار سنگھ کی بات کو گیدڑ بھبکی سمجھ کر بھلا دیا۔ حقائق کا علم مجھے اس وقت ہوا جب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔

ہوا یہ کہ جس دن جھجار سنگھ سے پارو کہنے پر میری اور عارج کی تکرار ہوئی تھی اسی دن اس نے اپنی ماں سے بات کی۔ ماں نے جھجار سنگھ کو سمجھایا کہ وہ ایسی چھوٹی بات نہ کرے۔ اس کیلئے کوئی بھی راجہ اپنی بیٹی دے سکتا ہے۔

جھجار سنگھ سرکش' خودسر اور ضدی تھا۔ وہ اپنی ضد پر اڑ گیا۔ مجبوراً اس کی ماں نے اپنے شوہر سے یہ ذکر کیا۔

نرسنگھ راؤ بھی اس رشتے پر راضی نہ تھا مگر وہ بیٹے کی خودسری سے بھی واقف تھا۔ اس نے پاربتی کے باپ کو بلا کر رشتے کی بات کی۔ پاربتی کے باپ نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی بیٹی اتنے بڑے گھر کی بہو بنے گی اور راجہ نرسنگھ راؤ اس کا سمدھی ہو جائے گا۔ اس نے خاندان والوں سے مشورہ کیے بغیر اسی وقت رشتہ منظور کر لیا۔ اسے یقین تھا کہ جب خاندان والوں کو

اس بات کی خبر ہو گی تو سبھی اس کے فیصلے کی تائید کریں گے جو دوست ہوں گے انہیں خوشی ہو گی اور دشمن جلیں گے۔ پاربتی کے باپ کا اندازہ غلط ثابت نہ ہوا۔ پھر یہ کہ ہمت بھی کس میں تھی کہ راجہ نرسنگھ راؤ کے خلاف زبان کھول سکتا۔ خاندان بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

ذہنی طور پر پاربتی ابھی بلوغیت کی اس منزل پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ اپنے لئے درست یا نادرست کا فیصلہ کر سکے۔ اسی بنا پر جب اسے اپنے رشتے کا علم ہوا تو بس یہ خیال آیا کہ دلاور اسے پسند نہیں کرے گا۔ وجہ یہ کہ دلاور اور جھجار سنگھ ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ مختلف اوقات میں دلاور کی باتوں سے پاربتی کو یہ اندازہ بھی ہوا تھا کہ دلاور اسے پسند کرتا ہے۔ اسے بھی دلاور اچھا لگتا تھا مگر دونوں میں سے کسی نے اپنے جذبوں کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پاربتی عمر کی اس منزل میں تھی کہ عشق کی گہرائی اور اس کے رموز و نکات سمجھنا آسان نہ تھا۔ اس نے اپنے والدین اور خاندان والوں کی بے پناہ خوشی کے آگے اپنے جذبات کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ پاربتی کے ردعمل کو جاننے کیلئے میں نے اس کا جسم چھوڑ دیا تھا۔

☆......☆......☆

پاربتی کو یہ خیال بھی تھا کہ دلاور اور اس کے درمیان مذہب کی دیوار حائل ہے جسے گرا دینا ممکن نہیں۔ وہ بڑے شوق کے ساتھ دلاور سے بزرگان دین کے قصے اور حکایتیں سنتی اور ان سے متاثر بھی ہوتی مگر اسے علم تھا اس کے والدین ہرگز اجازت نہیں دیں گے کہ وہ مسلمان ہو جائے یا دلاور کو اپنا لے۔ عقائد مختلف ہونے کے باوجود خاندان والے ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا خیال رکھتے تھے۔ وہ کبھی نہ ایک دوسرے کے عقائد کو زیر بحث لاتے‘ نہ تنقید کرتے اسی لئے وہ خاندان اب تک رشتوں ناتوں میں بندھا ہوا تھا اور ان کے درمیان اختلافات نہیں تھے۔

اس واقعے کے بعد جب عارج پہلی بار مجھ سے ملا تو بے حد اداس تھا۔ اس کے حریف جھجار سنگھ نے عشق کے محاذ پر اسے شکست دے دی تھی جس کا زخم بھرنا محال تھا۔

”اے عارج! تو اتنا کھویا کھویا سا کیوں ہے؟“ جب بہت دیر عارج چپ رہا تو میں نے اسے مخاطب کیا۔

”یہ تو پوچھ رہی ہے اے دینار!“ عارج کی آواز میں کڑواہٹ تھی۔ ”کیا تجھے خبر نہیں کہ تو اس حویلی کو چھوڑ کر اونچے برجوں والے قلعے میں جانے والی ہے...... وہ بھی جھجار سنگھ کی بیوی بن کر۔“

”ہاں خبر ہے۔“ میں نے کہا۔ مجھے عارج کے لہجے کی تلخی پسند نہیں آئی تھی۔ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی۔ ”تو شاید بھول رہا ہے کہ جھجار سنگھ کا رشتہ مجھ سے طے نہیں ہوا۔ اس کی بیوی میں نہیں پاربتی بنے گی...... مجھے معلوم تھا عارج کہ تو اس پر خوش نہیں ہو گا‘ پر ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ ہونی کو کس نے ٹالا ہے۔“

”مگر میں اسے انہونی سمجھتا ہوں۔“ عارج کی آواز سے غصہ جھلکنے لگا۔ غالباً اسے توقع نہیں تھی کہ مجھے بھی اس رشتے پر اعتراض نہ ہو گا۔ میرے نزدیک عارج کا غصہ اس کے انسانی قالب کے سبب تھا۔ اس کا انسانی قالب پاربتی کو بے پناہ چاہتا تھا۔ پھر بھی عارج

ہونے کی حیثیت سے اسے اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔ اسی وجہ سے میں بھی غصے میں کہنے لگی۔ ''تو اسے اگر انہونی سمجھتا ہے' سمجھا کرُ مجھے کیا۔''

''تجھے کیا۔'' عارج نے بدستور غصے میں کہا۔ ''ٹھیک کہا تو نے اے دینار!...... تجھے کیا...... میں جانتا ہوں تو چاہتی تو یہ رشتہ ہرگز نہ ہو پاتا...... لیکن تو میرے پاس رہنا کب چاہتی ہے۔ تو نے کبھی جھجار سنگھ کو بھی غور سے دیکھا ہے۔ وہ صورت ہی سے چمار معلوم ہوتا ہے۔''

''عارج!'' میرا پارہ چڑھ گیا۔ ''اپنی حد میں رہ عارج!'' پھر دانستہ اسے چڑانے کی خاطر میں بولی۔ ''تو اس شخص کو برا بھلا کہہ رہا ہے جو میرے انسانی قالب کا منگیتر ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔''

''کیا ہے وہ؟ بتا'' عارج خفگی سے بولا۔

''راجہ نرسنگھ کے بعد وہی راج سنگھاسن پر بیٹھے گا۔ پھر کیا تو کیا میں دونوں ہی اس کی رعایا کہلائیں گے اور وہ راجہ!'' میں نے کہا۔

اس پر عارج نے طنز کیا۔ ''تو رعایا میں کب ہوگی' تجھے تو سب رانی کہیں گے اے دینار!''

''ہاں کہیں گے رانی پھر؟'' میں غصے میں آ کر اسے اور بھی چڑانے لگی۔ ''جھجار سنگھ نسلی اور اصلی راجپوت ہے۔ اس کے پرکھوں نے اپنے مذہب کو نہیں بدلا جس طرح کہ تیرے انسانی قالب دلاور علی کے......''

''مگر تیرے انسانی پیکر کے پرکھے بھی تو وہی تھے جو میرے تھے۔'' عارج بول اٹھا۔ ''بول کیا تو اس بات سے انکار کر سکتی ہے کہ تیرے اور میرے انسانی قالبوں کے دادا سگے بھائی تھے۔''

''مجھے اس سے کیا لینا' ہوں گے۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔

پھر اس دن کے بعد سے میرے اور عارج کے درمیان تلخی بڑھتی گئی۔ میں عموماً پاربتی کے جسم سے نکل آتی اور تماشہ دیکھتی۔ نوخیز و نوجوان پاربتی کو اس وقت یہ احساس نہ تھا کہ اس نے کوئی شیشہ دل توڑ دیا ہے۔ اس کی چاہت جیسے کچے دھاگے سے بندھی ہوئی تھی جو ایک ہی جھٹکے میں ٹوٹ گئی۔ اس کے برعکس اپنے انسانی قالب کے زیر اثر عارج تمام تر تلخیوں کے باوجود اپنے عشق میں سچا تھا۔ وہ سچا تھا اسی لئے رقابت کا زہر اس پر اثر کر چکا تھا۔ اسی زہر کا اثر تھا کہ اس نے مجھے بھی خفا کر لیا ورنہ عام حالات میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں

اکثر اسے شاہ پور کے قلعے اور اس کے اونچے برجوں کو حسرت سے تکتے دیکھتی۔ اسے شاید نہ اپنی قسمت سے گلہ تھا نہ حالات سے۔ رنج تھا تو غالباً یہ کہ جسے اس نے کبھی غیر نہ سمجھا' وہی بدل گئی۔ وہ محبت کے دو بول ہی کہہ دیتی' آنسو ہی بہا دیتی' یہی تسلیم کر لیتی کہ جھجار سنگھ واقعی اس کے انسانی قالب کے قابل نہیں ہے تو ممکن ہے عارج کو چین آ جاتا مگر میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا' کچھ بھی نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

میرا اپنا نقطہ تھا کہ زمانہ بدل جانے سے محبت نہیں بدل جاتی۔ سو عارج کو بھی نہیں بدلنا چاہیے تھا۔

عارج نے اب اس حویلی میں آنا چھوڑ دیا تھا جہاں میں پاربتی کے قالب میں رہتی تھی۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔ مجھے دیکھے بغیر وہ بے کل سا رہتا تھا۔ بے کل تو خیر اسے اب بھی تھی مگر اس نے اپنے دل کو مار لیا تھا۔ گویا اب اس گلی میں جانا کیا' اب اس کوچے میں خاک اڑانا کیا جہاں اس کے ارمانوں کا خون بہا ہے' شاید عارج یہی سوچتا ہو اور اس کے قدم رک جاتے ہوں۔

کئی دن ہو گئے اور عارج نہ آیا تو میں خود ہی اس سے ملنے پہنچ گئی۔ شام کا وقت تھا اور عارج گھر کے اوپر والے دالان میں پڑا ہوا غالباً اپنے خوابوں کا ماتم کر رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لئے اور پلنگ پر لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ لازماً مجھ پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ میرے بغیر اس کی زندگی بالکل بے رنگ ہو گئی ہے۔

''آ اے دینار!'' اس نے یوں مسکرا کر کہا جیسے کوئی بات نہ ہو۔

میں اس کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''تیرا غصہ شاید ابھی اترا نہیں۔''

''نہیں مجھے تو کوئی غصہ نہیں' میں کیوں غصہ ہوتا۔''

''پھر مجھ سے غیروں کی طرح بات کیوں کر رہا ہے؟''

عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہنے لگا۔ ''اپنا تو کسی اور کو تو نے بنا لیا ہے اے دینار!''

''دیکھ عارج' تو نے پھر وہی بات چھیڑ دی۔ آخر تجھے جھجار سنگھ سے اتنی نفرت کیوں ہے؟''

''اس لئے کہ وہ اسی قابل ہے۔'' عارج طیش میں آنے لگا یقیناً میری زبان سے اپنے رقیب کا نام سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ مزید بولا۔ ''اس نے صرف میری دشمنی میں تجھے اپنایا ہے۔ وہ کمینہ اور بزدل ہے۔''

''اس نے مجھے یعنی دینار کو نہیں پاربتی کو اپنایا ہے۔'' میں بولی۔

”ایک ہی بات ہے۔“ وہ منہ بگاڑ کر کہنے لگا۔

”نہیں ہے ایک بات“ میں نے تردید کی۔ ”اور اگر تو اسے ایک ہی بات سمجھتا ہے تو کیا تجھے یہ خیال نہیں کہ تو میرے ہی منہ پر میرے منگیتر کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔“ میری آواز میں بھی اب تیزی آ گئی۔

”وہ تیرا منگیتر ہوا کرے لیکن میں اسے اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔“ عارج کا لہجہ یہ کہتے ہوئے مزید سخت ہو گیا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔ ”مجھے جب بھی موقع ملا اسے ذلیل کروں گا۔“

”تیرے انسانی قالب کو برسوں تو ہو گئے اس سے لڑتے ہوئے کسی نے آج تک نہیں سنا کہ دلاور علی اپنے بدمقابل جھجار سنگھ کے ہاتھ سے تلوار گرا سکا۔ ہو۔ دلاور اس برس بھی جشن میں یہی کہہ کر گیا تھا کہ اپنے حریف کو ذلیل کرے گا۔ پھر کیا ہوا؟ دلاور کو کامیابی ہوئی؟“

میں بھی جواباً نشتر زنی کرنے لگی۔

”تو اب تو میرے مقابلے پر اس کی حمایت کرے گی۔“ غصے کی زیادتی سے عارج کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ ”وہ جسے تیرا انسانی قالب بھالو اور ریچھ کہتا ہے‘ وہی تجھے اتنا عزیز ہو گیا‘ تو جلد ہی میرے ہاتھوں اس کا حشر دیکھ لے گی۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکے گا؟“

”جھجار سنگھ کو چھوڑ اے عارج! تو مجھ سے بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

”تجھ سے مقابلہ اے دینار!“ عارج اس طرح بولا جیسے اس کے سینے میں کوئی نشتر ٹوٹ گیا ہو۔ ”تو...... تو لڑے گی مجھ سے۔“

”کیوں‘ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ میں تجھے ہر میدان میں شکست دے سکتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا میں اپنے انسانی قالب کے زیر اثر سب کچھ کہہ رہی ہوں۔ پاربتی کے مزاج میں بڑی ضد تھی۔

میں نے عارج کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو یوں لگا کہ اس کی قوت برداشت جواب دینے لگی ہو۔ اسے مقابلے کی دعوت میں دے رہی تھی۔ میں جسے اس نے چاہا تھا‘ ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ وہ اسی پر تو خفا تھا کہ اب مجھ پر جھجار سنگھ اپنا حق جتا رہا تھا۔

میرے بجائے کوئی آدم زادی ہوتی یا جن زادی‘ عارج شاید اس سے مقابلے کا فیصلہ نہ کرتا۔ صنف نازک سے لڑنا وہ اپنی مردانگی کے خلاف سمجھتا لیکن میری اور بات تھی۔ نہ میں کوئی آدم زادی تھی نہ کوئی معمولی جن زادی۔ اس کے علاوہ میں نے جس آدم زادی پاربتی

کے جسم پر قبضہ کیا تھا وہ بھی کوئی ایسی عام لڑکی نہیں تھی جس نے خاندانی روایت برقرار رکھنے کیلئے بس یوں ہی تلوار چلانا سیکھ لیا ہو۔ پاربتی کو بھی شکست دینا آسان نہ ہوتا میری بات تو خیر الگ ہی تھی۔

”اے دینار! تیری ہی طرح میں بھی جنات میں سے ہوں۔“ عارج پرجوش آواز میں بولا۔ ”تو آگ سے بنی ہے تو میں بھی آگ سے پیدا کیا گیا ہوں۔ ہاں مجھے یہ ندامت ضرور ہو گی کہ میں نے ایک جن زادی سے نبرد آزمائی کی۔“

”مجھے صنف نازک ہونے کا طعنہ نہ دے اے عارج! میں جن زادوں کے منہ پھیر دینے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔“ میں نے بھی کسی جھجک کے بغیر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ میری آواز میں جوش تھا۔ ”سن عارج! اگر تو مجھ سے ہار گیا تو پھر کبھی جھجار سنگھ کے خلاف تلوار نہیں اٹھائیو۔“

”اور تجھے شکست ہو گئی پھر؟“ عارج کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔ ”تو کیا جھجار سنگھ کو ٹھکرا دے گی؟ ہے اتنی ہمت“

”ہے ہمت!“ میں غصے میں بولی۔ اپنے انسانی قالب کے زیر اثر مجھے غصہ آئے جا رہا تھا۔ غصے پر قابو پانا میرے لئے مشکل تھا۔ بات بڑھتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ میں نے غصے میں ایک ایسی بات کہہ دی جو عارج کیلئے بھی حیران کن تھی۔

عارج کو یقیناً یہ گمان نہ ہو گا کہ میں اتنی بڑی بات کہہ دوں گی۔ وہ اسی لئے بولا۔ ”تجھے احساس بھی ہے تو کیا کہہ رہی ہے۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ”میں زبان سے نہیں پھر سکتی‘ چاہے میری جان چلی جائے۔“

وہ بڑی بات یہ تھی کہ میں اپنے انسانی قالب پاربتی کو اس صورت میں مسلمان ہونے پر مجبور کر دوں گی کہ عارج اگر مجھے شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ مزید یہ کہ میں پاربتی سے کہلوا دوں گی کہ وہ جھجار سنگھ سے شادی نہیں کرے گی۔

پھر میرے اور عارج کے درمیان مقابلے کی تفصیلات طے ہوئیں۔

سورج ڈوبنے سے پہلے ہی میں عارج کے ساتھ شاہ پور کے گھنے خاردار جنگل کی طرف نکل گئی۔ ہم دونوں گھوڑوں پر سوار تھے اور ہمارے جسموں پر ہتھیار سجے ہوئے تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ بستی والے ہماری طرف متوجہ ہوتے۔ دلاور علی اور پاربتی ہتھیار سجا کر ادھر جاتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ ہم دونوں انہی کے قالبوں میں تھے۔ انہوں نے بہت دن

جنگل میں مشقیں کی تھیں۔

ذرا دور جا کر جنگل میں ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہم تماشہ بنے بغیر اپنے حوصلے نکال سکتے۔ راستے میں ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ میری طرح عارج کی تیوریوں پر بھی بل پڑے ہوئے تھے۔ تلوار' ڈھال' نیزہ' جمدھر اور تیر کمان' ہر ہتھیار ہم اپنے ساتھ لائے تھے۔ جب ہم مقابلے کی جگہ پہنچ گئے تو پہل عارج نے کی۔

پہلا مقابلہ تیراندازی کا ہونا تھا۔ عارج نے اپنے شانے سے لٹکی ہوئی کمان اتاری اور دو تیر ترکش سے نکال کر ہاتھ میں لے لئے۔ شرائط کے مطابق اسے گھوڑے سے نہیں اترنا تھا۔ سو وہ گھوڑے ہی پر بیٹھا رہا۔ میں بھی گھوڑے سے نہیں اتری تھی۔ عارج کے ہاتھ میں دو تیر دیکھ کر میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا ''کمال'' دکھانے والا ہے۔ میرے ہونٹوں پر اسی لئے استہزائیہ مسکراہٹ آ گئی جسے عارج نہیں دیکھ سکا۔ وہ میری طرف متوجہ نہ تھا۔

کمان میں تیر جوڑ کر عارج اسے اوپر فضا میں بلند کر رہا تھا۔ پھر اس نے کمان کھینچ کر تیر چھوڑ دیا۔

ابھی وہ پہلا تیر نیچے آ رہا تھا کہ عارج نے بڑی سرعت سے دوسرا تیر چھوڑ دیا۔ دوسرے تیر کا پھل' پہلے تیر کے دنبالے میں جا کر لگ گیا اور پھر دونوں تیر اسی طرح نیچے آ گرے۔ تیراندازی کا یہ وہ کمال تھا جو عارج کے انسانی قالب دلاور علی کو اپنے اجداد سے ورثے میں ملا تھا لیکن وہ یہ بھول گیا تھا کہ میرے انسانی قالب پارتی اور دلاور کے اجداد ایک تھے۔

اب میری باری تھی۔ جب میں نے پہلا تیر چھوڑا تو میرے قالب کا حسین و نازک جسم بھی کسی کمان کی طرح تن گیا۔ ابھی میرے ہاتھ میں دو تیر اور تھے۔ میں نے فضا میں چھوڑے ہوئے پہلے تیر کو بالکل عارج ہی کی طرح نشانہ بنایا۔ میرے چھوڑے ہوئے دونوں تیر یکے بعد دیگرے پہلے تیر کے دنبالے میں لگے۔

اس طرح گویا میں نے یہ ثابت کر دیا کہ تیراندازی میں عارج سے ایک قدم آگے ہوں۔ تیراندازی کی مشقوں کے دوران میں پارتی نے کبھی یہ مظاہرہ نہیں کیا ہو گا کیونکہ یہ میری اختراع تھی۔ عارج کو بہرحال یہ ضرور معلوم تھا کہ میرا نشانہ بہت سچا ہے۔ عارج بھی اگر یہ کوشش کرتا کہ ایک تیرے کے بجائے دو تیر پہلے تیر کے دنبالے میں پوست کر دے تو شاید ناکام نہ رہتا مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ وہ اپنی شکست پر ملول سا دکھائی دیا لیکن ابھی اور مقابلے بھی تھے۔

مکمل ہار جیت کا فیصلہ ابھی باقی تھا۔ یہ فیصلہ اس وقت ہوتا جب گھڑسواری' نیزہ بازی اور شمشیرزنی کے مقابلے ختم ہو جاتے۔ جیت اس کی ہوتی جو زیادہ مقابلوں میں اپنی برتری تسلیم کرا لیتا۔ چار مقابلوں میں سے ابھی ایک ہی کا فیصلہ ہوا تھا۔ عارج اگر بقیہ تینوں مقابلوں میں مجھے ہرا دیتا تو شرائط کے مطابق جیتا ہوا قرار پاتا۔

تیراندازی کے بعد نیزہ بازی کا مقابلہ ہونا تھا۔ عارج نے غالباً پہلی شکست کے پیش نظر مجھ سے پہل کرنے کو کہا۔ ''نہیں'' میں بولی۔ ''یہ بات ہمارے درمیان طے نہیں ہوئی تھی کہ ایک بار تو پہل کرے گا اور دوسری مرتبہ مجھے پہل کرنی ہو گی۔''

''تو اب؟''

''اب یہ کہ میں اپنا جمدھر کسی درخت کے تنے میں گاڑ کے آتی ہوں تو اس کا نشانہ لے۔'' پھر میں نے عارج کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

تیزی سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے میں نے وہ چھوٹا سا میدان عبور کیا اور اپنی پیٹی سے جمدھر کھینچ کر ایک درخت کے تنے میں گاڑ دیا۔ پھر میں جس تیزی سے گئی تھی' اسی تیزی سے لوٹ آئی۔

میں نے آتے ہی عارج کو مخاطب کیا۔ ''اگر تمہیں یاد نہ ہو تو پھر بتا دوں کہ جمدھر کو نشانہ بنا کر درخت کے تنے سے نیچے گرانا ہے اور.....'' ''اور اس طرح کہ میرا نیزہ درخت کے تنے میں پیوست نہ ہو۔'' عارج نے میری بات پوری کر دی۔ ''مجھے سب کچھ یاد ہے۔'' عارج سپاٹ لہجے میں بولا اور نیزہ اپنے ہاتھوں میں تولنے لگا۔

عارج کی نگاہ دور اس درخت پر جمی ہوئی تھی جس کے تنے میں جمدھر کا پھل پیوست تھا۔ وہ اسی لئے یہ نہ دیکھ پایا کہ میرے ہاتھ میں بھی نیزہ ہے۔ عارج نے نیزہ بلند کیا اور پھر نشانہ لے کر اسے ذرا ترچھا ہدف کی طرف پھینک دیا۔ نیزے نے ابھی نصف فاصلہ طے کیا تھا کہ چھناکا سا ہوا۔ عارج کا پھینکا ہوا نیزا زمین پر آ رہا۔

عارج نے مجھے غصیلی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ بات شرائط کے قطعی خلاف ہے۔''

''کیا بات؟'' میں جان کر انجان بن گئی۔

''تو نے میرے پھینکے ہوئے نیزے کو کیوں نشانہ بنایا؟''

''میں اپنا نشانہ آزما رہی تھی۔ میرا نیزہ غلطی سے تیرے نیزے سے ٹکرا گیا۔'' میں نے بات تو بنا دی لیکن میرے لہجے سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ میں جھوٹ بول رہی

ہوں اور میں نے دانستہ عارج کو چڑانے کیلئے ایسا کیا ہے۔ دراصل یہ بھی میرا ایک حربہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عارج کو غصہ آ جائے اور وہ جذباتی ہیجان کا شکار ہو کر صحیح نشانہ نہ لے سکے۔ میں نے اسی غرض سے استہزائیہ انداز اختیار کیا اور مزید بولی۔ ''اپنا نیزہ اٹھالا اور دوبارہ کوشش کر کے دیکھ لے۔''

عارج نے غالباً اندازہ لگالیا کہ اسے دانستہ غصہ دلانا چاہتی ہوں ورنہ میں یہ حرکت نہ کرتی۔ وہ اسی لئے اپنا غصہ پی گیا اور کچھ کہے بغیر اپنا نیزہ اٹھالیا۔ مجھے اپنا حربہ ناکام ہوتا دکھائی دیا۔

پھر اس سے پہلے کہ عارج دوبارہ نیزہ پھینکتا میں بول اٹھی۔ ''میرے پاس ایک نیزہ اور بھی ہے۔''

''تو؟'' عارج اپنا نیزہ بلند کرتے ہوئے رک گیا۔ ''تو کیا کہنا چاہتی ہے؟''

''یہ کہ اگر میں چاہوں تو اس مرتبہ بھی تیرے نیزے کو درخت تک نہ پہنچنے دوں۔ جب تو اپنا نیزہ اٹھانے گیا تو تجھے میرا نیزہ بھی اٹھا کر لانا چاہئے تھا۔'' میں دانستہ اس سے الجھ رہی تھی۔

''کوئی زبردستی ہے؟''

''ہاں ہے تو'' میں اسے ہر ممکن طور پر غصہ دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''میں تجھ سے زبردست تو ہوں ابھی پہلے مقابلے میں میرا یہ دعویٰ ثابت بھی ہو چکا ہے۔''

''میں کسی قیمت پر تیرا نیزہ اٹھا کر نہیں لاؤں گا۔'' عارج کو آخر غصہ آ ہی گیا۔

میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تو جلدی سے بولی۔ ''اگر تو اس پر بضد ہو تو میں خو......''

''نہیں'' عارج نے میری بات کاٹ دی۔ ''اب یہ مقابلہ بعد میں ہوگا۔ پہلے میں تجھ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہوں۔'' عارج کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر چلا گیا۔ نیزہ اب اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔

جو مقابلے پہلے نسبتاً دوستانہ فضا میں ہو رہے تھے اب اور ہی رنگ اختیار کر گئے۔ عارج کے تیور دیکھ کر میں نے اپنے گھوڑے کو پیچھے ہٹالیا اور اسی کے ساتھ نیام سے تلوار کھینچ لی۔ عارج بھی اپنے گھوڑے کو دور لے گیا۔

چند ہی لمحوں بعد ہم دونوں کے گھوڑے مخالف سمتوں سے بڑے وحشیانہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دوڑے۔ ہم دونوں ہی تلواریں علم کیے ہوئے تھے۔ گھوڑے قریب آ

گئے تو ہندی تلواریں بجلی کی طرح کوندنے لگیں۔ تلواروں کی جھنکار سے جنگل گونجنے لگا۔ دل کے ہاتھوں عارج پہلے ہی اپنی عزت نفس کو بہت مجروح کر چکا تھا اس لئے وہ میرے چہرے کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا یقیناً اسے اپنی کمزوری کا علم تھا۔ دیر تک ہم دونوں کی تلواریں آپس میں ٹکراتی رہیں مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہم دونوں کو معمولی چرکے لگے۔

ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہوئے ہم دونوں ہی نے یہ خیال رکھا تھا کہ مقابلہ ہار جیت کے فیصلے کی خاطر ہے کسی کو نقصان پہنچانے کیلئے نہیں۔

ابھی ہمارے درمیان مقابلہ جاری ہی تھا کہ جانے کدھر سے جھجار سنگھ اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

''شرم کر!'' جھجار سنگھ چیخ کر عارج سے بولا۔ ''مرد ہو کر عورت سے مقابلہ کرتا ہے۔ اگر تو رشتے میں میرا ہونے والا سالا نہ ہوتا تو ابھی تیرا سر اڑا دیتا۔'' جھجار سنگھ کو غالباً خبر نہیں تھی کہ جو بات اس نے محض عارج کو غصہ دلانے کیلئے کہی وہ سچ بھی ہوگی۔ درحقیقت میرے اور عارج کے انسانی قالبوں میں خاندان کی طرف سے یہی رشتہ تھا۔ دلاور علی رشتے میں پارتی کا بھائی ہی لگتا تھا۔

بات کا زخم تلوار کے زخم سے کاری ہوتا ہے۔ عارج تلملا گیا۔ اس نے تیزی سے اپنا گھوڑا جھجار سنگھ کی طرف موڑا۔ یہ دیکھ کر جھجار سنگھ نے بھی اپنی تلوار سونت لی۔ ہر چند کہ عارج کافی تھک چکا تھا لیکن اس نے پہلے ہی ہلے میں جھجار سنگھ کے چھکے چھڑا دیئے۔ اس کے حریف جھجار سنگھ کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ میں نے مداخلت نہیں کی حالانکہ جھجار سنگھ میرے انسانی قالب کا منگیتر تھا مگر اس کے پیچھے ہٹنے پر مجھے خوشی ہی محسوس ہوئی۔ ظاہر ہے عارج اس پر حاوی آ گیا تھا اور یہ بات بحیثیت دینار میرے لئے باعث مسرت ہی تھی۔ سیدھی سی بات تھی کہ میرے دل میں جھجار سنگھ کیلئے نہیں عارج کیلئے جگہ تھی۔

عارج بہت جوش میں تھا۔ وہ اپنے حریف کو سنبھلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں جھجار سنگھ صرف اس کے حملوں سے بچاؤ پر مجبور ہو گیا۔ جھجار سنگھ اور عارج کے درمیان ہونے والا یہ مقابلہ شاہ پور میں ہر سال منعقد ہونے والے مقابلوں سے قطعی مختلف تھا۔ یہ مقابلے دلاور علی اور جھجار سنگھ کے درمیان ہوتے تھے۔

اس وقت عارج اور جھجار سنگھ دونوں ہی قواعد و ضوابط سے ہٹ کر لڑ رہے تھے۔ وقت بھی محدود نہ تھا کہ یہ مقابلہ رک جاتا۔ سالانہ مقابلوں میں وقت کی قید بھی ہوتی تھی۔ اسی قید کی وجہ سے دلاور علی اب تک اپنے حریف کو زیر نہ کر سکا تھا۔ اس مقابلے میں ایسی کوئی پابندی

نہ تھی۔ عارج وہ خطرناک داؤ بھی آزما رہا تھا مقابلوں میں جن کی ممانعت ہوتی تھی۔ مجھ سے لڑتے ہوئے اس نے ایسا نہیں کیا تھا کیونکہ میں بہرحال اس کی محبوبہ تھی۔

عورت کیلئے آدم زادوں میں ہمیشہ سے جنگ ہوتی آئی ہے مگر یہ جنگ ذرا مختلف تھی۔ اس جنگ کا ایک فریق پہلے ہی ہار چکا تھا اور ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔ اگر عارج اپنے حریف' اپنے رقیب کو مقابلے سے بھاگنے پر بھی مجبور کر دیتا تو بھی میں اسے نہ ملتی۔

لڑتے لڑتے جھجار سنگھ نے ذرا سنبھالا لیا۔ عارج کے وار روکنے کے ساتھ ساتھ اب وہ خود بھی وار کرنے لگا۔ یہ الگ بات کہ جھجار سنگھ کے حملوں کی رفتار تیز نہ تھی مگر اس کے حملے تھے بہت خطرناک۔ میں پوری طرح مستعد و چوکنا تھی کہ جھجار سنگھ کا کوئی بھی وار عارج کیلئے جان لیوا ثابت نہ ہو سکے۔ دونوں ہی لڑاکا تھے۔ جب تک ان دونوں میں سے کوئی ایک گھوڑے سے نہ گر جاتا' مقابلہ جاری رہتا۔ ان دونوں ہی کے انداز حرب و ضرب سے اب واضح طور پر یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ میں نے جب یہ خطرہ محسوس کیا تو مداخلت کرنی چاہی۔

جب میں درمیان میں آ گئی تو دونوں ہی کو رکنا پڑا۔ ایک کی میں محبوبہ تھی' دوسرے کی گویا منگیتر' پھر بھلا چلتی ہوئی تلواریں کیسے نہ رک جاتیں۔

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی' جھجار سنگھ کسی زخمی شیر کی طرح دھاڑا۔ "الگ ہٹ جا پارو!...... بیچ میں نہ آ۔ یہ مردوں کا کھیل ہے' موت اور زندگی کا کھیل' یہ کھیل مردوں ہی کو سجتا ہے۔"

مجھے جھجار سنگھ کی یہ بات بری لگی اور میں نے اپنا گھوڑا پیچھے ہٹا لیا۔ اگر یہ مقابلہ کسی طرح رک جاتا تو جھجار سنگھ ہی کیلئے بہتر ہوتا۔ وہ کئی زخم کھا چکا تھا اور ایک بار تو مرتے مرتے بچا تھا۔ اس کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر لگا ہوا زخم سب سے زیادہ مہلک تھا۔ اگر وہ تیزی سے اپنی ڈھال چہرے کے آگے نہ کر لیتا تو عارج کے دوسرے وار میں گھوڑے سے نیچے گر چکا ہوتا۔ زخمی عارج بھی تھا مگر اس قدر نہیں۔

درمیان سے میرے ہٹتے ہی اور جھجار سنگھ کو ذرا سا غافل پا کر عارج اپنی تلوار علم کیے اس کی طرف لپکا۔ میں سمجھ گئی کہ عارج کا یہ وار انتہائی خطرناک اور فیصلہ کن ثابت ہو گا۔

اگر اب میں بھی چاہتی تو جھجار سنگھ کو عارج کے وار سے نہ بچا پاتی۔ اس خطرناک وار سے جھجار سنگھ تو کسی طرح گھوڑے کی پشت پر لیٹ کر بچ گیا مگر اس کے گھوڑے کی ایک ٹانگ تقریباً آدھی کٹ گئی۔ نتیجہ یہ کہ گھوڑا ہنہنا کر الف ہو گیا اور جھجار سنگھ کو اپنی پشت سے نیچے گرا

کر ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔

جھجار سنگھ سر کے بل زمین پر گرا تو پھر اٹھ نہ سکا۔ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ عارج اپنے گھوڑے سے کود کر اس کی طرف جھپٹا۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ جھجار سنگھ کا کام تمام کر دینا چاہتا تھا۔ لڑائی کے جوش میں لازماً عارج کو یہ ہوش نہ رہا کہ جھجار سنگھ اب زمین سے اٹھنے کے قابل نہیں ہے۔ اسی وقت میں نے تیزی سے اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر عارج کا راستہ روک لیا۔ اسی دوران میں اپنی تلوار بھی نیام میں کر چکی تھی اور تلوار اب عارج کے سر سے زیادہ دور نہیں تھی۔

"آگے بڑھ کر بزدلی کا ثبوت نہ دے عارج!" میں نے بلند آواز میں کہا۔ مجھے یہ خدشہ نہیں تھا کہ کوئی میری آواز سن لے گا۔ وہاں عارج' جھجار سنگھ اور میرے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ جھجار سنگھ بیہوش تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں مزید بولی۔ "جو ہوش کھو بیٹھا ہو اس پر تلوار اٹھانا بہادروں کا شیوہ نہیں' سو تو بھی ایسا نہ کر۔"

میری بات سن کر عارج کی تلوار جھک گئی' اس کے چہرے سے سنجیدگی جھلک رہی تھی۔

"تو اگر اپنی زندگی...... میری مراد تیرے انسانی قالب سے ہے' تو یہاں سے بھاگ جا۔" میں نے عارج کو پھر مخاطب کیا۔ "یقین کر کہ یہ بات راز ہی رہے گی کہ میں نے تجھے...... یعنی پاربتی نے دلاور علی کو فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔ اگر کسی کو خبر ہو گئی کہ تو نے اس علاقے کے راجہ نرسنگھ راؤ کے جوان بیٹے کی یہ حالت بنا دی ہے تو تیرا زندہ بچنا مشکل ہے۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ تو مارا جائے۔"

"مگر کیوں؟ ...... کیوں اے دینار...... تو مجھے کیوں زندہ دیکھنا چاہتی ہے۔" عارج نے میرے چہرے کی طرف نگاہ اٹھائی۔

"تو...... تو اے عارج! اس...... اس کی وجہ اچھی طرح جانتا ہے۔ تیرے دل میں اگر ...... اگر ذرا بھی میرے لئے جگہ باقی ہے تو ...... تو پھر میری بات مان لے۔" میرا لہجہ قدرے جذباتی ہو گیا۔ اب سے پہلے کبھی میں نے اپنی کوئی بات عارج سے منوانے کیلئے ایسا لہجہ اختیار نہیں کیا تھا۔ یقیناً یہ پاربتی کے قالب کا اثر تھا۔ پاربتی کے دل میں کہیں نہ کہیں دلاور کیلئے ضرور چاہت پوشیدہ تھی۔ اسی سبب سے میرے انسانی قالب کا چہرہ اور لہجہ بہت کچھ کہہ رہا تھا' وہ جو اس نے اب تک دلاور سے نہیں کہا تھا اور وہ جسے سننے کی دلاور کو آرزو تھی عرصہ دراز سے دلاور اسی کا منتظر تھا۔

"اے دینار! کیا میں اس طرح تجھ سے بچھڑ جاؤں گا؟...... تو مجھے خود سے دور

کیوں کر رہی ہے؟...... میں ایسا کیوں نہ کروں کہ...... کہ تیرے ساتھ رہنے کیلئے دلاور علی کا قالب چھوڑ کر جھجار سنگھ کے جسم میں گھس جاؤں۔'' عارج کہنے لگا۔

''مجھے اس پر کوئی عتراض نہیں اے عارج! لیکن شاید ایسا ممکن نہیں ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔

اس پر عارج نے مجھ سے وضاحت چاہی۔

''فوری طور پر تو ایسا اس لئے نہیں ہو سکتا کہ جھجار سنگھ بے ہوش ہے۔'' اس کے جسم میں اتر کر تجھ پر بھی بیہوشی طاری ہو جائے گی۔

''جھجار سنگھ کو ہوش میں بھی لایا جا سکتا ہے اے دینار!...... یا اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کیا جا......''

''اے عارج!'' میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھی۔ ''تو اس معاملے کی نزاکت کو سمجھ نہیں رہا۔'' میں بولی۔

''تو پھر مجھے تو ہی سمجھا دے۔'' عارج نے کہا۔

''دیکھ' اگر تو جھجار سنگھ کو ہوش میں لا کر اس کے جسم میں اتر گیا مگر تیرے وجود کو قرار نہ آیا تو مجبوراً تجھے جھجار سنگھ کا جسم چھوڑنا پڑے گا۔'' میں عارج کو سمجھانے لگی۔ ''ایسی صورت میں تیرے لئے ایک ہی راستہ رہ جائے گا کہ دلاور کے قالب ہی کو دوبارہ اپنا لے۔ اگر ایسا ہوا تو تجھے فرار ہونے کیلئے بہت کم وقت مل سکے گا۔''

''کوئی ضروری نہیں اے دینار کہ مجھے جھجار سنگھ کے جسم میں قرار نہ آئے۔'' عارج بحث کرنے لگا۔ ''میں یہ کوشش ضرور کروں گا۔''

''اگر تو میرا مشورہ نہیں مانتا تو پھر تیری مرضی جو تیرے جی میں آئے کر۔''

میری بات سن کر عارج نے تلوار اپنی نیام میں رکھی۔ عارج بہت جلد جھجار سنگھ کو ہوش میں لے آیا۔ اسے میں نے جھجار سنگھ کے جسم میں داخل ہوتے دیکھا لیکن ذرا ہی دیر میں وہ باہر نکل آیا۔ اس نے باہر آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ دوبارہ جھجار سنگھ کو بیہوش کر دیا۔

''کیوں' کیا ہوا اے عارج؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔ وہ ایک بار پھر دلاور علی کے قالب میں اتر چکا تھا۔

''اے دینار! اس کافر آدم زاد کے اندر تو بے انتہا اندھیرا اور گھٹن ہے۔'' عارج بتانے لگا۔ ''اگر میں فوراً ہی باہر نہ آ جاتا تو میرا دم گھٹ جاتا۔ تو ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔''

''مجھے بھی پاربتی کے جسم میں اترے خاصی دیر ہو چکی ہے۔'' میں نے عارج کو بتایا۔

''اب میرا دم بھی گھٹنے لگا ہے' مجھے اس آدم زادی کا جسم چھوڑنا پڑے گا۔ سن! تجھے اب مجھ سے جدا رہنے کی عادت بھی ڈالنی ہوگی۔ ہم اس طرح اپنے دشمن اس بوڑھے عفریت وہموش کو دھوکہ دینے میں زیادہ کامیاب رہیں گے۔ وہ یہی سمجھے گا کہ ہم دونوں ساتھ ہوں گے جبکہ یہ حقیقت نہیں ہوگی۔''

''تجھ سے الگ رہنے کی میں کوشش کروں گا اے دینار!'' عارج نے وعدہ کیا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ آخری بار اس نے بڑی حسرت کے ساتھ میری طرف دیکھا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ عارج کو میں نے اپنے اس ارادے سے آگاہ نہیں کیا کہ اب طویل عرصے کیلئے پاربتی کا جسم چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ پاربتی کا جسم چھوڑ کر اب میں کسی اور آدم زادی کا جسم اپنانا نہیں چاہتی تھی۔ کسی انسانی قالب میں رہنے کے بجائے میں نے عارج کے ساتھ ہی شاہ پور سے روانگی کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اس طرح کہ عارج کو اس کا پتہ نہ چل سکے۔ مجھے اس کیلئے ایک تو اندھیرے کی چادر اوڑھنی پڑی' دوسرے عارج سے قدرے فاصلے پر رہنا پڑتا تاکہ وہ میرے وجود کی خوشبو محسوس نہ کر لے۔ میں اس سے یہ اندازہ بھی لگانا چاہتی تھی کہ اگر میرے بغیر عارج کو کبھی ماضی یا مستقبل کا سفر کرنا پڑے تو وہ کامیاب ہوگا کہ نہیں۔

راتوں رات سفر کرتا ہوا عارج گوالیار پہنچا۔ اسے میں نے احساس ہی نہ ہونے دیا کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ وہ گوالیار میں بھی نہیں رکا۔ اسے راجہ نرسنگھ کی طاقت اور اقتدار کا اندازہ تھا۔ میری توجہ عارج کے ذہن پر بھی تھی کہ اس کے آئندہ اقدامات سے باخبر رہ سکوں۔ اگر وہ کوئی غلط قدم اٹھانے والا ہو تو اسے روک سکوں اس کیلئے بھی مجھے سامنے نہ آنا پڑتا۔ میں اس کے ذہن کو مناسب قدم اٹھانے کی ترغیب دیتی اور وہ یہی سمجھتا کہ اس نے خود یہ بات سوچی ہے۔ میرے نزدیک یہ بڑا دلچسپ کھیل تھا۔ مجھے اس میں مزہ آ رہا تھا کہ عارج کے ساتھ ساتھ تھی اور وہ بھی لاعلم تھا۔

اس بات کا عارج کو پورا احساس تھا کہ جہانگیر کا وہ منہ چڑھا مصاحب نرسنگھ راؤ مشکل ہی سے اسے کہیں چین کا سانس لینے دیتا۔ عارج کو یہ فکر بھی تھی کہ کہیں اس کے ''جرم'' کی سزا دلاور علی کے گھر والوں کو نہ بھگتنی پڑے جس کے قالب میں اس نے پناہ لے رکھی تھی۔ دلاور علی کے باپ نے عارج سے اپنے کسی دوست کا ذکر کیا تھا جو لاہور میں بخشی کے عہدے پر فائز تھا۔ یہ عہدہ اس لحاظ سے اہم تھا کہ بخشی کا کام فوج کی تنخواہ تقسیم کرنا اور حساب کتاب رکھنا تھا۔

لاہوراس علاقے شاہ پور سے اتنی دور تھا کہ وہاں تک نرسنگھ راؤ کے ہاتھ نہ پہنچتے۔
بستی بستی شہروں شہروں خاک چھانتا ہوا عارج ایک مدت میں لاہور پہنچ سکا۔

قلعہ لاہور میں بخشی وزیر خان کی تلاش عارج کیلئے زیادہ پریشانی کا سبب تو نہ بنی مگر بخشی تک رسائی حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کیلئے عارج کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ وزیر خان بڑا اکھڑ مزاج مشہور تھا۔

''لڑکے! مجھے بتایا گیا ہے کہ تو شاہ پور سے آیا ہے اور مجھ سے اپنی شناسائی کا دعویٰ کرتا ہے۔'' وزیر خاں نے عارج کو دیکھتے ہی سپاٹ سے لہجے میں کہا۔ ''مگر میں نے تجھے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

جواب میں عارج نے دلاور علی کے باپ کا نام لیا اور بولا۔ ''میں فن حرب وضرب سے واقف ہوں۔ اگر آپ کی عنایت ہو جائے تو میں فوج میں بھرتی کر لیا جاؤں۔''

وزیر خاں نے اسے غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔ ''تیرے باپ کو تو میں پہچان گیا مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تو گھر سے بھاگ کر نہیں آیا؟''

اس بات پر عارج چکرا گیا' اسے یہ امید نہ تھی کہ بخشی وزیر خاں اس سے اتنا بحث و مباحثہ کرے گا۔ اس نے سوچا یہ بوڑھا خبطی میرے کسی کام نہیں آ سکتا اور پھر بلا جھجک کہا۔ ''معاف کیجئے گا بزرگ! مجھے یہ غلط فہمی تھی کہ آپ واقعی میرے باپ کے دوست ہیں کیونکہ انہوں نے بڑی محبت سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ میں اجازت چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ واپس چلنے کیلئے مڑا۔

''رک جا لڑکے!'' وزیر خاں زور سے بولا۔ ''میں تیرے باپ کا دوست ہوں اسی لئے تجھ سے اتنی پوچھ گچھ کر رہا تھا ورنہ بھگا دیتا۔''

عارج رک گیا اور مڑ کر کہا۔ ''میں آپ کے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا' اسے آپ گستاخی کے بجائے میری مجبوری سمجھیں۔''

بخشی وزیر خاں اپنے ہی ڈھب کا آدمی تھا۔ عارج اپنی دانست میں اس سے مل کر مشکل میں پھنس گیا تھا۔ بوڑھا اسے زبردستی اپنے گھر لے گیا' پھر کہنے لگا۔ ''اگر تو یہاں سے بھاگا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' بوڑھے کی آواز میں سختی تھی۔ ''تجھ میں اگر واقعی صلاحیت ہوئی تو میں تجھے اچھی جگہ دلوا سکتا ہوں جیسا کہ تو کہتا ہے۔ یہاں کا قلعہ دار بھی بخشی وزیر خاں کی بات نہیں ٹال سکتا' مگر پہلے میں اس بات کی تصدیق کر لوں کہ تو کہیں میرے دوست کے دل پر کوئی داغ لگا کر تو نہیں بھاگ آیا...... تجھے شاید اس بات کا اندازہ نہیں کہ جوان اولاد بچھڑ

جائے یا گھر سے بھاگ جائے تو باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے۔''

وزیر خاں کی بات سن کر عارج فکرمند ہو گیا۔ اس نے بوڑھے کے رویے سے یہ اندازہ تو لگا لیا کہ وہ مخلص اور وضع دار آدمی ہے مگر یہ خلوص اسے مہنگا پڑ سکتا تھا۔ اگر کسی طرح راجہ نرسنگھ راؤ یا جھجار سنگھ کے کانوں میں یہ بھنک پڑ جاتی کہ وہ کہاں ہے تو پھر بات بگڑ جاتی۔ راجہ نرسنگھ راؤ اپنا اثر و رسوخ کام میں لا کر دلاور علی کے قالب سے اس نے نکلنے پر مجبور کر دیتا۔ ظاہر ہے کہ جب نرسنگھ راؤ' دلاور علی کی کھال کھنچواتا تو عارج کو اپنا انسانی قالب چھوڑنا ہی پڑتا۔

''کیا سوچنے لگا؟'' بوڑھے وزیر خاں نے عارج کو سوچ میں کھویا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

☆......☆......☆

"میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کو سب کچھ بتا دوں۔" عارج نے جواب دیا۔

"دیکھو تو چاہے کچھ نہ بتا مگر ایک بات اچھی طرح سے سمجھ لے اگر تو واقعی گھر سے بھاگ کر آیا ہے تو میں تیری ایک نہیں سنوں گا' میں تجھے بندھوا کر یہاں سے زبردستی شاہ پور بھجوا دوں گا۔" وزیر خاں نے گویا عارج کو دھمکی دی۔

"میں شاہ پور سے بھاگ کر تو آیا ہوں مگر اس کی وجہ کچھ اور ہے۔" عارج نے اعتراف کر لیا۔ پھر بوڑھے کو ساری بات بتا دی۔ بوڑھے نے پہلے تو عارج کو بہت ڈانٹ پلائی' پھر بولا۔ "ان حالات میں تو یہ اور ضروری ہو گیا ہے کہ میں اپنے کسی خاص آدمی کو شاہ پور بھیجوں۔ معلوم نہیں تیرے باپ اور تیری ماں کا کیا حال ہوگا۔ کم سے کم انہیں یہ تو معلوم ہو جائے کہ تو میرے پاس پہنچ گیا ہے اور بخیریت ہے' اب فکر کی کوئی بات نہیں۔"

لاہور میں بخشی وزیر خاں صاحب حیثیت اور بااثر آدمی تھا۔ اس کا بڑا سبب بخشی کا عہدہ تھا۔ تمام ہی سرکاری کارندوں کو اس سے کوئی نہ کوئی کام پڑتا رہتا تھا۔ وہ اصولی آدمی تھا اس لئے کبھی کسی کی ناجائز بات نہ مانتا مگر جائز کام میں روڑے بھی نہ اٹکاتا۔ مغل حکومت کا وہ پرانا نمک خوار تھا۔ ایک ایک پائی کا وہ پورا حساب رکھتا اور اپنے نائبوں کو حرام روزی نہ کھانے دیتا۔ اس کیلئے یہ مشکل نہ ہوا کہ اپنے خرچ پر کسی کو شاہ پور بھیج دے۔

وزیر خاں نے دلاور علی کے باپ کو ایک خط لکھا اس نے اپنے آدمی کو جو خط دیا اس میں وہ ساری باتیں لکھ دیں جو اسے عارج سے معلوم ہوئی تھیں۔ پھر دلاور علی کی طرف سے کوئی فکر نہ کرنے کو لکھا۔ وزیر خاں نے اپنے بھیجے ہوئے آدمی کو یہ تاکید بھی کر دی کہ میرا خط دلاور علی کے باپ ہی کو دینا اور خط کا جواب بھی لے کر آنا۔ اپنے خط میں اس نے ایک ایسی بات بھی لکھی جس کا علم عارج کو نہیں تھا۔

لاہور کے قلعے میں ہی وزیر خاں کی سکونت تھی۔ اس کی حویلی خاصی بڑی اور ہوا کے رخ پر تھی۔ بوڑھا وزیر خاں پانچ وقت کا نمازی تھا مگر اس کے باوجود صاحب دل مشہور تھا۔

جب قدرے رات ڈھل جاتی تو گویا وہ طلوع ہوتا۔

پھر بوڑھا وزیر خاں ہوتا اور نوجوان و حسین کنیزیں ایسے میں کسی کو اس کے پاس جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ وزیر خاں خود بھی اپنی خلوت سے نہ نکلتا۔ خوبصورت کنیزوں کو حویلی میں دیکھ کر عارج کو کچھ کچھ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ بوڑھا وزیر خاں واقعی صاحب دل ہے اور محض زاہد خشک نہیں۔ ایک مرتبہ اتفاق سے عارج نے وزیر خاں کو رات کے وقت دیکھ لیا تو اس پر ایک اور ہی راز کھلا اور وہ حیران رہ گیا۔ اس نے وزیر خاں کی صرف ایک ہی جھلک دیکھی تھی' وزیر خاں کے جسم پر زنانہ لباس تھا۔

بظاہر عارج کو وزیر خاں کی حویلی میں کوئی تکلیف نہ تھی لیکن چند روز بعد وزیر خاں کا اصل چہرہ سامنے آیا تو وہ پریشان ہو گیا۔ پھر بھی اس نے صبر و تحمل سے کام لیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بوڑھے نے ابھی براہ راست عارج کو نہیں چھیڑا تھا۔

پہلے دن ہی بوڑھے وزیر خاں نے اپنی بوڑھی بیوی اور نوجوان بیٹی کو یہ تاکید کر دی تھی کہ دلاور علی سے پردہ نہ کیا جائے اور اسے گھر کا ہی فرد سمجھا جائے۔ بوڑھے کی بس ایک ہی بیٹی تھی جو عمر میں عارج کے انسانی قالب دلاور علی کے برابر تھی۔ واجبی صورت کی وہ لڑکی بے حد شوخ اور آفت کی پرکالہ تھی۔ اس کا نام نسترن تھا۔ وہ دو چار دن میں ہی عارج سے بے تکلف ہو گئی۔ شوخ اور چلبلی نسترن کی وجہ سے حویلی میں عارج کا دل لگ گیا تھا۔

وزیر خاں عارج پر کڑی نظر رکھتا اور کم ہی اسے حویلی سے باہر جانے کی اجازت دیتا۔ اس نے عارج سے کہا تھا کہ جب تیرے بیان کی تصدیق ہو جائے گی تو یہ پابندیاں نرم کر دی جائیں گی اور پھر اس کے بعد ہی ملازمت کا بندوبست کیا جائے گا۔

عارج نے بوڑھے کی بات مان لی تھی کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مستقبل کیلئے اس نے جو فیصلہ کیا تھا اس فیصلے پر اسی طرح عملدرآمد ممکن تھا۔ اسے خود پر پورا اعتماد تھا کہ اس نے جو کچھ سوچا ہے ایک نہ ایک دن ضرور پورا ہوگا۔ اپنے رقیب جھجار سنگھ کو وہ بھولا نہیں تھا جس کی وجہ سے اپنی دانست میں نجمہ سے بچھڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے سینے میں انتقام کے شعلے بجھے نہ تھے۔

اس عرصے میں عارج نے وزیر خاں کے بارے میں یہ اندازہ لگایا تھا کہ اس کے کردار میں کجی ہے۔ یہ بات عملاً بھی ایک شب درست ثابت ہو گئی۔ وزیر خاں نے عارج کو ایک خاص کام کے بہانے اس رات اپنے خلوت خانے میں بلوا لیا تھا جہاں طلب کئے بغیر عشا کے بعد کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بعد عشا وزیر خاں کے خاص خدمت گار اور کنیزیں

ہی وہاں آتی جاتی دکھائی دیتی تھیں۔ جب عارج اندر پہنچا تو باریش وزیر خاں کو دیکھ کر حیرت میں رہ گیا۔

وزیر خاں کے جسم پر اس رات بھی زنانہ لباس تھا اور اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کے سامنے ساغر و مینا سجے ہوئے تھے۔

''آج رات ہمارے ساقی بنو گے تم؟'' وزیر خاں عجیب سے خمار آلود لہجے میں عارج سے کہنے لگا۔

''آپ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ میرے والد کے دوست اور قابل احترام ہیں لیکن کچھ لوگوں کو عزت راس نہیں آتی۔ آپ بھی مجھے انہی میں سے لگتے ہیں۔'' عارج برا بھلا کہتا ہوا اٹھا اور خلوت خانے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ اسے باہر سے بند ملا۔

''تم یہاں سے جا نہیں سکتے۔'' بوڑھا اس کی بے بسی پر لہرا کر بولا۔

''خبیث بوڑھے! کیا تو سمجھتا ہے کہ اس طرح مجھ سے اپنی بات منوا لے گا۔ نہ میں خود شراب پیتا ہوں اور نہ کسی کو شراب پلا سکتا ہوں۔'' عارج غصے سے بے قابو ہونے لگا۔

''میں کل ہی تیری حویلی چھوڑ کر چلا جاؤں گا' مجھے خبر نہیں تھی کہ تو اندر سے اتنا مکروہ ہوگا۔''

حویلی چھوڑ کر چلے جانے کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور بوڑھا شیطان راہ راست پر آ گیا' وہ ایک دم پلٹا کھا گیا۔ وہ کچھ کہے بغیر اندرونی دالان میں جا کر لباس بدل آیا۔

''دلاور بیٹے!'' وزیر خاں آتے ہی بولا۔ ''مبارک ہو تجھے کہ تو میرے امتحان پر پورا اترا ہے۔ تو نے جو گستاخی کی میں نے اسے معاف کیا' مجھ سے تو نے جو کچھ کہا نہ کہتا تو امتحان میں ناکام ہوتا' بیٹھ جا کہ واقعی میں تجھ سے ایک اہم بات کرنا چاہتا تھا اور اسی لئے تیرا امتحان لیا تھا۔'' یہ کہہ کر وزیر خاں دروازے کی طرف بڑھ گیا اور وہاں پہنچ کر مخصوص انداز میں دستک دی۔ دروازہ کھل گیا' دروازے کے باہر بوڑھے کا کوئی خدمت گار ضرور موجود تھا۔ بوڑھے کے کہنے پر عارج مسند پر بیٹھ تو گیا مگر امتحان کے ڈھونگ پر اسے یقین نہ آیا۔ عارج کو اس پر کوئی شک نہ تھا کہ بوڑھے وزیر خاں نے اسے بدکتے دیکھ کر یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ پھر کچھ ہی دیر کے بعد وزیر خاں نے جو گفتگو کی تو وہ چکرا گیا۔ عارج کو یہ سمجھنے پر مجبور ہونا پڑا کہ بوڑھے نے اس کا امتحان ہی لیا ہوگا۔ کوئی اپنے ہونے والے داماد کو بھلا کس طرح برے راستے پر ڈال سکتا ہے۔

وزیر خاں اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ''دراصل میں تجھے اپنی فرزندی

میں لینا چاہتا ہوں۔ مجھے تیرے باپ کے جواب کا انتظار ہے مگر میں تیری مرضی بھی جاننا چاہتا ہوں' بتا تجھے میری بیٹی نسترن پسند ہے؟''

یہی وہ بات تھی جو وزیر خاں نے عارج کو نہیں بتائی تھی۔ وزیر خان نے دلاور علی کے باپ کو جو خط بھیجا تھا اس میں یہ ذکر بھی کر دیا تھا' عارج کے خیال میں یہ بھی بڑی بے حیائی کی بات تھی کہ وہ بوڑھا اپنی بیٹی کے بارے میں اس سے ایسی بات کر رہا تھا۔ اس کا سوچنا کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا کیونکہ عموماً آدم زادوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایک خیال عارج کو یہ بھی آیا کہ شاید اس طرح بوڑھا ہمیشہ کیلئے اسے اپنے جال میں پھانسنا چاہتا ہے۔ اسی خیال سے اس نے بوڑھے کی پیشکش بالکل رد کر دی۔ یوں بھی اگر میں نے نسترن کا جسم اپنا لیا ہوتا تو عارج اس پیشکش کو قبول کر سکتا تھا۔

''لڑکے! تجھے شاید یہ خبر نہیں کہ یہ بات تیرے لئے کتنے بڑے اعزاز کی ہوگی۔'' وزیر خاں نے کہا۔ ''میں تجھے اس وقت تک سوچنے کا موقع دیتا ہوں جب تک تیرے باپ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آ جاتا۔'' یہ کہہ کر وزیر خاں نے عارج کو اپنے خلوت خانے سے جانے کی اجازت دے دی۔ عارج مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ آیا۔

پھر یہ بھی اسی رات کا واقعہ ہے کہ نسترن نے پچھلے پہر عارج کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

نسترن کی آواز پہچان کر عارج نے دروازہ کھول دیا۔ نسترن کے ساتھ ایک نوجوان تھا جس کے چہرے سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ عارج نے سوالیہ نظروں سے نسترن کی طرف دیکھا۔

سوالیہ نظروں کے جواب میں نسترن جلدی سے بولی۔ ''دلاور! تمہیں ...... نہیں تم...... تم انہیں اپنے کمرے میں سلا لو۔ ممکن ہے ابا جی بھی ادھر آ جائیں۔ ان سے کہہ دینا' یہاں تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہی نسترن نے اس نوجوان کو کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ نوجوان کچھ جھجکتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ نسترن اسی وقت جانے کیلئے مڑ گئی۔ نسترن کی بات سے صاف ظاہر تھا کہ نوجوان سے اس کا کیا تعلق ہوگا اور اس کی نوعیت کیا رہی ہو گی۔

وزیر خاں نے اپنی دانست میں عارج کو کچھ دن کیلئے ڈھیل دے دی تھی' وہ ایسے بن گیا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ عارج کو اس شخص کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا جو وزیر خاں کا خط لے کر شاہ پور گیا تھا۔

پھر خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وہ شخص لوٹ آیا۔ دلاور کے باپ نے عارج کو بھی اپنا بیٹا سمجھ کر خط لکھا تھا۔ دلاور کے باپ کا خط پڑھ کر عارج کو اس کی سادگی اور بھولپن پر بڑی ہنسی آئی۔ اس نے لکھا تھا کہ تم وزیر خاں کو میری جگہ سمجھو اور ان کے کسی حکم سے سرتابی نہ کرو فی الحال لاہور ہی میں رہو شاہ پور کے حالات تمہارے لئے ٹھیک نہیں۔

زبانی بھی عارج نے اس شخص سے کئی کام کی باتیں معلوم کر لیں۔ وہ شخص اس وقت شاہ پور ہی میں تھا جب راجہ نرسنگھ راؤ نے اپنے بیٹے جھجار سنگھ کی شادی بہت دھوم دھام سے پاربتی کے ساتھ کی۔ راجہ کی اس خوشی میں پورا شاہ پور شریک ہوا۔ دلاور علی کے والدین نے بھی اس شادی میں شرکت کی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ راجہ نے اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اپنے رقیب کی مکمل کامیابی پر عارج کو بڑا ملال ہوا۔ خلوت میں وہ خود کلامی کرنے لگا۔ ''اے دینار! تو نے اس زمانے میں آ کر مجھ سے وفا نہ کی اور...... اور میرے دشمن کی بیوی ہو گئی...... اس کے تصرف میں آ گئی۔''

یہی وہ لمحات تھے کہ جب میں نے عارج ہی کی آواز بنا کر اس کے دماغ میں سرگوشی کی۔ ''مگر وہ دینار تو نہیں...... وہ تو پاربتی ہے۔ جھجار سنگھ کی بیوی دینار نہیں پاربتی ہے۔ دینار تو دن کے وقت پاربتی کے جسم میں رہتی ہے۔ اس سے زیادہ دیر تک رہنا تو ممکن ہی نہیں۔''

''ہاں میں ٹھیک ہی تو سوچ رہا ہوں۔'' عارج پھر بڑبڑانے لگا۔ ''دینار مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔''

میرا جو مقصد تھا پورا ہو گیا۔ عارج کو یقین آیا کہ میں اس کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔

اسی روز بخشی وزیر خاں نے عارج کو پھر خلوت میں بلوا لیا۔ بوڑھا اس سے بولا۔ ''تم چاہو تو خود بھی وہ خط پڑھ سکتے ہو جو تمہارے باپ نے میرے خط کے جواب میں لکھا ہے۔ اس نے تمہارے اوپر مجھے مکمل اختیار دے دیا ہے۔'' بوڑھا کچھ دن سے عارج کے ساتھ شائستگی اور تہذیب سے گفتگو کرنے لگا تھا۔

''مجھے نہیں پڑھنا وہ خط'' عارج بے رخی سے کہنے لگا۔ ''مجھے تو آپ یہ بتائیں کہ مکمل اختیار مل جانے کے بعد کیا ارادہ ہے؟'' دوسرا جملہ اس نے چبھتی ہوئی آواز میں ادا کیا۔

''بس وہی ارادہ ہے جو پہلے تھا۔'' وزیر خاں مسکرایا۔

''کیا ارادہ ہے ہے؟ کچھ بتائیں تو سہی!''

''تم تو بات بات پر بدکنے لگتے ہو، یہ نہیں سوچتے کہ میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں۔''

''ضرور سوچتا، اگر مجھے آپ کی چاہت کا سبب معلوم نہ ہوتا۔'' عارج نے بلا جھجک کہہ دیا۔

''ارے تمہیں تو ناحق میری طرف سے غلط فہمی ہو گئی ہے۔'' بوڑھے نے ہنس کر کہا۔ ''تم شاید اس امتحان کی وجہ سے......''

''یہ ذکر دوبارہ نہ چھیڑیں تو بہتر ہے۔'' بوڑھے وزیر خاں کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی عارج بول اٹھا۔ ''آپ کو اور کچھ نہ کہنا ہو تو میں جاؤں۔ میں اپنا اور آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔''

''اور کچھ نہ سہی تو گھڑی دو گھڑی کو میرے پاس بیٹھ ہی جایا کرو۔'' بوڑھے نے عارج کی طرف دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''وقت کو میں نے کبھی تم سے زیادہ قیمتی نہیں سمجھا۔'' بوڑھا یہ کہہ کر کچھ دیر خاموش رہا پھر عارج اٹھنے لگا تو اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔ ''سنو تو' مجھے تم سے ایک ضروری اور اہم بات کرنی ہے۔''

''کہئے وہ بات!'' عارج بولا۔

''بات دراصل یہ ہے دلاور کہ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ تم بھی اس سے واقف ہو۔ میں تمہیں بیٹا بنانا چاہتا ہوں۔ تمہارے باپ نے مجھے یہ اجازت بھی دے دی ہے کہ میں نسترن کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں۔'' بوڑھے نے پھر پانسہ پلٹا۔

''میں اس سلسلے میں اسی وقت کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں جب خود اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں۔ ابھی تو خود میں ہی آپ کی روٹیوں پر پڑا ہوں۔'' عارج نے بھی میری ذہنی ترغیب کے سبب موقع دیکھ کر داؤ آزمایا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس بوڑھے عیار سے بآسانی گلوخلاصی ممکن نہیں ہے۔ میں نے بھی خود یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ بوڑھا پل پل رنگ بدلنے لگتا تھا۔ اس کا توڑ یہی تھا کہ عارج بھی کسی بات پر قائم نہ رہے۔

''تم صاف جواب دو مجھے' میں ہیر پھیر کا قائل نہیں ہو...... اور سنو! اگر تم نے انکار بھی کر دیا تو میں زبردستی اپنی بات نہیں منواؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہیں ملازمت دلوا دوں گا۔'' وزیر خاں نے عارج کو متوقع نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

عارج کیوں کہ نسترن کی بے راہ روی سے واقف تھا' دوم میرے سوا کسی سے اس کی شادی ممکن بھی نہیں تھی اس لئے بغیر لاگ لپیٹ کے اس نے دوٹوک کی بات کہہ دی۔ ''میں کسی قیمت پر نسترن سے شادی نہیں کروں گا۔''

''یہ ہوئی نا مردوں والی بات' میں تمہارے انکار پر ناراض نہیں ہوا۔ تم سے بس مجھے

ایک بات اور کہنی ہے۔ اس کا بھی مجھے صاف جواب ہی چاہیے۔ ملازمت مل جانے کے بعد اگر تم یہیں میری حویلی میں رہو تو مجھے خوشی ہو گی۔ تمہیں یہاں پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ جبراً میں تم سے یہاں رہنے کو نہیں کہوں گا۔"

وقتی طور پر میری ذہنی ترغیب کے تحت عارج نے یہ وعدہ کر لینے میں حرج نہ سمجھا۔ بوڑھا وزیر خاں بہر حال عارج کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی بات نہیں منوا سکتا تھا۔ اس کا احساس یقیناً وزیر خاں کو بھی تھا۔

پھر وزیر خاں نے اپنے وعدے کے مطابق عارج کو مغل فوج میں بھرتی کرا دیا۔ اس کیلئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

اپنی ذہانت اور لیاقت کے سبب عارج نے چند ہی دن میں افسران کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

بوڑھے وزیر خاں کو شیطان نے ایک بار پھر بہکایا اور اس نے عارج کو اپنی راہ پر لگانا چاہا۔ اس کے بعد وزیر خاں کا نہ تو کوئی لالچ عارج کو روک سکا اور نہ کوئی دھمکی کارگر ہوئی۔ عارج ہی کیا کوئی بھی آنکھ دیکھتے مکھی نہیں کھاتا۔ پھر بھلا وہ کس طرح وزیر خاں کی بیٹی نسترن کو اپنانے کی حامی بھر لیتا۔

عارج اور وزیر خاں کے اختلاف کا آخر یہ نتیجہ نکلا کہ عارج نے الگ سکونت اختیار کر لی۔ اب وہ برسر روزگار اور اس کیلئے ایسا ممکن تھا کہ الگ رہ سکے۔ وزیر خاں برا آدمی ہونے کے باوجود منتقم مزاج نہ تھا اس لئے عارج کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

آہستہ آہستہ عارج ترقی کرتا گیا اور یوں ہی کئی برس بیت گئے۔ ان برسوں میں وہ شاہ پور کی طرف سے غافل نہیں رہا تھا۔ اب وہ خود اس حیثیت میں تھا کہ لوگوں کو ملازم رکھ سکے۔ اس کے ذاتی خدمت گاروں کی تعداد بھی نصف درجن سے زیادہ تھی' کنیزیں اس کے علاوہ تھیں۔ خدمت گاروں ہی میں سے ایک کو وہ کئی بار خصوصی ہدایات دے کر شاہ پور بھیج چکا تھا۔ یہ خصوصی ہدایات شاہ پور کے راجہ نرسنگھ راؤ اور اس کے اہل خاندان سے متعلق ہوتیں۔ اسے ملنے والی آخری اطلاع کے مطابق جھجار سنگھ مجھے ساتھ لے کر آگرہ روانہ ہو چکا تھا حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ جھجار سنگھ مجھے نہیں پاربتی کو ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے تو پاربتی کا جسم بہت پہلے چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت تک پاربتی کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔

خود میں بھی جھجار سنگھ اور پاربتی کی طرف سے بے خبر نہیں تھی۔ پاربتی اب دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔

عارج نے کچھ سوچ کر اپنے اسی خدمت گار کو جھجار سنگھ کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کیلئے آگرہ بھیج دیا۔ کوشش کے باوجود وہ ابھی تک پاربتی کو بھلا نہیں سکا تھا۔ اس کی دو وجوہ تھیں' پہلی وجہ تو عارج کے انسانی قالب دلاور علی کا پاربتی سے عشق تھا' دوسرا سبب یہ تھا کہ میں نے پاربتی کے قالب ہی میں پناہ لی تھی۔ عارج کو یہ غلط فہمی تھی کہ میں ابھی تک پاربتی کے جسم میں ہوں۔ میرے سوا وہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اس لئے کوئی آدم زادی اس کی زندگی میں کیسے آ سکتی تھی۔ یہاں میں یہ بتاتی چلوں کہ اکثر جن زاد آدم زادیوں سے شادی کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہی معاملہ جن زادیوں کے ساتھ ہے۔ ان میں سے بیشتر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کسی آدم زاد کی بیوی بن جائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ عارج یا مجھے یہ "شوق" نہیں تھا۔

ان دنوں عارج پر اس کے انسانی قالب دلاور علی کی فطری صفات غالب تھیں۔ وہ اسی لئے پہروں جاگتا اور پہروں پاربتی کے خیالوں میں کھویا رہتا۔ ایک صورت تھی جو دل میں سما گئی تھی۔ ایک چہرہ تھا جو نہیں بھولتا تھا۔ ایک خواب تھا کہ بکھر کر بھی پوری طرح نہیں بکھرا تھا۔ رات کے پچھلے پہر اس کافر ادا کی یاد دبے پاؤں دل میں اتر آتی اور عارج کی پلکوں پر ستارے جھلملانے لگتے۔ کچھ باتیں آدمی ہی کیا جنات کے اختیار سے بھی باہر ہوتی ہیں۔ پاربتی کو بھلا دینا بھی عارج کے اختیار میں نہ تھا۔ عارج نے سوچا تھا کہ وہ یوں ہی ساری عمر پاربتی کی یاد کے سہارے گزار دے گا۔ اب تک اس کی تمام تر جدوجہد اسی رخ پر تھی۔ وہ اس حیثیت اور مرتبے تک پہنچنے کی کوشش میں تھا کہ شاہ پور کا راجہ نرسنگھ راؤ اس کے مقابلے میں اپنا اثر و قدر استعمال نہ کر سکے مگر شاید ابھی اس کی منزل دور تھی۔ اسے مزید انتظار کرنا تھا۔ ابھی اپنی محبوبہ کا حصول اس کیلئے مشکل تھا۔

عارج نے اپنے جس خدمت گار کو آگرہ بھیجا تھا' وہ کامیاب لوٹ کر آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ جھجار سنگھ مغل فوج میں افسر ہو گیا ہے۔ جھجار سنگھ نے شاہ پور کیوں چھوڑا اس کی وجہ عارج کو پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی۔

شاہ پور میں جھجار سنگھ سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ یہ بات شاہ پور میں چھپائے نہیں چھپ سکی تھی کہ دلاور علی کے ہاتھ جھجار سنگھ کو شکست ہو چکی ہے۔ شکست کھا جانے ہی کی شرمندگی اور ذلت نے جھجار سنگھ کو زیادہ دن شاہ پور میں نہیں ٹکنے دیا تھا۔ جھجار سنگھ کو اپنے باپ کی سفارش پر مغل فوج میں افسری مل گئی تھی۔ اس کے برعکس عارج اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر آگے بڑھا تھا۔ عارج چاہتا تو خاموشی سے جھجار سنگھ کو ٹھکانے لگوا دیتا مگر یہ

بزدلی ہوتی اور وہ بہرحال بزدل نہیں تھا، اپنی جنگ وہ خود لڑنا چاہتا تھا۔

پھر اسی طرح کئی برس اور گزر گئے۔ عارج کی جدوجہد جاری رہی۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جس کا اسے انتظار تھا۔ اسی دوران میں مغل بادشاہ جہانگیر کا ستارہ گردش میں آنے لگا۔ جہانگیر کی چہیتی ملکہ نور جہاں اور ولی عہد شہزادہ خرم کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی۔ یہی شہزادہ خرم بعد میں شاہجہاں کے لقب سے مشہور ہوا۔ یہ نور جہاں کا سوتیلا بیٹا تھا۔ سوتیلی ماں اور بیٹے کے درمیان کشمکش کی وجہ سے حکومت میں ابتری پیدا ہوگئی۔ جہانگیر ان پیچیدہ معاملات کو سلجھانے میں اس قدر محو تھا کہ اسے یہ احساس نہ ہوسکا کہ سارا ملک بغاوتوں کا دنگل بنا ہوا تھا۔ راجہ نرسنگھ راؤ نے اس موقع پر فائدہ اٹھایا اور حکومت وقت سے بغاوت کردی۔

راجہ نرسنگھ راؤ نے اپنے تمام علاقے کا انتظام خود سنبھال کر شاہی کارندوں کو بے دخل کردیا۔ مطلق العنان راجہ ہونے کا اعلان کرنے کے ساتھ ہی اس نے دوسرے علاقوں پر بھی دھاوے بولنے شروع کردیئے اور بڑی دولت اکٹھی کرلی۔ اس نے بڑی تیزی سے اردگرد کے تمام تعلقوں میں بھی بغاوت کے شعلے بھڑکا دیئے۔ اس کا بیٹا جھجھار سنگھ اب بھی آگرہ ہی میں تھا اور بظاہر حکومت کا وفادار تھا۔ آگرہ ہی اس وقت تک دارالحکومت تھا اور اکبرآباد کہلاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ آدمی کی مٹی جہاں کی ہوتی ہے وہ خود اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ کشمیر میں قیام کے دوران جہانگیر سخت علیل ہوگیا اور صاف نظر آنے لگا کہ اب اس کے چل چلاؤ کا وقت آگیا ہے۔ اسی حالت میں اس نے کشمیر سے لاہور کی طرف کوچ کردیا۔ کھانے پینے کی تمام چیزوں حتیٰ کہ افیون سے بھی جہانگیر کو نفرت ہوگئی تھی جو برسوں سے اس کی رفیق تھی۔

جہانگیر کو بہ جز چند پیالے شراب کے کسی چیز سے رغبت نہیں رہی تھی۔ کشمیر سے واپسی میں راجور کی منزل پر پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے جہانگیر نے راستے ہی میں شراب کا ایک پیالہ مانگا۔ پیالہ آیا تو اس نے منہ سے لگالیا مگر شراب حلق سے اتر نہ سکی اس لئے کلی کردی۔

راجور میں دولت خانے تک جاتے جاتے جہانگیر پر نزع کا عالم طاری ہوگیا۔ پھر چاشت کے وقت ہندوستان کا وہ مغل تاجدار سفر آخرت پر روانہ ہوگیا۔ ملکہ نور جہاں کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہوگئی۔ وہ روتی دھوتی اور ماتم کرتی ہوئی اپنے رفیق حیات کے جنازے کو لے کر لاہور آئی اور وہاں اسے اپنے باغ میں دفن کردیا۔

نور جہاں کا داماد اور سوتیلا بیٹا شہریار اس وقت لاہور میں تھا۔ اسے یہ خبر ملی تو اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ عارج بھی قلعہ لاہور میں تھا اور اب وہ دلاوری کی حیثیت سے نمایاں مغل سرداروں میں شمار ہوتا تھا۔ شہزادہ شہریار نے امراء اور مغل سرداروں کو انعام و اکرام سے نوازا تو عارج کو بھی خلعت ملی۔ ادھر یمین الدولہ آصف خان، شہریار کے مقابل تھا۔ وہ دراصل شہزادہ خرم (شاہجہان) کا حامی تھا۔ یہ موقع ایسا تھا کہ عارج سے درست فیصلہ کرنے میں غلطی ہو جاتی تو مارا جاتا۔ میں نے اسی لئے غیر محسوس طور پر عارج کو صحیح فیصلہ کرنے میں مدد دی۔

بہادر اور لائق مغل سرداروں کو اپنا ہمنوا بنانے کیلئے آصف خان سرگرم تھا۔

بخشی وزیر خاں پرانا گھاگ اور جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس مرتبہ میں نے اسے استعمال کیا۔ وزیر خاں نے عارج کو مشورہ دیا کہ تم آصف خاں سے مل جاؤ، فائدے میں رہو گے، شہریار کی بادشاہت چند روزہ ثابت ہوگی۔ خود وزیر خاں نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔

وزیر خاں لاکھ برا آدمی سہی مگر اس نے عارج کو کبھی غلط مشورہ نہیں دیا تھا۔ عارج نے اسی لئے کسی بحث و مباحثے کے بغیر اس کا مشورہ قبول کرلیا۔ یہ نوبت نہیں آئی کہ مجھے عارج کو ذہنی ترغیب دینی پڑتی۔

پھر میرا قیاس قطعی درست ثابت ہوا۔ شہریار کی فرمانروائی دو ہفتے سے زیادہ نہ رہی۔ اسے آصف خاں کے مقابلے پر شکست ہوئی۔ آصف خاں نے شہریار کو اندھا کرا کے قید خانے میں ڈلوا دیا۔

کچھ ہی دن بعد نئے بادشاہ شاہجہان کے حکم پر شہریار کو قتل کردیا گیا۔ اس پر بغاوت کا الزام تھا۔

لاہور پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں بھی عارج نے اپنی روایت برقرار رکھی تھی اور بڑی جی داری سے لڑا تھا۔ آصف خاں نے اس کے جوہر دیکھ کر اسے اپنے ساتھ آگرہ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ الگ بات کہ ایسا میری ہی ترغیب پر ہوا تھا۔

لاہور سے آگرہ جانے میں عارج کے ارادے کو نہیں میرا اور حالات دونوں ہی کا دخل تھا۔ آصف خان کا حکم ٹالنا عارج کے بس کی بات نہیں تھی۔ آگرہ پہنچنے کے بعد جب شاہجہاں نے آصف خاں کو وکالت اور وزارت عظمیٰ کا عہدہ دیا تو اسی کی سفارش پر عارج کو ''خان'' کا خطاب اور ایک ہزاری امیر کا منصب ملا۔ مغلوں میں اکبر بادشاہ کے زمانے سے یہ قانون چلا آرہا تھا کہ سوائے اس شخص کے کوئی اپنے نام کے ساتھ ''خان'' کا اضافہ نہیں کر

سکتا جسے دربار سے یہ خطاب ملا ہو۔ تو یوں یہ خطاب عارج کے انسانی قالب کے نام کا حصہ بن گیا اور اب وہ دلاور علی خاں کہلانے لگا۔

دارالحکومت آگرہ آکر عارج کے سارے زخم جیسے پھر سے ہرے ہو گئے' وہ اس کی محبوبہ یعنی میں اب اس کی دانست میں ایک ہی شہر میں تھے۔ اب سے تقریباً 12 سال پہلے وہ میرے کہنے پر شاہ پور سے فرار ہوا تھا۔ 12 سال میں وہ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اسے 12 سال سال پہلے شاہ پور میں جن لوگوں نے دیکھا تھا اب مشکل ہی سے پہچانتے۔ اب اس کا انسانی قالب پہلے سے کہیں بھاری اور مضبوط تھا' چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں' جھجار سنگھ شاید اسی لئے اسے نہ پہچان سکا مگر عارج اپنے رقیب کو پہچان چکا تھا۔ اس کے قریب اور اس کی حیثیت میں اب کوئی فرق نہیں تھا۔

اب عارج کے انسانی قالب دلاور اور جھجار کے درمیان شاہ پور قلعے کی اونچی فصیلیں نہیں تھیں۔ وقت نے اونچ نیچ کا فرق مٹا دیا تھا۔ اس سے قطع نظر یہ کہ جب سے جھجار کے باپ نرسنگھ راؤ نے مغل حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی وہ ایک ہزاری منصب دار ہونے کے باوجود حکومت کی نظر میں تھا۔ اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کیلئے جاسوس مقرر تھے۔ اب وہ وقت آ چکا تھا جس کا عارج نے طویل عرصے سے انتظار کیا تھا وہ اب جھجار سنگھ سے اپنی محرومیوں کا انتقام لے سکتا تھا۔

عارج کے سینے میں انتقام کے شعلے بھڑکنے کے ساتھ ساتھ میرے انسانی قالب پر پاربتی کی دید کی آرزو بھی کروٹیں لینے لگیں۔ اس کا خیال تھا کہ میں ابھی تک پاربتی کے قالب میں ہوں۔ اس نے سوچا کہ ایک بار پاربتی کو دیکھ تو لے۔ کیا اب بھی اسے ایک نظر دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھے گا؟ کیا وہ ابھی تک اتنی ہی حسین ہوگی؟ کیا وہ مجھے پہچان لے گی؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات عارج کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔

پھر عارج نے بالا بالا سب کچھ معلوم کرا لیا۔ پاربتی اب کہاں رہتی ہے؟ صبح ہی صبح مندر جانے کیلئے کس راہ سے گزرتی ہے؟ اور یہ کہ اس کا شوہر جھجار سنگھ کس وقت گھر پر نہیں ہوتا؟ اس جستجو اور بخشش و بخ میں کافی دن گزر گئے۔

عارج کو اپنے سارے سوالوں کے جواب مل گئے تو ایک دن وہ مندر کے راستے پر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پاربتی کو آتے دیکھا تو بس دیکھتے رہ گیا۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

عارج حیران تھا کہ بارہ سال گزر جانے کے باوجود پاربتی ذرا نہیں بدلی تھی۔ بارہ

سال پہلے بہار کی آمد آمد تھی اور اب وہ مجسم بہار بن چکی تھی۔ اس روز کوشش کے باوجود عارج اسے مخاطب نہ کر سکا۔ اس وقت تک میں پاربتی کے جسم میں اتر چکی تھی۔ پاربتی کے قالب میں بالکل بیگانوں کی طرح میں اس پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر مندر کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے یہ تاثر دیا تھا کہ جیسے جھجار سنگھ کی طرح عارج کے انسانی قالب کو نہیں پہچان پائی۔ میرا منشا یہ تھا کہ خود عارج مجھ سے مخاطب ہو تو میں اس سے بات کروں۔

پھر کئی روز بعد عارج نے اپنے اندر ہمت پیدا کی کہ مجھے آواز دے سکے۔

اس دن بھی میں نے پاربتی کے جسم پر قبضہ کر لیا تھا۔ میں قریب آ گئی تو عارج نے آہستہ سے کہا۔ ''اے دینار! سن'' میں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی اور اسے سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے دانستہ بولی۔ ''کون ہے تو؟...... میرا نام وہ نہیں جو تو نے لیا ہے۔'' مصلحت کے تحت میں نے غلط بیانی سے کام لیا۔

''پھر کیا نام ہے تیرا؟'' عارج نے پوچھا۔

''تجھے اس سے کیا۔''

عارج نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں اور کہنے لگا۔ ''بارہ سال کا عرصہ اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ تیرے وجود کی خوشبو حافظے میں نہ رہے' کیا تو واقعی مجھے نہیں پہچانی' میں...... میں عارج ہوں۔''

''عارج!'' میں نے جان کر حیرت کا تاثر دیا۔

''ہاں اے دینار! میں تیرا عارج ہوں۔''

''میں تجھے پہچان گئی' تو وہی ہے نا جو موت کے ڈر سے شاہ پور چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔'' مجھ پر پاربتی کا قالب غالب آنے لگا۔

خلاف توقع میری بات سن کر عارج تیز آواز میں بولا۔ ''میں خود نہیں بھاگا تھا بلکہ تو نے مجھے بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔''

''چل یہی سہی' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''پڑتا ہے فرق'' عارج کو غصہ آنے لگا۔

''پڑتا ہوگا۔'' نہ چاہنے کے باوجود میں عارج سے بے اعتنائی برت رہی تھی۔ ''فرق پڑنے نہ پڑنے سے مجھے بھلا کیا لینا مگر اس وقت تو میری راہ کیوں کھوٹی کر رہا ہے۔''

''کوئی کسی کی راہ روکتا ہے تو سوچ سمجھ کر ہی روکتا ہے۔ میں تجھے یہ بتاتا......''

''ابھی اس آدمی نے اس زمین پر جنم نہیں لیا اے عارج! جو میری راہ روک لے۔''

عارج کی بات میں نے کاٹ دی۔ پھر مزید بولی۔ ''اور تجھے تو اس بات کا اچھی طرح تجربہ ہے' اگر برسوں پہلے کا وہ تجربہ بھول گیا ہو تو اسے ایک بار پھر دہرایا جا سکتا ہے۔ میں آج بھی انہی شرائط پر تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں۔''

عارج سے میں جو کچھ کہہ رہی تھی' غیر ارادی ہی تھا۔ مجھ پر پاربتی کا قالب پوری طرح حاوی تھا' میری رگوں میں دوڑتا ہوا انسانی خون خود بخود ہی جوش کھا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ برسوں گزر جانے پر بھی پاربتی بالکل نہیں بدلی تھی۔

وہ دونوں انسانی قالب دلاور علی اور پاربتی راجپوت تھے۔ اس کے علاوہ ان کا تعلق ایک ہی راجپوت خاندان سے تھا۔ اگر ان میں سے کوئی دوسرے خاندان کا ہوتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔

عارج نے کہا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں اے دینار! کہ تو اس مرتبہ بھی جھجار سنگھ کو میرے انتقام سے بچانا چاہتی ہے مگر ایسا نہیں ہوگا۔ تجھے بھی نیچا دیکھنا پڑے گا اور میں جھجار سنگھ کے غرور کو بھی خاک میں ملا دوں گا۔''

غصے میں ڈوبی ہوئی یہ سخت آواز بھی مجھے عارج کی معلوم نہیں ہو رہی تھی یقیناً اس پر دلاور علی کی فطری صفات غالب تھیں۔ اس راستے سے صرف اکادکا راہگیر آ رہا تھا اور یوں بھی صبح کا دھندلکا ابھی پوری طرح چھٹا نہیں تھا اس لئے کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ باتیں کرتے کرتے ہم راستے کے ایک طرف ہو گئے۔

عارج کے دعوے پر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ مجھے' دینار کو نیچا دکھانے کی بات کر رہا تھا۔ اگر اس کا دعویٰ جھجار سنگھ تک محدود ہوتا تو غالباً میں اتنی چراغ پا نہ ہوتی۔

''مجھے نیچا دکھائے گا تو!'' میں تقریباً چیخ اٹھی۔ ''پھر ہو ہی جائے تجھ سے مقابلہ۔''

اس پر عارج کہنے لگا۔ ''پہلے مقابلے کی شرائط تو طے کر لے اے دینار!''

''مجھے تیری ہر شرط منظور ہے۔'' میں تیزی سے بولی۔

''پھر بھی سن لے تاکہ تجھے بعد میں ملال نہ ہو۔''

اس کے بعد عارج نے مجھے یکے بعد دیگرے تمام شرائط سے آگاہ کیا۔ میں اس کے الفاظ پر غور کیے بغیر ہر شرط سن کر ''منظور'' کہتی رہی۔ مجھے عارج کے مقابلے میں اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں عارج کی پیش کردہ شرائط پر ضرور غور کرتی۔ عارج کی پہلی شرط یہ تھی کہ میں ہار گئی تو اپنے انسانی قالب پاربتی کو مسلمان ہونے پر مجبور کر دوں گی۔ یہ شرط پہلے مقابلے میں بھی شامل تھی جو عارج اور میرے درمیان شاہ پور میں ہوا تھا مگر جھجار سنگھ کی

مداخلت کے سبب کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔

''تو پھر سوچ لے اے دینار!'' عارج کی آواز میں چبھن تھی۔ ''تجھے شاید علم نہ ہو کہ تیرے انسانی قالب کے اسلام قبول کرنے کی صورت میں کسی کافر کے گھر رہنا تجھ پر حرام ہو جائے گا...... تجھے جھجار سنگھ کو چھوڑنا پڑے گا۔''

''تو یہ تیری ایک اور شرط ہے۔'' میں نے عارج کو گھورتے ہوئے کہا۔

''نہیں' عارج نے جواب دیا۔ ''مگر تو چاہے تو اسے بھی شرط سمجھ سکتی ہے۔ میں تجھے صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمان ہونے کی شرط قبول کرنے کا مطلب کیا ہے۔''

''میں کہہ چکی ہوں کہ مجھے تیری تمام شرطیں منظور ہیں اور میری طرف سے......''

عارج نے میری بات کاٹ دی اور بولا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تو مجھ سے جھجار سنگھ کی زندگی کی بھیک مانگنا چاہتی ہے۔''

''تو بھیک دے گا مجھے!'' میری آواز غصے سے کانپنے لگی۔ ''تو کیا جھجار سنگھ کو مٹی کا بنا ہوا سمجھتا ہے' وہ بھی تیرے انسانی قالب کی طرح راجپوت ہے۔ اگر تجھے یہ گمان ہے کہ پہلے کی طرح اب بھی تو اسے شکست دے سکتا ہے تو یہ تیری بھول ہے۔ جھجار سنگھ آج رات تک دہلی سے لوٹ آئے گا۔ کل صبح تو جہاں کہے میں اسے بھیج دوں۔ وہ تیری تلوار کی دھار دیکھنے آ جائے گا۔ پہلے تو اپنا یہی ارمان پورا کر لے کہ تجھے کوئی گلہ نہ رہے' پھر مجھ سے مقابلہ کر لینا۔''

یہ بات عارج کے علم میں بھی تھی کہ ان دنوں جھجار سنگھ کسی کام سے دہلی گیا ہوا تھا مگر واپسی کب ہوگی' یہ مجھ سے اسے معلوم ہوا۔ پاربتی کے جسم میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اس کا ذہن پڑھ لیا تھا۔

عارج کو شاید یہ اندازہ نہ تھا کہ برسوں گزر جانے کے باوجود میرا وہی طنطنہ ہوگا اور بات بڑھ جائے گی۔ اس کی اصل جنگ جھجار سنگھ ہی سے تھی' مجھ سے نہیں۔ میں تو گویا خوامخواہ درمیان میں آ گئی تھی۔ میں نے اسے جب خود ہی جھجار سنگھ سے لڑنے کا موقع دے دیا کہ وہ پہلے اپنے انتقام کی آگ بجھا سکے تو وہ فوراً راضی ہو گیا۔

''جھجار سنگھ کو کہیں آنے کی ضرورت نہیں۔'' عارج نے کہا۔ ''کل صبح خود میں ہی تیری حویلی پر پہنچ جاؤں گا۔''

''میں اور جھجار تیرا انتظار کریں گے۔'' یہ کہتے ہی میں تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

میں کیونکہ آج رات کا کچھ ابتدائی حصہ بھی پاربتی کے جسم ہی میں رہ کر گزارنا چاہتی تھی اس لئے پاربتی کے جسم کو چھوڑ دیا۔ بات یہ تھی کہ جھجار سنگھ نے پاربتی کو بھی یہ نہیں بتایا تھا'

سرکاری کام کی آڑ لے کر وہ دراصل کس غرض سے دہلی گیا تھا۔ میں یہی معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اس دن شام ہی کو میں نے ایک بار پھر پاربتی کے جسم پر قبضہ کر لیا۔

جھجار سنگھ سورج نکلنے سے پہلے ہی آگرہ لوٹ آیا تھا۔ میں جب پاربتی کے جسم میں اتری اور جھجار سنگھ کے ذہن پر توجہ دی تو مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ درحقیقت آگرہ میں جھجار سنگھ پر بڑی پابندیاں تھیں اس کیلئے آگرہ میں اپنے باپ نرسنگھ راؤ کے بھیجے ہوئے آدمی سے ملنا خطرناک تھا۔ وہ کافی دن سے اپنے باپ کے ساتھ رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ اسے موقع کی تلاش تھی۔ باپ کی طرف سے اشارہ ملتے ہی شاہ پور کیلئے روانہ ہو جاتا۔

☆......☆......☆

بالا بالا جھجار سنگھ تمام تیاریاں مکمل کر چکا تھا پاربتی کو خبر نہیں ہونے دی تھی۔ مجھے اس سبب پاربتی کا ذہن پڑھ کر ان باتوں کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔ جھجار سنگھ کو امید تھی کہ اس بار شاہ پور سے جو آدمی آئے گا وہ یہی پیغام لائے گا کہ فوراً چلے آؤ۔ اس کی وجہ نرسنگھ راؤ کی علالت تھی۔ مہینے بھر پہلے وہ سخت بیمار ہو گیا تھا۔ شاہ پور سے پیغام رساں تو آیا لیکن یہ وہ پیغام نہیں تھا جس کا جھجار سنگھ کو بے چینی کے ساتھ انتظار تھا۔

شاہ پور سے آنے والے نے راجہ نرسنگھ راؤ کے مرنے کی اطلاع دی تھی۔ اسی اطلاع کے ساتھ باغی راجپوت سرداروں کے پیغام تھے۔ انہوں نے جھجار سنگھ سے جلد از جلد شاہ پور پہنچنے کی درخواست کی تھی۔ نرسنگھ راؤ کی موت کو اس وقت تک کیلئے چھپا لیا گیا تھا جب تک جھجار سنگھ شاہ پور نہ پہنچ جاتا۔ راجپوت سردار اب جھجار سنگھ کو اپنا راجہ بنانا چاہتے تھے۔

اگر یہ خبر پھیل جاتی کہ نرسنگھ راؤ مر چکا ہے تو راجپوتوں کے حوصلے جواب دے جاتے اور پھر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مغل فوجیں بھی باغی علاقے میں بے دھڑک داخل ہو جاتیں۔ راجپوت سرداروں نے اس خبر کو چھپا کر بہت عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ انہوں نے جھجار سنگھ کو لکھا تھا کہ تمہارے باپ اور ہمارے راجہ نرسنگھ راؤ نے اس قدر زر و جواہر اور پیسہ جمع کر لیا تھا کہ خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ ان خزانوں کے علاوہ دفینے بھی ہیں۔ سورگ باشی راجہ نے مرنے سے پہلے ان کے ٹھکانے بھی ہمیں بتا دیئے ہیں۔ تم آ جاؤ کہ سب کچھ اب تمہارا ہے۔ سپاہیوں کی تنخواہیں بھی اب تک وقت پر ادا کی جاتی رہی ہیں۔

جھجار سنگھ جب حویلی میں پہنچا تو اس کے کچھ ہی دیر بعد میں نے پاربتی کا قالب اپنا لیا تھا۔ اس کے چہرے سے غیر معمولی جوش کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کا اندازہ میں نے پہلی ہی نظر میں کر لیا تھا۔

میرا ہاتھ پکڑ کر جھجار سنگھ مجھے حویلی کے اندر والے دالان میں لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ملازموں کو یہ تاکید کر دی کہ کسی کو بھی ادھر نہ آنے دیا جائے۔ پاربتی کا بیٹا بکرماجیت اب گیارہ سال کا ہو گیا تھا۔

باپ کی ڈانٹ کھا کر وہ بھی میرے پیچھے نہ آیا۔ خود میں بھی جھجار سنگھ سے خلوت میں بات کرنا چاہتی تھی۔ میں اسے عارج کے انسانی قالب دلاور علی کے بارے میں بتاتی۔ دالان میں پہنچتے ہی جھجار سنگھ نے وہ پیغام میرے ہاتھ میں تھما دیا جو راجپوت سرداروں کی طرف سے اسے ملا تھا۔

پیغام کے بارے میں مجھے پہلے ہی جھجار سنگھ کا ذہن پڑھ کر پتہ چل چکا تھا مگر ظاہر ہے کہ میں جھجار سنگھ کو یہ کیسے بتا دیتی اور اسی بنا پر میں نے وہ پیغام پڑھ کر حیرت سے کہا۔ "یہ پیغام لے کر کون آیا؟"

"اس کو چھوڑو۔" جھجار سنگھ بولا۔ "ہمیں آج ہی رات آگرے سے نکل جانا ہے۔"

"مگر کیسے؟" میرے لہجے میں اب بھی حیرت تھی۔

جواب میں مجھے جھجار سنگھ نے وہ سب کچھ بتا دیا جو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔

"تم نے مجھ سے یہ باتیں کیوں چھپائیں؟ کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہ تھا؟" میں بولی۔

"پارو! یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ تم صرف وہ سامان باندھ لو جسے ساتھ لے جانا بہت ضروری ہے۔ میں اتنے میں قلعے سے ہو کر آتا ہوں۔ تمہیں تو خبر ہے کہ ہم پر جاسوس مقرر ہیں۔ ان کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ میں پہلے ہی راستہ ہموار کر چکا ہوں' بس وعدے کے مطابق انہیں رقم کی ادائیگی کرنی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا تو ہم یہاں سے فرار نہیں ہو سکیں گے۔" یہ کہہ کر جھجار سنگھ نے مجھ سے تجوری کی چابیاں مانگیں۔

"ہم یہاں سے آج رات نہیں' کل رات نکلیں گے جھجار سنگھ!" میں نے کہا۔

"وہ کیوں؟" جھجار سنگھ نے پوچھا۔

"ہم آج رات یہاں سے چلے گئے تو دونوں بزدل کہلائیں گے۔" میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"اس میں بزدلی کی کیا بات ہے پارو! ہم ....."

"تم سمجھے نہیں' میں کچھ اور کہنا چاہتی ہوں۔" میں بول اٹھی۔

"تو بولو بھی نا۔" جھجار سنگھ کی آواز میں اس بار قدرے جھنجلاہٹ اور بیزاری تھی۔

''تو سنو کہ تمہارا پرانا دشمن دلاور علی آگرے پہنچ چکا ہے اور میں نے اسے کل صبح اپنا حوصلہ نکالنے کیلئے یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔''

''دلاور علی!...... یہاں؟'' جھجار سنگھ کیلئے یہ اطلاع خلاف توقع ہی تھی۔ وہ اسی لئے دنگ رہ گیا پھر جب اس کی حیرت کسی قدر کم ہوئی تو اس نے مجھ سے تفصیلات معلوم کیں۔ اس کے بعد وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''یقین کرو کہ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو میں اپنے دشمن سے فیصلہ کیے بغیر یہاں سے نہ ٹلتا لیکن صرف اس کی خاطر تمہارے اور اپنے مستقبل کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ ہمیں ہر قیمت پر آج ہی رات آگرے سے روانہ ہونا ہے۔''

''کچھ بھی ہو جھجار سنگھ! مگر یہ تو قطعی بزدلی ہے۔'' میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔

''یہ بزدلی نہیں، عقل کی بات ہے پارو!'' جھجار سنگھ اپنی بات پر اڑا رہا۔ ''اگر کسی طرح پتا جی کے سورگ باش ہونے کی خبر عام ہوگئی تو پھر ہم آگرے سے فرار نہیں ہو سکیں گے۔ اس کمینے کی وجہ سے میں یہاں نہیں رک سکتا، تم اسے میرا آخری فیصلہ جانو۔''

پھر میں نے بہت کوشش کی کہ جھجار سنگھ میری بات مان لے مگر ناکام رہی۔ جھجار سنگھ ایک رات بھی آگرہ میں رہنے پر راضی نہ ہوا۔ اسی دوران میں میرے اور جھجار سنگھ کے درمیان تلخ کلامی بھی ہوگئی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

''میں زبان دے چکی ہوں اور زبان دے کر پھر جانا آن کے خلاف ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

''یہ کیوں بھول جاتی ہو پارو کہ تم عورت ہو مرد نہیں اور زبان مرد کی ہوتی ہے عورت کی نہیں۔ اگر میں نے اسے زبان دی ہوتی تو اور بات تھی۔'' جھجار سنگھ اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔

مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ میں یہ توہین برداشت نہ کر سکی اور جھجار سنگھ پر برس پڑی۔ پھر جھجار سنگھ نے بڑی منت سماجت کر کے میرا غصہ ٹھنڈا کیا اور بات ختم ہوئی۔

میں اگر اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لاتی تو جھجار سنگھ سے اپنی بات منوا لینا مشکل نہ ہوتا لیکن اسے ضروری نہیں سمجھا۔ مصلحتاً میں نے جھجار سنگھ کو ان شرائط سے آگاہ نہیں کیا تھا جو عارج اور میرے درمیان طے ہوئی تھیں ورنہ شاید جھگڑا اور بڑھ جاتا۔ مجبوراً اسی رات پاربتی اپنے شوہر کے ساتھ آگرہ سے فرار ہوگئی۔ میں اس سے قبل ہی پاربتی کے جسم سے نکل آئی تھی۔

دوسرے دن صبح جب عارج جھجار سنگھ کی حویلی پہنچا تو حویلی ویران پڑی تھی۔ اس

کے نزدیک یہ بات ناممکن تھی کہ میرا جیسا مزاج رکھنے والی جن زادی مقابلے سے بھاگ جائے گی۔

ابھی عارج وہیں کھڑا تھا کہ میں نے اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ اس کیلئے میں ایک آدم زاد گھڑ سوار کو پہلے ہی اپنے اثر میں لے چکی تھی۔ گھڑ سوار آدم زاد کو معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

ہوا یہ کہ ایک جانب سے ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور عارج کے قریب سے گزر گیا۔ وہ تیر حویلی کے دروازے میں پیوست ہو گیا تھا۔ عارج تیزی سے مڑا تو اس نے کافی فاصلے پر ایک گھڑ سوار کو دیکھا جو تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ وہ تیر اسی گھڑ سوار نے چلایا تھا جس سے ایک پیغام بندھا ہوا تھا۔

گھڑ سوار کا تعاقب کرنے کے بجائے عارج نے اس پیغام کو دیکھنا زیادہ ضروری سمجھا جو اسی کیلئے ہو سکتا تھا۔ تھا بھی ایسا ہی، میں اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے سے تیر کھینچ لیا اور مہر بند پیغام اس سے جدا کر کے تیر ایک طرف پھینک دیا۔

وہ مہر بند پیغام میری طرف سے عارج کیلئے ہی تھا۔ عارج نے سوچا کہ پیغام پہنچانے والا گھڑ سوار پاربتی کا کوئی ملازم ہوگا حالانکہ ایسا نہ تھا۔ عارج کو غالباً یاد نہیں رہا تھا کہ میں ایک جن زادی ہوں اور یہ معمولی کام کسی بھی آدم زاد سے لے سکتی ہوں۔

عارج توجہ سے میرا پیغام پڑھنے لگا، لکھا تھا۔ ''مجھے نہ پا کر یہ نہ سمجھ لینا کہ میں اپنی زبان سے پھر گئی ہوں۔ میں آخری سانس تک اپنے کہے ہوئے الفاظ پر قائم رہوں گی۔ میں یہاں سے کہاں اور کیوں جا رہی ہوں جلد ہی تجھے اس سوال کا جواب مل جائے گا تو اگر وہاں آ سکے اور تیرے اندر اتنی ہمت ہو تو وہاں ضرور آنا۔ میں تیرا انتظار کروں گی۔'' اس پیغام کے شروع اور آخر میں دانستہ میں نے بطور احتیاط عارج اور اپنے نام نہیں لکھے تھے۔ مجھے اس سلسلے میں تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ آدم زادوں کو ہم جنات کے نام معلوم ہونا کبھی کبھی خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

جنات کو اپنا غلام بنانے کیلئے آدم زاد جو وظیفے کرتے ہیں ان کیلئے ہمارا نام جاننا ضروری ہوتا ہے۔

پھر چند ہی دن گزرے تھے کہ عارج کو معلوم ہو گیا کہ میں کہاں ہوں حالانکہ یہ بات غلط تھی۔ اسے، میرے بارے میں نہیں پاربتی کے متعلق پتہ چلا تھا۔ میں تو اس کے ساتھ آگرہ ہی میں تھی۔

یہ حقیقت سامنے آنے پر کہ جھجار سنگھ دارالحکومت سے فرار ہو گیا ہے ان جاسوسوں کو سخت سزائیں دی گئیں جنہیں جھجار سنگھ کی نگرانی پر مقرر کیا گیا تھا۔ غداری کے صلے میں انہیں جھجار سنگھ سے جو زر و جواہر اور نقد رقم ملی تھی وہ بھی نکلوا لی گئی۔

باغی راجہ نرسنگھ راؤ مر چکا ہے اور اس کی جگہ جھجار سنگھ نے لے لی ہے' یہ خبر پا کر مغل افواج کے سپہ سالار خان خاناں مہابت خاں کو بھی بہت رنج ہوا۔ باغی جھجار سنگھ کو اب تک اسی کی پشت پناہی حاصل رہی تھی ورنہ باپ کے باغی ہونے کے بعد اسے گرفتار کر لیا جاتا۔ یوں فرار ہو کر جھجار سنگھ نے اس کے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچائی تھی۔

مہابت خاں اکثر کہا کرتا تھا کہ ضروری نہیں جیسا باپ ہو ویسا ہی بیٹا بھی ہو۔ سبھی کو خبر تھی کہ جھجار سنگھ کس کا پروردہ ہے' نتیجے کے طور پر جھجار سنگھ کی سرکوبی کیلئے سب سے پہلے مہابت خاں ہی نے آواز اٹھائی۔ اس طرح وہ اپنے دامن پر لگنے والے داغ کو دھو دینا چاہتا تھا۔

شاہجہان کو برسر اقتدار آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس کیلئے بھی یہ ضروری تھا کہ اپنا رعب اور اقتدار قائم کرنے کی خاطر اس فتنے کا سر کچل دے۔ عارج کو جب معلوم ہوا کہ مہابت خاں کا کیا ارادہ ہے تو اس نے وکیل سلطنت (وزیر اعظم) آصف خاں سے اس سلسلے میں ملاقات کی۔ آصف خاں سے عارج بہت قریب تھا۔

آصف خاں ہی ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ جھجار سنگھ کی سرکوبی کیلئے جو فوج بھیجی جائے اس میں عارج بھی شامل ہو۔

کسی مصلحت کے پیش نظر آصف خاں عارج کو مہابت خاں کے ساتھ بھیجنے پر راضی نہ ہوا مگر اس نے ایک اور راہ نکال لی۔

اس بغاوت کو ختم کرنے کیلئے بادشاہ کے سامنے مہابت خاں کے علاوہ آصف خاں نے بھی سرگرمی اور دلچسپی کا اظہار کیا۔

اس کے بعد ہی شاہجہان نے وسیع فوجی کارروائی کا حکم دیا۔

سپہ سالار مہابت خاں کو دس ہزار سوار' پانچ ہزار بندوقچیوں' پانچ سو بیل داروں اور تیر اندازوں کے ساتھ گولیار کے راستے باغی جھجار سنگھ پر حملے کا حکم ملا۔ اس کیلئے مہابت خاں کو سرکاری خزانے سے ایک لاکھ روپیہ دیا گیا اور دوسرے امراء کو بھی اسی طرح شاہانہ عنایات سے نوازا گیا۔ ان امراء میں عارج بھی تھا۔

عارج کو مہابت خاں سے الگ آصف خاں کی ایک معیت پر کماں دار مقرر کیا گیا

تھا۔ صوبیدار مالوہ خان جہاں لودھی کے نام بھی حکم جاری کیا گیا کہ وہ اپنے امراہیوں اور امدادی فوج کے ساتھ مہابت خاں کے ساتھ آ ملے۔ باغی علاقے پر چاروں طرف سے بھرپور یورش کی خاطر قریبی علاقوں کے امیروں کو بھی پیغام بھیجے گئے۔

جب یہ تمام انتظامات ہو گئے تو خود بادشاہ وقت شاہجہاں بھی اپنے ساتھ ایک بڑی فوج لے کر دارالحکومت آگرہ سے نکلا۔ شکار کی شہرت دے کر وہ آہستگی کے ساتھ گوالیار کی طرف بڑھنے لگا۔ شاہجہان نے اپنے اصل مقصد کو مطلق راز میں رکھا۔ ابتدا ہی میں اس کیلئے یہ شہرت اچھی نہ ہوتی کہ ایک معمولی باغی کی سرکوبی کیلئے خود اسے بھی حرکت میں آنا پڑا مگر وہ راجپوتوں کے طرز جنگ اور ان کی بہادری سے خوب واقف تھا۔

شاہجہاں کو علم تھا کہ باغی راجپوتوں پر غلبہ پانا آسان نہیں ہوگا۔ وہ محاذ جنگ سے قریب ہوتا تو اس کی فوجوں کی ہمت بندھی رہتی اور دشمن کے حوصلے بھی پست ہو جاتے۔ پھر اگر وہ باغی مہابت خاں کے قبضے میں نہ آتے یا اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے تو خود شاہجہاں تازہ دم فوج کے ساتھ میدان میں آ جاتا اور اس طرح فتح یقینی ہو جاتی۔

بادشاہ وقت تو یہ منصوبے بنا رہا تھا دوسری جانب جھجار سنگھ نے نئی حکمت عملی اختیار کی۔ اس نے شاہ پور کو اپنا مرکز بنانے کے بجائے اسی علاقے کے ایک مضبوط قلعے ایرج کو اپنا مستقر حکومت بنا لیا۔ ایرج کا قلعہ اس پورے باغی علاقے کا سب سے مضبوط قلعہ تھا اور جنگی نقطہ نظر سے بھی بہتر تھا۔

میں یوں تو عارج کے ساتھ تھی لیکن جھجار سنگھ کی نقل و حرکت پر بھی نظر رکھے ہوئے تھی۔

مغل افواج منزلوں پر منزلیں مارتی ہوئی باغی علاقے میں داخل ہو گئیں۔ انہوں نے تیزی سے پیش قدمی کر کے قلعہ ایرج کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ قلعہ کافی بلندی پر تھا اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ دشوار گزار تھا۔

عارج حملہ آور فوجوں کے ہراول دستے میں تھا۔ وہ بڑی ترتیب اور نظم کے ساتھ اپنی فوج کو اوپر چڑھا لے گیا۔ عارج اور اس کے سپاہی تقریباً دو فرسنگ تک اوپر چڑھتے چلے گئے۔ قلعہ ایرج اب زیادہ دور نہیں تھا۔

جھجار سنگھ نے پہلے ہی سے کچھ فوج کمین گاہوں میں بٹھا رکھی تھی۔ یہی فوج دفعتاً اپنی کمین گاہوں سے نکل کر عارج کی فوج پر ٹوٹ پڑی۔ اسی وقت میں نے قلعے کا دروازہ کھلتے دیکھا۔ عارج بھی اس طرف متوجہ ہو گیا۔ جھجار سنگھ قلعے سے ایک بڑا لشکر لے کر نکلا۔ عارج

نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ جھجار سنگھ کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر آگے آگے کون ہے۔

ہر چند کہ عارج کی فوج دو طرف سے گھر چکی تھی مگر وہ ہمت نہ ہارا۔ جھجار سنگھ کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر پاربتی کو سوار دیکھ کر عارج کا خون کھول اٹھا تھا۔ اسے یہ غلط فہمی تھی کہ اب بھی میں پاربتی کے جسم ہی میں ہوں۔ اس نے بہادری کے ساتھ آگے بڑھ کر قلعے سے نکلنے والی راجپوتوں کی فوج پر حملہ کر دیا۔

ادھر نشیب میں بھی جنگ چھڑ چکی تھی۔ جھجار سنگھ نے یقیناً پہلے ہی سے تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں اور دانستہ مغل فوج کو آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا۔ نشیب میں مہابت خاں کے ساتھ جو فوج اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی اس پر بھی راجپوتوں نے عقب سے حملہ کیا تھا۔

راجپوتوں کے اچانک حملے سے اوپر نیچے ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔

عارج کا لشکر دونوں جانب سے راجپوتوں کے نرغے میں آ گیا تو لشکر میں بڑی بے ترتیبی اور ابتری پھیل گئی۔ وہ سنبھالے نہ سنبھلا۔ لشکر کے قدم اکھڑنے لگے مگر عارج مٹھی بھر جیالوں کے ساتھ دشمن کے مقابلے پر ڈٹا رہا۔

دشمن کی جانب سے پاربتی اپنی شجاعت کے بے مثل نمونے دکھا رہی تھی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح عارج کے انسانی قالب دلاور علی تک پہنچ جائے کیونکہ وہ بھی اسے دیکھ چکی تھی۔

ادھر عارج اپنے قالب دلاور علی کے دیرینہ رقیب و حریف جھجار سنگھ کے مقابل جما ہوا تھا۔ وہ بڑی بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ اسے یوں مردانہ وار لڑتے دیکھ کر اس کے سپاہیوں کی ہمت بھی کچھ بندھی اور وہ پسپا ہوتے ہوتے ایک بار پھر سنبھل گئے۔ عارج کے سپاہی ادھر ادھر سے جمع ہو کر اس کے قریب آ گئے اور جم کر لڑنے لگے۔

دشمن کے حملے روکنے میں عارج کو اتنی مہلت نہ مل سکی کہ مزید آگے بڑھ سکے۔

یہ خونریز معرکہ ابھی اپنی پوری شدت کے ساتھ جاری تھا کہ شاہجہان کے گوالیار پہنچنے کی خبر سارے مغل لشکر میں پھیل گئی۔ اس خبر نے مغل لشکر میں جیسے دلیری کی تازہ روح پھونک دی۔ دوسری طرف اسی خبر نے جھجار سنگھ اور راجپوت سرداروں میں تہلکہ ڈال دیا۔

جھجار سنگھ اپنی فوجوں کو معرکہ جنگ سے ہٹا لایا اور قلعہ ایرج میں محصور ہو گیا۔

زخمی ہونے کے باوجود عارج آخر وقت تک بڑی دلیری سے لڑا تھا۔ اس کا سارا جسم جیسے زخموں سے سجا ہوا تھا۔ زخموں سے اتنا خون بہہ چکا تھا کہ اس پر نقاہت سی طاری ہو گئی تھی۔

ادھر وہ خونریز معرکہ دن بھر کی جنگ کے بعد ختم ہوا ادھر عارج زخموں کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گیا۔ اسے فوراً لشکر کی پچھلی صفوں میں منتقل کر دیا گیا۔ میں اس کی طرف سے پوری طرح چوکنا اور محتاط تھی۔ اسے میں نے ہی بے ہوش کیا تھا تاکہ اس کے زخموں کی مرہم پٹی ہو جائے۔ اسی کے ساتھ وہ آرام بھی کر لے۔ میری توقع کے مطابق جراح اور طبیب اس کی نگرانی پر مامور ہو گئے۔

ایک تیر کا پیکان (پھل) عارج کے انسانی قالب کے سینے کی دائیں جانب پسلیوں میں پھنسا ہوا تھا جسے بڑی مشکل سے نکالا گیا۔

سپہ سالار مہابت خاں اور دوسرے امراء عارج کی عیادت کیلئے اس کے خیمے میں آئے اور طبیبوں سے بھی اس کا حال پوچھا۔ عارج اب تک بے ہوش تھا۔ طبیبوں نے کہا تھا کہ اگر صبح تک اسے ہوش نہ آیا تو اس کا بچنا مشکل ہے۔

وہ رات عارج پر بہت بھاری گزری لیکن طبیبوں کے ساتھ ساتھ میری کوشش سے اسے صبح تک ہوش آ ہی گیا۔ صبح ہوتے ہی عارج کے لشکر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ طبیبوں کے منع کرنے کے باوجود عارج دو خدمتگاروں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے خیمے کے در تک آیا۔ خیمے کے باہر ہجوم تھا جس نے عارج کو دیکھ کر خوشی سے نعرے لگائے۔ پھر عارج دوبارہ بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اسی وقت اسے قلعہ ایرج کے فتح ہونے کی خوشخبری سنائی گئی۔

''کب؟'' عارج نے شدید حیرت سے پوچھا۔

''رات کے اولین حصے میں۔'' عارج کو بتایا گیا۔ ''شب خون مارا گیا تھا۔''

پھر عارج کو دیگر تفصیلات کا علم ہوا۔ بھرت سنگھ اور مغل فوج کے دو امیروں نے قلعہ ایرج کو شب خون مار کر فتح کیا تھا۔ محصورین میں سے تین ہزار کو قتل کر دیا گیا تھا اور باقی نے ہتھیار ڈال کر اطاعت قبول کر لی تھی۔

اب تک عارج کو جو تفصیلات بتائی گئی تھیں ان میں جھجار سنگھ اور پاربتی کا ذکر نہیں آیا تھا۔ عارج نے اس سلسلے میں استفسار کیا تو اسے پتہ چلا کہ وہ دونوں ہاتھ نہیں آ سکے۔ شاید وہ قلعے کی سرنگ کے ذریعے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ سرنگ کا سراغ لگا لیا گیا تھا۔ حلقہ اطاعت میں آ جانے والے راجپوت سرداروں میں سے ایک نے سرنگ کی نشاندہی کی تھی۔

عارج کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہاں سے کوچ کر سکتا۔ وہ اپنا لشکر لئے سات دن تک وہیں پڑا رہا۔ سپہ سالار مہابت خاں اور دوسرے امراء اپنی فوجوں کے ساتھ گوالیار پہنچ

چکے تھے۔

اس عرصے میں عارج کو گوالیار سے مختلف خبریں موصول ہوتی رہیں۔ پہلی خبر یہ تھی کہ محصور ہوتے ہی جھجار سنگھ نے خطا بخشی کیلئے ایک راجپوت سردار کو اپنا وکیل بنا کر شاہجہان کے پاس گوالیار بھیجا تھا۔ وہ راجپوت سردار یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ جھجار سنگھ دست بستہ عرض کرتا ہے حضور اس سیاہ کار کے صفحہ اعمال کو عفو کے پانی سے دھو دیں تو پھر تا عمر حضور کی نافرمانی کی جرأت نہ کرے۔ کبھی اطاعت اور فرماں برداری کے دائرے سے باہر قدم نہ رکھے۔ اسی اثنا میں ایک شاہی ہرکارے نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ قلعہ ایرج کو فتح کر لیا گیا ہے اور پھر بقیہ تفصیلات بیان کیں۔

دوسری خبر ارج کو یہ ملی کہ جب چوتھے روز شاہی لشکر فتح و کامرانی کے بعد گوالیار میں واپس آ کر ٹھہرا تو وہ امراء دربار جو دولت مغلیہ کے قدیم خیر خواہ اور سچے جاں نثار تھے اپنی جاں بازیوں کے صلے میں عنایات شاہانہ اور مناصب جلیلہ سے ممتاز و معزز ہوئے۔ تمام فوجی افسروں کی گودیاں زر و نقد سے لبریز کر دی گئیں۔

آخری خبر اس روز عارج کو ملی جب وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ گھوڑے پر بیٹھ سکے۔ یہ خبر اس کیلئے سب سے اہم تھی۔ سپہ سالار مہابت خاں اور دیگر کئی امیروں کی سفارش پر جو مہابت خاں کے زیر اثر تھے جھجار سنگھ کو معاف کر دیا گیا تھا۔ مہابت خاں کے ساتھ جھجار سنگھ اب دکن روانہ ہو چکا تھا۔

اس اہم خبر کی تفصیلات یہ تھیں کہ جب جھجار سنگھ دست بستہ شاہجہاں کے حضور میں پیش کیا گیا تو بادشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر معافی کا تاج رکھا۔ جھجار سنگھ نے ہزار اشرفیاں، پندرہ لاکھ روپے اور چالیس ہاتھی اس خطائے بے جا کے جرمانے میں بادشاہ کے نذر کیے جو اس سے سرزد ہوئی تھی۔ بادشاہ نے چار ہزار سوار جھجار سنگھ کی ماتحتی میں دے کر اسے اس کی آبائی جاگیر پر قبضہ دے دیا۔ پھر اس کیلئے حکم ہوا کہ وہ فوراً سپہ سالار خان خاناں مہابت خاں کے ساتھ دکن روانہ ہو گئے۔ ہر چند کہ طبیبوں نے ابھی عارج کو سفر کی اجازت نہیں دی تھی مگر اس نے اپنی فوج کو گوالیار کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ یوں بھی اب وہاں رکھا ہی کیا تھا۔ عارج کا جی اس لئے بھی وہاں بولانے لگا تھا کہ پاربتی گویا اس کی دانست میں پھر ایک بار اس سے بہت دور چلی گئی تھی اور وہ ابھی تک اپنے رقیب جھجار سنگھ سے انتقام بھی نہ لے سکا تھا۔ بادشاہ وقت مغل تاجدار شاہجہاں نے تو اس باغی کو معاف کر دیا تھا لیکن عارج اسے کیسے معاف کر دیتا۔

گوالیار میں عارج سے پہلے اس کی جواں مردی کے قصے پہنچ چکے تھے۔ شاہجہان نے اسے بھی خلعت فاخرہ عطا کی اور منصب میں بھی اضافہ کیا۔ اب وہ تین ہزاری منصب دار بنا دیا گیا تھا۔

عارج کو ابھی طویل عرصے آرام اور علاج کی ضرورت تھی۔ یمین الدولہ آصف خاں کے اصرار پر جو بادشاہ کے ساتھ گوالیار آ گیا تھا عارج اپنے انسانی قالب دلاور علی کے آبائی وطن شاہ پور جانے پر راضی ہو گیا۔ عارج مزید چند روز گوالیار ہی میں رک کر اپنے خدمت گاروں اور طبیبوں کے ہمراہ شاہ پور روانہ ہو گیا۔ وہ بے خبر تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ ہوں۔

برسوں بعد وہ شاہ پور پہنچا تو دلاور علی کے والدین اور گھر والوں کی جیسے عید ہو گئی۔ شاہ پور کے قلعہ دار نے اس سے درخواست کی کہ وہ قلعے میں قیام کرے مگر اس نے دلاور علی کی آبائی حویلی ہی میں رہنا پسند کیا۔

مکمل صحت یاب ہوتے ہوتے عارج کے انسانی قالب کو کئی ماہ لگ گئے۔ پھر شاہ پور میں مزید قیام اس کیلئے مشکل ہو گیا۔ وہ جس راہ سے گزرتا اسے پاربتی کی شکل میں گویا میری یاد آتی۔ دلاور علی کے والدین نے لاکھ چاہا کہ عارج کی شادی کر دیں مگر ظاہر ہے وہ کس طرح اس پر راضی ہو سکتا تھا۔ وہ تو ایک جن زاد تھا اور اس کے دل میں ایک جن زادی سمائی ہوئی تھی۔ اس نے اسی لئے شادی سے صاف انکار کر دیا۔ اگر اس کی شادی کسی ایسی آدم زادی سے کرائی جاتی، میں جس کے جسم پر قابض ہوتی تو یقیناً وہ آمادہ ہو جاتا۔ اس بات سے بھلا آدم زاد کس طرح واقف ہو سکتے تھے۔ عارج کا انسانی قالب اب نوعمر و نوجوان بھی نہیں رہا تھا کہ دلاور علی کے والدین زبردستی کرتے۔

اب تو عارج کو بس یہ لگی ہوئی تھی کہ جلد از جلد آگرہ پہنچ کر کوئی ایسی راہ نکالے کہ دکن جا سکے۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ سرکاری تقرری کے بجائے اپنے طور پر دکن چلا جائے لیکن اسے یہ بات خلاف مصلحت معلوم ہوئی۔ اب وہ غیر معروف و غیر اہم نہیں رہا تھا کہ یہ بات راز میں رہ سکتی۔ وہ شاہی امراء میں شامل تھا۔ اس طرح اس کے دکن پہنچنے کو کچھ سے کچھ معنی پہنائے جاتے۔ بادشاہ کی اجازت حاصل کیے بغیر اس کا دکن جانا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ نتیجے کے طور پر وہ کچھ ہی دن بعد آگرہ روانہ ہو گیا۔

وہ آگرہ پہنچا تو اسے کچھ ایسی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں کہ اسے طویل عرصے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی بالآخر اس نے آصف خاں سے بات کی جو اس پر ہمیشہ سے مہربان تھا۔ آصف خاں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ جشن نوروز منعقد ہونے کے بعد دکن میں اس کا

تقرر ہو جائے گا۔ شاہجہاں یہی جشن برپا کرنے لاہور سے آگرہ پہنچا تھا۔ شاہجہاں کو تخت حکومت پر جلوس کیے یہ آٹھواں سال تھا۔ اس کا اقتدار مضبوط و مستحکم تھا۔

جشن نوروز میں عارج نے بھی شرکت کی۔ جب تک وہ جشن برپا رہا عارج کا خیال کسی طرف نہ گیا۔

پوری محفل زریں فرش فروش اور رنگین آئینہ بندی سے جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔ در و دیوار سے طلائی شعاعیں پھوٹتی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس محفل کی تمامتر رونق تخت طاؤس سے تھی۔ اسے پہلی بار دیکھ کر میں بھی مبہوت سی ہو گئی۔ اسی تخت طاؤس پر ہندوستان کا مغل بادشاہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس زمانے میں یہ تخت سات سال کی مدت میں ایک کروڑ روپے کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ اس میں چودہ لاکھ روپے کا تو سونا ہی لگا تھا اور باقی رقم کے بیش قیمت جواہر لگائے گئے تھے۔

مغل تاجدار شاہجہاں جب تخت طاؤس پر بیٹھا تو موسیقاروں نے راگ چھیڑ دیئے اور رقاصاؤں نے رقص کے کمال دکھانے شروع کیے۔ پھر امراء سلطنت مراسم تہنیت و تسلیمات بجا لائے۔ عارج بھی ان امراء میں شامل تھا۔

بزرگوں، شاعروں اور ارباب طلب کے دامن زر و جواہر سے بھر دیئے گئے۔

تخت طاؤس کی تعریف میں مشہور شاعر محمد جان قدسی نے جو اشعار اس محفل میں پڑھے۔ ان میں سے دو شعر یہ تھے۔

زہے فرخندہ تخت بادشاہی
کہ شد ساماں بہ تائید الٰہی
فلک روزی کہ می گردش مکمل
زر خورشید را بگداخت اول

اس جشن کے انیس دنوں میں شاہجہاں نے دل کھول کر انعام اور بخشش دی۔ کوئی محتاج ایسا نہ رہا جو غنی نہ بن گیا ہو۔ لوگوں نے اس داد و دہش کے طفیل برسوں کا سامان جوڑ لیا۔

جشن کے بعد آصف خاں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ خان خاناں مہابت خاں ان دنوں برہان پور کی مہم میں مصروف تھا۔ عارج کیلئے حکم ہوا کہ وہ اپنے ساتھ کچھ تازہ دم فوج لے کر خان خاناں کی مدد کو پہنچ جائے اور اپنے جوہر دکھائے۔ عارج کے دل کی مراد پوری ہوئی۔ برہان پور دکن ہی کے صوبے میں تھا اور اس کا رقیب جھجار سنگھ بھی وہیں تھا۔

عارج اسی ماہ کے آخر تک فوج کو ساتھ لے کر دکن روانہ ہو گیا۔ پاربتی کی صورت میں گویا مجھے دیکھے اسے کئی برس گزر گئے تھے۔ میری یاد نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ دلچسپ حقیقت یہ تھی کہ میں اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ عارج واقعی میرے لئے بے چین ہے یا اپنے انسانی قالب دلاور علی کے زیر اثر پاربتی کی یاد اسے مضطرب کیے ہوئے ہے؟ سوال کا جواب مجھے مل تو سکتا تھا مگر اس کیلئے ضروری تھا کہ میں عارج پر خود کو ظاہر کر دیتی۔ ایسی صورت میں چوری چھپے کا وہ لطف ختم ہو جاتا جو مجھے سرشار کیے ہوئے تھا۔ میں نے اسی لئے حالات کو جوں کے توں رہنے دیا اور ان میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی۔

برہان پور پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں عارج کو ایک ایسی خبر ملی کہ اس کا دل بجھ گیا۔ اس خبر کے مطابق جھجار سنگھ خان خاناں مہابت خاں سے رخصت لے کر اپنے وطن شاہ پور پہنچ چکا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے ایک بار پھر سرکشی اختیار کر لی تھی اور سارے علاقے میں بغاوت کے شعلے بھڑکا دیئے تھے۔

افتاں و خیزاں عارج برہان پور پہنچا تو بقیہ تفصیلات کا علم ہوا۔ جھجار سنگھ نے اپنے علاقے میں پہنچنے کے بعد ایک شاہی تعلقے دار بھیم نرائن کو حیلے سے شاہ پور بلایا۔ جب بھیم نرائن شاہ پور پہنچا تو جھجار سنگھ نے اسے ہمراہیوں سمیت قتل کر ڈالا۔

اس کے بعد جھجار سنگھ نے تعلقے کے خزانے اور قلعے کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

پاربتی کو جھجار سنگھ اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا مگر مہابت خاں کو دھوکے میں رکھنے کیلئے اپنے نوجوان بیٹے بکرماجیت کو اسی کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ مہابت خاں اسی لئے یہ دھوکہ کھا گیا کہ جھجار سنگھ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گا۔ جھجار سنگھ کیونکہ پہلے ہی اپنے بیٹے کو پٹی پڑھا گیا تھا اس لئے موقع ملتے ہی وہ بھی باپ کے پیچھے پیچھے دکن سے فرار ہو گیا اور جان بچا کر شاہ پور پہنچ گیا۔

17 سالہ بکرماجیت کے ساتھ راجپوتوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ ان راجپوتوں کو جھجار سنگھ نے پہلے ہی سانٹ لیا تھا۔ جب برہان پور میں مہابت خاں کو یہ اطلاع ملی تو اس نے مالوے تک برماجیت کا تعاقب کیا۔ مہابت خاں جلدی میں اپنے ساتھ زیادہ فوج نہیں لے جا سکا تھا۔ جب سرکاری فوج باغی راجپوتوں کے سر پر پہنچ گئی تو بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں خاصے راجپوت مارے گئے مگر ان کا ایک گروہ بکرماجیت کو مغل فوج کے نرغے سے نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ برماجیت کو بھی اس لڑائی میں دو زخم لگے تھے۔

برماجیت جب بچ کر نکل گیا تو بقیہ راجپوت منتشر ہو گئے جن میں سے اکثر کو مغل فوجیوں نے پکڑ کر قتل کر دیا۔

مہابت خاں ابھی تک مالوہ میں تھا۔ عارج کو کیونکہ اسی کے پاس بھیجا گیا تھا اس لئے وہ برہان پور میں رکنے کے بجائے اپنا لشکر لے کر خود بھی مالوہ پہنچ گیا۔ مالوہ سے اسے یہ خبر مل گئی تھی کہ جب تک دارالحکومت آگرہ سے مہابت خاں کیلئے کوئی نیا حکم نہیں آ جائے گا وہ کدھر کا رخ کرے۔ مالوہ ہی میں رکا رہے گا۔ اس نے اپنی بقیہ فوجوں کو بھی مالوہ میں بلوا لیا تھا۔

ادھر عارج اپنا لشکر لے کر مالوہ پہنچا۔ ادھر آگرہ سے احکام آ گئے۔ سپہ سالار مہابت خاں کو باغی علاقے پر فوج کشی کا حکم دیا گیا تھا۔ آگرہ سے جو احکام آئے انہی میں ایک حکم عارج کیلئے تھا۔ اس کی گزشتہ خدمات اور کارگزاریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حکم ملا تھا کہ تم بھی لشکر کے ساتھ مہابت خاں کی مدد کرو۔ تم کیوں کہ اسی علاقے کے ہو اور پہلے بھی وہاں اپنے جوہر دکھا چکے ہو اس لئے تمہیں آگے ہراول میں رہنا ہے۔ اسی حکم کے بعد میں جھجار سنگھ کے حالات معلوم کرنے باغی علاقے میں پہنچ گئی۔

ادھر جھجار سنگھ کو اپنے مخبروں سے شاہ پور میں بادشاہی لشکر کے مقرر ہونے کی اطلاع مل گئی۔ اس نے پاربتی سے مشورہ کیا جو شروع ہی سے بغاوت کے خلاف تھی۔ اس وقت نوجوان بکرماجیت بھی وہاں موجود تھا جو بالکل اپنے باپ جھجار سنگھ پر گیا تھا۔

پاربتی نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''ابھی تم پورے علاقے کا صحیح طرح بندوبست بھی نہیں کر سکے ہو۔ ایسے میں مغل فوج سے لڑنا کسی طرح مناسب نہیں ہو گا۔ اگر تم میری مانو تو بادشاہ سے اپنے قصوروں کی معافی مانگ لو۔ وہ......''

بکرماجیت جو باپ کی صحبت میں رہ کر خراب ہو گیا تھا اس نے منہ بگاڑ کر اپنی ماں کی بات کاٹ دی۔ ''ماں! تو یہ کیوں بھول جاتی ہے کہ ہم راجپوت ہیں۔ کسی سے معافی مانگنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ تو بزدلی کی باتیں نہ کیا کر۔''

''یہ بزدلی نہیں عقل مندی ہے' تو چپ بیٹھا رہ' تجھے ابھی کچھ خبر نہیں تو بچہ ہے۔'' پاربتی نے اس خودسر کو ڈانٹ دیا۔

بکرماجیت ناراض ہو کر وہاں سے پیر پٹختا ہوا چلا گیا۔

''پارو! یہ بری بات ہے۔ جوان اولاد کو اس طرح نہیں ڈانٹا کرتے۔'' جھجار سنگھ بولا۔

''تم نے اسے بھی اپنی طرح بے لگام کر دیا ہے۔ وہ میرا بالکل ادب نہیں کرتا۔''

پاربتی نے شکایت کی۔

''خیر اسے چھوڑو' میں تو تمہاری تجویز پر غور کر رہا ہوں۔'' جھجار سنگھ کہنے لگا۔

''پھر کسی نتیجے پر بھی پہنچے کہ نہیں؟'' پاربتی نے پوچھا۔

''تم نے جو مشورہ دیا ہے وہ ہمارے لئے بہت مناسب ہے۔'' جھجار سنگھ کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

''فی الحال سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' پاربتی نے وضاحت چاہی۔

''مطلب یہ کہ اس طرح ہمیں وقت مل جائے گا۔ بادشاہ اس طرح یہی سمجھے گا کہ ہم فرماں برداری پر آمادہ ہیں۔'' جھجار سنگھ نے جواب دیا۔

پاربتی حیرت سے بولی۔ ''تو کیا سچ مچ تمہارا یہ ارادہ نہیں؟''

''بالکل نہیں'' جھجار سنگھ نے انکار میں سر ہلایا۔ ''یہ تو بس جھانسہ ہو گا' میں اس عرصے میں سارے علاقے کا بندوبست کر لوں گا۔''

''افسوس ہے تم پر اور تمہاری عقل پر جھجار سنگھ!'' پاربتی نے پر تاسف لہجے میں کہا۔ ''تمہارے دماغ میں اتنی سی بات نہیں آتی کہ ہم مغل فوجوں سے آخر کب تک مقابلہ کر سکیں گے۔ لڑاکا راجپوت تو ان کے ساتھ بھی ہیں' پر مغل خود ہی لڑنے میں پیچھے نہیں۔''

اس پر جھجار سنگھ بگڑ گیا اور کہنے لگا۔ ''تم نے مجھے کبھی ٹھیک مشورہ نہیں دیا۔ تم ہمیشہ دشمنوں سے ڈراتی رہتی ہو۔''

''مگر دشمنی تو تم خود مول لیتے رہتے ہو۔ اس کے باوجود بھی مغل بادشاہ ایک مرتبہ تمہیں معاف کر چکا ہے۔ اب بھی وقت ہے جھجار سنگھ! اپنی سرشت سے باز آ جاؤ ورنہ تمہارا انجام مجھے اچھا نظر نہیں آتا۔'' پاربتی کی آواز بھی جواباً بلند ہو گئی۔

''مجھے تمہاری نصیحت کی کوئی ضرورت نہیں۔'' یہ کہہ کر جھجار غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر اسی روز جھجار سنگھ نے بادشاہ شاہجہاں کے نام ایک اطاعت آمیز پیغام لکھوایا۔

جھجار سنگھ نے اس پرفریب پیغام میں خان خاناں مہابت خاں اور آصف خاں کو اپنا سفارشی بنا کر درخواست کی کہ بادشاہ سلامت دربار کے کسی بھی آدمی کو مقرر کر دیں جو میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ خطاکار کو خطاپوش بارگاہ میں لے جائے۔

میں اس منافقانہ پیغام کا ردعمل دیکھنے کی خاطر جھجار سنگھ کے وکیل ہی کے ساتھ دارالحکومت آگرہ جا پہنچی۔ یہ شہر اب میرے لئے اجنبی نہیں رہا تھا۔ دربار میں جب جھجار سنگھ کا وکیل پیغام لے کر حاضر ہوا۔

پیغام پڑھے جانے کے بعد شاہجہاں نے ارکان دولت کی طرف دیکھا اور انہیں مخاطب کیا۔ ''کیا رائے ہے؟''

سب نے متفق ہو کر کہا کہ ایسے باغی کی سزا قتل ہے۔ اس کے برعکس وزیراعظم آصف خاں نے برگشتہ بخت جھجار سنگھ کی سفارش کرتے ہوئے کہا۔ ''جہاں پناہ! تاریخ میں بکثرت ایسی مثالیں موجود ہیں کہ بغاوت کے جرم میں قتل کی سزا دی گئی ہے لیکن جھجار سنگھ کے اس جرم سے اغماض فرما کر حضور اسے بخش دیں تو حضور کی فیاضی اور رحم دلی کی نظیر پچھلی تاریخوں میں بھی کہیں نہیں ملے گی۔'' آصف خاں کی آواز میں نرمی تھی اور ایک نوع کی درخواست بھی۔

بادشاہ نے آصف خاں کی بات سن کر سر جھکا لیا اور پھر قدرے توقف سے بولا۔ ''تم نے جو کچھ کہا بے شک سچ ہے لیکن تاوقتیکہ...... دشمنان دولت اپنے جرائم اور بدعنوانیوں کی کافی سزا نہ پائیں اور ان کی بغاوت کے بھڑکتے ہوئے شعلے آب شمشیر سے نہ بجھائے جائیں ملک میں امن دامان قائم رہنا مشکل اور سخت مشکل ہے۔'' یہ کہہ کر بادشاہ دربار عام سے اٹھ کھڑا ہوا اور حرم سرا میں جلوہ آرا ہو کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

☆.... ☆...... ☆

پایہ تخت کا ایک بڑا نامور اور مشہور ہندی شاعر سندر کب نامی تھا۔ وہ جھجار سنگھ سے قریبی تعلق رکھتا تھا۔ دوسرے دن شاہجہاں نے اس شاعر کو فوج کا ایک زبردست دستہ دے کر جھجار سنگھ کے پاس بھیجا۔ بادشاہ نے سندر کب کے ذریعے جھجار سنگھ سے یہ کہلا کر بھیجا کہ اگر جھجار سنگھ وہ تیس لاکھ روپے جو اس نے سرکاری تعلقے داروں سے بہ جبر وصول کیے ہیں شاہی خدام کے حوالے کر دے اور اپنے بیٹے بکرماجیت کو لے کر بدستور سابق خان خاناں مہابت خاں کے پاس چلا جائے تو میں اسے اس کے قصوروں کو معاف کر دوں گا۔ جھجار سنگھ کو دربار میں پیش ہونے کی ضرورت نہیں۔

بادشاہ وقت کا یہ پیغام لے کر شاعر سندر کب آندھی اور طوفان کی طرح شاہی لشکر سے بہت پہلے جھجار سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔ سندر کب خود بھی راجپوت تھا۔ اس وقت تک جھجار سنگھ کو مطلوبہ مہلت مل گئی تھی۔ اس نے تمام باغی علاقے کا بندوبست سنبھال لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سرکش جھجار سنگھ کو بادشاہ کی طرف سے تیس لاکھ روپے کا مطالبہ بھی گراں گزرا تھا۔ وہ لالچی اس رقم کی واپسی پر آمادہ نہیں تھا۔ شاعر سندر کب نے قومی ہمدردی اور قدیم تعلق کا لحاظ کرتے ہوئے جھجار سنگھ کو بہت سمجھایا اور بغاوت کے برے نتائج اس پر واضح کیے مگر وہ فتنہ انگیز نہ مانا۔ وہ اپنے تمول کی کثرت پر اس درجہ مغرور اور خار دار درختوں سے بھرے ہوئے جنگلوں پیچ در پیچ گھاٹیوں پر ایسا مطمئن تھا کہ سندر کب کی کسی بات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ سندر کب کی ساری کوششیں رائیگاں ہوئیں۔

اس موقع پر پاربتی نے ایک بار پھر جھجار سنگھ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔

''تم مجھے یہ بتاؤ کہ ہمیں مغل حکومت کے ساتھ رہنے میں بھی کیا پریشانی ہے؟'' پاربتی نے نرمی سے کہا۔

''تمہارے سوال کا میں کیا جواب دوں' تمہیں آزادی اور غلامی کا فرق ہی نہیں معلوم۔'' جھجار سنگھ منہ بگاڑ کر بولا۔

"مگر ہم مغلوں کے غلام تو نہیں ہیں۔" پارتی نے بحث کی۔

"تم اس معاملے میں مداخلت نہ کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔" جھجار سنگھ نے یہ کہہ کر پارتی کو خاموش کر دیا۔

سندر کب مایوس ہو کر لوٹ گیا۔ آگرہ پہنچ کر اس نے دربار میں تمام واقعہ بیان کر دیا۔ مغل تاجدار شاہجہاں کو کم ہی غصے کی حالت میں دیکھا جاتا تھا مگر اس روز اہل دربار نے اس کے چہرے کو غصے سے سرخ ہوتے دیکھا۔ پھر شاہجہاں کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔

اس وقت دربار میں سکوت طاری تھا' جب مغل تاجدار شاہجہاں کی سخت آواز سنائی دی۔ "اس راجپوت جھجار سنگھ کو شاید معلوم نہیں کہ ہم عفو و درگزر کے ساتھ ساتھ باغیوں کو کیفر کردار تک پہنچانا بھی جانتے ہیں۔" چند لمحے خاموشی کے بعد شاہجہاں نے کہا۔ "ہم شہزادہ محمد اورنگزیب کی بابت اپنا سابقہ حکم منسوخ کرتے ہیں۔ ہمارے نئے حکم کا انتظار کیا جائے۔ اللہ گواہ ہے کہ ہم نے حجت تمام کی مگر اس بدبخت باغی نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اب ہم اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کریں گے۔"

شہزادہ محمد اورنگزیب کو شاہجہاں ایک بڑا لشکر دے کر دکن بھیجنے والا تھا' اسے روک دیا گیا۔ پھر اگلے روز شاہجہاں نے نیا حکم جاری کیا۔ نئے حکم کے مطابق شہزادہ اورنگزیب کو تمام مغل افواج کا سپہ سالار مقرر کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ بادشاہ کی طرف سے شہزادے کیلئے حکم ہوا کہ وہ بلاتاخیر اپنے ہمراہ زبردست لشکر لے کر باغی جھجار سنگھ کے قلع قمع کی خاطر آگرہ سے روانہ ہو جائے۔ مغل فوج پہلے ہی سے کوچ کیلئے تیار تھی البتہ اب اس کی منزل بدل گئی تھی اور تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ دو روز کے بعد ہی لشکر آگرہ روانہ ہو گیا۔ کئی نامور امراء اورنگزیب کی رکاب میں تھے۔ یہ فوج بھی بڑے اہتمام سے جھجار سنگھ کے علاقے کی طرف بڑھی۔ جو حالات و واقعات پیش آ رہے تھے ان پر میری پوری نظر تھی۔ مغل افواج کی نقل و حرکت کے ساتھ ہی میں جھجار سنگھ کی جنگی حکمت عملی سے بھی بے خبر نہیں تھی۔ اب مجھے آدم زادوں کے ان معاملات میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ جنات اس طرح فتنہ و فساد برپا نہیں کرتے اور نہ اپنے ہم جنسوں سے یوں جینے کا حق چھینتے ہیں۔ بلاشبہ آدم زاد بڑے فسادی ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں ہم جنات ان کے مقابلے کچھ بھی نہیں۔

باغی علاقے میں پہلا مضبوط قلعہ آوندچہ کا تھا۔ جھجار سنگھ نے پہلی بار مغل فوج کو بلا روک ٹوک اندر آنے دیا تھا مگر اس مرتبہ پارتی کے مشورے پر اس نے مغل فوجوں کو پہلے ہی مورچے پر روکنے کا فیصلہ کیا۔ اس قلعے تک پہنچنے کیلئے مبارزت کی صورت میں مغل فوجوں کو

بڑی دشواری ہوتی۔ راستے میں گھنے خاردار درختوں کے جھنڈ تھے۔ ان میں باآسانی راجپوت سپاہ کو چھپایا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ راستے بھی بے حد دشوار گزار اور ناہموار تھے۔ پھر ہزاروں خونخوار راجپوتوں کو راستے میں دائیں بائیں گھاٹیوں اور گنجان درختوں کی کمین گاہوں میں بٹھا دیا گیا کہ جس وقت مغل فوجیں اس طرف سے گزریں یہ لوگ سد راہ ہو کر کمین گاہوں سے تیر و تفنگ کی بارش کر دیں۔ اس کے بعد جب مغل سپاہی سراسیمگی اور بے سروسامانی کے عالم میں بھاگنے لگیں تو راجپوت کمین گاہوں سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑیں۔ ان تمام تیاریوں کے بعد خود جھجار سنگھ پانچ ہزار لڑاکا راجپوتوں کو ساتھ لے کر قلعہ آوندچہ میں محصور ہو گیا۔

خان خاناں کا خیال یہ تھا کہ جھجار سنگھ اس بار بھی قلعہ ایرج کو اپنی پناہ گاہ بنائے گا اور مغل فوجوں کو راستے میں نہیں روکا جائے گا۔ امراء میں صرف عارج اس خیال سے متفق نہیں تھا جس نے مغل امیر دلاور علی کے جسم پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اسی غرض سے اس نے مخبروں کو پہلے ہی آگے روانہ کر دیا تھا۔

سب سے آگے ہراول میں عارج اور اس کا ہی لشکر تھا۔ تیز رفتار مخبروں نے جب عارج کے خیال کی تصدیق کر دی تو وہ مہابت خاں سے ملا۔ مہابت خاں خود بھی اس سے مشورہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہ علاقہ عارج کے انسانی قالب دلاور علی ہی کا تھا۔ باغی علاقے میں ابھی مغل لشکر داخل نہیں ہوا تھا۔ اس علاقے سے ایک منزل دور پڑاؤ ڈال دیا گیا تھا۔

جب عارج مہابت خاں کے خیمے میں داخل ہوا تو اس نے شاہی ہرکارہ کو دیکھا جو باہر نکل رہا تھا۔

عارج جیسے ہی اندر پہنچا مہابت خاں نے اسے مبارکباد دی۔ عارج نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ کل صبح تک شہزادہ اورنگزیب بھی ایک بڑا لشکر لے کر یہاں پہنچنے والے ہیں۔ انہی کو جہاں پناہ نے اس مہم کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ اب سرکش و باغی جھجار سنگھ کسی طرح نہیں بچ سکے گا۔ وہاں جو امراء موجود تھے انہوں نے بھی مہابت خاں کی رائے سے اتفاق کیا۔

"حکم آیا ہے کہ اب اسی وقت پیش قدمی کی جائے جب شہزادہ حضور یہاں پہنچ جائیں۔" مہابت خاں نے مزید بتایا۔ "اب ہم قلعہ ایرج پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ وہاں تک پہنچنے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔"

مہابت خاں کچھ زیادہ ہی خوش فہم نظر آ رہا تھا۔ اس نے عارج کی آمد کو بھی زیادہ اہمیت نہ دی۔ جب اس نے قلعہ ایرج پہنچ کر دم لینے کا ذکر کیا تو عارج خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔ "حضور! میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

''ہاں ضرور!'' مہابت خاں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''ہم تو خود تمہاری رائے جاننا چاہتے تھے۔ اول تو یہ کہ اس علاقے سے تم بہت اچھی طرح واقف ہو' دوم ہم نے سنا ہے کہ تم نے اپنے کچھ مخبروں کو بھی آگے بھیجا تھا۔''

''آپ نے درست سنا تھا۔'' عارج بولا۔ پھر بتانے لگا۔ ''مخبروں کی اطلاعات کے مطابق جھجار سنگھ اس مرتبہ ہمیں آسانی سے اندر نہیں گھسنے دے گا۔'' پھر عارج نے مخبروں سے ملنے والی اطلاعات کا ذکر کرنے کے بعد کہا۔ ''قلعہ آدند چہ اس علاقے کی سرحد سے زیادہ دور نہیں ہے لیکن اس طرف رخ کرنے کی صورت میں ہماری فوجوں کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر ہمارا مقصد قلعہ ایرج پہنچنے کا ہوتا تو ہمیں اس دشوار گزار راستے سے گزرنے کی ضرورت نہ ہوتی مگر اب ہمیں بہر حال اسی راستے پر جانا ہے۔''

عارج ابھی کچھ اور بھی کہتا کہ مہابت خاں بول اٹھا۔ ''یہ بتاؤ کہ اس علاقے میں ہماری فوجوں کو کیا دشواریاں پیش آسکتی ہیں؟''

''عرض کرتا ہوں۔'' عارج نے جواب دیا۔ پھر وہ اس دشوار گزار راستے کی تفصیلات بیان کرنے لگا۔ ہمیں اس راستے سے قلعہ آدند چہ پہنچنے کیلئے گنجان خاردار درختوں کے ہزاروں جھنڈ' صدہا غار اور کھنڈر طے کرنے پڑیں گے جو نہایت ہی پر خطر اور ہولناک ہیں۔ یہاں بآسانی ہزاروں سپاہیوں کو گھات میں بٹھایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے جھجار سنگھ نے اسی لئے یہ میدان منتخب کیا ہے۔

''تم نے بڑی تشویشناک تصویر کھینچ کر ہمیں فکر مند کر دیا۔'' مہابت خاں نے کہا' پھر بولا۔ ''یہ کہو کہ پھر تدبیر کیا ہو؟''

''اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ ہماری فوجیں درختوں کے جھنڈ کاٹتی ہوئی آگے بڑھیں' اسی کے ساتھ دشوار گزار راہوں کو بھی ہموار کریں۔ اس کام کیلئے فوج کا ایک حصہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح بقیہ افواج کو آگے بڑھنے میں دقت نہیں ہو گی۔ دوسرا فائدہ اس سے یہ ہو گا کہ اگر دشمن کے سپاہی وہاں چھپے ہوں گے تو بھاگ نکلیں گے۔'' عارج نے تفصیل کے ساتھ مہابت خاں کے سوال کا جواب دیا۔

''یہ تو تم نے بہت لمبا کام بتا دیا۔'' مہابت خاں انکار میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ پھر اس نے وہاں موجود دوسرے امراء کی رائے لی۔

مہابت خاں کی مرضی نہ دیکھ کر سارے ہی امراء نے عارج کی اس تجویز سے اختلاف کیا۔ مہابت خاں نے اس معاملے کو دوسرے دن صبح پر یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شہزادہ

اورنگزیب کی آمد ہی پر اب کوئی قطعی فیصلہ ہو گا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح اورنگزیب ایک بڑے لشکر کو ساتھ لئے اس منزل پر پہنچ گیا۔ آگرہ سے روانگی کے وقت اس نے عارج کے انسانی قالب دلاور کا نام سنا تھا۔ اس کے علاوہ وزیر اعظم آصف خاں نے بھی اورنگزیب سے کہا تھا کہ کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے پہلے شہزادہ حضور دلاور کی رائے بھی معلوم کر لیں۔ اورنگزیب کی شخصیت اجنبی نہیں تھی۔ ہم ایک اور عہد میں بھی اس سے مل چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب خود اورنگزیب اقتدار سنبھال چکا تھا۔ میں اس کا تفصیلی ذکر اپنی سرگزشت میں پہلے کر چکی ہوں۔

اورنگزیب کو عارج نے تمام صورتحال سے آگاہ کر دیا تو وہ بولا۔ ''آفریں ہو تم پر کہ ہم نے جیسا سنا تھا تمہیں ویسا ہی پایا تھا۔ تمہاری تجویز نہایت معقول ہے' ہم ابھی خان خاناں کو بلا کر انہیں تمہاری تجویز سے مطلع کرتے ہیں اور اس پر عملدرآمد کا حکم دیتے ہیں۔''

''خادم ان کے حضور میں یہ عرض گزار چکا ہے۔'' عارج نے دبی زبان میں کہا۔

''پھر تو وہ یقیناً تمہاری تجویز سے متفق ہوں گے۔''

''افسوس کہ نہیں شہزادہ عالی وقار!'' عارج نے جواب دیا۔

اورنگزیب کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور اس نے کہا۔ ''سخت تعجب ہوا ہمیں!...... تم فی الحال جاؤ' ہم خان خاناں سے گفتگو کر کے ہی تمہیں کوئی قطعی حکم دیں گے۔''

''بہتر ہے شہزادہ محترم!'' عارج یہ کہتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر اسی دن اورنگزیب نے عارج کو دوبارہ بلایا اور تجویز پر عمل کرنے کی ذمہ داری اسی پر ڈال دی۔

اس کے بعد ہزاروں بیل دار اور تبردار خاردار درختوں کے گھنے جھنڈ کاٹنے اور راستوں کو ہموار کرنے کیلئے مقرر ہو گئے۔ پھر اورنگزیب نے عارج کو پیش قدمی کا حکم دیا اور خود مہابت خاں کو ساتھ لئے قلب لشکر میں رہا۔ مغل فوجوں کی اب اورنگزیب خود کمان کر رہا تھا۔ ہراول پر پہلے ہی سے عارج تھا۔ اس نے حکم ملتے ہی پیش قدمی کر دی۔

ادھر تو یہ صورتحال تھی' دوسری جانب جب جھجار سنگھ کو اپنے مخبروں کے ذریعے پیش قدمی اور عارج کی تجویز کا علم ہوا تو وہ گھبرا گیا۔ اسی گھبراہٹ میں وہ کوئی حکم دینے والا تھا کہ میرے انسانی پیکر پاربتی کو یہ خبر ہو گئی اور وہ جھجار سنگھ کے پاس پہنچ گئی۔ میں اس وقت وہاں موجود تو تھی مگر پاربتی کے جسم میں نہیں تھی۔

جھجار سنگھ نے راجپوت سرداروں کو طلب کر لیا تھا اور ان سے مشورے کر رہا تھا۔ ابھی

راجپوت سرداروں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ علاقے کی سرحد سے قلعہ آوندچہ تک پھیلے ہوئے ہزاروں راجپوت سپاہیوں کو یکجا کر لیا جائے۔ جھجار سنگھ بھی انہی کے حق میں معلوم ہو رہا تھا۔ جب اس نے کوئی رائے نہیں لی تو وہ خود ہی بول اٹھی۔ ''یہ بالکل مناسب نہیں۔''

پاربتی کی طرف پلٹتے ہوئے جھجار سنگھ نے سوال کیا۔ ''کیوں رانی؟...... تم اس تجویز کے خلاف کیوں ہو؟'' جب سے جھجار سنگھ نے بغاوت کی تھی خود کو راجہ کہلوانے لگا تھا اور پاربتی کو دوسرے کے سامنے رانی کہنے لگا تھا۔

جھجار سنگھ کے سوال کا پاربتی نے جواب دیا۔ ''اگر ہم نے دشمنوں کا راستہ روکنے والے سپاہیوں کو بھی یہاں بلا لیا تو وہ ہمارے سر پر آ جائیں گے۔ مانا کہ اس طرح ہمارے وہ سپاہی زیادہ تعداد میں مارے جائیں گے جو متفرق ہو کر جگہ جگہ چھپے ہوئے ہیں لیکن یہ سوچو کہ ان سے لڑتی بھڑتی مغل فوج جب یہاں تک پہنچے گی تو کس حال میں ہو گی...... یقیناً وہ تھکی ہوئی اور پریشان حال ہو گی اور ایسی صورت میں ہم اسے کاٹ کے رکھ دیں گے۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے پاربتی پرجوش نظر آنے لگی۔

کچھ دیر کو راجپوت سرداروں کی اس مجلس پر سکوت سا طاری ہو گیا۔ پاربتی کی رائے سب سے مختلف ہونے کے باوجود پرزور تھی۔ پھر جھجار سنگھ ہی نے اس خاموشی کو توڑا اور بولا۔ ''یہ تو بہت بڑی قیمت ہے اگر ہمارے جوان اسی طرح اور اتنی بڑی تعداد میں کاٹ دیئے گئے تو پھر آئندہ ہم کسی لڑائی میں کیسے ان کا سامنا کریں گے' ہماری تو کمر ٹوٹ جائے گی۔''

جھجار سنگھ کا یہ کہنا تھا کہ سبھی سردار باری باری اس کے حق میں بولنے لگے۔ کافی دیر بحث مباحثے کے بعد ایک راہ نکل ہی آئی۔ ہر چند کہ پاربتی اس پر بھی پوری طرح متفق نہ تھی مگر جھجار سنگھ کی بوکھلاہٹ اور کمزوری کو دیکھ کر اس نے مزید ضد نہ کی اور اتفاق کر لیا۔

طے یہ پایا کہ قلعہ آوندچہ سے ایک منزل دور سارے راجپوت سپاہیوں کو سمٹ آنے کا حکم دے دیا جائے۔ وہاں بھی گھنا جنگل تھا۔ اس طرح راجپوت سپاہی قلعے سے زیادہ لمبی مسافت پر نہ ہوتے اور بالکل منتشر حالت میں بھی نہ رہتے۔ جھجار سنگھ نے یہ فیصلہ ہوتے ہی فوراً حکم جاری کر دیا۔

جو حکم دیا گیا اس پر نہایت تیزی سے عمل کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ باغی علاقے میں داخل ہونے کے باوجود مغل فوج کو مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ عارج کی نگرانی میں فوج کا ہراول انتہائی مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرتا رہا۔ ہزاروں بیلدار اور تبردار حکم کے مطابق راستے کو صاف اور ہموار کرتے جا رہے تھے۔ اسی بنا پر مغل فوج کو پیش قدمی میں کوئی

دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

جب قلعہ آوندچہ صرف ایک منزل پر رہ گیا تو اورنگزیب نے فوجوں کو رک جانے کا حکم دیا۔ عارج نے جن خطرات کا اظہار کیا تھا وہ اب تک پیش نہیں آئے تھے۔ اس وجہ سے مہابت خاں کی بن آئی تھی۔ اسے بہر حال یہ بات گراں گزری تھی کہ شہزادہ اورنگزیب نے عارج کو اس پر ترجیح دی تھی۔ اورنگزیب نے عارج کی تجویز قبول کر لی تھی اور مہابت خاں کے خیال کو رد کر دیا تھا۔

اس وقت شام ہونے والی تھی۔ اورنگزیب کا خیال تھا کہ رات کو وہیں قیام کر کے صبح پیش قدمی کی جائے۔ جہاں تک مغل فوجیں بڑھ آئی تھیں وہاں تک تو جنگل کا صفایا ہو چکا تھا لیکن سامنے گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ وہاں پڑاؤ ڈالنے کی صورت میں لشکر کو خطرے کا سامنا رہتا۔ عارج کے ذہن میں یہی بات تھی۔

متوقع خدشات اور خطرات کو خود تک محدود رکھنے کے بجائے عارج نے اورنگزیب سے ان کا اظہار کر دیا۔ اورنگزیب نے مشورہ طلب نظروں سے مہابت خاں کی طرف دیکھا۔

''حضور والا! خادم کے نزدیک اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہمیں قلعے تک مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' مہابت خاں بولا۔ اس پر اورنگزیب نے کہا۔ ''لیکن اطمینان کر لینے میں کیا مضائقہ ہے۔'' چند لمحے توقف کے بعد اس نے عارج کو حکم دیا۔ ''تم اپنے ساتھ کچھ فوج لے جاؤ اور جنگل میں کچھ دیر دور جا کر لوٹ آؤ۔ اس طرح مجھے یہ اطمینان ہو جائے گا کہ یہاں پڑاؤ ڈالنے میں خطرہ نہیں۔''

عارج کے ساتھ ہی اورنگزیب نے راجہ دیبی سنگھ کو بھی کر دیا جو قلعہ آوندچہ کی وراثت کا دعویدار تھا۔

ابھی دن ساںہیں تھا' مگر جنگل میں اندھیرا سا پھیلنے لگا تھا۔ عارج کے حکم پر سپاہیوں نے مشعلیں روشن کر لیں۔ میری توجہ عارج کے ذہن پر بھی تھی۔ اسے جھجار سنگھ کے مزاحمت نہ کرنے پر شدید حیرت تھی۔ اس کے خیال میں جھجار سنگھ نے اس دشوار گزار علاقے میں پناہ لینے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔

مختصری مغل فوج کچھ دور تک جنگل میں بڑھتی گئی تو اچانک کمین گاہوں میں چھپے ہوئے راجپوت سپاہیوں نے عقب سے چھاپہ مارا۔ عارج نے بزدلوں کے اس حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر رفتہ رفتہ راجپوتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ مغل فوج کو اب چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

عارج کو تو دشمنوں سے برسرِ پیکار ہونے میں کچھ اور سوچنے کی مہلت نہ مل سکی لیکن راجہ دیبی سنگھ نے ایک قاصد کو اورنگزیب کے پاس دوڑا دیا کہ اس واقعے کی خبر کر دے۔

راجپوتوں کے گھیرے سے نکلنے کیلئے قاصد کو بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ اس کا جسم زخموں سے بچ گیا مگر وہ نیم جاں حالت میں بھی اورنگزیب تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اورنگزیب یہ خبر سن کر طیش میں آ گیا۔ بالآخر عارج کا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا۔ اس نے فوراً یلغار کا حکم دے دیا۔ جب اورنگزیب مغل افواج کو لے کر جنگل میں اس جگہ پہنچا جہاں معرکہ گرم تھا اس نے دیکھا کہ عارج مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ دشمن کے نرغے میں پھنسا ہوا ہے اور بہت بے جگری سے لڑ رہا ہے۔

اورنگزیب کے حملے کی تاب نہ لا کر راجپوتوں کے پیر اکھڑ گئے۔ وہ بھاگ اٹھے اور اس طرح مغلوں کے ہاتھوں بڑی تعداد میں مارے گئے جو سپاہی زندہ بچ گئے وہ قریبی پہاڑوں کی تیرہ و تاریک گھاٹیوں میں جا چھپے۔ اس موقع پر اورنگزیب نے منادی کرا دی کہ جو لوگ حلقہ اطاعت میں آ جائیں اور ہتھیار ڈال دیں انہیں فوراً امان دی جائے اور جو اطاعت قبول نہ کریں بلا تاخیر قتل کر دیئے جائیں۔ بڑی شدت اور سختی سے ان احکام کی تعمیل ہوئی۔

ہزاروں راجپوتوں کو خون کے دریا میں نہلا دیا گیا۔ جو راجپوت سپاہی پہاڑوں کی گھاٹیوں اور کمین گاہوں میں چھپے ہوئے اب بھی تیروں کی بارش کر رہے تھے۔ ان سے اگرچہ مغل فوج کو کچھ نقصان پہنچا مگر اس کی پیش قدمی نہ رکی۔ چھپے ہوئے دشمنوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا جاتا رہا۔ جس طرف سے کوئی تیر آتا مغل سپاہی اسی جانب ہلہ بول دیتے۔

زندہ بچ جانے والے سپاہی کیونکہ قدم قدم پر مزاحمت کر رہے تھے اس لئے مغل فوج کی پیش قدمی بہت سست رفتار تھی۔ جنگل اور گھاٹیوں کی پرخطر مسافت طے کرنے میں جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ان سے بڑے بڑے تجربے کار مغل سردار گھبرا گئے مگر عارج اسی طرح تازہ دم اور برسرِ پیکار نظر آتا تھا۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ اس پورے لشکر میں آدم زادوں کے ساتھ ہی ایک جن زاد بھی موجود ہے۔ وہی جن زاد ایسا تھا جو ہر قیمت پر دشمن کے قلعے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کا سبب صرف مجھے معلوم تھا۔ عارج کے سینے میں آگ ہی ایسی لگی تھی جو دشمن کو زیر کیے بغیر کسی طرح نہ بجھتی۔ وہ دشمن، وہ جھجار سنگھ اس کا رقیب بھی تو تھا۔ اب تک عارج اسی غلط فہمی کا شکار تھا کہ میں نے پاربتی کے جسم میں مستقلاً پناہ لے رکھی ہے اور جھجار سنگھ کی بیوی بن کر اس سے بے وفائی کر چکی ہوں۔

میں نے دانستہ عارج کی غلط فہمی کو دور نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ عارج کے عشق کی

شدت کا اندازہ کرنا بھی تھا۔

بالآخر گھنا جنگل عبور کر کے مغل فوجیں ایک کھلے میدان میں پہنچ گئیں۔ وہاں سے قلعہ آوندچہ تقریباً تین میل کی مسافت پر تھا۔

یہاں راجپوتوں نے بڑی دلیری سے مغل فوجوں کا مقابلہ کیا۔ وہ سب طرف سے سمٹ سمٹا کر مغل فوج کی راہ میں دیوار بن گئے لیکن حوصلوں اور ولولوں نے اس دیوار میں شگاف ڈال دیا۔ اس خون ریز معرکے میں بہت سی مغل فوج ضائع ہوئی، اسی کے ساتھ کئی مشہور مغل سردار مارے گئے مگر آگے بڑھتے ہوئے قدم نہ رکے۔

مغل لشکر باغیوں کو زیر و زبر کرتا ہوا اس مقام تک پہنچ گیا جہاں سے قلعہ آوندچہ صرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر رہ گیا۔ وہاں لشکر نے پڑاؤ ڈال دیا۔ منزل کو اس قدر قریب دیکھ کر عارج اپنے جوش کو نہ دبا سکا۔ اس نے اورنگزیب سے قلعے کا محاصرہ کرنے کی اجازت لے لی۔ اورنگزیب نے اس موقع پر بھی راجہ دیبی سنگھ کو عارج کے ساتھ کر دیا۔

عارج نے بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ قلعے کی طرف یلغار کر دی۔ وہ پہلے ہی حملے میں جھجار سنگھ کے بہت سے مورچے فتح کر کے قلعے کی دیوار کے نیچے پہنچ گیا۔ پھر اس نے تین طرف سے محاصرہ کر کے باقاعدہ فوج متعین کر دی۔ عام گزرگاہوں پر عارج نے پہرا بٹھا دیا اور حکم دیا کہ باہر سے رسد کی کوئی چیز نہ آنے پائے۔ جھجار سنگھ اپنے پانچ ہزار ہمراہیوں کو لئے ہوئے قلعے کی فصیل پر موجود تھا۔ عارج کی فوج پر وہ ہر طرف سے تیروں اور آتش بار گولوں کی بارش کر رہا تھا۔ رانی پاربتی بھی منہ پر نقاب ڈالے اور بدن پر ہتھیار سجائے ہوئے جھجار سنگھ کے پہلو میں موجود تھی۔

یہی وہ لمحات تھے جب میں نے خاصے عرصے کے بعد ایک مرتبہ پھر رانی پاربتی کے جسم میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ عارج ہی تھا۔ کافی مدت کے بعد وہ پاربتی کے مقابل آیا تھا۔

پاربتی کے جسم میں اترنے اور قرار پانے کے بعد میں نے پوری توجہ، انہماک اور سرگرمی سے عارج کے پرزور حملوں کو روکنا شروع کر دیا۔ عارج کے حکم پر نیچے سے توپیں سر کی جا رہی تھیں اور جواباً تیر بھی چلائے جا رہے تھے۔

اورنگزیب کو یقیناً اندازہ نہ تھا کہ عارج ایک دم اتنی سرگرمی دکھائے گا اور میدان کارزار گرم کر دے گا۔ اسے ایک ایک پل کی خبر ملتی رہتی تھی۔ یہ بات مجھے معلوم تھی۔ میدان جنگ میں اورنگزیب کبھی حالات سے غافل نہیں رہتا تھا۔ اسی بنا پر اورنگزیب نے عارج کی

مدد کو مہابت خاں کے ساتھ مزید فوج آگے بھیج دی۔

عارج کو میں اور مجھے عارج دیکھ چکا تھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے انسانی قالبوں کو پہچانتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ عارج مستقل طور پر دلاور علی کے جسم پر قابض تھا جبکہ میرے ساتھ بوجوہ ایسا نہیں تھا۔ جب ضرورت محسوس کرتی میں پاربتی کے جسم پر اتر جاتی۔

مہابت خاں جب مزید فوج لے کر عارج کی مدد کو پہنچا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا پھیل جانے کے سبب دونوں ہی طرف سے جنگ میں شدت نہیں رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر بعد جنگ بالکل رک جائے گی اور پھر یہی ہوا۔

عارج مسلسل مستعد و سرگرم تھا۔ گھڑی بھر آرام کیے بغیر وہ لڑتا رہا تھا اسی وجہ سے کافی تھک گیا تھا۔ اس نے نہ صرف اپنی فوج کو لڑوایا تھا بلکہ عملاً خود بھی اس کے ساتھ شانہ بشانہ لڑا تھا۔ اس کے چلائے ہوئے تیر صحیح نشانے کے سبب راجپوت باغیوں کے سینوں میں ترازو ہوتے رہے تھے۔ مہابت خاں نے بھی یہ بچشم خود دیکھ لیا کہ عارج تھکن سے چور ہے۔ اس نے اسی لئے عارج کو آرام کا مشورہ دیا۔ عارج نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور مہابت خاں نے اس کی جگہ سنبھال لیا۔

مہابت خاں کی آمد کے بعد ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب عارج آرام کرے گا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں ایک منصوبہ تشکیل پانے لگا تھا۔ مجھے علم تھا کہ اگر میں نے جھجار سنگھ کو اپنے منصوبے کے متعلق بتایا تو وہ اس سے اتفاق نہیں کرے گا۔ میرے نزدیک یہ بات قطعی طے شدہ تھی کہ فتح آخر کار مغلوں ہی کو ہوگی اور راجپوت مغلوب ہوں گے۔ میں بس وقتی طور پر ہی عارج کو زچ کرنا چاہتی تھی۔ میں ابھی فصیل ہی پر تھی کہ جھجار سنگھ نے مجھے وہاں سے جانے اور آرام کرنے کیلئے ضد کی۔

ہر چند کہ یہ میرے منصوبے کے خلاف تھی مگر مصلحتاً اور وقتی طور پر میں نے جھجار سنگھ کی بات مان لی۔ مجھے یقین تھا کہ خود جھجار سنگھ بھی کچھ دیر میں اپنی جگہ راجپوت سرداروں کو متعین کر کے سو رہے گا تاکہ صبح تازہ دم ہو کر اپنے دشمن کے مقابل آ سکے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ ابھی ایک پہر رات بیتی ہوگی کہ میں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے جھجار سنگھ کو بے خبر گہری نیند سوتے دیکھا۔ میں نے جلدی جلدی مگر خاموشی اور احتیاط کے ساتھ اپنے انسانی پیکر پر ہتھیار سجائے اور باہر نکل گئی۔

جب میں کچھ ہی دیر کے بعد دوبارہ قلعے کی فصیل پر پہنچی تو راجپوت سردار مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے تو خود مجھے سونے کیلئے جاتے دیکھا تھا اور اس وقت مجھے سونا ہی

چاہیے تھا۔

کئی سردار میرے ساتھ ہو لئے کیونکہ فصیل پر میں کہیں رکی نہیں۔ چہل قدمی کرتے ہوئے میں گہری نظروں سے نیچے کا جائزہ لے رہی تھی۔ معاً میں نے ایک راجپوت سردار کو مخاطب کیا۔ ''دیکھو ہمارا دشمن اس وقت کیسا بے خبر ہے!..... ہے نا؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''ہاں رانی!'' راجپوت سردار نے میری تائید میں کہا۔ ''بظاہر کوئی سرگرمی معلوم نہیں ہوتی۔

''اگر ایسے میں شب خون مارا جائے تو دشمن کے ہوش اڑ جائیں۔'' میری آواز پر جوش ہو گئی۔ میرا منصوبہ شب خون مارنا ہی تھا۔

''مگر راجہ...'' ایک راجپوت سردار نے کچھ کہنا چاہا۔

''انہیں آرام کرنے دو۔'' میں نے سخت آواز میں کہا۔ ''یہ میرا حکم ہے' رانی پاربتی کا حکم' شب خون ضرور مارا جائے گا۔ تم میں سے جسے اپنی جان کا خوف ہو' میرے ساتھ نہ آئے۔''

پھر کسی کی مجال نہ ہوئی کہ پاربتی کے سامنے دم مار سکتا۔ میں گھوڑے پر سوار ہوئی اور پھر قلعے کا دروازہ کھلوایا۔ میرے ساتھ دلیر راجپوتوں کا غول تھا۔ قلعے کا دروازہ کھلتے ہی میرا گھوڑا کمان سے چھوٹنے ہوئے کسی تیر کی طرح تیزی کے ساتھ آگے بڑھا۔ اسی کے ساتھ میرے ساتھیوں نے بھی باگیں چھوڑ دیں۔ میری آنکھوں میں ایک طرف تو عارج کے انسانی پیکر کا چہرہ گھوم رہا تھا کہ جب اسے شب خون کا علم ہوگا تو اس پر کیا گزرے گی۔ دوسری جانب میں مغلوں کی یہ غلط فہمی دور کر دینا چاہتی تھی کہ ہمیشہ میدان جنگ میں انہی کا پلہ بھاری رہتا ہے۔

کسی کو یہ توقع نہیں رہی ہوگی کہ راجپوت مغلوں کے مقابلے میں انتہائی کم تعداد کے باوجود ان پر شب خون مارنے کی ہمت کر سکیں گے۔ محاصرہ کیے جانے کے باوجود قلعے کا دروازہ کھول کر باہر آ جانا بڑے عزم و حوصلے کی بات تھی۔

میں نے مغل فوج پر ایسا حملہ کیا کہ افراتفری مچ گئی۔ میری نظریں عارج کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کا خیمہ تلاش کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ چیخ و پکار سے یقیناً اس کی آنکھ کھل جانی چاہیے تھی۔ میری یہ توقع بھی پوری ہوئی۔

خیمے کے باہر مغل فوج کا پرچم لہرا رہا تھا مگر وہاں مجھے کوئی محافظ نظر نہ آیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ محافظ خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے ہوں گے۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میں نے

خیمے کے پردے کو جنبش کرتے دیکھا۔

''کوئی اس پر تیر نہیں چلائے گا۔'' میں نے چیخ کر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''وہ میرا شکار ہے اور میں ہی اسے نشانہ بناؤں گی۔'' ظاہر ہے میرے ساتھ جو راجپوت سپاہی تھے ان میں سے کسی کا چلایا ہوا تیر بھی عارج کیلئے موت کا پیغام ثابت ہو سکتا تھا۔ میں بھلا عارج کی موت کیسے گوارا کر سکتی تھی۔

اسی اثنا عارج اپنے انسانی پیکر پر ہتھیار سجائے خیمے سے نکلا۔ اس وقت مغل فوج راجپوتوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں میں پامال ہو رہی تھی۔ ان کا قتل عام جاری تھا۔

یہ بڑا نازک اور خطرناک وقت تھا۔ اگر میں اپنے سپاہیوں کو عارج پر حملہ کرنے سے نہ روک دیتی تو لازماً اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ صورتحال دیکھ کر عارج نے اپنے گھوڑے پر سوار ہونے میں دیر نہیں کی۔ اس کا گھوڑا خیمے کے در سے بندھا ہوا تھا۔

عارج اور میں نے تقریباً ایک ساتھ اپنے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی۔ میں نے دانستہ عارج کو نکل جانے دیا۔ عارج نے بھاگتے ہوئے مغل سپاہیوں کو للکار کر روکا۔ اسے دیکھ کر سپاہیوں کی ہمت غالباً بندھی۔ وہ اسی لئے اس کے اردگرد اکٹھے ہونے لگے۔ اچانک ایک جانب سے شور اٹھا اور میں ادھر متوجہ ہو گئی۔ مہابت خاں نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ میں اس سے برسرِ پیکار ہو گئی۔ ابھی ذرا دیر ہوئی تھی کہ عارج بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا' میں جو مغل سپاہیوں کیلئے پیغام اجل بنی ہوئی تھی۔ عارج نے اپنا گھوڑا میری طرف دوڑا دیا۔

میرا عالم اس وقت یہ تھا کہ گھڑی بھر میں کہیں ہوتی' گھڑی میں کہیں۔ شب خون کا یہ آخری مرحلہ تھا۔ پھر جب تک عارج میرے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوا' میں نے تیزی سے اپنے گھوڑے کا رخ موڑ دیا اور ہاتھ اٹھا کر دائرے کی صورت میں گھمایا۔ راجپوت سپاہیوں کیلئے یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ لڑتے بھڑتے قلعے میں واپس آ جائیں۔

ممکن ہے کہ عارج مجھے روکنے میں کامیاب ہو جاتا کہ درمیان میں کئی راجپوت سپاہی آ گئے۔ عارج کو مجبوراً ان سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس اثنا میں میں کافی دور نکل آئی۔ عارج یقیناً مجھ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا مگر اس کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

یہ لڑائی مسلسل تین روز تک جاری رہی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اب خود اورنگزیب مقابل پر آ چکا تھا۔ اس نے اگلے مورچوں کی کمان سنبھال لی تھی۔ اس کے ایک جانب عارج اور دوسری جانب مہابت خاں تھا۔

تین دن تک میں حملہ آور مغل فوج پر مسلسل گولہ باری کراتی رہی۔ جھجار سنگھ اب میری کوئی بات نہیں ٹال رہا تھا عملاً اب میں ہی جھجار سنگھ کے بجائے راجپوت سپاہ کو لڑوا رہی تھی۔

تیسرا دن گزر گیا تو پھر پاربتی کی کمان میں راجپوتوں نے شب خون مارا۔ میں اب پاربتی کے جسم سے نکل آئی تھی کیونکہ اس شب خون کے حق میں نہیں تھی۔ اس مرتبہ پاربتی کے ساتھ جھجار سنگھ بھی تھا اب مغل فوج غافل نہیں تھی۔

دراصل میں نے جو پہلا شب خون مارا تھا اس کی کامیابی کے بعد جھجار سنگھ غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہی غلط فہمی اسے لے ڈوبی۔ میں بذاتِ خود اس شب خون کو غلط سمجھ رہی تھی۔ جھجار سنگھ کو میں نے اسی لئے پہلے یہ بتا دیا تھا کہ اب صورتحال بدل چکی ہے' شب خون مارنا خودکشی کے مترادف ہے اس لئے کہ مغل چوکنا ہیں۔

شب خون مارے جانے سے پہلے میں نے دیر تک فصیل پر چڑھ کر اطراف کا جائزہ لیا تھا اور پھر جھجار سنگھ کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ سر خود جھجار سنگھ نے میرا مشورہ قبول نہ کیا تو مجبوراً مجھے اس کی بیوی پاربتی کا جسم چھوڑنا پڑا۔

اس شب خون کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کے پہلے ہی جوابی حملے سے راجپوتوں کے پیر اکھڑ گئے۔ سخت معرکے کے بعد جھجار سنگھ کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اب میری نظر دونوں ہی نبرد آزما لشکروں پر تھی۔

اس معرکے میں کافی مغل فوج کام آئی لیکن اب دو بدو لڑائی نے گویا جنگ کا فیصلہ کر دیا۔ اگر جھجار سنگھ مزید کچھ دیر میدان میں ڈٹا رہتا تو جنگ کا آخری فیصلہ اسی رات ہو جاتا لیکن پاربتی کے بروقت اصرار پر وہ فوراً قلعہ بند ہو گیا اور یوں مقابلے سے اپنی جان بچا کر لے گیا۔ پاربتی ہی نے اسے مغل سپاہیوں کے نرغے سے نکلنے میں مدد دی تھی۔

اس قلعے میں بھی قلعہ ایرج کی طرح کسی آڑے وقت کیلئے ایک خفیہ سرنگ موجود تھی۔ جھجار سنگھ اب جی چھوڑ بیٹھا تھا۔ شب خون میں تقریباً تین ہزار سے زیادہ راجپوت مارے گئے تھے۔

جھجار سنگھ نے اسی رات اپنی جگہ ایک راجپوت سردار کو متعین کر دیا اور قلعے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ نقد و جواہر کے خزانوں میں سے جس قدر سات خچروں پر لادا جا سکا اس نے لادا اور پھر پاربتی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔

پاربتی فرار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس پر جھجار سنگھ اور پاربتی کے درمیان تلخ کلامی ہو گئی۔

''تم آخر کیوں یہیں رہنے پر بضد ہو؟'' جھجار سنگھ نے قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔

''تمہیں خود اس کی وجہ معلوم ہے۔'' پاربتی نے جواب دیا۔

''مگر میں تمہاری زبان سے وجہ سننا چاہتا ہوں۔'' جھجار سنگھ زور دے کر بولا۔

''سننا ہی چاہتے ہو تو سنو کہ اس طرح راجپوت سپاہیوں کو مغلوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہو جانا سخت بزدلی ہے۔'' پاربتی نے بلا جھجک کہہ دیا۔ اس پر پاربتی کے بیٹے نے اپنے باپ کی حمایت لی اور پاربتی نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''بکرماجیت! تو چپ رہ۔'' کافی تو تکار کے بعد آخر پاربتی کو بھی جھجار سنگھ کے ساتھ وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ صرف چند راجپوت سرداروں کو یہ خبر ہو سکی کہ جھجار سنگھ وہاں سے فرار ہو کر کہاں گیا ہے۔

صبح جب قلعے میں یہ خبر عام ہوئی تو راجپوت سپاہی جی ہار گئے۔ نتیجے کے طور پر دوپہر سے کچھ پہلے ہی انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اورنگزیب قلعے کے شرقی دروازے سے لشکر کے ساتھ قلعے میں داخل ہوا۔ اس کی رکاب میں عارج بھی تھا۔ پاربتی اور جھجار سنگھ کے فرار کی خبر اس سے بھی نہ چھپ سکی تھی۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ منزل قریب آتے آتے اس سے دور ہو گئی تھی۔ پھر جو کچھ بھی ہوا عارج نے اس میں زیادہ دلچسپی نہ لی۔

قلعے کے جنوبی دروازے پر فتح کا پرچم نصب کیا گیا اور فصیل پر اورنگزیب کے حکم سے اذان دی گئی۔ جن راجپوت سرداروں نے ہتھیار ڈال کر امان طلب کی تھی انہی میں سے ایک نے یہ راز کھول دیا کہ جھجار سنگھ وہاں سے فرار ہو کر دھاسونی گیا ہے۔

اورنگزیب نے قلعے کا انتظام کر کے اسے راجہ دیبی سنگھ کے سپرد کیا اور لشکر کو فوری طور پر قلعہ دھاسونی کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ یہ حکم سن کر عارج کو بہت خوشی ہوئی۔ وہ جو بجھ سا گیا تھا ایک بار پھر پر جوش نظر آنے لگا۔

مغل فوج دو دن میں دھاسونی پہنچی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ وہاں بھی راجپوتوں کی خاصی تعداد تھی۔ سپاہی وہاں پہنچتے ہی مورچے کھودنے اور نقبیں لگانے میں بڑی سرگرمی کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ وہاں کی زمین اتنی پتھریلی اور سخت تھی کہ فولاد بھی اس کے آگے کند پڑ جاتا تھا تاہم بہادروں نے ہمت نہ ہاری اور یہ کام کر لیا۔

دھاسونی کے اس مضبوط قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا۔ یہ قلعہ جھجار سنگھ کے باپ نرسنگھ راؤ نے اپنے دور اقتدار میں تعمیر کرایا تھا۔ جب قلعے کو مغل فوجوں نے گھیر لیا تو جھجار سنگھ نے توپ، بندوق اور آتشیں ہتھیاروں کے استعمال میں کمی نہ کی۔ منجنیقوں کے ذریعے بہت بھاری

بھاری پتھر بھی مغل فوج کی طرف پھینکے گئے۔ دلبرداشتہ اور ہر طرف سے مایوس ہونے کے باوجود راجپوتوں نے مغل سپاہیوں کو زیادہ قریب نہ آنے دیا۔ وہ مغلوں پر مسلسل تیر برساتے رہے پتھر پھینکتے رہے اور گولہ باری کرتے رہے۔ یہ حال بدستور رہا اور سینکڑوں مغل سپاہی مارے گئے تو اورنگزیب نے امراء کا اجلاس طلب کر لیا۔

☆...☆...☆

اس اجلاس میں عارج بھی ایک امیر کی حیثیت سے شریک تھا۔

حالات نے کچھ ایسی صورتحال اختیار کر لی تھی کہ عارج کی ذاتی ''جنگ'' مغلوں اور راجپوتوں کی جنگ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ خود وہ بھی اس جنگ میں ایک فریق کی طرف تھا۔ میں نے اس کے دل و دماغ پر توجہ کی تو پتہ چلا وہ جو دعا کر رہا تھا بڑی عجیب سی تھی اور وہی یہ دعا کر سکتا تھا کہ اس جنگ میں اس کا دشمن نہ مارا جائے۔ جھجار سنگھ سے خود اسے آخری معرکہ کرنا تھا۔ اس نے تو جیسے اپنی زندگی کا یہی مقصد بنا لیا تھا ورنہ اتنی طویل جدوجہد کیوں کرتا۔ اس نے بڑے طویل عرصے صبر کیا تھا اور اب اسے صبر کا یارانہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے امراء کے اجلاس میں ایک ایسی خطرناک تجویز پیش کی سب حیران رہ گئے۔ یہ تجویز اس کی جواں مردی اور بہادری کا ثبوت بھی تھی۔

عارج کی تجویز پر صرف اورنگزیب کو حیرت نہ ہوئی کیونکہ اب وہ عارج کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ امراء کو اس وقت اور بھی حیرانی ہوئی جب اورنگزیب نے عارج کی تجویز منظور کر لی اور باقی امراء کی تجویزوں کو قطعی رد کر دیا۔

پھر اسی روز عارج کی تجویز پر عمل کرنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ہوش ربا کمندیں اور آسمان پایہ زینے تیار کیے جانے لگے۔ عارج کی تجویز یہ تھی کہ سنگ باری اور گولہ باری کے باوجود جس طرح بن پڑے قلعے پر چڑھا جانا چاہیے اور ایک دم یورش کر دینی چاہیے۔

جھجار سنگھ کی نقل و حرکت اور اس کے رد عمل پر بھی میں نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ اس نے اب اپنے خلاف یہ سامان فراہم ہوتے دیکھا تو اس کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اس نے خوفزدہ ہو کر اورنگزیب کو صلح کا پیغام بھیجا۔

ابھی صلح کی یہ گفتگو شروع نہ ہوئی تھی کہ عارج کے لشکریوں اور بہادر روہیلوں کی جمعیت نے قلعے کی جنوبی سمت سے کمندوں کے ذریعے چڑھائی شروع کر دی۔ پھر انہوں نے قلعے کے اندر پہنچ کر قلعے کے دروازے کو آگ لگا دی۔ بہت سے جان باز مغل سردار قلعے میں گھس گئے۔ عارج ان میں پیش پیش تھا۔

جھجار سنگھ پاربتی اور اپنے اہل و عیال کو لے کر انتہائی یاس اور سراسیمگی کے عالم میں قلعے سے باہر نکل آیا۔ پھر وہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف کو بھاگ اٹھا۔

ابھی مغل فوج کو جھجار سنگھ کے فرار کی خبر نہ تھی۔ طے یہ پایا کہ صبح ہونے کے بعد فوج قلعے میں داخل ہو گی مگر عارج سے کہاں صبر ہوتا۔ عارج کی دیکھا دیکھی وہ لوگ بھی قلعے میں گھس پڑے جو لوٹ مار اور غارت گری کیلئے بے چین تھے۔ انہیں جس طرف سے بھی راستہ ملا قلعے میں داخل ہو گئے۔

جب یہ خبر خان خاناں مہابت خاں کو ملی تو وہ قلعے میں آیا اور لوگوں کو سختی کے ساتھ لوٹ مار کرنے سے روک دیا۔ اس نے جگہ جگہ سخت گیر آدمی مقرر کر دئیے کہ وہ نگرانی کرتے رہیں۔

اسی دوران میں عارج شمشیر برہنہ لئے سارے قلعے میں چکراتا رہا مگر اسے اپنے دشمن کا سراغ نہ مل سکا نہ ہی کہیں پاربتی نظر آئی۔ اس کی بے خبری پر مجھے ہنسی آنے لگی۔ یہ عقدہ دوسرے دن صبح کھلا کہ جھجار سنگھ اور پاربتی دونوں رات ہی کو فرار ہو گئے تھے۔

دوسرے روز صبح خان خاناں مہابت خاں نے مال و اسباب کی ضبطی اور مدفون خزانوں کی تلاش کیلئے عارج کو مقرر کیا۔ دلبرداشتہ عارج کو بہ مجبوری یہ کام انجام دینا پڑا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے مخبروں کو شاہ پور روانہ کر دیا۔ اب اس کے خیال میں وہی ایک ایسا قلعہ رہ گیا تھا جہاں جھجار سنگھ پناہ لے سکتا تھا۔

عارج نے اپنے جن آدمیوں کو مدفون خزانوں کی تلاش پر مامور کیا تھا وہ خبر لے کر آئے کہ جنگل میں ایک کنویں کے اندر سونے کے سکے اور چاندی کے برتن بھرے ہوئے پائے گئے ہیں۔ عارج نے یہ اطلاع خان خاناں کو دی۔

خان خاناں خود جنگل میں موجود اس کنویں پر پہنچا اور مزید کنوؤں کی تلاش پر بھی آدمی مقرر کیے۔ دو تین اور کنوؤں میں بھی جو غلہ ذخیرہ کرنے کیلئے بنائے جاتے ہیں سونے کے دفینے ملے۔

ابھی دفینوں کی تلاش جاری تھی اور کام ختم نہ ہوا تھا کہ عارج کے بھیجے ہوئے مخبر شاہ پور سے واپس آ گئے۔ انہوں نے انتہائی تیز رفتاری کا ثبوت دیا تھا۔ عارج کا اندازہ قطعی درست ثابت ہوا۔ جھجار سنگھ شاہ پور ہی گیا تھا۔ عارج نے یہ خبر فوراً اورنگزیب کو پہنچائی۔

لکھم ونس کے خیال سے اورنگزیب نے فی الحال وہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے حکم دیا کہ مہابت خاں اور عارج اپنے اپنے لشکروں کو لے کر فوراً روانہ ہو جائیں۔ وہ بھی پیچھے

پیچھے آتا ہے۔ اورنگزیب نے ایک اور تجربے کار امیر کو بھی ان دونوں کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔ مغل افواج کے یہ تینوں لشکر شاہ پور کی طرف روانہ ہو گئے۔

ادھر جھجار سنگھ میں اب قطعی یہ ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ مزید مقابلہ کر سکتا اور نہ ہی وہ اس غرض سے شاہ پور گیا تھا۔ شاہ پور سے وہ برار کے علاقے میں گونڈوانہ اور دیوگڑھ کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یوں بھی شاہ پور میں صرف دو ہزار سپاہی تھے جو ظاہر ہے کہ مغل فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

جھجار سنگھ کی بدقسمتی سے انہی دنوں گونڈوانہ کا زمیندار فوت ہو گیا تھا۔ وہ زمیندار جھجار سنگھ کا دوست تھا۔ اس کے مرنے اور مغل فوج کے شاہ پور کی حدود میں داخل ہونے کی خبر جھجار سنگھ کو ایک ساتھ ملی۔

جھجار سنگھ یہ صورتحال دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا' ناچار اس نے قلعے کی توپوں کو توڑ کر ناکارہ بنا دیا۔ عمارتوں کو بارود سے اڑا دیا اور جس ساز و سامان کو ساتھ لے جانا محال تھا اسے آگ لگا دی پھر اس نے جواہر' قیمتی مال و اسباب' نقد روپیہ' سونے چاندی کے برتن اور دیگر اشیاء ہاتھیوں' اونٹوں پر بار کرا دیں۔ آخر میں وہ پاربتی اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہوا۔ یہ رات کا وقت تھا' جھجار سنگھ نے وہاں راجپوت سپاہیوں کو بھی نہ چھوڑا اور انہیں بھی اپنے ساتھ لے لیا کہ کسی آڑے وقت کام آ سکیں۔ وہ رات ہی کے وقت شاہ پور سے دیوگڑھ روانہ ہو گیا۔

صبح ہوتے ہوتے مغل فوجیں شاہ پور کی بستی میں داخل ہو گئیں اور اس پر قبضہ کر لیا۔

ایک بار پھر جھجار سنگھ غوطہ دے گیا تھا' عارج نے دور دور تک مخبروں کو دوڑایا اس مرتبہ جھجار سنگھ نے اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا کہ وہ کدھر گیا ہے۔ عارج کے روانہ کردہ مخبر دو ہفتے کے بعد اس کا پتہ لگا پائے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ جھجار سنگھ روزانہ سات آٹھ کوس سے زیادہ مسافت طے نہیں کر سکتا ہے۔ اس کے اور مغل فوج کے درمیان اب پندرہ روز کا فرق پڑ گیا تھا پھر بھی عارج نے اس ضمن میں مہابت خاں سے بات کی کہ تعاقب کیا جائے۔

مہابت خاں نے عارج کی بات مان لی اور تعاقب پر راضی ہو گیا۔ اسی دن فوج کو کوچ کا حکم دے دیا گیا پھر یہ فوج شہر بہ شہر اور قصبہ بہ قصبہ مکمل پندرہ روز تک رات دن جھجار سنگھ کے تعاقب میں آگے بڑھتی رہی۔

آخر کار ایک روز عین غروب آفتاب کے وقت جھجار سنگھ مغل فوج کے نرغے میں آ گیا۔ جب تک درمیان میں کچھ فاصلہ رہا دونوں فوجوں کے درمیان تیروں اور نیزوں کا تبادلہ

ہوتا رہا۔ جب فاصلہ ختم ہو گیا تو دونوں نے تلواریں علم کر لیں اس کے ساتھ سخت گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ اس آخری مقابلے میں عارج سے میں بالکل قریب تھی کوئی بھی لمحہ عارج کی زندگی کا آخری لمحہ ثابت ہو سکتا تھا ہر چند کہ مغل فوج کا پلہ بھاری تھا اور اس کی تعداد بھی راجپوتوں سے بہت زیادہ تھی لیکن جنگ بہر حال جنگ ہوتی ہے۔ اگر مغل لشکر جیت جاتا اور عارج کو اس فتح کی قیمت اپنی زندگی دے کر ادا کرنی پڑتی تو میرے نزدیک یہ شکست ہی ہوتی۔

مجھے سب سے زیادہ خطرہ پاربتی کی طرف سے تھا وہ راجپوت عورت بلاشبہ شجاعت اور بہادری کے قابل تعریف جوہر دکھا رہی تھی۔ اس مردانہ ہمت عورت نے وہ تیغ زنی کی جو کسی بہتر سے بہتر شجاع مرد سے ممکن نہ تھی' وہ جس طرف تلوار چلاتی تھی ایک دو سر ضرور زمین پر گرتے نظر آتے تھے غرض کہ اسی ہنگامے میں رات ہو گئی مگر جنگ نہ رکی۔

میری خود غرضی بار بار مجھے اس پر اکسا رہی تھی کہ میں بھی اس جنگ میں شریک ہو جاؤں۔ اس کا راستہ یہ تھا کہ میں اس دلیر و بہادر راجپوت عورت پاربتی کے جسم میں اتر جاتی یوں میں اپنے محبوب عارج کا دفاع کر سکتی تھی۔ یقیناً یہ دشمن کو فریب دینا ہوتا' میری طبیعت اس فریب پر آمادہ نہ ہوئی' میرے نزدیک یہ بزدلانہ اقدام تھا۔

دوسری ایک صورت اور بھی تھی کہ عارج کی جان خطرے میں نہ پڑتی' میں اسے دلاور علی کے انسانی قالب سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیتی۔ اس میں بس ایک اندیشہ تھا کہ عارج اپنے انسانی قالب کے زیر اثر اسے اپنی توہین تصور نہ کرتا ایسی صورت میں ظاہر ہے وہ دلاور علی کا جسم چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ ابھی میں اسی تذبذب کا شکار تھی کہ میری نظر عارج پر پڑی اس وقت تک وہ جھجار سنگھ اور پاربتی کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ راجپوتوں نے ان دونوں کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا جسے توڑنے میں عارج کو پسینے آ گئے' لڑتے لڑتے وہ اپنے لشکر سے کٹ کر رہ گیا تھا۔

عارج پہلے اپنی تلوار بلند کیے جھجار سنگھ کی طرف لپکا مگر پاربتی اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر فوراً درمیان میں آ گئی اور بلند آواز سے عارج کو اس کے انسانی قالب کے نام سے مخاطب کیا۔ "دلاور! ابھی میں زندہ ہوں اور اپنا عہد نہیں بھولی۔"

مجبوراً عارج کو پاربتی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ان دونوں کی تلواریں آپس میں ٹکرائیں۔ پہلا وار پاربتی نے کیا تھا جسے عارج نے تیزی سے پہلو بدل کر اپنی تلوار پر روک لیا تھا۔

ادھر تو عارج اور پاربتی ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوئے ادھر جھجار سنگھ موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے بیٹے بکرماجیت کو ساتھ لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ان دونوں کو فرار ہوتے دیکھ کر عارج کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ پاربتی کے وار روکنے میں مصروف تھا جو بڑے جان لیوا تھے مقابلہ کیونکہ برابر تھا اس لئے میں نے مداخلت نہیں کی اس وقت ان دونوں کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

پاربتی کو ابھی خبر نہ تھی کہ اس کا بے غیرت شوہر لڑنے کے بجائے اپنی جان بچا کر فرار ہو چکا ہے۔ اسے جھجار سنگھ سے ایسی بزدلی کی توقع نہیں تھی کہ اس کو تنہا چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

پھر عارج نے چیخ کر پاربتی سے کہا۔ "اے دینار! تو نے آج پھر....."

عارج اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ میں پاربتی کے جسم میں ہوں اس نے اسی لئے پاربتی کو میرے نام سے مخاطب کیا تھا۔ پاربتی نے اسی بنا پر عارج کی بات کاٹ دی۔ "کون دینار؟ ..... تو کس کا نام لے رہا ہے دلاور؟"

"تو..... تو کیا تو ..... تو دینار نہیں ہے؟" عارج حیرت سے بولا۔

عین اسی لمحے میں نے عارج سے سرگوشی کی۔ "پاربتی ٹھیک کہتی ہے اے عارج! میں وہاں نہیں یہاں ہوں' تیرے پاس!" ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے اندھیرے کی چادر اپنے وجود سے الگ کر دی۔ اب عارج مجھے بآسانی دیکھ سکتا تھا اور میری آواز تو وہ سن ہی رہا تھا مگر کوئی آدم زاد نہ تو میری آواز سن سکتا تھا نہ اس کیلئے مجھے دیکھنا ممکن تھا۔

میرے بارے میں حقیقت کا علم ہونے کے بعد عارج نے اپنی حیرت پر بمشکل قابو پایا۔ اس عرصے میں وہ پاربتی کے وار بھی روکتا رہا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو پاربتی اسے موقع سے فائدہ اٹھا کے ٹھکانے لگا دیتی۔

معاً عارج کو ایک وار سے بچتے دیکھ کر پاربتی کہنے لگی۔ "لگتا ہے دلاور علی! کہ تو موت کو اپنے سامنے دیکھ کر حواس کھو بیٹھا ہے اور تجھے میرا نام بھی یاد نہیں رہا' میں پاربتی ہوں کوئی اور نہیں!..... پاربتی تیری موت!"

"پاربتی! میری موت نہ تیرے ہاتھوں لکھی ہے نہ اس بزدل کے ہاتھوں جو تجھے اکیلا چھوڑ کر فرار ہو گیا ہے مگر میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" عارج نے بتایا۔ "تو نے درمیان میں آ کر آج پھر اسے میرے ہاتھ سے بچا لیا۔"

اس انکشاف کے بعد کہ جھجار سنگھ فرار ہو چکا ہے خلاف توقع پاربتی نے اپنے ہاتھ

سے تلوار پھینک دی' عارج ہی نہیں میں بھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ تلوار پھینکنے کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنی شکست قبول کر لی ہے۔ اپنے ہاتھ سے تلوار پھینکتے ہی پاربتی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا اور سسکیاں لینے لگی تھی۔ جنگل کے اس حصے میں اب صرف عارج اور پاربتی ہی تھے یا پھر میں تھی جو خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔ مجھے اس آدم زادی پاربتی پر ترس آ رہا تھا جس کے شوہر نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا تھا۔

مغل فوج منتشر ہو کر بھاگنے والے راجپوت سپاہیوں کے تعاقب میں جنگل کے اندر گھس گئی اور چن چن کر انہیں قتل کر رہی تھی۔

عارج نے اپنی تلوار نیام کر لی اور گھوڑے سے کود گیا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے پاربتی کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ میری توجہ عارج پر تھی اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے پاربتی کو آواز دی اور گھوڑے سے اتر آنے کو کہا۔

''میں..... آج ہار گئی دلاور!'' پاربتی سسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''وہ..... وہ واقعی بزدل نکلا..... جھجار سنگھ بزدل..... ہاں وہ بزدل تھا... اور میں نے اسے..... اسے اپنا کر غلطی کی۔''

عارج نے اسے سہارا دے کر گھوڑے سے اتارا۔ رقت کے سبب پاربتی کے سارے جسم پر رعشہ طاری تھا۔ وہ دلیر راجپوت عورت تھی جسے کسی نے آج تک روتے نہیں دیکھا تھا' زار و قطار رو رہی تھی۔

''اے عارج! اسے سنبھال ورنہ یہ گر پڑے گی۔'' میں بول اٹھی۔

عارج نے میرے کہنے پر پاربتی کو گرنے سے بچانے کیلئے سہارا دیا تو وہ اچانک عارج کے سینے سے لگ گئی۔ میرے لئے یہ صورتحال توقع کے خلاف تھی مگر میں نے مداخلت نہیں کی۔ غالباً اس کی وجہ اس آدم زادی سے میری ہمدردی تھی اور یہ بھی کہ میں اس کے جسم میں بھی رہ چکی تھی۔

پاربتی کے بجائے اگر کوئی اور آدم زادی اس طرح عارج کے سینے سے لگی ہوئی تو شاید میں برداشت نہ کر پاتی۔

پھر جب پاربتی کا جی کچھ ہلکا ہو گیا اور طبیعت قدرے سنبھل گئی تو عارج اسے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر جنگل سے نکل آیا۔

اس وقت تک مغل فوج کے بیشتر سپاہی بھی جنگل سے باہر آ کر ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ انہی کے درمیان مہابت خاں نظر آ رہا تھا جو عارج کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ اس

نے عارج کو ادھر آتے دیکھا تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ پھر اس کی نظر پاربتی پر پڑی جس کا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔

جب عارج نے مہابت خاں کو جھجار سنگھ اور بکر ما جیت کے فرار ہو جانے کی خبر دی تو مہابت خاں نے سخت افسوس کا اظہار کیا۔ اب گھوڑوں اور سپاہیوں کی حالت اس قابل نہ تھی کہ مزید آگے بڑھا جاتا مجبوراً مہابت خاں نے ایک وسیع تالاب کے کنارے فوج کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔

ابھی آخری فتح باقی تھی۔ عارج اسی وجہ سے مجھے مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ خیمے لگائے جا چکے تھے اور عارج پاربتی کو اپنے خیمے میں لے آیا تھا۔ پاربتی تو خیر مجھے دیکھنے کی اہل نہیں تھی مگر عارج مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ خیمے سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

''پاربتی! تم آرام کرو' میں ابھی آتا ہوں۔'' عارج نے میرے ساتھ خیمے کے در کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''آرام!'' پاربتی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

عارج اپنے خیمے سے باہر آ گیا تو میں بولی۔ ''اپنا گھوڑا کھول لے کہ تجھے اس پر سواری کرنی ہے۔''

گھوڑا خیمے کے در پر بندھا ہوا تھا۔ عارج نے کچھ کہے بغیر گھوڑا کھولا اور اس پر سوار ہو گیا۔

''آ میرے ساتھ اے عارج!'' میں نے کہا۔

''تو مجھے اپنے ساتھ کدھر لے جا رہی ہے اے دینار!'' عارج نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے سوال کیا۔

''کسی کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تو کہاں جا رہا ہے۔'' میں نے تاکید کی کیونکہ وہ ابھی پڑاؤ سے باہر نہیں نکلا تھا۔ کوئی بھی شناسا راستے میں اس سے پوچھ سکتا تھا کہ وہ کدھر جانے کا قصد رکھتا ہے۔

''مجھے خود کچھ معلوم نہیں تو کسی اور کو کیا بتاؤں گا اے دینار! تو بھی کبھی کبھی لطیفے کہنے لگتی ہے۔'' عارج بولا' پھر کہنے لگا۔ ''ویسے تجھے یہ بتا دوں کہ میں تجھ سے سخت ناراض ہوں۔''

''جانتی ہوں میں اور اس ناراضگی کا سبب بھی مجھے معلوم ہے۔ تجھے میری بابت جو غلط فہمی ہے ابھی کچھ دیر بعد دور ہو جائے گی۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''تو یہی تو سمجھتا ہے کہ میں تیرے بجائے اس کافر آدم زاد جھجار سنگھ کے عشق میں گرفتار ہوں؟''

"ہاں اور کیا!" عارج بول اٹھا۔ "ہاں تو نے اب تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ کس طرف سے لے جارہی ہے۔"

"ذرا اس پڑاؤ سے باہر نکل آ پھر بتاتی ہوں۔" میں نے جواب دیا پھر جب ذرا ہی دیر بعد جب عارج اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا پڑاؤ کو پیچھے چھوڑ آیا تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تو نے جھجار سنگھ کو فرار ہوتے دیکھا تھا کہ وہ کس طرف گیا ہے۔"

"نہیں اے دینار!" عارج نے جواب دیا۔ "میں پارٹی سے نبرد آزما تھا۔"

"میں نے دیکھا تھا اور میں تجھے ادھر ہی لے جارہی ہوں۔" جھجار سنگھ کدھر گیا ہے اس سے میں ہی واقف تھی۔ اس بدقسمت آدم زاد پر فرار ہونے کے بعد کیا گزری۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا لیکن واقعات کے تسلسل کی خاطر اس واقعے کو دانستہ پہلے بیان کررہی ہوں۔

بدبخت جھجار سنگھ پر یہ گزری کہ کچھ ہی دور جاکر اسے اس علاقے کے گونڈوں نے گھیر لیا۔ جب انہیں جھجار سنگھ کا حال احوال معلوم ہوا تو اسے مزید آگے بڑھنے سے روک دیا اور لوٹ جانے پر اصرار کیا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک باغی شخص ان کے علاقے میں پناہ لے اور وہ اس کی وجہ سے مغل فوج کے عتاب کا شکار ہوں۔

میں جب عارج کے ہمراہ وہاں پہنچی تو یہی تکرار جاری تھی۔ جھجار سنگھ نے عارج کو دیکھا تو اس نے تیزی سے اپنے گھوڑے کو موڑا اور سامنے آ گیا' بکرماجیت بھی اس کے ساتھ تھا۔

گونڈوں نے عارج کے لباس سے پہچان لیا کہ وہ کوئی مغل سردار ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنی دانست میں عارج کی مدد کو آگے بڑھے۔

عارج نے بلند آواز میں انہیں آگے بڑھنے سے منع کیا اور مداخلت نہ کرنے کیلئے تاکید کی۔ ان لوگوں کے قدم رک گئے۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر نوجوان بکرماجیت نے تیزی سے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور پہلو سے عارج پر وار کرنا چاہا اسی وقت میں بول اٹھی۔ "اے عارج! سنبھل" میں نے عارج کو بکرماجیت کی طرف سے چوکنا کردیا۔

عارج نے سنبھل کر بکرماجیت کا وار روکا اور پھر خود بھرپور وار کیا۔ پھر اس سے پہلے کہ بیٹے کی مدد کو باپ آگے بڑھ سکتا۔ عارج کی تلوار بجلی کی طرح کوندی اور ناتجربہ کار بکرماجیت کا سر کٹ کر دور جاگرا۔

اسی دوران میں جھجار سنگھ نے عارج پر حملہ کردیا۔ کوشش کے باوجود عارج خود کو زخمی

ہونے سے نہ بچا سکا۔ اس کے بائیں شانے پر گہرا زخم لگا مگر اسے سنبھلنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس نے جھجار سنگھ کا دوسرا وار اپنی تلوار پر روک کر تیزی سے اپنے گھوڑے کو پیچھے ہٹا لیا۔ جھجار سنگھ بغیر توقف کیے اس پر جھپٹا۔ اسی وقت ذرا سی مہلت پا کر عارج نے اس کی طرف پوری قوت سے نیزہ پھینکا وہ اسی لئے پیچھے ہٹا تھا۔ نیزہ نشانے پر بیٹھا کہ اسے ایک سچے نشانے باز نے پھینکا تھا۔

جھجار سنگھ کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر اپنے سینے میں پیوست نیزے کو نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ عارج نے جھپٹ کر اس کی گردن پر وار کیا۔ باغی جھجار سنگھ کا سر کٹ کر زمین پر آ رہا اور دھڑ گھوڑے کی پشت پر لڑھک گیا۔ وہ انتقام کی آگ جو عارج کے انسانی قالب دلاور علی کے سینے میں عرصہ دراز سے بھڑک رہی تھی ہمیشہ کیلئے سرد ہوگئی۔

پھر گونڈوں کے اس گروہ نے عارج کے زخم کی مرہم پٹی کی اور خاطر مدارات میں لگ گئے۔ بے چارے غریب آدم زاد ہر زمانے ہی میں صاحب اقتدار طبقے کے افراد سے حسن سلوک کرتے ہیں خواہ انہیں جواب میں کچھ نہ ملے مگر اس وقت ان غریبوں نے ایک جن زاد کے ساتھ یہ رویہ اپنایا تھا۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا کہ اگر وہ لوگ جھجار سنگھ کو آگے بڑھنے سے روک نہ دیتے تو شاید عارج اتنی جلد انتقام کی آگ نہ بجھا پاتا بہر اعتبار جھجار سنگھ اس کا رقیب تھا۔

یہی وجہ تھی کہ عارج نے آدم زادوں کی خدمت کا وہ صلہ دیا جو یقیناً کوئی اور مغل سردار نہ دے پاتا۔ عارج نے ان میں سے کچھ سرکردہ افراد کو بلا کر مخصوص ہدایات دیں اور پھر خاموشی سے لوٹ آیا۔

دوسرے دن صبح عارج کی ہدایات کے مطابق یہ لوگ جھجار سنگھ اور بکرماجیت کے سر لے کر مہابت خاں کے حضور حاضر ہوئے اور بیان کیا کہ ہم نے ان دونوں باغی باپ بیٹے کو قتل کیا ہے۔

مہابت خاں نے ان گونڈوں کو خلعت' نقد روپیہ اور گھوڑے دے کر رخصت کیا۔ وہ دل ہی دل میں عارج کو دعائیں دیتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ لازماً یہ بڑے ظرف اور حوصلے کی بات تھی کہ عارج نے اپنی کارکردگی ان غریب آدم زادوں سے منسوب کرادی تھی۔

جھجار سنگھ اور بکرماجیت کے سروں کو شاہجہاں کے ملاحظے کی غرض سے ایک عرضداشت کے ساتھ آگرے بھیج دیا گیا۔

عارج اپنے لشکر اور جنگی قیدیوں کو لے کر جب آگرہ پہنچا تو جشن کی مجلس مرتب تھی۔ باغی جھجار سنگھ اور اس کے بیٹے بکرماجیت کے سروں کی تشہیر کرا کے انہیں قلعے کے دروازے پر لٹکوا دیا گیا تھا۔

قلعے کے دروازے سے جب پاربتی اندر داخل ہو رہی تھی تو میں بھی اس کے قریب ہی تھی۔ پاربتی کی نگاہ ان سروں کی طرف اٹھی تو اس کے منہ سے بے اختیار ایک سسکی نکل گئی۔ پھر اس نے ادھر سے نگاہ ہٹالی' اسے بزدل جھجار سنگھ کے متوقع انجام پر تو زیادہ ملال معلوم نہیں ہوتا تھا البتہ نوجوان و نافرمان بیٹے بکرماجیت کی موت نے یقیناً اس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ اولاد خواہ نافرمان ہی کیوں نہ ہو ایک ماں اس کی موت کا دکھ برداشت نہیں کر سکتی۔

عارج نے جب پاربتی اور راجپوت قیدیوں کو بادشاہ کے حضور پیش کیا تو میں بھی وہیں موجود تھی۔ شاہجہاں کے مزاج میں اس وقت نرمی تھی اور وہ عفو و درگزر پر آمادہ تھا۔ یوں بھی وہ خواتین کے معاملے میں زیادہ سختی کا قائل نہیں تھا۔ سارا دربار ہمہ تن گوش تھا کہ دیکھیں شاہجہاں ان باغیوں خصوصاً پاربتی کے بارے میں کیا فیصلہ سناتا ہے۔

ان مجرموں کی صف میں پاربتی بھی سب سے آگے سر جھکائے کھڑی تھی۔ پورے دربار میں شاہجہاں کے فیصلے کا سب سے زیادہ منتظر عارج تھا۔ عارج نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا کہ ایک باغی کی بیوی ہونے اور اس کی باغیانہ سرگرمیوں میں آخری وقت تک حصہ لینے کے سبب پاربتی کیلئے سزائے موت کا حکم ہو سکتا ہے۔ شاہجہاں اگر یہ حکم دے بھی دیتا تو کچھ عجیب یا انصاف سے بعید نہ ہوتا۔ اس کا یہ حکم انصاف کا تقاضہ سمجھا جاتا کیونکہ وہ عورت جو اس کے روبرو کھڑی تھی جانے کتنے مغل سپاہیوں کو اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار چکی تھی۔ شاہجہاں اس بات سے بے خبر نہیں تھا مگر جب شاہجہاں نے سب سے پہلے اسی عورت کو قبول اسلام کی دعوت دی تو سارے درباری ششدر رہ گئے۔

''جہاں پناہ! میں تو اسی وقت کلمہ پڑھ چکی تھی جب میں نے حضور کے ایک جواں مرد منصب دار دلاور علی خان کے آگے اپنی تلوار پھینک کر شکست قبول کر لی تھی۔'' پاربتی نے یہ کہتے ہوئے اپنا سر اٹھا کر پہلے بادشاہ پھر عارج کی طرف دیکھا۔

بادشاہ نے پاربتی کو انعام و اکرام سے نوازا اور شاہی مہمان خانے کا ایک حصہ اس کیلئے مخصوص کر دیا۔

سارا دربار ''مرحبا مرحبا'' کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ پھر شاہجہاں نے اس شرط پر ان باغی راجپوتوں کے قصور بھی معاف کر دیئے کہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ان

کی جاں بخشی کر دی جائے گی۔

باغی راجپوتوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ تھی ان میں سے صرف چند سرکشوں نے جن کی تعداد سو کے قریب تھی اسلام قبول کرنے کے بجائے موت کو ترجیح دی اور باقی سبھی مسلمان ہو گئے۔

عارج کو اس بات کا اندازہ تھا کہ پاربتی کو نوجوان بیٹے کی موت کا کس قدر صدمہ ہو گا اس نے اسی لئے مناسب یہی سمجھا کہ پاربتی ابھی کچھ دن شاہی محل ہی میں رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب دربار برخاست ہوا تو وہ پاربتی سے نگاہ ملائے بغیر دربار سے نکل گیا۔

چند روز بعد عارج نے شاہی محل کے اس حصے کا رخ کیا جہاں شاہجہاں کے معزز مہمان ٹھہرائے جاتے تھے تو میں بھی ساتھ تھی۔ میں نے دانستہ عارج کی نگاہوں سے اوجھل ہونے کی خاطر اندھیرے کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کا سبب یہ دیکھنا بھی تھا کہ عارج پر اس کے انسانی قالب کے اثرات کس قدر ہیں اور کس حد تک پاربتی کی چاہت میں مبتلا ہے' اس کا اندازہ لگا سکوں۔

خدمت گاروں نے پاربتی کو عارج کے آنے کی خبر دی۔ پاربتی نے حاضری کا اذن دیا۔ عارج دھڑکتے دل اور لرزتے ہوئے قدموں سے پاربتی کے سامنے پہنچا' اسے سامنے دیکھ کر پاربتی نے کنیزوں کو خلوت کا اشارہ کیا۔ چند ہی لمحوں بعد اس آراستہ و پیراستہ کمرے میں وہ دونوں اپنی دانست میں تنہا اور آمنے سامنے تھے۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ میں بھی وہاں موجود ہوں۔

''پارو! میں تمہیں تمہارے شوہر اور بیٹے کا پرسا دینے آیا ہوں۔'' عارج نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات پوری کی۔

''میرا شوہر بزدل تھا اور راجپوتوں میں بزدل کا پرسا نہیں ہوتا' رہا بیٹا تو وہ نادان تھا اور اس نے نادانی کی سزا پائی۔ میں بہرحال ایک ماں ہوں اس کیلئے میرا دل ہمیشہ خون کے آنسو روتا رہے گا۔'' پاربتی کی پلکوں پر میں نے ستارے جھلملاتے دیکھے۔

عارج خاموش کھڑا رہا' شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے' کیسے کہے۔

''تم یوں کیوں کھڑے ہو؟... آؤ میرے پہلو میں بیٹھو' مجھے فتح کرنے میں تمہیں برسوں لگے لیکن تم نے آخر مجھے فتح کر ہی لیا۔''

عارج اس کے برابر جا بیٹھا..... وہ ہونٹ کاٹتی رہی۔ اس کے حسین اور نازک نتھنے شدت ضبط سے پھڑکتے رہے۔ پھر یقیناً ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ عارج کے

بازوؤں پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔ عارج نے اس کے سر کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چھوا اور پھر اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ شاید یہ خوشی کے آنسو تھے: ایک طویل ہجر اور محرومیوں کے ختم ہونے کے آنسو تھے مگر یہ ہجر اور یہ محرومیاں عارج کی نہیں اس کے انسانی قالب دلاور علی کی تھیں۔

میرے نزدیک فیصلہ کن لمحات آ چکے تھے میں اسی لئے بلاتاخیر پاربتی کے جسم میں اتر گئی۔

''پارو!'' عارج کی بھرائی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''اے عارج! ہوش میں آ'' میں بول اٹھی۔ ''تو نے اتنی دیر سے یہ کیا پارو پارو کی رٹ لگا رکھی ہے۔ میں پارو نہیں دینار ہوں۔''

''پاگل ہے تو مجھے پاگل کر دے گی اے دینار!'' عارج نے چونک کر خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''پاگل تو اسے کیا جاتا ہے جو پہلے سے پاگل نہ ہو'' میں نے عارج پر فقرہ چست کیا۔

''یعنی تو مجھے پاگل سمجھتی ہے؟''

''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ تو کب اس آدم زادی پاربتی کے جسم میں اتر جاتی ہے اور کب اسے چھوڑ کر چل دیتی ہے۔''

''اچھا ان فضول باتوں کو چھوڑ اور کام کی بات کر۔'' میں بولی۔

''میں تیرا مطلب سمجھ گیا اے دینار!'' عارج سنجیدہ ہو گیا۔ ''اب ہم دونوں کے ساتھ رہنے کی راہ ہموار ہو چکی ہے۔ تیرا انسانی قالب کلمہ پڑھ چکا ہے' ہم شادی کر کے بآسانی ان انسانی قالبوں میں ساتھ ساتھ رہ سکتے ہیں۔''

''تو نے ٹھیک کہا اے عارج! لیکن تجھے یقیناً ایک بات یاد نہیں رہی۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا ہے اے دینار!'' عارج نے پوچھا۔

''پچھلی بار ہم ہندوستان سے پورے بیس برس بعد عراق لوٹے تھے۔'' میں بتانے لگی۔ ''اس پر عالم سوما نے مجھ سے کہا تھا کہ اس مرتبہ کی طرح لوٹنے میں بیس برس نہ لگا دینا' پھر تو یہ بھی بھلا بیٹھا کہ جب ہم عراق سے ہندوستان کیلئے چلے تھے تو عالم سوما بیمار تھا۔''

''ہاں.... مگر ہمیں.....ہمیں تو اس دفعہ بھی عراق سے چلے عرصہ دراز ہو گیا ہے۔

غالباً اس عہد میں آنے کے بعد ہم نے تقریباً 25 برس گزار دیئے ہیں' یہ.....یہ تو اچھا.....کچھ اچھا نہیں ہوا اے دینار!'' عارج کی آواز سے فکرمندی کی جھلک رہی تھی۔

عارج کے بھولپن اور غفلت پر مجھے ہنسی آ گئی۔

''لے مجھے فکر میں مبتلا کر کے ہنس رہی ہے تو؟.... یہ بھی خوب رہی۔''

''اب تجھے فکر میں نہیں بلکہ پاربتی کے عشق ہی میں مبتلا رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے اسے چھیڑا۔ ''اور لڑا اس سے عشق!''

''مجھے پاربتی سے نہیں تجھ سے عشق تھا اور ہے۔ پاربتی کا جسم تو محض ایک ذریعہ تھا کیونکہ اس کے جسم میں تو ہی تھی۔'' عارج اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ پھر اس نے مجھ سے شکوہ کیا کہ میں نے جھجار سنگھ کو اس پر ترجیح کیوں دی۔

''وہ ترجیح میں نے نہیں خود پاربتی نے دی تھی۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''میں تو پاربتی کے جسم میں بہت ہی کم رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے عارج کو حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ یہ حقیقت اس کیلئے حیران کن ہی تھی۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولا۔ ''اے دینار! اب تو یہ بتا کہ کیا کرنا ہے؟''

''تو دراصل آدم زادوں کے درمیان اور ان کے جسموں میں رہ کر خاصا غبی ہو گیا ہے اے عارج! ورنہ مجھ سے آئندہ اقدام کے بارے میں نہ پوچھتا اور نہ تجھے یہ فکر لاحق ہوتی کہ ہم نے اس زمانے میں رہتے ہوئے تقریباً پچیس برس بتا دیئے ہیں۔ اس بات کو بہرحال یاد رکھا کر کہ تو کوئی آدم زاد نہیں بلکہ حیرت انگیز پراسرار قوتوں کا مالک ایک جن زاد ہے تو یقیناً یہ بات بھول گیا ہے کہ ہم جب بھی چاہیں ماضی یا مستقبل کے کسی بھی زمانے میں جا سکتے ہیں۔ پھر ایسی صورت میں کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم اس عہد میں عرصہ دراز سے مقیم ہیں۔''

''واقعی اے دینار! میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی۔'' عارج نے اعتراف کیا۔

''خدا کا شکر ہے کہ اب تو تجھے عقل آ گئی' یہ بتا پہلے ہم کس دور کے عراق میں گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''جہاں تک مجھے یاد ہے' وہ ایک سو نوے ہجری (190ھ) کا زمانہ تھا۔'' عارج نے جواب دیا۔

''تجھے ٹھیک یاد ہے۔'' میں بولی۔ ''پھر بتا' اس مرتبہ یہ مناسب رہے گا کہ ہم دو سال بعد یعنی ایک سو بانوے ہجری (192ھ) کے زمانے میں عراق پہنچیں تیرا کیا مشورہ ہے اے عارج!''

"یہ مدت زیادہ نہیں۔" عارج نے پھر تائید کی' پھر کہنے لگا۔ "ہمیں کیونکہ اب واپس عراق جانا ہے اس لئے یہ انسانی قالب چھوڑنے ہی پڑیں گے' موقع ملا تو ہم پھر کبھی ہندوستان آ ئیں گے۔"

عارج کے لہجے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے فوری طور پر ہندوستان چھوڑنے کے سبب رنج ہو شاید اس کی وجہ پاربتی اور دلاور کے عشق کا منطقی انجام تک پہنچنا تھا۔ عارج کا انسانی قالب غالباً پاربتی کو اپنانا چاہتا تھا۔ اس میں بظاہر اب کوئی دشواری بھی نہیں رہی تھی کیونکہ پاربتی مسلمان ہو چکی تھی۔ بحیثیت مہمان محل کے ایک حصے میں رہتے ہوئے شاجہاں کے ایما پر باقاعدہ اسے مسلمان بنالیا گیا تھا اب اس کا نام پاربتی نہیں رشیدہ تھا۔

ہمارے انسانی قالبوں کو بہر حال ہمیشہ کیلئے ایک ہونا تھا۔ اسی بنا پر میں نے عارج کی خوشنودی کیلئے کہا سنو یہ تو ہم نے طے کر ہی لیا ہے کہ ہمیں کس زمانے اور کس سرزمین پر واپس جانا ہے' ایسی صورت میں اگر چند روز اور رکنا پڑ جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

عارج فوراً ہی میری بات کی گہرائی تک پہنچ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا۔ "اچھا ہے دینار! اس طرح میں ایک بار پھر تجھے اپنی بیوی بنے ہوئے عروسی جوڑے میں دیکھ لوں گا۔"

"قطعی نہیں" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "تو مجھے نہیں پاربتی عرف رشیدہ کو دلہن بنے دیکھے گا۔"

"لیکن رشیدہ کے جسم میں تو تو ہی ہوگی۔"

"اچھا اب زیادہ کٹ حجتی نہ کرو ورنہ اسی وقت تجھے یہاں چھوڑ کر عراق چلی جاؤں گی۔" میں بولی۔

عارج ہنس پڑا اور کہا۔ "عراق جانے کی دھمکی تو اس طرح دے رہی ہے جس طرح آدم زادیاں اپنے شوہروں کو میکے جانے کی دھمکیاں دیتی ہیں۔" پھر اس سے پہلے کہ جواب میں کچھ کہتی عارج بولا اٹھا۔ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ "اے رشیدہ بیگم! تمہارا عاشق' تمہارا سودائی دلاور علی خاں تمہیں اپنے عقد میں لینا چاہتا ہے' تمہیں قبول ہے؟"

"اور مہر کی رقم تو ہضم ہی کر گیا' عشق کا جھانسہ دے کر" مجھے بھی شرارت سوجھ گئی۔

"چلو اپنا بھاؤ تم خود ہی لگا دو رشیدہ بیگم!"

"میں کوئی بکاؤ مال نہیں جو تو بھاؤ کی بات کر رہا ہے۔"

تھوڑی دیر تک ہم دونوں کے درمیان اسی طرح نوک جھونک ہوتی رہی اور پھر عارج میرے پاس سے چلا گیا۔

دلاور علی خاں کی حیثیت سے عارج کوئی معمولی امیر نہیں تھا۔ یہ بات بھی سب کے علم میں تھی کہ دلاور علی خاں نے اب تک شادی نہیں کی حالانکہ اس کی عمر پچاس برس سے زیادہ ہو رہی تھی۔ میرے انسانی قالب کی عمر بھی تقریباً پچاس برس تھی۔

دو ایک روز بعد ہی عارج نے موقع دیکھ کر خلوت میں بادشاہ وقت شاجہاں سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ نومسلم رشیدہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس پر شاجہاں نے بے انتہا خوشی کا اظہار کیا اور بولا۔ "ہم اسے اپنی بیٹی کی طرح اس محل سے رخصت کریں گے۔"

پھر شاجہاں نے حقیقتاً اپنے لفظوں کی لاج رکھی' اس نے بیٹی کی حیثیت سے خاصا جہیز دیا۔

جس روز یہ شادی ہوئی ہندوستان میں میری اور عارج کی آخری رات تھی۔ ہم دونوں ان انسانی قالبوں سے باہر نکل آئے جنہیں رہنے کیلئے خاصا عرصے استعمال کیا تھا۔ دلاور علی اور پاربتی کے عشق کو منزل مل گئی تھی۔

اس رات کو نصف شب سے کافی پہلے ہم 192 ہجری کے عراق میں پہنچ گئے۔ جب ہم بابل کے کھنڈرات میں داخل ہوئے تو وہاں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ عالم سوما نے ان کھنڈرات میں اپنی سکونت کیلئے جو حصہ مخصوص کر رکھا تھا وہ ہمیں وہیں ملا' ہم نے اسے صحت مند دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

☆......☆......☆

ہاں یہ سب اللہ کا کرم ہے کہ اس نے طبیب ہامہ کی کوششوں کو بار آور کیا۔ اللہ اسے خوش رکھے اور میری اس خدمت کا اجر عطا کرے۔ عالم سوما بولا۔ پھر اس نے ہمارے پوچھے بغیر بتایا۔ ''وہ حصار جو اس ظالم عفریت نے تم دونوں کیلئے بغداد کے گرد کھینچ رکھا تھا اسے میں نے اپنے عمل کے ذریعے بیکار بنا دیا ہے۔ اب عفریت وہموش اسی غلط فہمی کا شکار رہے گا کہ جب تم بغداد میں داخل ہونے کی کوشش کرو گے اسے خبر ہو جائے گی۔''

''اور وہ کافر جنات جو حصار کی نگرانی پر مامور تھے اے سوما!'' میں نے سوال کیا۔

''سردار قبیلہ ہونے کی حیثیت سے میرے ایما پر تیرے باپ اخضم نے ان پر پابندی لگا دی ہے کہ وہ بغداد اور اس کے گرد و نواح میں نظر نہ آئیں۔ حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں انہیں سخت سزائیں مل سکتی ہیں۔'' عالم سوما نے جواب تفصیل سے دیا۔ ''اس حکم کو نافذ ہوئے بھی تقریباً سال ہو رہا ہے' کافر جنات اب بغداد کا پہرا نہیں دے رہے۔''

''پھر تو ہم اب بغداد میں رہ سکتے ہیں۔'' عارج بول اٹھا۔

''بالکل!..... لیکن اس کیلئے اب تمہیں نئے انسانی قالب اپنانے ہوں گے۔ تمہیں خبر ہی ہے کہ تمہارے پہلے انسانی قالبوں ایوب اور جمیلہ کو عفریت وہموش قتل کر چکا ہے۔ یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ اب بھی قصر خلافت ہی میں رہو یا کہیں اور۔''

''اے سوما! ہم جس مقصد سے آدم زادوں کے درمیان رہنا چاہتے ہیں وہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ہم وہاں رہیں جہاں آدم زادوں کی قسمت کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔'' میں بولی۔

''تیرا کہنا درست ہے اے دینارا!'' عالم سوما نے کہا۔ ''میں نے پہلے بھی تجھے قصر خلافت میں سکونت پر چوکنا رہنے کی تاکید کی تھی اور اب بھی تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ باختیار آدم زادوں سے بچ کے رہنا۔''

''پہلے کی طرح میں اب بھی تیری نصیحت پر عمل کروں گی۔'' میں نے عالم سوما کو یقین دہانی کرائی۔

وہ رات عارج کے ساتھ میں نے بابل کے کھنڈرات ہی میں گزاری۔ پچھلی بار میری ملاقات اپنے بڑے بھائی یوسف سے نہیں ہو سکی تھی۔ اس مرتبہ اپنے والدین کے علاوہ میں بڑے بھائی سے بھی ملی میں صبح ہی صبح ان سے ملنے پہنچ گئی۔

بابل کے کھنڈرات سے عارج کے ساتھ عرصہ دراز کے بعد میں بغداد کیلئے روانہ ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ وہ رجب کا مہینہ تھا اور ہجری 192 تھی۔ بغداد پہنچ کر ہم نے پہلے حالات کا جائزہ لیا اور انسانی قالبوں میں اترنے کی جلدی نہیں کی۔

خلیفہ وقت ہارون الرشید کا بچپن اور جوانی دونوں ہی میں دیکھ چکی تھی اور اب اس کا بڑھاپا میرے لئے حیران کن تھا۔ پتہ نہیں یہ آدم زاد اتنی جلد بوڑھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ جنات میں ایک سو سال تک تو بچوں کے کھیلنے کودنے کے دن ہوتے ہیں مگر اول تو کم ہی آدم زاد اس عمر تک پہنچتے ہیں۔ اگر وہ سو سال کے ہو بھی جائیں تو معذور نظر آنے لگتے ہیں۔ جیسے زندگی ان پر تہمت ہو۔ ہارون الرشید کو تو ابھی سو سال کی عمر پانے میں کئی دہائیاں باقی تھیں۔ اس کی عمر تو پچاس برس بھی نہیں ہوئی تھی۔

بغداد آئے ہوئے ہارون الرشید کو چند ہی دن ہوئے تھے۔ اس کے بارے میں پہلی تشویشناک خبر مجھے یہ ملی کہ وہ علیل ہے۔ بغداد آمد سے قبل رقہ ہی سے اس کی علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ رقہ میں اس نے اپنے بیٹے قاسم کو اپنا نائب مقرر کیا اور خزیمہ بن خازم کو قاسم کے پاس چھوڑ کر وہ دارالخلافہ بغداد پہنچ گیا۔ اس نے اپنے آئندہ اقدام سے کسی کو بھی آگاہ نہیں کیا تھا۔ خود میں نے بھی یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کی وجہ ہارون کی علالت تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس حالت میں بھی نیچے نہیں بیٹھے گا۔ اپنی وسیع و عریض مملکت پر وہ اپنی گرفت مضبوط رکھنا چاہتا تھا۔ کسی کی ذرا سی بھی نافرمانی برداشت کرنا اس کے مزاج سے قطعی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

خلیفہ کے فیصلے ہی عوام پر اثر انداز ہوتے تھے اس لئے حسب سابق عارج کے ساتھ میں نے خلیفہ کے قریب ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ حسب سابق میں نے خلیفہ کے خاص خدمت گاروں میں ایک جوڑے کو تلاش کر لیا۔ اس جوڑے کی سکونت قصر خلافت ہی میں تھی۔

آدم زادوں کے اس جوڑے غفار اور سعدیہ میں اگر کوئی خرابی تھی تو بس یہ کہ وہ ادھیڑ عمر تھے۔ خوبی یہ تھی کہ ان دونوں ہی کو ہارون بہت پسند کرتا تھا اور ان کی خدمت سے خوش

تھا۔

میں نے جب عارج کو اس بارے میں بتایا تو وہ کہنے لگا۔ "ارے لاحول پڑھ ان دونوں پر۔"

"آخر کیوں؟ کوئی وجہ تو بتا۔" میں بولی۔

"ذرا سوچ اے دینارا! تو اس بوڑھی سعدیہ کا جسم اپنائے گی!...... تجھے کیا ہو گیا ہے۔" عارج نے کہا۔

"ضروری تو نہیں کہ ہم جو انسانی قالب اپنائیں وہ حسین و نوجوان ہی ہوں......تو یوں کیوں نہیں کہتا تجھے غفار کا بوڑھا جسم پسند نہیں آیا اور تو اس کے اندر نہیں رہنا چاہتا۔"

"یہ بات نہیں!" عارج نے انکار کیا۔ "مجھے غفار کا جسم اپنانے پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ میں تجھے اس بوڑھی آدم زادی......"

"اب وہ اتنی بوڑھی اور بدصورت بھی نہیں اگر ایسا ہی ہے تو کوئی اور جوڑا تو ڈھونڈ لے۔" میں بول اٹھی۔

اس پر عارج راضی ہو گیا۔ اگلے ہی دن اس نے میرے لئے ایک خادمہ حسین کی نوجوان بیٹی کلثوم کا انسانی پیکر منتخب کر لیا اور مجھے اس کے متعلق بتا کر کہنے لگا۔ "تو آدم زادی کے جسم میں اتر کر دیکھ لے۔"

"اور اگر مجھے اس کے جسم میں قرار نہ آیا تو؟" میں نے سوال کیا۔

"اسی لئے تو پہلے آزمائش کو کہہ رہا ہوں۔" عارج نے جواب دیا۔

"لیکن تو ایک بات بھول گیا کہ کلثوم ابھی غیر شادی شدہ ہے۔" میں نے اعتراض کیا۔

"میں نے اس کا حل بھی سوچ رکھا ہے' پہلے تو ہاں تو کر اے دینارا!" عارج بولا۔ "تو فکر نہ کر ہم دونوں ساتھ ہی رہیں گے۔"

"جب تک تو مجھے یہ نہیں بتائے گا کہ تو نے کیا سوچا ہے اور کلثوم کا تیرے ساتھ رہنا کس طرح ممکن ہے میں کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی۔"

"کلثوم کا رشتہ ایک اور خادمہ کے بیٹے اسحاق سے ہو چکا ہے۔" عارج نے بتایا۔

"میں نے اسحاق کے جسم میں اتر کر دیکھ لیا ہے۔ میں اس کے جسم میں رہ سکتا ہوں' اب تیری سمجھ میں آئی پوری بات۔"

"مگر جب ان دونوں کی شادی ہو جائے گی تبھی تو وہ ساتھ رہ سکیں گے کیا خبر کب ان

کی شادی...."

"کیا کلثوم اور اسحاق کے والدین کو ان دونوں کی فوری شادی پر آمادہ کرنا تیرے لئے کوئی مشکل کام ہے۔" عارج نے یہ کہہ کر مجھے لاجواب کر دیا' پھر خود ہی بولا۔ "اب تو اور بھی سوال کرے گی کہ وہ دونوں خلیفہ کے خدمت گاروں میں کس طرح شامل ہوں گے' ہے نا؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ اپنی مطلب براری کی خاطر ہم اپنی جناتی صفات استعمال کریں گے۔"

کلثوم مشکل سے بیس برس کی ہو گی اب تک اس کا رشتہ کبھی کا ہو جاتا مگر اس کی ماں بڑی بضد تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی چہیتی بیٹی کو نظروں سے اوجھل نہیں کرے گی۔ اس کی بس ایک ہی صورت تھی کہ وہ قصر خلافت میں ہی سکونت پذیر کسی نوجوان سے بیٹی کی شادی کرتی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے عمر زیادہ ہونے کے باوجود اسحاق کو پسند کر لیا تھا۔ اسحاق کی پہلی بیوی مر چکی تھی اور وہ بے اولاد تھا۔ میں نے ہر بات پہلے ہی معلوم کر لی تھی۔ کلثوم اتنی خوبصورت تھی مگر ماں کی ضد کے آگے کلثوم کا باپ بھی مجبور ہو گیا اور اس نے اسحاق کا رشتہ قبول کر لیا۔

اسحاق کو اپنی پہلی بیوی سے محبت تھی لیکن اپنے ماں باپ کے اصرار پر وہ کلثوم کو دیکھ کر اور برسوں تنہا رہ کے اپنا گھر بسانے کو آمادہ ہو گیا۔ تمام معلومات حاصل کر کے میں ایک شب کلثوم کے جسم میں داخل ہو گئی۔ خلاف توقع مجھے معمولی سی گھٹن کا احساس بھی نہ ہوا۔ اس آدم زادی کے جسم میں بڑی نزاکت و لطافت تھی۔ میرے لئے اس نوع کا پہلا تجربہ تھا۔ اس کے بعد ایک ہفتے کے اندر ہی اندر سب کچھ ہو گیا۔ اسحاق اور کلثوم کی شادی ہو گئی۔ ظاہر ہے مجھے اس کیلئے جناتی صفات کو بروئے کار لانا پڑا۔ میں نے کلثوم کی ماں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ اس کا وقت آ گیا ہے اور وہ بہت جلد مرنے والی ہے۔ اس کیلئے مجھے وقتی طور پر اسے بیمار بھی کرنا پڑا۔

کلثوم اور اسحاق کے انسانی قالبوں پر میں اور عارج نے قبضہ کر لیا۔ اب ہمارے پیش نظر دیگر مسائل تھے مجھے اور عارج کو کم ہی خلوت نصیب ہوتی تھی کیونکہ اسحاق کا کنبہ بہت بڑا تھا۔ اس کے سات بھائی اور پانچ بہنیں تھیں۔ صرف ایک بہن کی شادی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ تین چھوٹے بھائی شادی شدہ اور بچوں والے تھے۔ یہ آدم زاد اس قدر شریر تھے کہ ہر وقت گویا میری ناک میں نکیل ڈالے رہتے تھے تائی اماں کی رٹ لگائے رہتے۔ ان کی مائیں کچھ نہ کہتیں اور کم بختیں مجھے پریشان کر کے خوش ہوتی رہتیں۔

ایک شب خلوت میسر آنے پر میں نے عارج سے کہا۔ ”یہ تو نے مجھے کس جنجال میں پھنسا دیا۔ اس گھر میں رہنا تو عذاب ہے میرے لئے۔ اسحاق کے چھوٹے بھائیوں کی ظالم بیویوں نے سارا گھر کا کام کاج مجھی پر ڈال دیا ہے' دن بھر سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی۔“

”اس کی تدبیر سوچ لی ہے میں نے۔“ عارج پرسکون آواز میں بولا۔ ”فکر نہ کر اے دینار! دو ایک دن کی بات ہے' تیری جان کے عذاب ٹل جائیں گے۔ تو الگ گھر میں میرے ساتھ سکون سے رہے گی' میں نے ڈول ڈال دیا ہے۔“

”لیکن مجھے بھی تو کچھ بتا!“ میں نے کہا۔

”پہلے کام تو ہو جانے دے۔“

”مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اسحاق کے بھائیوں کی بھوندل اور بدصورت بیویاں میرے انسانی قلب کی خوبصورتی دیکھ کر جلن میں مبتلا ہو گئی ہیں۔“

”کہا نا میں نے کہ“ ایک دن صبر کر لے۔“ عارج نے مجھے پھر تسلی دی۔

پھر وہی ہوا جو عارج نے کہا تھا۔ قصر خلافت کے نگران نے مجھے اور عارج کو بوڑھے خلیفہ کی خدمت پر مامور کر دیا۔ غفار اور سعدیہ کو ادھیڑ عمری کے سبب خلیفہ کی خدمت سے ہٹا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہمیں خلیفہ وقت کی خدمت کا فریضہ انجام دینے پر الگ سکونت فراہم کر دی گئی تھی۔

اسحاق کے گھر والوں سے جان چھوٹنے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں چاہتی تو حاسد آدم زادوں کے خلاف جوابی کارروائی بھی کر سکتی تھی مگر مجھے یہ مناسب معلوم نہ ہوا۔ پہلے دن خلیفہ کے روبرو میری اور عارج کی طلبی ہوئی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ہمیں گہری نظروں سے دیکھا وہ اپنے بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے سے بیماری جھلک رہی تھی۔

خلیفہ نے ہم دونوں سے زیادہ بات نہیں کی اور مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔

”تم دونوں کو ہم اپنی خدمت میں قبول کرتے ہیں۔“ خلیفہ ہارون نے نقاہت آمیز آواز میں کہا۔

اس پر ہم نے قاعدے کے مطابق تعظیماً جھک کر شکریہ ادا کیا۔ خلیفہ نے رخصت کا اشارہ کیا تو ہم وہاں سے چلے آئے۔

کسی خلیفہ کی خدمت گاری کا ہمارے لئے یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ ہم تمام ادب و آداب سے واقف تھے۔ اسی سبب قصر خلافت کے نگران نے ہماری تربیت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہم نے اس کے ہر سوال کا اطمینان بخش جواب دیا تھا اور اس کی ہر آزمائش پر

پورے اترے تھے۔

اس پہلی ہی ملاقات میں خلیفہ ہارون کے ذہن پر میں نے پوری توجہ دی تھی۔ اس بنا پر مجھے بہت سی نئی باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ خلیفہ زیادہ عرصے بغداد میں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ طبیبوں نے ابھی اسے مزید سفر نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا مگر عموماً مطلق العنان حکمران کم ہی کسی کا مشورہ قبول کرتے ہیں۔ یہی صورتحال خلیفہ ہارون کی تھی فی الحال وہ ہر قیمت پر رافع بن لیث کی سرکوبی کرنا چاہتا تھا جو خراسان میں تھا۔ رافع کے علاوہ اس نے ہرثمہ کی گرفتاری کے احکام بھی جاری کر دیئے تھے کیونکہ ہرثمہ ہی کی سازش کے سبب زیر حراست رافع کو سمرقند کے قید خانے سے فرار ہونے کا موقع ملا تھا۔

خلیفہ کا ذہن پڑھ کر ہی مجھے رافع کے بارے میں تفصیل معلوم ہوئی تھی۔ یہ تفصیل عجیب اور دلچسپ تھی۔

دراصل رافع بن لیث ایک حسین ترین آدم زادی ریطہ کے عشق میں مبتلا ہونے کی وجہ سے خلیفہ وقت کی نظروں میں قابل سزا ٹھہرا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ یحیٰی بن اشعث اور رافع کے درمیان دوستی تھی۔ یحیٰی بھی خلیفہ کے بااعتماد سرداروں میں سے ایک تھا۔ خلیفہ ہارون نے یحیٰی کو بھی سمرقند میں رافع کی مدد کیلئے متعین کیا تھا۔ یحیٰی کی حیثیت معاون و مشیر کی تھی۔ سمرقند کا عامل رافع ہی تھا۔ مگر خلیفہ نے اسے اہم اقدامات کیلئے یحیٰی سے مشورے کا پابند کر دیا تھا۔ یوں گویا یحیٰی اور رافع کی حیثیت تقریباً مساوی تھی۔ رافع اور یحیٰی کی دوستی اس قدر بڑھی کہ ان کے درمیان گھریلو تعلقات استوار ہو گئے۔ دونوں دوستوں کی بیویوں نے ایک دوسرے سے پردہ کرنا چھوڑ دیا۔ درحقیقت یہ تجویز یحیٰی کو رافع ہی نے دی تھی۔ اس کا سبب یحیٰی کی بیوی ریطہ تھی۔ ایک روز رافع نے ریطہ کی جھلک دیکھ لی تھی اور تبھی سے اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ خلیفہ کا ذہن پڑھنے کے ساتھ ہی اس قصہ عشق کی تفصیل جاننے کیلئے میں نے اپنی جناتی صفات بھی استعمال کیں۔ یحیٰی کے کہنے پر ریطہ نے پردہ ختم کر دیا تو جیسے رافع کی عید ہو گئی۔ ریطہ کو بھی اپنے حسن کا احساس تھا مگر یحیٰی کبھی اس کی تعریف نہیں کرتا تھا۔ اس کے برعکس رافع نے پہلی بار ہی جب خلوت میسر آئی تو ریطہ کے حسن کا قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔

ریطہ کے حسن کی تعریف رافع نے جن الفاظ میں کی وہ الفاظ ریطہ کے دل میں اتر گئے۔

”ریطہ! تمہاری دراز زلفیں گھٹاؤں کی طرح ہیں' تمہاری پیشانی ہے کہ چاند کا زرپاش ہلال' ابرو ہیں کہ کمان' آنکھیں ہیں کہ دو ساغر چھلکے چھلکے' رخسار ہیں کہ سرخ سیبوں کی طرح'

لب ہیں کہ گلاب کی پنکھڑیاں اور جسم ہے کہ بستر دیبا و حریر' تمہارے جسم کی جنبش ہے کہ جنبش شاخ' جب تم چلتی ہو تو لگتا ہے زمانہ تمہاری ٹھوکروں میں ہے' ریطہ تم چلتا پھرتا میخانہ ہو۔''

خلوت میں ہونے والی یہ پہلی ملاقات ہی کام کر گئی۔ یحییٰ بیرون شہر گیا ہوا تھا۔ بیوی اور محبوبہ میں فرق ہوتا ہے اور یہ احساس چند ہی ملاقاتوں میں ریطہ کو ہو گیا۔ وہ اپنے بے مثال حسن کے سبب اپنے شوہر یحییٰ سے جس تعریف و ستائش کی متمنی تھی اس کمی کو رافع نے پورا کر دیا۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز ریطہ نے بھی جواباً رافع سے اظہار عشق کر دیا اور بولی۔ ''میں یحییٰ سے علیحدگی چاہتی ہوں تاکہ تمہیں اپنا سکوں' یہ بتاؤ رافع کیا ایسا ممکن ہے؟''

''مشکل تو ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔'' رافع نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں کوئی تدبیر سوچ کر بتاؤں گا۔''

پھر چند ہی روز بعد رافع کے ذہن میں ایک تدبیر آ گئی۔

رافع نے موقع ملتے ہی ریطہ سے کہا۔ ''یحییٰ لاکھ تمہاری قدر نہ کرتا ہو لیکن تمہیں ہرگز طلاق نہیں دے گا۔ اس سے علیحدگی کی بس ایک یہ صورت ہے وہ یہ کہ تم دو افراد سے اپنے ارتداد و کفر کی شہادت دلا دو تو تمہاری گلو خلاصی ہو جائے گی اور یحییٰ سے تمہارا نکاح ٹوٹ جائے گا۔ بعد میں تم توبہ کر کے پھر مسلمان ہو جانا' میں تم سے شرعی طور پر عقد کر لوں گا۔''

ریطہ نے رافع کے مشورے پر ایسا ہی کیا اور رافع سے اس نے عقد بھی کر لیا۔

یحییٰ کو اس پر بڑا دکھ ہوا۔ اس نے خلیفہ ہارون کے کان تک یہ شکایت پہنچا دی۔ ریطہ اور رافع کے عقد کی وجہ سے یحییٰ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ اب اس پر ہر بات واضح ہو گئی تھی کہ اس کی حسین بیوی ریطہ کو ہتھیانے کیلئے کیا چال چلی گئی ہے۔ اس نے اصل واقعہ لفظ بہ لفظ خلیفہ ہارون سے عرض کر دیا۔

خلیفہ ہارون نے اپنے طور پر اس واقعے کی تفتیش کرائی اور اسے صحیح پانے پر علی بن عیسیٰ کو سمرقند کا عامل مقرر کر دیا۔ اسی حکم کے تحت رافع اب سمرقند کا عامل نہیں رہا تھا۔ خلیفہ نے نئے عامل علی بن عیسیٰ کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ رافع کی ریطہ سے علیحدگی کرا کے رافع پر حد شرعی جاری کی جائے۔ رافع کو شہر سمرقند میں گدھے پر زیر حراست سوار کرا کے تشہیر کی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔

خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں رافع کو ریطہ سے علیحدہ کر کے قید میں ڈال دیا۔

قید کے دوران ہی میں رافع کو یہ معلوم ہوا کہ علی بن عیسیٰ کی جگہ خلیفہ نے ہرثمہ کو

سمرقند کا عامل مقرر کر کے علی کو بلخ کا عامل بنا دیا ہے۔ رافع کو قید میں چند ماہ گزر چکے تھے' وہ بااثر و بارسوخ شخص تھا۔ قید میں رہتے ہوئے بھی ریطہ کی طرف سے وہ غافل نہیں تھا۔ ہرثمہ بھی اس کے دوستوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے ہرثمہ کو ایک خفیہ پیغام بھجوایا۔

چند روز بعد قید خانے میں رافع کو عامل سمرقند ہرثمہ کا جو جواب ملا' اسے پڑھ کر رافع کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ہرثمہ نے اپنے جوابی پیغام میں صرف چند ہی الفاظ لکھے تھے مگر یہ الفاظ بہت معنی خیز تھے۔ ''یقین کرو رافع! کہ میں یہ نہیں بھولا' تم میرے دوست ہو۔''

اپنی دوستی کی لاج رکھنے کیلئے ہرثمہ نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ رافع کی محبوبہ ریطہ سے اس کی ملاقات کا بندوبست کر دیا۔ اس عرصے میں ہرثمہ کو رافع کے قصہ عشق سے واقفیت ہو چکی تھی۔ عامل سمرقند ہونے کے سبب ہرثمہ کیلئے رافع سے ریطہ کی ملاقات کرانا مشکل نہیں تھا۔ اس ملاقات میں رافع نے اپنی محبوبہ کو تسلی دی کہ اب میں زیادہ دن قید نہیں رہوں گا۔ ریطہ کو یہی یقین دہانی عامل سمرقند ہرثمہ نے کرائی تھی۔ وہ اسی لئے اپنے محبوب و شوہر رافع کی طرف سے مطمئن ہو گئی۔

ہرثمہ نے رافع کی رہائی کیلئے جو منصوبہ بنایا تھا۔ اس سے مختصراً ایک خفیہ پیغام کے ذریعے رافع کو آگاہ کر دیا۔ ہرثمہ کو اس وقت یہ اندازہ نہ تھا کہ آئندہ حالات کیا رخ اختیار کر جائیں گے۔ رافع نے قید کے دوران ہی میں اپنے بھائی بشیر سے بھی خفیہ مراسلت جاری رکھی تھی۔ یہ عزائم ہرثمہ کے منصوبے سے الگ تھے۔ رافع کے عزائم محض آزادی تک محدود نہیں تھے' ان عزائم سے بشیر بخوبی آگاہ تھا۔

چند ہی روز بعد ایک فوجی سردار داؤد کو سمرقند میں اپنا نائب مقرر کر کے ہرثمہ آس پاس کے علاقوں کا دورہ کرنے نکل گیا۔ اپنی روانگی سے قبل وہ داؤد کو قید خانہ سمرقند کے بارے میں ضروری ہدایات دے گیا تھا۔ اس نے داؤد سے کہا تھا کہ ضروری نہیں سابق عامل سمرقند رافع بن لیث ہمیشہ ہی خلیفہ وقت کا معتوب رہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے' تم خود رافع سے مل کر پتہ لگانا کہ زنداں میں اسے کوئی تکلیف یا شکایت تو نہیں لیکن تمہاری اور رافع کی گفتگو کا کسی کو علم نہ ہو' تم کو اس سے ملتے وقت تنہا ہونا چاہیے۔

پھر ادھر تو ہرثمہ سمرقند سے روانہ ہوا۔ ادھر داؤد نے قید خانے جا کر رافع سے ملنا ضروری سمجھا۔ داؤد کو ہرثمہ اور رافع کی دوستی کا علم بھی تھا اس نے اسی لئے کسی قسم کی تاخیر یا بے پروائی سے کام نہیں لیا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ رافع خود اس کا منتظر ہے۔

رافع کو قید خانے کے اندر ایک کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا۔ ہرثمہ کی ہدایت کے مطابق

داؤد تن تنہا اس کوٹھڑی تک گیا اور اس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا پھر جیسے ہی وہ رافع کے قریب پہنچا۔ اچانک قطعی خلاف توقع رافع نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے نہایت تیزی سے داؤد کی کمر کے گرد بندھی پٹی سے خنجر کھینچ لیا' پیچھے سے خنجر داؤد کی گردن پر رکھ کر رافع نے اسے کوٹھڑی سے نکلنے کا حکم دیا۔ اچانک حملے کی بنا پر داؤد کے حواس بجا نہ رہے اور وہ آسانی یرغمال بن گیا۔ رافع نے اس کی تلوار بھی نیام سے کھینچ کر اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ زندان کے محافظ بے بسی سے دیکھتے رہ گئے اور داؤد کو یرغمال بنا کر رافع وہاں سے نکل آیا۔

شام ہو چلی تھی' قید خانے کے باہر رافع کا بھائی بشیر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ طویل عرصے تک رافع سمرقند کا عامل رہ چکا تھا وہاں کے سرکاری افسران پر اس کا اثر تھا۔ بشیر پہلے ہی راہ ہموار کر چکا تھا' نتیجہ یہ کہ قید خانے سے نکلتے ہی رافع نے داؤد کے گلے پر خنجر پھیر دیا۔ پھر اسی رات قلعہ سمرقند پر رافع کا قبضہ ہو گیا۔

خلیفہ ہارون بھی ہرثمہ اور رافع کے قریبی تعلقات سے آگاہ تھا۔ اس نے یہی اندازہ لگایا کہ ہرثمہ نے خود رافع کو فرار اور سمرقند پر قبضے کا موقع دیا ہے۔ ابتدائی تفتیش سے بھی کچھ ایسی ہی صورتحال سامنے آئی کہ ہرثمہ نے کوئی سازش کی ہے۔ خلیفہ نے اسی کے پیش نظر ہرثمہ کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔

کئی واقعات ایک ساتھ رونما ہوئے۔ ایک طرف تو ہرثمہ کے خلاف تفتیش ہو رہی تھی' دوسری جانب علی بن عیسیٰ نے یہ خبر پا کر کہ رافع نے بغاوت کر دی ہے اور سمرقند پر قابض ہو گیا ہے' اپنے بیٹے کو فوج دے کر رافع سے جنگ کی خاطر روانہ کیا۔ رافع نے اسے شکست فاش دی۔ وہ فرار ہونا چاہتا تھا مگر اسے یہ موقع بھی نہ ملا اور مار ڈالا گیا۔

علی بن عیسیٰ کو جب یہ خبر ملی تو پریشان ہو گیا' اپنے جوان بیٹے کی موت کا بھی اسے صدمہ تھا۔ اس کے باوجود وہ رافع سے جنگ کیلئے لشکر کی آراستگی اور سامان جنگ کی درستی میں مصروف ہو گیا۔ اس خیال سے کہیں رافع مرو پر قبضہ نہ کر لے' وہ بلخ سے مرو چلا آیا۔

خلیفہ وقت کو اطلاع دیئے بغیر علی بن عیسیٰ نے خود اپنی صوابدید پر حالت پریشانی میں یہ قدم اٹھایا۔ خلیفہ کے علم و اطلاع اور اجازت کے بغیر یہ اقدام بہرحال نافرمانی پر محمول کیا گیا۔ اسی کے نتیجے میں علی بن عیسیٰ کو معزول کر دیا گیا۔

دوسری جانب ہرثمہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اسے جب اپنی گرفتاری کے احکام کا علم ہوا تو فوراً خلیفہ سے معافی مانگ لی۔

خلیفہ ہارون نے ہرثمہ کو معاف کر دیا مگر اس شرط پر کہ وہ تاخیر کے بغیر سمرقند پر حملہ کر

دے اسی صورت میں اسے خلیفہ کا وفادار سمجھا جائے گا۔ ہرثمہ کے پاس اپنی جان بچانے کا یہ بہت اچھا موقع تھا۔ اس نے فوراً خلیفہ کی شرط قبول کر لی' ویسے بھی اس کے دوست رافع نے دوستی نہیں نبھائی تھی۔ رافع نے تجاوز کیا تھا ورنہ ہرثمہ کا منصوبہ اس کی رہائی تک محدود تھا۔ اس منصوبے میں نہ تو ہرثمہ کے نائب داؤد کو قتل کرنا شامل تھا نہ حکومت وقت سے بغاوت کر کے سمرقند پر قابض ہونا تھا۔ بلاشبہ ہرثمہ کے اعتماد کو رافع نے غیر ضروری و غیر ذمہ دارانہ اقدامات کر کے ٹھیس پہنچائی تھی' وہ اسی لئے دل شکستہ تھا۔

رافع کے ہمراہ نامور فوجی سردار تھے مگر انہوں نے جب ہرثمہ کو مقابل دیکھا تو ان میں سے اکثر اسے چھوڑ کر ہرثمہ سے جا ملے۔ ہرثمہ نے رافع کا سمرقند میں محاصرہ کر لیا اور نہایت سختی سے ایک مدت دراز تک محاصرہ کیے رہا۔ اسی اثنا میں ہرثمہ نے طاہر بن حسین کو خراسان سے طلب کر لیا۔ ایک دوست دوسرے دوست کے مقابل آ گیا۔

سمرقند میں رافع کے محاصرے کا ابھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا کہ حمزہ خارجی نے اطراف خراسان کو شاہی لشکر سے خالی پا کر رافع کی شہ پر سر اٹھایا۔ ہرات و بجستان کے عمال سے بھی رافع کے دوستانہ مراسم تھے' انہوں نے بھی نمک حرامی پر کمر باندھ لی۔ ان عمال نے رافع کے ایما پر بہت سامان حمزہ خارجی کو بھیج دیا۔

یہ خبریں ہرثمہ کو بھی ملیں اور اس نے رافع پر دباؤ بڑھا دیا' دونوں دوستوں کے مابین لڑائی میں فتح و کامیابی ہرثمہ کو حاصل ہوئی لیکن مختصر سی فوج کے ساتھ رافع جان بچا کر فرار ہو گیا۔ رافع کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ سمرقند سے فرار ہو کر رافع خراسان پہنچ گیا۔ خراسان میں حمزہ خارجی نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے خراسان رافع کے حوالے کر دیا اور خود اس کا نائب بن گیا۔ اسی بغاوت کو ختم کرنے اور رافع کی سرکوبی کیلئے خلیفہ ہارون خراسان جانے کا قصد رکھتا تھا۔ اگر وہ بیمار نہ پڑ گیا ہوتا تو اب تک اپنے ارادے پر عمل کر چکا ہوتا۔

یہی وہ حالات تھے جب میں عارج کو ساتھ لئے بغداد پہنچی اور ایک بار پھر قصر خلافت میں داخل ہوئی۔ ہم نے اسحاق اور کلثوم کے انسانی قالبوں پر قبضہ کر لیا تھا اور خلیفہ ہارون الرشید کے خدمت گاروں میں شامل ہو گئے تھے۔

ابھی ہمیں قصر خلافت میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ صبح ہی صبح غیر معمولی ہلچل دکھائی دی۔

میں نے ہارون الرشید کے طبیب خاص جبرئیل بخت یشوع کو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے قصر کے اس حلقے کی طرف جاتے دیکھا جو خلیفہ کیلئے مخصوص تھا۔ میرا اور عارج کا شمار

کیونکہ ہارون کے خاص خدمت گاروں میں ہوتا تھا اس لئے مخصوص حصے میں جانے پر ہمارے لئے کوئی پابندی نہیں تھی۔ مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ ہارون کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ ہارون کا عیسائی طبیب خاص جبرئیل مجھے اس لئے کچھ گھبرایا ہوا لگا تھا۔

''اے دینار! چل کر دیکھتے ہیں کہ کیا معاملہ ہے؟'' عارج دھیمی آواز سے مجھ سے مخاطب ہوا۔

اسی وقت خلیفہ کے مخصوص حصے کی طرف سے ایک کنیز سلمہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھ کر میں چونک اٹھی اور پوچھا۔ ''کیا ہوا اے سلمہ! تمہاری آنکھوں میں آنسو؟''

چند لمحے سلمہ میری بات کا جواب نہ دے سکی۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''کنیز ہیلانہ کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''تو وہ...... وہ طبیب خاص......''

''تت...... تم شاید کچھ غلط...... غلط سمجھ رہی ہو کلثوم!'' سلمہ رک رک کر بولی۔ ''طبیب خاص وہاں ہیلانہ کے مرنے کی تصدیق کرنے نہیں گئے' وہ تو امیر المومنین کو دیکھنے گئے ہیں جن کی طبیعت ہیلانہ کے انتقال کی خبر سن کر بگڑ گئی ہے۔''

میں نے یہ سن کر ٹھنڈا سانس بھرا' مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ہارون حسن پرست واقع ہوا ہے اور اس کے حرم میں متعدد حسین ترین اور قیمتی کنیزیں ہیں لیکن کسی کنیز سے اس کے اتنے زیادہ لگاؤ کا پتہ نہ تھا۔

سلمہ چلی گئی تو عارج آہستہ آواز میں کہنے لگا۔ ''مجھے تو اس آدم زادی کی بات پر یقین نہیں آیا' ہارون تو پہلے ہی سے بیمار ہے' کسی کنیز کے مر جانے سے وہ اپنے دل پر اتنا اثر نہیں لے سکتا ہے۔ یقیناً یہ سلمہ کی خام خیالی ہے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے اے عارج!'' میں تائید میں بولی۔

دو ایک روز میں ہارون کی طبیعت سنبھل گئی مگر میرا اور عارج کا خیال غلط ثابت ہوا۔ ہارون کی طبیعت اچانک بگڑ جانے کی وجہ اس کی چہیتی کنیز ہیلانہ ہی تھی۔ کنیز سے اس کی جذباتی وابستگی کا ثبوت وہ مرثیہ تھا جس نے بہت شہرت پائی۔ خلیفہ ہارون علم و فن کا شیدائی ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی ایک اچھا شاعر تھا۔ مجھے ہارون کے اس درد انگیز مرثیے کے کچھ اشعار اب بھی یاد ہیں۔

''جب ہیلانہ کو موت آئی تو مجھے بڑا درد اور رنج ہوا' وہ مجھ سے جدا ہو گئی تو میرا عیش جاتا رہا' میں جیسا تھا ویسا نہ رہا۔ دنیا میں بہت سے انسان ہیں مگر تیری موت کے بعد میں نے تجھ سا کوئی نہیں دیکھا۔ واللہ! میں تجھے اس وقت تک نہیں بھولوں گا جب تک ہوا ٹہنیوں کو حرکت دیتی رہے گی۔''

ہارون کو برسوں پہلے میں نے اس وقت جوانی میں دیکھا جب وہ ولی عہد تھا لیکن اب وہ بہت بدل گیا تھا۔ مجھے اس کی شخصیت مختلف تضادات کا پیکر محسوس ہوئی۔ اسی ضمن میں مجھے ہارون کا ایک اور واقعہ یاد ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنی ایک محبوب کنیز سے کسی بات پر ناراض ہو گیا۔ اس خوبصورت کنیز کو ہارون نے ایک لاکھ درہم میں خریدا تھا۔ ناراضگی کے سبب ہارون نے اس کنیز کو اپنی خلوت میں حاضر ہونے سے روک دیا لیکن اسی کے فراق میں اشعار بھی لکھے۔ ہارون کی ایسی ہی حرکتوں سے کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے وہ خود اپنے ہی زخموں کو کرید کے لذت محسوس کرتا ہو۔

ایک طرف اس کے حرم میں حسین ترین کنیزیں تھیں اور وہ عیش و نشاط کا دلدادہ تھا۔ اپنے بڑے بھائی ہادی کی طرح اسے بھی نشے کا چسکا لگ چکا تھا جس نے اس کی صحت تباہ کر دی تھی۔ ابھی وہ 44 برس کا تھا کہ بوڑھا دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ نشہ مے سے بھی لطف اندوز ہوتا اور نشہ حسن بھی اسے سرشار رکھتا۔

دوسری جانب ہارون کی شخصیت کا ایک اور بھی رخ تھا۔ اس کے دربار میں قاضی ابو یوسف جیسے عالم' فضل بن عیاض اور ابن سماک جیسے عابد و زاہد اور سفیان ثوری جیسے محدث شامل تھے۔

یہ میرے ہی سامنے کا واقعہ ہے کہ ہارون نے ایک نابینا عالم ابو معاویہ ضریر کو دعوت دی' میں ایک برتن لے کر اس کے ہاتھ دھلانے کو آگے بڑھی تو ہارون نے اشارے سے مجھے روک دیا۔ پھر اس نے سلفچی میرے ہاتھ سے لے لی اور خود ابو معاویہ کے ہاتھ دھلائے۔ جب وہ ہاتھ دھو چکے تو ہارون نے ان سے پوچھا۔ ''آپ کے ہاتھ کس نے دھلوائے ہیں؟''

''مجھے خبر نہیں۔'' ابو معاویہ نے جواب دیا۔

''محض تعظیم علم کیلئے میں نے خود آپ کے ہاتھ دھلائے ہیں۔'' ہارون نے بتایا۔

یہ حقیقت ہے کہ ہارون نے علم و فن کی بڑی پذیرائی کی۔ اس نے اپنے دور حکومت میں تالیف و ترجمے کا ایک باقاعدہ محکمہ بیت الحکمت کے نام سے قائم کیا اور تراجم کا جو کام خلیفہ منصور کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا اسے منظم کیا۔ اسی کے عہد میں یونانی' ایرانی اور

سنسکرت کی کتابوں کے تراجم کرنے کی غرض سے مترجمین کو معقول تنخواہوں پر مقرر کیا گیا جن علوم کی اشاعت پر ہارون کے عہد میں خاص طور پر توجہ دی گئی وہ طب' نجوم' ہیئت' موسیقی' تاریخ' شاعری اور ادب تھے۔

میں نے ہارون کو ابن سماک کی بڑی عزت کرتے دیکھا۔ وہ اکثر ابن سماک سے نصیحت کرنے کی فرمائش کا خواہاں رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ابن سماک نے سلطنت و دولت کو بے ثبات قرار دیا۔ پھر خلیفہ کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں امیر المومنین کے چہرے پر سوال پڑھ رہا ہوں۔''

اسی دوران میں ہارون کو پیاس لگی اور وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''پانی لاؤ!''

میں تعمیل حکم میں پانی لے آئی اور منقش کٹورا ہارون کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ہارون پانی پینا چاہتا تھا کہ ابن سماک نے کہا۔ ''ذرا ٹھہریئے! اگر آپ کو شدت کی پیاس لگی ہو اور کہیں پانی نہ ملے تو آپ صرف ایک پیالہ پانی کتنے میں خرید سکتے ہیں' میری مراد زیادہ سے زیادہ قیمت سے ہے۔''

''نصف سلطنت میں۔'' ہارون نے جواب دیا۔

ابن سماک نے کہا۔ ''اچھا اب آپ پانی پی لیجئے۔'' جب ہارون نے پانی پی لیا تو ابن سماک نے پھر پوچھا۔ ''یہ پانی جو آپ نے پیا ہے' پیٹ ہی میں رہ جائے تو اس کے اخراج کی غرض سے کیا خرچ کر سکتے ہیں؟''

ہارون بلا تردد بولا۔ ''اپنی پوری سلطنت!''

ابن سماک نے تب کہا۔ ''بس ثابت یہ ہوا کہ سلطنت و دولت کی کوئی حیثیت نہیں' ایک پیالہ پانی کے برابر بھی نہیں۔ ایک ذہین و فہیم شخص کیلئے اس طرف رغبت کرنا محض حماقت ہے۔''

اس وقت میں نے ہارون کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ لازماً اس کا دل بہت گداز تھا مگر اسی کے ساتھ اتنا سخت بھی کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کی سخت گیری کے یوں تو متعدد واقعات ہیں لیکن میری آنکھوں دیکھا ایک ایسا واقعہ ہے جسے پڑھ کر یقیناً آدم زادوں کے دل دہل جائیں گے۔ یہ واقعہ ہارون کی وفات سے چند روز پہلے کا ہے' جب وہ شدید علیل تھا' اس کا ذکر آگے آئے گا۔

میں نے عارج کے ساتھ کس لئے آدم زادوں کے درمیان سکونت اختیار کی ہے اور اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا' دوبارہ قصر خلافت میں سکونت اختیار کرنے

کے بعد ابھی خدمت خلق کی غرض سے میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکی تھی۔ میں نے ایک شب اس بات کا ذکر عارج سے کیا تو وہ بھی کہنے لگا۔ ''اے دینار! تیرا یہ سوچنا غلط نہیں' ہمیں آدم زادوں خصوصاً مظلوموں کی فلاح و بہبود کیلئے کچھ کرنا چاہیے۔''

''مگر کیا؟ یہ بھی تو بتا اے عارج!'' میں نے سوال کیا۔

عارج سوچ میں ڈوب گیا اور خود میں بھی یہی سوچنے لگی۔

معاً میں نے عارج کو مخاطب کیا۔ ''عمال حکومت اور سرکاری افسران کا رعایا کے ساتھ برتاؤ کیا' تیرے خیال میں منصفانہ ہے؟''

''نہیں'' عارج نے جواب دیا۔ ''مگر ہم ان تمام کے اس برتاؤ کو کس طرح بدل سکتے ہیں؟''

''یہ سوچنے کی بات ہے کہ اس سلسلے میں کیا قدم اٹھایا جائے۔''

میں نے کہا۔ ''فی الحال تو ہم رعایا کو درپیش مسائل پر غور کر رہے ہیں۔ اگر اس معاملے کی تہ تک پہنچا جائے کہ عوام کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کا سبب کیا ہے تو اصل بات سامنے آ جائے گی۔''

''وہ کیا اے دینار؟'' عارج نے دریافت کیا۔

''یہ کہ ناانصافی کے پیچھے عمال و افسران کی ناجائز آمدنی ہے۔ اس ناجائز آمدنی کو روک دیا جائے تو ناانصافی کا بڑی حد تک خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ناجائز آمدنی روکنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ جو عمال و افسران مقرر کیے جائیں وہ امین' دیانتدار اور معتبر ہوں اور رعایا پر ظلم و تشدد نہ کریں تو میری بات سمجھ رہا ہے اے عارج!''

''ہاں سمجھ رہا ہوں اے دینار!'' عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''لیکن تو ایک بات بھول رہی ہے کہ مسلمانوں کی یہ سلطنت کس قدر وسیع و عریض ہے۔ خلیفہ کو اپنے عمال و افسران کی کارکردگی کا پتہ کس طرح چلے گا؟''

فوری طور پر مجھے عارج کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں سوجھا مگر جلد ہی ایک راہ نظر آ گئی۔ میں بولی۔ ''اس کیلئے خبر رسانی کے محکمے کو بہتر بنایا جا سکتا ہے تاکہ خلیفہ کو صحیح خبریں ملتی رہیں۔''

''بات پھر وہیں آ جاتی ہے اے دینار! کہ ہم آدم زادوں کی فلاح کیلئے جو کچھ سوچ رہے ہیں اس پر عملدرآمد کیسے ہو؟''

''اس کیلئے پہلے ضرورت تو خلیفہ ہارون کو یہ احساس دلانے کی ہے کہ رعایا کے ساتھ

انصاف نہیں ہو رہا اور اس کے ذمے دار عمال و افسران ہیں جو ناجائز آمدنی کیلئے ایسا کر رہے ہیں۔" میں نے بتایا۔

پھر میرے اور عارج کے درمیان مزید کچھ دیر تک اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ ہم نے اس ضمن میں کچھ باتیں طے کیں اور پھر سو گئے۔

اگلے ہی روز مجھے ہارون الرشید کے ذہن پر اثر انداز ہونے کا موقع مل گیا' میں نے اس کے ذہن میں ساری باتیں اس طرح بٹھائی تھیں جیسے خود یہ سب اس کے دماغ میں آیا ہو۔

"اس کیلئے تحریری اصول و ضوابط ضروری ہیں تاکہ ان کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔" ہارون سوچنے لگا۔ "اگر کوئی خلاف ورزی کرے تو اسے ضوابط کے مطابق گرفت میں لیا جا سکے لیکن یہ کام کون کرے؟ میری طبیعت ٹھیک ہوتی تو میں خود یہ اہم کام انجام دے سکتا تھا۔"

عین اسی لمحے میرے ذہن میں ایک نام آیا اور میں نے ہارون کے دماغ میں سرگوشی کی۔ "قاضی ابو یوسف سے بھی تو یہ کام لینا ممکن ہے۔"

"ہاں یقیناً' یہ انتہائی مناسب رہے گا۔" ہارون بے خیالی میں بڑبڑایا اور پھر اسی وقت قاضی ابو یوسف کو طلب کر لیا۔

قاضی ابو یوسف نے اس پر بے حد خوشی کا اظہار کیا اور کہا۔ "امیر المومنین کو اللہ تعالیٰ اس کی جزا دے گا' میں ہر ممکن طور پر جلد از جلد اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ!"

☆..... ☆..... ☆

پھر وہی ہوا جو قاضی ابو یوسف نے کہا تھا۔ اس نیک آدم زاد نے شب و روز ایک کر دیئے' نتیجہ یہ نکلا کہ اس قدر بڑا اور اہم کام صرف ایک مہینے کی مختصر مدت میں ہو گیا۔ رعایا کی فلاح کیلئے جو تجاویز میں نے سوچی تھیں وہ بھی قاضی کے ذہن میں ڈال دیا۔

اصلاحات مفید پر مبنی ایک کتاب کا نام "الخراج" رکھا گیا۔ اس کتاب کے آغاز میں قاضی نے لکھا۔ "امیر المومنین نے رعایا سے ظلم کے ازالے اور اس کی فلاح و بہبود کیلئے خراج' عشور' صدقات اور جزیے پر ایک جامع کتاب لکھنے کا حکم دیا۔ اسی حکم کی تعمیل میں یہ کتاب لکھی گئی۔"

قاضی ابو یوسف نے اپنی اس کتاب میں ہارون الرشید کو مشورہ دیا کہ محکمہ خراج میں جو عمال مقرر کیے جائیں وہ دیانت دار ہوں اور ان میں خوف خدا ہو اور وہ رعایا پر ظلم و تشدد نہ

کریں۔ خبر رسانی کے محکمے سے متعلق میری تجویز بھی اس کتاب میں موجود تھی۔ میں نے اپنی دانست میں آدم زادوں کیلئے ایک ایسا کام کیا جو ثواب جاریہ کے ضمن میں آتا تھا۔ ہارون نے بظاہر قاضی ابو یوسف کے مشوروں پر ہی عمل کیا تھا' اسے کیا خبر تھی کہ ان مشوروں کے پیچھے ایک جن زادی کا ہاتھ ہے۔ غالباً آدم زاد اپنے لئے ہم جنات سے کسی خیر کی توقع نہیں رکھتے۔ آدم زادوں کی طرح نمود و نمائش کا شوق ہم جنات میں عموماً نہیں ہوتا۔ سو اگر میں نے آدم زادوں کیلئے کار خیر کیا تو مجھے نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پروا بہرحال آئندہ وقت نے ثابت کر دیا کہ پہلے رعایا کے ساتھ جو ناانصافیاں روا تھیں' ختم ہو گئیں۔ مسلمانوں کی اس عظیم الشان سلطنت میں عدل و انصاف قائم ہو گیا۔ ہارون نے خراج کی وصولی میں سختی کو ختم کر دیا اور ظالم عمال کو سزائیں دیں۔

اپنے کئی اہم عاملوں کو ہارون نے ظلم و تشدد کی بنا پر معزول کیا۔ ہارون نے اپنے ایک عامل کو جو خط لکھا تھا اور جو میری نظر سے بھی گزرا اس سے ہارون کی رعایا پروری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس جانب ہارون کے ذہن کو میں نے ہی متوجہ کیا تھا جو خط میں نے پڑھا' اس کا ایک اقتباس یہ ہے۔ ہارون نے اپنے عامل (گورنر) کو لکھا تھا۔ "میں نے تجھے عزت اور شہرت دی مگر تو نے میرے اس احسان کا یہ بدلہ لیا کہ میرے حکم اور صریح ہدایات کی خلاف ورزی کر کے تو نے اپنے علاقے میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ میری رعایا پر تو نے ظلم کیا' اپنے طرز عمل کی خرابی' بے جا حرص نیز کھلی ہوئی خیانت مجرمانہ سے اللہ اور اس کے خلیفہ کو تو نے ناراض کیا۔ میں نے اب تیری جگہ جو عامل مقرر کیا ہے اسے حکم دیا ہے کہ وہ تجھ سے' تیری اولاد سے' تیرے اہل کاروں اور عہدیداروں سے نہایت سخت مواخذہ کرے جس مسلمان یا ذمی کا کوئی مطالبہ تیرے ذمے واجب الادا ہو وہ تجھ سے پورا کرائے۔"

ہارون الرشید کی شخصیت کا مثبت رخ تو یہ تھا جو ابھی میں نے بیان کیا اور مزید بیان آئندہ آئے گا مگر منفی رخ یہ تھا کہ وہ کوشش کے باوجود نشہ مے اور نشہ حسن سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عیش و عشرت' کثرت مے نوشی اور جنگی مہمات نے ہارون کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔

یہ بات شاید میں پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ ہارون کی شخصیت میں عجیب و غریب تضاد تھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ اس نے نو مرتبہ حج کیا اور متعدد بار معرکہ جہاد میں شریک ہوا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی زندگی رنگینیوں سے بھی بھری ہوئی تھی۔ اس کی کثرت مے نوشی کے قصے عام تھے۔ اس کا حرم کافی وسیع تھا اور وہ خوبصورت کنیزوں کا بڑا قدردان تھا۔ ایک

طرف اگر وہ رحم دل' فیاض اور فراخ دل تھا تو دوسری طرف ظلم کرنے اور انتقام لینے کا بھی عادی تھا۔ برامکہ کے ساتھ اس کا برتاؤ اس کی متضاد طبیعت کو نمایاں طور پر ظاہر کرتا ہے جس کا بیان میری سرگزشت میں پہلے آ چکا ہے۔

چند ماہ بغداد میں آرام کرنے اور مسلسل علاج و تدرے پرہیز سے ہارون کی طبیعت پہلے کی نسبت خاصی سنبھل گئی تھی۔ اس کے آئندہ عزائم سے اب تک میرے سوا کوئی واقف نہ تھا لیکن جب اس نے سامان جنگ اور سفر کیلئے انتظامات کا حکم دیا تو بغداد میں کھلبلی مچ گئی۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس حکم کی وجہ کیا ہے اور ہارون کدھر کا قصد رکھتا ہے۔

خلیفہ منصور کے آزاد کردہ غلام ربیع کا بیٹا فضل خلیفہ کے بہت قریب تھا۔ اس نے ایک روز ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ ''اے امیر المومنین! اگر مناسب خیال فرمائیں تو اپنے جانثاروں کو آگاہ فرمادیں' سامان جنگ و سفر درست کرنے کے حکم سے حضور کی کیا مراد ہے۔''

اس پر ہارون مسکرایا اور بولا۔ ''اے ربیع کے بیٹے! کیا تجھے نہیں معلوم کہ خراسان میں بغاوت ہو چکی ہے۔ ایسے میں کیا ہم پر لازم نہیں کہ باغی و سرکش رافع بن لیث کو اس کے کیے کی سزا دیں۔''

''آپ نے بالکل بجا فرمایا اے امیر المومنین!'' فضل بن ربیع نے کہا۔ ''یقیناً رافع کی سرکوبی ضروری ہے۔''

اس دن کے بعد سے سبھی اہل دربار کو حقیقت کا علم ہو گیا۔ طبیب خاص کے کانوں تک بھی یہ خبر ہو گئی تو وہ فکر مند ہو گیا۔ وہ خلیفہ سے ملا اور عرض کیا۔ ''اے امیر المومنین! ابھی مزید کچھ عرصے آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔''

''جبرئیل! ہم نے بہت آرام کر لیا' اب ہمیں سلطنت کے کام کرنے دو۔ ہم ضرورتاً ہی سفر کر رہے ہیں۔'' ہارون کہنے لگا۔ ''پھر یہ کہ تم بھی اس سے واقف ہو کہ بغداد کی آب و ہوا ہمیں زیادہ راس نہیں۔ ہم اسی لئے عموماً بغداد کے بجائے اب تک بیماری کے دوران میں یہاں سے دور رہے ہیں۔ ہم نے رقہ میں رہنا پسند کیا ممکن ہے تبدیلی آب و ہوا سے ہماری طبیعت مزید بہتر ہو جائے۔''

عیسائی طبیب خاص نے پھر زیادہ بحث نہیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہارون اس کی بات نہیں مانے گا۔

خادموں کی حیثیت سے مجھے اور عارج کو بھی ہارون کے ساتھ جانے کا حکم مل چکا تھا۔ اس سے قبل عارج اور میں خلیفہ مہدی اور ہارون کے بڑے بھائی خلیفہ ہادی کے ساتھ بھی سفر

کر چکے تھے۔ کسی خلیفہ کے ساتھ سفر کرنے کا ہمارے لئے یہ تیسرا موقع تھا۔

''دیکھ اے دینارا! اس بار کیا گزرتی ہے۔'' عارج نے روانگی سے چند روز پہلے ایک رات مجھ سے کہا۔

''خیر جو گزرے گی' وہ تو گزر ہی جائے گی لیکن میں تجھ سے ایک اور بات کہنا چاہتی ہوں اے عارج!''

''ہاں بول!'' عارج بولا۔ وہ قریب ہی دوسرے بستر پر لیٹا تھا۔ اس نے میری طرف کروٹ لے لی۔

''تو سن! اہل دربار' عمال اور اراکین سلطنت میرے خیال میں واضح طور پر دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں اے دینارا! تیرا مقصد دو گروہوں سے کیا ہے اور وہ دو گروہ کون ہیں؟''

''تو اگر اپنے انسانی قالب کی آنکھیں اور کان کھلے رکھتا تو یقیناً تجھے مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آتی اے عارج!''

''تیری آنکھیں اور کان تو کھلے رہتے ہیں! ..... تو ہی کچھ بتا دے۔'' عارج کی آواز میں چبھن تھی۔

''اگر تو اس لہجے میں بات کرے گا تو میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''ڈرا کیوں رہی ہو' تو جیسے کہے گی بولوں گا۔'' عارج ہنس پڑا۔ ''آخر ایک روز تجھ سے اپنا نکاح بھی تو پڑھوانا ہے۔''

''تو اس لالچ میں فرمانبردار بن رہا ہے۔'' مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

''اچھا! اب اصل بات بتائے گی کہ ہنستی ہی رہے گی! ..... تو کن دو گروہوں کی بات کر رہی تھی؟'' عارج نے معلوم کیا۔

مجھے سنجیدہ ہونا پڑا اور پھر میں نے اس کی بات کا جواب دیا۔

''عربی اور عجمی گروہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہارون نے جن پہلے دو ولی عہدوں کا اعلان کیا ہے اور ان کیلئے بیعت لی ہے ان میں سے ایک کی ماں زبیدہ عربی اور دوسرے کی ماں عجمی یعنی ایرانی النسل ہے۔ اس کے علاوہ اس معاملے میں ایک اور بھی پیچیدگی ہے۔''

عارج ٹھنڈا سانس بھر کے بولا۔ ''چل وہ بھی بتا دے۔''

"لگتا ہے تو میری بات میں دلچسپی نہیں لے رہا اے عارج!"

"اگر دلچسپی نہیں لوں گا تو پھر تو میری بیوی......"

"فضول بات نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تو پھر تو کام کی بات کر، میں نے کب روکا ہے تجھے۔"

میرے سخت سست کہنے پر عارج پھر راہ پر آ گیا تو میں نے کہا۔ "ہارون نے اپنی دانست میں ولی عہدی کے مسئلے کو حل کر دیا ہے، یعنی پہلے امین خلیفہ بنے گا، پھر مامون، اس کے بعد موتمن مگر لگتا ہے کہ تاریخ شاید پھر ایک بار خود کو دہرانے والی ہے۔"

"وہ کیسے؟" عارج نے مجھ سے وضاحت چاہی۔

"تجھے یاد ہو گا کہ خلیفہ مہدی نے پہلے اپنے بڑے بیٹے ہادی ہی کو ولی عہد نامزد کیا تھا مگر بعد میں اس کی رائے بدل گئی تھی۔ وہ ہارون کو اپنے بعد خلافت کا حقدار تصور کرتا تھا۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں اس یہ کوشش کی بھی تھی مگر اسے زہر دے کر مار ڈالا گیا تو اور میں ہم دونوں ہی ہارون کے حق میں تھے اس لئے کہ وہ ہادی سے زیادہ لائق اور ذہین تھا۔"

"ہاں یہ سب کچھ یاد ہے مجھے۔" عارج بولا۔ "تو آگے کہہ۔"

"کہنا یہ ہے کہ مامون اور امین میں سے تجھے زیادہ لائق کون لگتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ویسے تو مامون لائق ہے مگر کیونکہ نسلاً میں بھی عرب ہوں اس لئے بوجوہ امین کے حق میں رائے دوں گا۔"

"اس کی وجہ بیان کر۔"

"ایک وجہ تو خود ہی تجھے سمجھ لینی چاہیے کہ امین اپنی ماں اور باپ دونوں کی طرف سے عرب ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ زبیدہ خلیفہ کی بیوی ہے جبکہ مراجل، یعنی مامون کی ماں مر چکی ہے، ایک ایرانی کنیز تھی۔ گویا مامون ایک کنیز زادہ ہے۔ شرفائے بن عباس اسی بنا پر امین کے حق میں ہیں۔ اے دینار! تو نے دو گروہوں کی بالکل درست نشاندہی کی ہے۔" عارج نے تفصیل سے میری بات کا جواب دیا۔

"لیکن میرے خیال میں یہ سب اچھا نہیں ہو رہا۔ یہ گروہ بندی مستقبل میں سلطنت بنو عباس کیلئے نہ سہی تو امین و مامون کیلئے انتہائی خطرناک ثابت ہو گی۔" میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ہمارے چاہنے نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا اے دینار!" عارج بولا۔ "ہو گا وہی جو

رب چاہے گا اس لئے یہ غم چھوڑ اور لمبی تان کر سو۔"

"تجھے شاید نیند آ رہی ہے، اچھا شب بخیر! انشاء اللہ کل صبح ملاقات ہو گی۔" میں نے یہ کہہ کر چادر چہرے پر ڈال لی۔

یہ واقعہ دوسرے ہی دن کا ہے کہ ہارون نے اپنے چھوٹے بیٹے مامون کو بڑے سوتیلے بیٹے امین کے ساتھ بغداد ہی میں رہنے کا حکم صادر کیا۔ میرے نزدیک مامون کا امین کے ساتھ بغداد میں رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے یہ بات مامون کے ایک بہی خواہ سردار فضل بن عباس کے دماغ میں ڈال دیا۔ فضل نے مامون کو خطرے کا احساس دلایا۔ مامون بھی خطرہ بھانپ گیا اور فضل کی بات مان لی۔ پھر اس نے خلیفہ ہارون سے درخواست کی کہ اسے بھی اپنے ساتھ خراسان لے جائے۔

ہارون نے مامون کی درخواست قبول کر لی۔ یوں بھی وہ اپنے اس نوجوان بیٹے کو زیادہ چاہتا تھا جس کا سبب بچپن ہی سے اس کی ذہانت و لیاقت تھی۔ امین کو اپنا ولی عہد مقرر کرنے کی غلطی کا اسے پورا احساس تھا۔ دراصل امین کی ولی عہدی کا اعلان اسی وقت ہو گیا جب اس کی عمر صرف پانچ سال تھی۔

امین کیونکہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے خاندان بنو عباس سے تعلق رکھتا تھا اس لئے برسر اقتدار خاندان کے تمام ہی بااثر افراد یہ چاہتے تھے کہ ہارون اسے اپنا ولی عہد نامزد کرے۔ زبیدہ اور اس کے بھائی عیسیٰ بن جعفر نے اس معاملے میں فضل بن یحییٰ برمکی کو اپنا ہم خیال بنالیا۔ یوں بھی فضل برمکی ہی امین کا اتالیق تھا۔ اس کے علاوہ دربار خلافت میں بھی فضل برمکی کا اثر بڑھ رہا تھا۔ فضل نے 175 ہجری میں خراسان کی مہم کے دوران میں ولی عہدی کے مسئلے پر توجہ کی اور افسران فوج سے مشورے کیے یہ وہ زمانہ تھا جب خاندان برامکہ بنو عباس پر چھایا ہوا تھا۔ اسی زعم میں فضل برمکی نے خلیفہ ہارون کی اجازت لئے بغیر امین کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا، پھر سرداران فوج سے امین کیلئے بیعت لے لی۔

ہارون کو جب اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو اسے تعجب ہوا لیکن زبیدہ اور دیگر افراد بنو عباس کے دباؤ سے اس نے امین کی ولی عہدی کو قبول کر لیا اور اس کی بیعت کیلئے تمام سلطنت میں احکام نافذ کر دیئے۔ اسی طرح کمسنی میں ہی امین کی ولی عہدی کا اعلان ہو گیا۔

دوسری جانب ایک ایرانی کنیز کا بیٹا ہونے کے باوجود مامون بچپن ہی سے ذہین تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت جعفر برمکی کے سپرد تھی جیسے جیسے مامون بڑا ہوتا گیا اس کی صلاحیتیں ہارون پر ظاہر ہوتی گئیں۔ ہارون کو یقین ہو گیا کہ امین کے مقابلے میں مامون خلافت کیلئے موزوں

رہے گا واقعہ بھی یہی تھا کہ امین کو ولی عہد مقرر کر کے ہارون نے غلطی کی تھی خود اسے بھی یہ احساس تھا۔ وہ اسی لئے اس غلطی کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ بعض امرائے سلطنت بھی امین کی ولی عہدی کے حق میں نہیں تھے۔

جب 180 ہجری میں جعفر برمکی کو عہدہ وزارت پر نامزد کیا گیا تو اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ولی عہدی کے مسئلے کا حل تلاش کیا جائے۔ جعفر برمکی اور دیگر امراء کے مشوروں سے ہارون نے 182 ہجری میں حج سے واپس آنے کے بعد مامون کو امین کے بعد اپنا ولی عہد نامزد کیا اس کیلئے ہارون نے امراء اور فوج کے سرداروں سے بیعت لی۔ مامون کا اصل نام شہزادہ عبداللہ تھا۔ ہارون ہی نے اسے مامون کا لقب دیا تھا۔ اسی کے ساتھ ہارون نے مامون کو خراسان اور اس کے ملحقہ صوبوں کا عامل (گورنر) بنا دیا تھا۔ مامون کی عمر اس وقت بارہ سال تھی۔ 186 ہجری میں ہارون کے بعض درباریوں نے جن میں عبدالملک بن صالح پیش پیش تھا یہ مشورہ دیا کہ ہارون اپنے تیسرے بیٹے قاسم کو بھی اپنا ولی عہد نامزد کر دے۔ ہارون نے یہ مشورہ بھی قبول کر لیا' اس نے قاسم کیلئے بھی بیعت لی اور اس کا لقب موتمن قرار دیا۔

یوں ہارون نے اپنے بعد تین جانشین نامزد کیے جن کی بنا پر لوگوں میں اختلاف رائے ہوا۔ بعضوں کے نزدیک یہ نامزدگیاں استحکام سلطنت کا باعث تھیں جبکہ دیگر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ یہ خانہ جنگی کا سبب ہوں گی۔

میرے نزدیک ان نامزدگیوں میں سب سے نازک معاملہ نسلی امتیاز کا تھا۔ عربی اور عجمی کی تفریق کسی بھی وقت فساد کی وجہ بن سکتی تھی پھر مامون کا ایک کنیز کی اولاد ہونا بھی رنگ لاسکتا تھا جبکہ ملکہ زبیدہ ہارون کے چچا کی بیٹی تھی۔ اسے ہارون کی پہلی بیوی ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ ہارون کی چھ بیویاں اور بیس کنیزیں تھیں۔ ان سے ہارون کے بارہ بیٹے اور چودہ بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹوں میں چار زیادہ مشہور ہوئے یعنی امین' مامون' موتمن اور معتصم۔

192 ہجری شعبان کی وہ آخری تاریخیں تھیں۔ جب خلیفہ ہارون الرشید نے بغداد سے کوچ کیا' خاص خدمت گاروں کی حیثیت سے عارج اور میں بھی اس کے ساتھ تھے۔

دارالخلافہ بغداد سے خلیفہ ہارون بقصد خراسان روانہ ہو کر ماہ صفر 193 ہجری میں جرجان پہنچا۔ اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ آب و ہوا کی تبدیلی صحت پر بہتر اثرات مرتب کرے گی اس کے برعکس تکلیف دہ سفر کے سبب اس کی علالت کا سلسلہ طول کھینچ گیا۔ اسی وجہ سے اسے جرجان میں رکنا پڑا۔ اس نے خود رک کر مامون کو خراسان کے دارالحکومت مرو روانہ

کر دیا۔ پھر وہ خود بھی جرجان میں نہ رکا اور وہاں سے طوس جا پہنچا۔ اس مرتبہ بھی ہارون نے سفر کے معاملے میں طبیب خاص کے مشورے کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روز بروز اس کی علالت زور پکڑتی گئی اور وہ نقل و حرکت سے بھی مجبور ہو گیا۔ جب ضرورت ہوتی تو عارج اور میں ہارون کو سہارا دے کر بستر سے اٹھاتے' واقعی وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔

ہارون کی نقل و حرکت محدود ہو گئی تو افواہ سازوں نے اس کے مرنے کی افواہ پھیلا دی۔ ہارون کو اس کا بڑا رنج ہوا' وہ ایک روز مجھ سے کہنے لگا۔ ''تو نے کچھ سنا اے کلثوم کہ بدخواہوں نے تیرے امیرالمومنین کو جیتے جی اپنی دانست میں مار ڈالا ہے مگر ہم اپنے عمل سے انہیں جھوٹا ثابت کر دیں گے۔''

''یقیناً اے امیرالمومنین!'' میں نے اسے دلاسا دیا۔ وہ شخص' وہ آدم زاد جو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا مطلق العنان حکمران تھا اور جس کا ہر حکم قانون کا درجہ رکھتا تھا مجھے اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ آدمی خواہ ساری دنیا فتح کر لے ہر شے پر قابو پا لے مگر موت کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ ہارون بھی مجھے کچھ ایسی ہی بے بسی کا شکار معلوم ہونے لگا تھا۔

گزشتہ روز شام کو ہارون نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا' میں بولی نہیں تھی مگر یہ خبر نہ تھی کہ وہ اپنے کس عمل سے افواہ سازوں کو جھوٹا ثابت کرے گا؟ دوسرے دن دوپہر کو مجھے اس سوال کا جواب مل گیا۔

ہارون نے مجھے اور عارج کو طلب کر لیا تھا۔ اس وقت تک مجھے ہارون کے ارادے کا پتہ نہ تھا۔

''ہمیں سہارا دے کر اٹھاؤ اور محل کے بیرونی دروازے تک لے چلو۔'' ہارون نے ہمیں حکم دیا۔ بیماری کے باوجود اس کے چہرے پر عجیب جوش کا اظہار ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں اس کی وجہ نہ آ سکی۔

''بہتر ہے اے امیرالمومنین!'' میں یہ کہتے ہوئے ایک طرف سے جھکی۔

دوسری جانب سے عارج تھا' وہ بھی ہارون کو سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

''ہاں شاباش کلثوم!'' ہارون نے میری حوصلہ افزائی کی اور کہنی پر زور دیا۔

میرے ہاتھوں میں سے ایک ہارون کی گردن میں اور دوسرا ہاتھ پشت پر تھا۔ ہارون کی جگہ مجھے یوں لگا کہ میں ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کو اٹھا رہی ہوں۔ میری اور عارج کی

کوشش سے ہارون بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

اسی وقت وزیر سلطنت فضل بن ربیع آ گیا اور تسلیمات بجا لایا۔

ہارون نے ربیع کو مخاطب کیا۔ ''تو نے ہمارے حکم کی تعمیل کرا دی؟''

''جی امیر المومنین! کل شب ہی منادی کرا دی گئی تھی کہ خلیفۃ المسلمین آج طوس کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کریں گے۔ اس ضمن میں تمام ضروری انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔'' وزیر سلطنت فضل بن ربیع نے جواب دیا۔

فضل کا جواب سن کر میں حیران رہ گئی۔ میرے خیال میں ہارون کی حالت ہرگز اس قابل نہ تھی کہ وہ طوس کے قلعے سے نکل کر شہر کی جامع مسجد تک جا سکتا اور وہاں نماز جمعہ پڑھ سکتا۔ اگر اعلان کے باوجود ہارون نماز پڑھنے کیلئے نہ جا پاتا تو بدخواہوں کو ایک اور موقع مل جاتا۔ میرا ذہن اس وقت بہت تیزی سے کام کر رہا تھا کہ اس مسئلے کا کیا حل ہو؟

''ہمیں اٹھا کے کھڑا کرو!'' ہارون نے مجھے اور عارج کو حکم دیا۔

ہم ہارون کو بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھانے لگے۔

اسی لمحے فضل نے ہمیں بتایا۔ ''میں نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ امیر المومنین کو زیادہ نہ چلنا پڑے۔ اس خواب گاہ سے نکل کر بس چھوٹی سی ایک راہداری عبور کرنی ہے۔ راہداری کے اختتام پر امیر المومنین کیلئے سواری موجود ہے اور محافظ دستہ بھی تعینات ہے۔''

تمام تیاریاں اپنی جگہ مگر ہارون کے جسم کی نقاہت و کمزوری دور کرنا کسی کے بس میں نہ تھا۔

ہارون کو ہم نے سہارا دے کے کھڑا کر دیا وہ آہستہ قدمی سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

یہی وہ لمحہ تھا جب اس مسئلے کا ایک حل میری سمجھ میں آ گیا۔ عارج کو اس حل سے آگاہ کرنا ضروری تھا کیونکہ اسی کو اس سلسلے میں بنیادی کردار ادا کرنا تھا اس کیلئے میں نے اشاروں کی زبان استعمال کی۔

''اے عارج! تجھے ہارون کے بیمار جسم میں اترنا ہے۔'' میں نے اشاروں کی زبانی میں عارج کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

''مگر مجھے ہارون کے جسم میں قرار نہ آیا تو!'' عارج نے سوال کیا۔

''تو اللہ مالک ہے' کچھ اور سوچیں گے۔ تجھ سے میں نے جو کہا ہے اس پر عمل کر۔'' میں نے جواب دیا۔

ہارون اپنے جسم کا سارا بوجھ عارج اور مجھ پر ڈالے ہوئے تھا۔ خدا خدا کر کے ہم اسے خواب گاہ سے باہر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ باہر راہداری میں آ کر وہ کہنے لگا۔ ''ذرا..... ذرا رک جاؤ کہ...... ہم اپنا سانس درست کر لیں۔''

''جی بہتر ہے اے امیر المومنین!'' اس مرتبہ عارج بولا۔

اب ہمیں چھوٹی سی راہداری عبور کرنی تھی' کچھ دیر رک کر ہم اسے طے کرنے لگے۔

''دیر نہ کر اب اے عارج!'' میں نے اشاروں کی زبان میں عارج کو تاکید کی۔ ''اتر جا ہارون کے جسم میں۔''

عارج میرا اشارہ سمجھتے ہی اسحاق کے قالب سے نکل کر بلاتاخیر ہارون کے جسم میں گھس گیا۔ میں نے اسی لمحے ہارون کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگتے محسوس کیا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ عارج ہارون کے جسم میں داخل ہو گا تو کیا صورت پیش آئے گی۔ میں بہرحال تشویش میں مبتلا تھی اور میری یہ تشویش غلط ثابت نہ ہوئی۔

ہارون کے بیمار جسم میں عارج کو قرار نہ آ سکا اور وہ گھبرا کر باہر نکل آیا۔

کسی آدم زاد کے جسم میں داخل ہونے اور باہر نکلنے سے جنات پر تو خیر کوئی اثر نہیں ہوتا مگر کمزور یا بیمار آدم زاد کے جسم اسے برداشت نہیں کر پاتے۔ ہارون بھی کمزور اور بیمار تھا سو برداشت نہ کر سکا اس پر بیہوشی طاری ہو گئی اور وہ ہمارے بازوؤں پر جھول گیا' فوری طور پر دیگر خادموں کو بلایا گیا اور ہارون کو اٹھا کر دوبارہ خواب گاہ میں لے آیا گیا۔

طبیب خاص جبرئیل کو اطلاع کی گئی تو وہ دوڑا دوڑا چلا آیا۔ اس نے ہارون کا معائنہ کیا اور اس کی نقل و حرکت پر پابندی لگا دی۔ پھر وہ کچھ ادویات دے گیا جو مقررہ وقت پر ہارون کو کھلائی اور پلائی تھیں۔

اس واقعے کو دو روز ہی گزرے تھے کہ ہارون کی دل بستگی اور خوشی کا سامان طوس پہنچ گیا۔

ہرثمہ بن اعین اور رافع کے درمیان سمرقند میں جب لڑائی ہوئی تھی تو اس میں بشیر بھی شامل تھا۔ رافع تو جان بچا کر خراسان پہنچ گیا تھا مگر اس کے بھائی بشیر کی کوئی خبر نہ لگی تھی کہ وہ کہاں گیا۔ رافع ہی کی طرح بشیر پر بھی خلیفہ ہارون کے بہت احسانات تھے مگر بھائی کی محبت میں وہ محسن کشی پر آمادہ ہو گیا تھا۔

بشیر کو ہرثمہ کے سپاہیوں نے سمرقند میں ہی ایک نواحی بستی سے گرفتار کیا تھا جہاں وہ بھیس بدل کر رہ رہا تھا۔ داڑھی اس نے منڈا دی تھی وہ اپنے رشتے داروں کی مخبری پر پکڑا گیا

تھا۔

خلیفہ کی نظر میں اپنا درجہ بلند کرنے کی خاطر ہی ہرثمہ نے بشیر کو پابہ زنجیر طوس پہنچا تھا۔

بشیر کے پکڑے جانے اور طوس آنے کی اطلاع پا کر ہارون کا چہرہ جیسے کھل اٹھا یہ گویا ایک اور ہی چہرہ تھا۔ ایک منتقم آدم زاد کا کا چہرہ' ہارون نے بشیر کو اپنے روبرو پیش کرنے کا حکم دیا۔

پھر ہارون ہی کے حکم پر میرے دیکھتے دیکھتے وہ خواب گاہ ایک مقتل میں تبدیل کی جانے لگی۔

''اے اسحاق!'' ہارون نے بلند آواز میں عارج کو مخاطب کیا۔'' نطع (جس پر آدمی کو قتل کیا جاتا ہے) یہاں بچھا۔'' اس نے اپنے بستر کے قریب اشارہ دیا۔ عارج نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ فضل بن ربیع بھی وہیں تھا۔ ہارون اس سے کہنے لگا۔ ''تو دیکھے گا اے ربیع! آج تک کسی کو اس طرح سے قتل نہ کیا گیا ہوگا جس طرح باغی و محسن کش بشیر کو ہمارے حکم پر مارا جائے گا۔ محض دعویٰ نہیں ابھی تو اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لے گا۔''

اسی لمحے زنجیر کھڑکنے کی آواز سنائی دی۔ خواب گاہ کے دروازے سے ہاتھوں میں برہنہ شمشیریں لئے محافظ اندر داخل ہوئے بشیر انہی کے نرغے میں تھا۔

ان محافظوں کو آتے دیکھ کر میں ایک طرف ہوگئی۔ عارج میرے قریب ہی تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید کی تمام تر توجہ بشیر پر مرکوز تھی۔ پھر جب اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی اور وہ بولا تو یوں لگا جیسے اسے کوئی بیماری لاحق نہ ہو۔ اس نے بشیر کو مخاطب کیا۔ ''اے بشیر! اے احسان فراموش! اے سگ آوارہ! سن کہ تو نے خود ہمارے غضب کو دعوت دی ہے۔'' ہارون سانس لینے کو رکا۔

بشیر یقیناً سمجھ چکا تھا کہ اس کی موت قریب ہے' ہارون اسے زندہ نہ چھوڑے گا۔ غالباً اس نے ہارون سے رحم کی درخواست کرنی چاہی تھی۔ میں نے اسے منہ کھولتے دیکھا تھا۔ یا تو یہ ہوا کہ خوف مرگ سے اس کا گلا خشک ہوگیا اور آواز نہ نکل سکی یا پھر ہارون کی آواز نے اس کی ہمت پست کر دی بہرصورت وہ کچھ بول نہ سکا۔

ہارون کی صدا کسی تازیانے کی طرح بلند ہوئی۔ ''یقین کر' اگر میری موت کے آنے میں اس قدر بھی وقفہ ہوتا کہ میں اپنے لبوں کو حرکت دے سکوں تو یہی حکم دیتا تجھے مار ڈالا جائے۔''

اس کے بعد ہارون نے کسی جلاد کے بجائے قصاب کو طلب کیا تو میں چونک اٹھی۔

تعمیل حکم میں قصاب کو ہارون کے روبرو پیش کیا گیا۔

''اس کا عضو عضو کاٹ کر علیحدہ کر دے۔'' ہارون نے قصاب کو حکم دیا۔

قصاب بطور تعظیم ہارون کے سامنے جھکا' وہ بھی ڈرا ڈرا سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ہارون یا وہاں موجود فضل بن ربیع سے تو کچھ نہ کہا البتہ اسے میں نے ایک محافظ سے سرگوشی کرتے سنا۔ وہ بشیر کی زنجیریں کھولنے کیلئے کہہ رہا تھا۔ اس وقت مجھے وہ آدم زاد بشیر قربانی کی غرض سے لایا جانے والا کوئی جانور محسوس ہوا۔ اس کی زنجیریں کھول دی گئیں۔ کسی آدم زاد اور ایک جانور میں اتنا ہی تو فرق ہے کہ ان میں سے ایک بے زبان ہوتا ہے۔ سو بشیر کی زبان کھل ہی گئی' مگر لا حاصل تب تک اس کے گلے پر چھری پھیرنے کیلئے اسے پچھاڑا جا چکا تھا۔

''نہیں!'' ہارون کی تیز آواز خواب گاہ میں گونج اٹھی۔

اس آواز کے ساتھ ہی قصاب اور وہ محافظ جو بشیر کو پکڑے ہوئے تھے ایک دم ساکت ہو گئے۔ قصاب کے ہاتھ میں جو چھری تھی' بشیر سے اس کی گردن کا فاصلہ خاصا کم رہ گیا تھا۔ اگر ہارون اسے روک نہ دیتا تو بشیر کی گردن کٹ چکی ہوتی۔

''یہ آدمی ہے' اسے جانور کی طرح نہ مارو۔'' ہارون نے اپنے حکم کی وضاحت میں مزید کہا۔ ''ہم نے اس کا عضو عضو کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ گردن ہی تو عضو نہیں ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء بھی تو ہیں۔''

با اختیار آدم زاد بے اختیار یا مجبور آدم زادوں کے ساتھ یہی کھیل کھیلتے آئے ہیں۔ میری آنکھوں نے دہشت و بربریت کے جو مناظر اب تک دیکھے تھے' ان میں ایک اور ہولناک منظر کا اضافہ ہوگیا۔ بشیر زندہ رہا اور قصاب اس کے جسم سے گوشت کے پارچے اتارتا رہا۔ اسی حالت میں اس نے دم توڑ دیا' مگر اس سے پہلے قصاب نے ہارون کے اشارے پر بشیر کی گردن کاٹ کر ایک طرف رکھ دی تھی۔

اس واقعے کے بعد حیرت انگیز طور پر ہارون کی طبیعت کچھ سنبھل سی گئی۔ وہ خود زور لگا کر اٹھنے بیٹھنے لگا۔ عارج کو اور مجھے پھر بھی اس کے ساتھ رہنا پڑتا تھا کہ کہیں وہ گر نہ پڑے۔ طبیب خاص جبرئیل کی طرف سے ملاقاتوں پر پابندی کو مسترد کر دیا تھا۔

''تو بھلا کون ہے ہم پر پابندی لگانے والا۔'' ہارون کے یہ الفاظ سن کر جبرئیل سہم سا گیا تھا۔ اس نے بلا تاخیر معافی مانگ لی تھی۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ رات کے وقت عارج اور میں اپنے اپنے انسانی قالبوں سے نکل آئے۔ ہمارے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات

نہیں تھی۔ اکثر ہم سیر سپاٹے کیلئے شہر طوس کے گلی کوچوں یا صحرا کی طرف ہو لیتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم لشکر گاہ کا چکر لگا آتے جو محل سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس رات بھی ہم لشکر گاہ کے گرد گھوم رہے تھے کہ ایک آدم زاد کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ایک خیمے سے نکلتے دیکھا۔

''اے عارج! کیا تجھے یہ آدم زاد کچھ چور چور سا نہیں لگتا؟'' میں بولی۔ ''لگتا تو ہے' لیکن چھوڑ ہمیں کیا۔'' عارج کی آواز میں لاتعلقی کا عنصر تھا۔

''ٹھہر جا' نا! تجھے تو روز صحرا میں سگذے بھرنے کی لگی رہتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میری نظریں اوسط قد والے اس آدم زاد پر لگی ہوئی تھیں۔

اس کا رخ اب قریب ہی موجود ایک اور خیمے کی طرف تھا۔ رات کے وقت اس کی یہ سرگرمی مجھے شک میں ڈالنے کیلئے کافی تھی۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے' میں نے سوچا اور عارج کو ساتھ لئے اس آدم زاد کی طرف بڑھی۔ تب تک وہ خیمے کے در پر پڑا ہوا پردہ اٹھا کر اندر جا چکا تھا۔

''میرا نام بکر بن المعتمر ہے اور میں بغداد سے آیا ہوں' اپنے آقا کو جا کر بتا دو۔'' اس آدم زاد کی دھیمی آواز مجھے سنائی دی۔

''آقا تو سو..... سو چکے ہیں'' دوسری گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ ''مگر آ..... آپ بغ..... بغداد سے تشریف لائے ہیں اس لئے.....''

میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوا کہ اس کے خیمے میں فوج کا کوئی بڑا سردار قیام پذیر ہے۔ یوں بھی لشکر گاہ کا یہ حصہ فوج کے سرداروں کیلئے مخصوص تھا۔ یہ بڑے بڑے خیمے کئی حصوں میں تقسیم ہوتے تھے۔ اس کا پہلا حصہ غلاموں اور خادموں کے علاوہ ذاتی یا نجی محافظوں کی سکونت کی خاطر مخصوص ہوتا تھا۔ خلیفہ اور اس کے اہل خاندان عموماً علاقے میں واقع کسی محل کے اندر رہتے تھے۔ وزیر سلطنت کو بھی فوج ہی کے ساتھ ٹھہرنا پڑتا تھا۔ یہی صورت طوس میں تھی۔ خلیفہ ہارون الرشید اور اس کا ایک بیٹا صالح محل میں قیام پذیر تھے۔ وزیر سلطنت فضل بن ربیع لشکر گاہ میں تھا۔ خیموں کی اس عارضی بستی میں جو دور تک پھیلی ہوئی تھی' وہاں وزیر سلطنت فضل کا قیام کہاں تھا' میں اس سے بے خبر تھی۔ میں نے اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ خیمہ جہاں بکر بن المعتمر گیا تھا فضل ہی کا خیمہ تھا۔ فضل کی آواز بھی میں نے پہچان لی۔

میں بے دھڑک فضل کے خیمے میں داخل ہو گئی تھی۔ عارج میرے پیچھے آ رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ ہم جنات کے نادیدہ وجود کسی آدم زاد کو کس طرح نظر آ سکتے تھے۔ اسی سبب ہمارے واسطے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ناوقت خادم کے جگانے پر فضل نے خفگی کا اظہار کیا تھا تو میں نے اس کی آواز سنی تھی۔

''کیا ہے؟..... کون آیا ہے اس وقت؟'' فضل کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔ جب خادم نے بغداد کا نام لیا تو فضل کی خمار آلود آواز غائب ہو گئی اور وہ بولا۔ ''آنے والے کو بٹھا' میں آتا ہوں۔''

☆.....☆.....☆

خادم الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ میں نے فضل کے دماغ کو ٹٹولا تو بس اتنا ہی جان سکی کہ بغداد سے آنے والا بکر اس کیلئے اجنبی نہیں۔ ہارون کے بیٹے محمد امین کا وہ قاصد تھا۔ ممکن ہے کہ مجھے کچھ اور کام کی باتیں معلوم ہو جاتیں مگر اسی لمحے عارج بولا۔ "اے دینار! کیا تو آج ساری رات یہیں گنوا دے گی؟۔۔۔ چلنا نہیں؟"

"کچھ دیر رک جا' ابھی چلتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ عارج چپ ہو رہا۔ ہماری آوازیں بھی آدم زادوں کیلئے اس وقت تک سن لینا ممکن نہیں جب تک کہ ہم خود ہی یہ نہ چاہیں۔ سو فضل وہاں اپنی موجودگی کے باوجود کچھ نہ سن سکا اور ہم دونوں اطمینان سے اس کی نقل و حرکت دیکھتے رہے۔

لباس تبدیل کر کے فضل خیمے کے بیرونی حصے میں پہنچا تو بکر نے اٹھ کر اسے تعظیم دی' پھر ایک سربند پیغام پیش کیا۔

"تو کوئی زبانی پیغام بھی لایا ہے؟" فضل نے بکر سے پوچھا۔

بکر نے جواب دیا۔ "ہر محکمے کے اعلیٰ افسران کو ان کے عہدوں پر حسب سابق برقرار رکھا جائے گا۔"

"اور کس کس کیلئے بغداد سے پیغام لایا ہے اے بکر!" فضل کے لہجے میں معنی خیزی کے ساتھ نرمی بھی آ گئی۔

"گستاخی کی معافی چاہتا ہوں اے حضور محترم! خادم کو اس بارے میں زبان کھولنے سے منع کیا گیا ہے۔" بکر نے بلا جھجک کہہ دیا۔

اس پر فضل کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ قاصد کا یوں رازداری برتنا اسے ناگوار ہوا تھا۔ اس نے محض اتنا کہا۔ "تیری فرض شناسی پر خوشی ہوئی لیکن۔۔۔ خیر تو جا' مجھے اب کچھ معلوم نہیں کرنا۔"

شہزادہ محمد امین کا قاصد خاص ایک مرتبہ پھر معافی مانگ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اب خیمے کے اس حصے میں فضل تنہا تھا' یعنی وہاں کوئی اور آدم زاد نہیں تھا۔ بکر کے جاتے ہی اس نے سربند پیغام کھولا اور شمع دان کے قریب جا کر اسے پڑھنے لگا۔ وہ اس بات سے ناواقف تھا کہ ایک جن زادی بھی وہ خفیہ پیغام پڑھ رہی ہے۔ عارج کو وقت ضائع ہونے پر ملال تھا' سو خفیہ پیغام پڑھنے میں اس نے دلچسپی نہیں لی۔ وہ تو دور کھڑا بس اس انتظار میں تھا کہ میں کب اس "فضول" کام سے فرصت پاتی ہوں۔ رات کے وقت ہارون کی خدمت گزاری پر دوسرے خدام و غلام مامور ہوتے تھے' یوں ہمیں گھومنے پھرنے کی مہلت مل جاتی تھی۔ ولی عہد و شہزادہ امین کا پیغام فضل کے نام پڑھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ مجھے اس سے یہ توقع نہیں تھی۔ اقتدار و حکومت حاصل کرنے کی خاطر آدم زاد واقعی بڑے خود غرض ہو جاتے ہیں۔

دور کھڑے عارج کے پاس پہنچ کر میں نے اسے مخاطب کیا۔ "چل اب۔"

"کہاں؟"

"کہیں بھی۔" میں نے کہا۔ "وہاں چل کہ جہاں ہمارے سوا کوئی نہ ہو۔"

"اور اگر وہ تیرا عاشق صادق عفریت دہموش کہیں مل گیا تو؟"

"دیکھ اے عارج! میں ڈرنے والی نہیں ہوں۔ تو یہ نہ بھولا کر کہ عالم سوما نے ہماری حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اب تک وہ کئی بار تجھے اور مجھے بچا چکا ہے۔ جانتے بوجھتے تو اس عفریت کا نام لے کر مجھے چھیڑتا ہے' میں خوب جانتی ہوں۔"

عارج ہنس دیا اور پھر کہنے لگا۔ "اے دینار! تو نے ہی تو مجھے مختلف جہانوں اور زمانوں کی سیر کرا کر اس قدر بے باک بنا دیا ہے ورنہ میں تیرا بڑا ہی فرمانبردار شوہر۔۔۔ اِنہیں۔۔۔ برہم نہ ہو!۔۔۔ میری مراد ہونے والے شوہر سے ہے۔"

"یہ وقت شوخی کا نہیں' چل کر کہیں بیٹھتے ہیں۔ یاد رکھ کہ ہم دونوں کے گرد حفاظتی حصار۔۔۔ نادیدہ حفاظتی حصار بھی قائم ہے جس کی موجودگی میں وہ شیطان کہ تو جسے میرا عاشق صادق کہہ رہا تھا' ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یوں بھی وہ ان دنوں مصر میں ہے۔ مجھے تجھ سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے۔" میں سنجیدگی سے بولی۔

"میں سمجھ گیا اے دینار! اکیلے میں تو مجھ سے کیا بات کرے گی۔"

"بڑا ہی قابل ہے تو' معلوم ہے مجھے۔۔۔ صرف باتیں حماقت آمیز کرتا ہے۔" میں نے چٹکی لی۔

"اب اگر تو میری قابلیت پر شک کرنے لگی تو ہو گیا میرا کام تمام۔"

"فکر کیوں کرتا ہے' اگر تو اسی طرح حالات سے غافل رہا تو نہ صرف تیرا بلکہ کسی روز

میرا بھی کام تمام ہو جائے گا۔"

"یعنی خلیفہ ہارون اس جہان فانی سے جاتے جاتے بھی قصاب کو بلوا کر ہمارے انسانی قالبوں کو......"

"زیادہ نہ بن اے عارج!"

"تو کم بن لیتا ہوں' تو بس حکم دے دیا کر مجھے!... انشاء اللہ مجھے ہمیشہ اپنا تابع فرمان پائے گی۔"

یہی نوک جھونک کرتے ہوئے ہم دونوں لشکر گاہ سے دور نکل آئے تھے۔ پھر ہمیں ایک نخلستان تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی جو شہر طوس کے قریب نہیں' خاصی دور تھا۔ عارج ایک درخت پر چڑھ گیا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔

"ہاں اے دینار! اب کہہ تو کیا بات کرنے والی تھی اور..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "بھکنے کی ضرورت نہیں ...یہ......"

"کس معاملے میں بھکنے کی ضرورت نہیں' یہ تو بتا دے اے دینار!" عارج بول اٹھا۔

"کچھ دیر خاموش رہ کر میری بات سن' ہر وقت فقرے بازی ٹھیک نہیں ہوتی۔"

"تو پھر کیا ٹھیک..."

"پھر بولا تو۔"

"اچھا اب نہیں بولوں گا' پکا وعدہ!"

"بولنے کو نہیں' میں بے سرا بولنے کو منع کر رہی ہوں' میں نے کہا اور اسے اسی کی کہی ہوئی ایک بات یاد دلائی۔"

"تو میں کیوں بھلا دوں کہ عرب ہوں اور مامون آدھا عرب ہے؟" عارج بحث کرنے لگا۔ "تجھے آخر اس آدم سے کس لئے اتنا انس ہے؟"

"انس ونس کچھ نہیں ہے' مجھے اس آدم زاد مامون سے۔" میں نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔ "عصبیت کا مطلب بھی معلوم ہے تجھے؟"

"ہاں معلوم ہے مجھے!... تو یہی تو کہے گا کہ اس کا مطلب استواری' رگ دے کی شراکت اور رشتے داری ہے یعنی اسے قرابت' اپنا پن اور شناخت یا اپنی پہچان بھی کہا جا سکتا ہے' لیکن یہ پہچان بھلائی کی طرف ہونی چاہیے برائی کیلئے نہیں تو مجھے پڑھانے کی کوشش نہ کیا کر' اب سن وہ بات کہ جو مجھے تجھ سے کہنی...... میرے نزدیک خلیفہ ہارون الرشید کے بعد امین کے مقابلے میں مامون خلافت یا یوں کہہ لے کہ اقتدار کیلئے زیادہ اہل ہے' تخت خلافت پر

مامون کو بیٹھنا چاہیے امین کو نہیں۔"

"اے دینار! کیا تو مجھے اپنی رائے سے اختلاف کا حق دے گی؟"

"بول" میں نے کہا۔

"تو اسے میرے تعصب کا نام دے یا کچھ اور میری رائے امین کے حق میں ہے۔" عارج کہنے لگا۔

کچھ دیر کو میں خاموش رہی اور حالات پر غور کرنے لگی۔ ہارون الرشید نے رفع شر کی خاطر پوری سلطنت کو ایک طرح سے تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا تاکہ بھائیوں کے درمیان جھگڑا نہ ہو۔ ان تینوں حصوں کا مرکز بغداد ہی تھا۔ تینوں علاقے اپنی اپنی جگہ خودمختار ہونے کے باوجود مرکز کے پابند تھے۔ مامون' امین اور موتمن ان تینوں بھائیوں میں سلطنت بانٹی گئی تھی۔ ہارون نے ان تینوں ہی کو یکے بعد دیگرے اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا حالانکہ اس کے اور بیٹے بھی تھے مثلاً شہزادہ معتصم' شہزادہ صالح' شہزادہ سلیمان وغیرہ' بوجوہ ولی عہد میں امین کو ترجیح مل گئی تھی یعنی مرکز میں وہ ہوتا' خلیفہ وقت وہ کہلاتا حالانکہ عمر میں بھی وہ مامون سے ایک سال چھوٹا تھا۔ اپنی زندگی میں ہارون نے امین کو عراق' شام اور عرب کی حکومت دی تھی' مامون کو خراسان اور ہمدان کے صوبے دیئے تھے۔ ان علاقوں کا دارالحکومت مرو موتمن کو جس کا اصل نام قاسم تھا' ہارون نے جزیرہ سے لے کر بازنطینی سرحدوں تک کے علاقے کا حکمران بنایا تھا۔ ہارون ہی نے موتمن کے بارے میں امین کو یہ اختیار دیا تھا کہ نالائق ثابت ہونے کی صورت میں امین اسے ولی عہدی سے خارج کر سکتا ہے۔ ہارون کی حدود سلطنت کے متعلق پہلے بھی میں بتا چکی ہوں' اپنی عمر کی آخری منزل تک آتے آتے اس کی سلطنت کا دائرہ مزید وسیع ہو چکا تھا' اب اس کی سلطنت عراق سے لے کر شام' افریقہ' ایشیائے کوچک (وسط ایشیائی ممالک)' روم' ترک' تاتار اور سندھ (ہندوستان) تک پھیلی ہوئی تھی۔

ایک جبر آدم زادوں کا ہوتا ہے اور ایک تاریخ کا جبر' میں سمجھتی ہوں کہ پہلے جبر سے تو نجات ممکن ہے لیکن تاریخ کے جبر سے مفر نہیں۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہی ہوں' مامون مرو میں تھا اور امین بغداد میں' جب عوام تک یہ بات جان گئے تھے کہ ہارون کا چل چلاؤ ہے تو بھلا خاندان والوں سے یہ "راز" کیسے چھپا رہ سکتا تھا اور بہت سی باتوں کے علاوہ بغداد سے میری محبت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بابل کے کھنڈرات وہاں سے بہت قریب تھے' جس طرح آدم زاد اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں' ہم جنات میں بھی یہ چیز موجود ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ کہ وہ مسلمان آدم زادوں کی وسیع و عریض سلطنت تھی اور میں بھی

مسلمان تھی لیکن اس سلطنت کے حکمران کا ظاہر و باطن مجھ پر عیاں تھا' سو میرے بیان کو اگر کوئی داستان طرازی سمجھتا ہے تو سمجھا کرے' میں نے جو دیکھا اور محسوس کیا' جو میرے تجربے اور مشاہدے میں آیا اسی کو بیان کیا۔ کبھی میں نے کسی کو مجبور نہیں کیا کہ وہ میری بات مان ہی لے' تفنن طبع کی تو خیر اور بات ہے عارج کو بھی عام طور پر میں اپنی مرضی کا پابند نہیں کرتی تھی۔ وہ امین کا طرفدار تھا اور میری رائے مامون کے حق میں تھی۔

میں گزشتہ برسوں میں ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں میں رہی تھی۔ عارج کی طرح مجھے بھی بغداد یاد آتا تھا' بس یہ کہ منہ سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ ایک تو یہ وجہ' دوسرا سبب یہ کہ مامون اس وقت بغداد کے بجائے مرو میں تھا' سوئم عارج کا بھی مجھے خیال تھا' اسی بنا پر میں نے فی الحال بغداد ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا' احسان البتہ عارج پہ دھر دیا۔

"چل یہی سہی اے دینار! تو نے میری کوئی بات مانی تو۔" عارج بولا۔

اس کی آواز میں شوخی میں نے محسوس کر لی اور کہا۔ "حد میں رہا کرو ورنہ کسی دن......"

"خود بھی جل جائے گی اور مجھے بھی جلا ڈالے گی۔" عارج بول اٹھا۔

برجستہ گوئی پر مجھے ہنسی آ گئی' وہ بھی ہنس دیا۔ وزیر سلطنت فضل بن ربیع کے نام امین کا قاصد بکر کیا پیغام لے کر آیا تھا نہ عارج نے پوچھا نہ میں نے بتایا۔ اس کے باوجود آدم زادوں کی خودغرضی اور اقتدار کی ہوس پر مجھے غصہ ضرور تھا۔ جاہ و حشم اور دولت و اقتدار کی خاطر آدم زادہ کچھ نہیں دیکھتے یا پھر جان کر انجان بن جاتے ہیں کبھی باپ' بیٹوں کو مروا ڈالتا ہے تو کبھی بیٹے باپ کو ہلاک کرا دیتے ہیں' انہیں ہم جنات کے مقابلے میں ذرا سی عمر ملتی ہے۔ مختصر عرصے میں بھی یہ ایک سے ایک نیا طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہارون تھا۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا مگر دنیا کے معاملات نمٹانے میں لگا ہوا تھا۔ رافع کے بھائی بشیر کے بے رحمانہ قتل کو میں بھولی نہیں تھی۔ بظاہر یہ امر عجیب سا لگتا ہے لیکن یہی ہے کہ اس واقعے کے بعد ہارون کی طبیعت سنبھل سی گئی تھی۔

ہر چند کہ میں نے بغداد میں قیام کا فیصلہ کر لیا تھا پھر بھی امین کی کم ظرفی مجھے گوارا نہ ہوئی۔ دوسرے دن ہارون کو اپنے اثر میں لے کر میں نے اسے بکر کی آمد سے آگاہ کر دیا۔

"بکر..... کون بکر!" ہارون بڑبڑانے لگا۔ "مجھے یاد کیوں نہیں آ رہا کہ یہ کون ہے۔"

"شہزادہ امین کا خاص قاصد بکر المعتمر!" میں نے ہارون کے دماغ میں سرگوشی کی۔

"مگر مجھے..... مجھے بکر کے آنے کی خبر کیسے ہوئی؟"

"اپنے ایک جاسوس کے ذریعے۔"

"ہاں..... ایسا ہی ہو گا' میں بھول گیا ہوں شاید۔" ہارون کی بڑبڑاہٹ اب بھی جاری تھی۔

ہارون سے بظاہر میں دور تھی لیکن اس کے الفاظ واضح طور پر سن رہی تھی۔ اپنی سماعت کا دائرہ میں نے کچھ وسیع کر لیا تھا۔

"کلثوم!" معاً مجھے ہارون نے میرے انسانی قالب کے نام سے پکارا۔

میں لپک کر اس کے قریب گئی۔ اس کی خواب گاہ میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔

"جی امیر المومنین!" میں مؤدب لہجے میں ہارون سے مخاطب ہوئی۔

"تیرا شوہر اسحاق کہاں ہے؟" ہارون نے مجھ سے پوچھا۔

"کچھ دیر پہلے ہی خود حضور ہی نے تو اسے لشکر گاہ کی طرف بھیجا ہے۔" میں نے عارج کے انسانی پیکر کی بابت بات بنا دی۔

"یہ ہمارے حافظے کو کیا ہوتا جا رہا ہے!....." ہارون میرا سہارا لئے بغیر خود ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ہمیں تو یاد نہیں کہ اسحاق کو ہم نے کہیں بھیجا ہے۔"

میں دراصل عارج کو سوتا چھوڑ کر ہارون کے پاس دانستہ چلی آئی تھی تاکہ اپنا مقصد پورا کر سکوں' اس کا ایک سبب اور بھی تھا صبح ہی صبح محل کے اس حصے کی طرف آتے ہوئے بکر کی جھلک نظر آ گئی تھی۔ وہ شہزادہ صالح کی خواب گاہ سے نکل کر محل سے باہر جا رہا تھا' ان حالات کا تقاضا یہی تھا کہ میں ہارون کو باخبر کر دوں' میں نے یہی کیا۔

"اچھا تو کسی اور خادم کو بلا!" ہارون دوبارہ مجھ سے بولا۔ میں نے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں کی۔

خادم آ گیا تو ہارون نے اس سے کہا۔ "لشکر گاہ میں جا اور فضل کو ساتھ لے آ!"

احتراماً خادم جھکا اور پھر الٹے قدموں خواب گاہ سے نکل گیا' اسی وقت عارج دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔

"ارے اسحاق! تجھے ہم نے کس لئے لشکر گاہ بھیجا تھا؟" ہارون نے عارج کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

عارج پہلے تو شپٹا گیا مگر وہ بھی آخر جن زاد تھا' تاڑ گیا کہ میں نے کوئی شرارت کی ہے' جواب میں بولا۔ "امیر المومنین نے اس غلام کو وزیر سلطنت فضل بن ربیع کو دیکھنے بھیجا تھا کہ وہ اپنے خیمے میں موجود ہیں یا نہیں۔"

"ہمیں یاد آ گیا۔" ہارون نے کہا۔

میں نے مسکرا کر عارج کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی وہی تدبیر کی تھی یعنی ہارون کو زیراثر لے لیا تھا جب حقیقتاً ایسا نہیں تھا تو پھر ہارون کو کیا یاد آتا۔ وہ بھی کیا کرتا' دو دو جن اس کی خواب گاہ میں تھے اور وہ ان کی وہاں موجودگی سے بے خبر تھا۔

فضل آیا تو ہارون نے اسے بھی آڑے ہاتھوں لیا' بولا۔ ''تو کچھ خبر بھی رکھتا ہے کہ تیرے آس پاس کیا ہو رہا ہے؟''

اس پر فضل چونک اٹھا' وہ بھی ایک ہی کائیاں تھا' جواب میں کہنے لگا۔ ''اے امیرالمومنین! کیوں نہیں' مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ محترم اور ولی عہد سلطنت کا قاصد خاص لشکرگاہ میں دیکھا گیا ہے۔''

''طویل کلام سے گریز کیا کر۔'' ہارون نے فضل کو ڈانٹ دیا' پھر بکر المعتمر کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔

غرض کہ بکر کو جب ہارون کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

''تو کس لئے بغداد سے یہاں طوس آیا ہے؟'' ہارون نے بارعب آواز میں بکر سے دریافت کیا۔

''اے امیرالمومنین! مجھے شہزادہ عالی ...... انہوں نے حضور کی مزاج پرسی کیلئے بھیجا تھا۔'' بکر نے رک رک کر جواب دیا۔

''اور تو ہماری خدمت میں حاضر ہونے کے بجائے لشکریوں سے ہماری خیریت پوچھتا پھر رہا تھا۔'' ہارون کے لہجے میں طنز تھا۔

بکر کے پسینے چھوٹ گئے' بڑی مشکل سے بول سکا۔ ''لشکر میں میرا ایک عزیز بھی ہے اے امیرالمومنین! غلام سے غلطی ہوگئی کہ......''

ہارون نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کوئی خط لایا ہے میرے نام؟......یا شہزادے نے زبانی مزاج پرسی کا تجھے حکم دیا ہے؟''

''زبا......زبانی اے امیرالمومنین!'' بکر جان کے خوف سے ہکلایا۔

''جھوٹا ہے یہ۔'' ہارون وہاں موجود فضل سے مخاطب ہوا۔

فضل اشارہ سمجھ گیا اور خواب گاہ کے دروازے پر متعین محافظ دستے کے سپاہیوں کو طلب کرلیا۔

''درے لگاؤ اسے!'' ہارون نے حکم دیا۔

سپاہیوں نے حکم پر عمل کیا۔ بکر ہوش کھو بیٹھا۔

''اسے فی الوقت زندان میں ڈلوا دو۔'' ہارون نے محافظوں سے کہا' وہ بکر کو وہاں سے اٹھا کر لے گئے۔

ہارون کے ''فی الوقت'' کہنے سے میں نے یہی مطلب نکالا کہ ابھی وہ اس قاصد کو مزید سزا دینی چاہتا ہوگا۔ تقدیر خود اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلنے والی ہے وہ اس سے بے خبر تھا۔ بہرطور اسے یہ احساس ہو ہی گیا کہ وقت کی لگامیں کھینچ رہی ہیں' یہ وہ زمانہ تھا جب ہارون کا زیادہ وقت مطالعے میں صرف ہوتا تھا۔ سفر میں وہ اپنا ذاتی کتب خانہ ساتھ رکھتا' جب وہ بغداد سے چلا تھا تو اٹھارہ صندوقوں میں اس کی کتابیں رکھی گئی تھیں۔ دنیا بھر کی کئی زبانوں سے عربی زبان میں کتابوں کے جو ترجمے کیے گئے تھے ان میں کتب یونان کی تعداد خاصی تھی۔ بغداد شہر کی بنیاد رکھنے والے خلیفہ منصور کے زمانے سے ترجموں کا کام باقاعدہ شروع ہوا تھا' ہارون نے اسی کام کو مزید عروج پر پہنچایا' مدینۃ الحکمت کے دارالترجمہ میں عیسائی' یہودی' ہندو' مسلمان وغیرہ سبھی شامل تھے۔ ہارون کی شخصیت کا یہ دوسرا رخ تھا۔ ''علم کے شہر'' میں اور کیا کیا کارنامے انجام دیئے گئے یہ بیان کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہارون کا دل مطالعے سے بھی اچاٹ ہونے لگا' اس کا عیسائی طبیب خاص جبرئیل اب پھر سے فکرمند دکھائی دیتا' اب تک اس راز سے میں ہی واقف تھی کہ امین نے اپنے چھوٹے بھائی صالح' فضل اور دیگر اہم افراد کے نام خطوط میں کیا لکھا تھا' ہارون کو اس کی خبر نہیں تھی۔

جمادی الاول **193** ہجری کے وہ آخری دن تھے کہ جب ایک صبح میں ہارون کے پاس پہنچی تو وہ سخت مضطرب تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کہنے لگا۔ ''اے کلثوم! جلد سرور کو بلوا۔''

عارج میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے اسے اشارہ کر دیا۔ عارج خواب گاہ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

سرور کا نام سن کر میں کھٹک گئی۔ یہ وہی تھا جس نے ہارون کے حکم پر جعفر برمکی کا سر قلم کیا تھا۔ یہی سرور محافظ دستے کا نگران تھا۔ میں سمجھی کہ آج کسی آدم زاد کی خیریت نہیں' مگر معاملہ مختلف نکلا۔

''غلام حاضر ہے اے امیرالمومنین!'' سرور آ کر بولا۔

''تو نے شہر طوس اچھی طرح گھوم پھر کے دیکھا ہے؟'' ہارون نے دھیمی آواز میں سرور سے معلوم کیا۔

''جی ہاں اے امیر المومنین! حکم فرمائیے' یہ غلام کیا خدمت بجالائے؟''

''یہاں کوئی ایسی جگہ دیکھ جہاں باغ ہو..... اور اس باغ میں اتنی گنجائش ہو کہ ایک قبر کھودی جا سکے۔'' ہارون نے رک رک کر کہا۔ اس کے لہجے سے اداسی جھلک رہی تھی۔ ''ہمیں آج ہی آ کر جلد جواب دے' اب جا!''

اقرار میں سر ہلا کر سرور بطور تعظیم ہارون کے سامنے جھکا اور چلا گیا۔

اسی روز شام کو سرور پھر حاضر ہوا اور ہارون کو مطلوبہ باغ کے بارے میں آ کر بتایا۔ وہ باغ شہر کی آبادی کے باہر تھا۔ اگلے ہی دن صبح ایک مرتبہ مزید سرور کی طلبی ہوئی۔ وزیر سلطنت فضل بھی موجود تھا۔ ہارون نے فضل اور سرور دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پست آواز میں کہا۔ ''سنو تم دونوں' ہم نے وہ قبر اپنے لئے کھدوائی ہے وہاں قرآن پڑھواؤ' ہم اپنی قبر دیکھنے جائیں گے۔''

''لیکن اے امیر المومنین! ابھی قبر نہیں کھودی گئی۔'' سرور ہمت کر کے بولا۔

''تو کھدوا قبر۔'' ہارون نے سرور سے کہا' پھر فضل سے مخاطب ہوا۔ ''آج ہی دوپہر تک' ہم اونٹ پر بیٹھ کر وہاں جانا چاہتے ہیں۔''

فضل اور سرور دونوں چلے گئے تو میں سوچنے لگی۔ کیا یہ آدم زاد ہارون اپنی آنکھوں سے اپنی قبر دیکھ سکے گا؟ مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا تھا۔ جب اس نے شہر طوس کی جامع مسجد میں نماز کی ادائیگی کا اعلان کرایا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار نہ ہو پایا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا' میرا سوچنا غلط ہے۔ عارج اس کے جسم میں میرے ایما پر داخل ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے ہارون پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ عارج کو ہارون کے قالب میں قرار نہیں آیا تھا۔

اس بار میں نے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہارون راہداری عبور کر کے اونٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

ظہر کے وقت سے پہلے ہی تمام انتظامات مکمل کر لئے گئے۔ ہارون کے خادمان خاص' غلام اور محافظ دستے کے سپاہی ساتھ تھے۔ ان افراد کے سوا عوام کو کچھ خبر نہیں تھی کہ خلیفہ وقت ہارون الرشید کہاں اور کیوں جا رہا ہے۔ ہارون کے خاص خادموں میں عارج کے ساتھ میں بھی تھی۔ خلیفہ کی گزرگاہ کا تعین پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ جب یہ مختصر سا قافلہ گزر رہا تھا تو راستے سنسان تھے۔ ایسا پردہ پوشی کی خاطر کیا گیا۔ اس موقع پر مجھے ہارون کی بیوی زبیدہ خاتون یاد آ گئی۔ ہارون اسے رقہ ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ رقہ سے ہارون بغداد آیا' وہاں سے طوس اور اب گویا یہاں سے اس کا کہیں اور جانا ممکن نہیں رہا تھا۔

ہارون کے پیچھے جو اونٹ تھا اس پر عارج اور دو خادموں کے ساتھ میں سوار تھی۔

آخر کار دھیمی رفتار سے چلتا ہوا وہ قافلہ اپنی منزل تک پہنچ ہی گیا۔ رفتار اس لئے دھیمی رکھی گئی کہ ہارون شدید علیل تھا۔

باغ کے ایک کنارے پر قدرے اندر کی جانب قبر کھودی گئی تھی تاکہ اونٹ پر بیٹھے بیٹھے ہارون کو اپنی قبر دکھائی دی جائے۔ اسے اونٹ کے اوپر سے نہ اترنا پڑے۔ وہ بڑا اداس کر دینے والا منظر تھا۔ ہارون بڑی حسرت سے اپنی قبر کو دیکھے جا رہا تھا۔

چند ساعتیں اسی طرح گزریں' پھر میں نے ہارون کی نحیف آواز سنی۔ ''اے ابن آدم! تیری جگہ یہ ہے۔''

وہاں سے واپسی پر محل آنے کے بعد ہارون نے اپنے سپاہیوں اور ملازمین میں رقم تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ یہ ساری باتیں اسی جانب اشارہ کر رہی تھیں کہ ہارون کو اپنی موت کا یقین ہو چکا ہے۔

پھر ہوا بھی یہی چند روز بعد رات کے وقت محل میں چیخ و پکار سن کر میں ٹھٹھک کر رک گئی۔ عارج اور میں اپنے اپنے قالبوں سے نکلنے ہی والے تھے' ہم حسب معمول ''شوق آوارگی'' پورا کرنا چاہتے تھے۔ یہ 3 جمادی الثانی 193 ہجری کا واقعہ ہے۔

سارے محل میں ہلچل مچ گئی' میں نے حقیقت حال معلوم کر لی' خلیفہ ہارون سفر آخرت پر روانہ ہو چکا تھا۔ اس وقت ہارون کی عمر 45 سال تھی' اس نے 23 برس ایک ماہ حکومت کی' دوسرے دن صبح شہزادہ صالح نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اسے مقررہ جگہ دفن کر دیا گیا۔ یہ آدم زاد بھی کتنی تھوڑی . . . . لاتے ہیں!

ہر چند کہ میری سرگزشت میں ہارون الرشید کا ذکر جگہ جگہ آیا ہے لیکن بہتر یہ ہو گا کہ جو باتیں میں اس کے بارے میں اب تک بیان نہیں کر سکی' وہ بھی مختصراً بیان کر دوں یوں آنے والے زمانوں کے تاریخ لکھنے والے بھی حقائق سے آگاہ ہو سکیں گے۔

بلاشبہ ہارون الرشید دور وسطیٰ کے عظیم حکمرانوں میں سے تھا' اس کا 23 سالہ دور ملکی امن و امان' بیرونی فتوحات' علوم و فنون کی ترقی' دولت کی فراوانی' حکومت کی شان و شوکت اور رفاہ عامہ کے کاموں کی شہرت کے سبب بنو عباس کی تاریخ میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ مطلق العنان حکمرانوں کے قصوں میں ہارون الرشید کا نام نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔ ہارون جس سلطنت کا وارث ہوا تھا اس کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں' اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ ہارون نے بھی ایک فرض شناس' مستعد اور باہمت حکمران کی طرح اقتدار سنبھالا اور اپنے

دور حکومت کو عباسی خلافت کا عہد زریں بنا دیا۔

ہارون کی فیاضی، علم دوستی، تحسین پرستی اور رعایا پروری کے واقعات فسانہ معلوم ہوتے تھے حالانکہ حقیقت یہ ہیں۔

انتظام سلطنت کو بہتر بنانے، بغاوتوں کو ختم کرنے، رعایا کی شکایات دور کرنے اور اپنی ذمے داریاں پوری کرنے کیلئے ہارون نے جس فرض شناسی کا ثبوت دیا اس کی مثال صرف خلیفہ منصور کے عہد میں ملتی ہے۔ سلطنت کے معاملات میں سوائے خرچ کے ہارون نے اپنے دادا منصور کے نقش قدم پر چلنا چاہا، یہ وہی آدم زاد خلیفہ منصور ہے جس نے بغداد کی بنیاد رکھی تھی۔ منصور خرچ کے معاملے میں بہت محتاط تھا جبکہ ہارون کی فیاضی ضرب المثل تھی۔

ہارون کے عہد میں حکومت کی آمدن بڑھ گئی تھی، اس نے اسی اعتبار سے دولت کو خرچ بھی کیا، ہارون کے دور میں محلات، مسجدیں، مدرسے، کارواں سرائے، سڑکیں، پل، نہریں اور اسپتال بڑے پیمانے پر تعمیر کیے گئے۔

ہارون اپنے عمال کی کارگزاریوں کی قدر بھی کرتا تھا اور ان کی خدمت کے صلے میں انہیں انعام و اکرام سے بھی نوازتا تھا۔ اس کے زمانے میں حکومت کا بڑا وقار تھا، دنیا کے بڑے حصے سے خراج آتا تھا، ہارون کے دربار میں جتنے علماء، فقہاء، قضاۃ، کاتب، ندیم اور گلوکار جمع ہوئے وہ کسی خلیفہ کے دربار میں نہ تھے، وہ ان میں سے ہر ایک کو انعام دیتا اور بڑے بڑے مدارج پر پہنچاتا، وہ خود بھی بڑا فاضل، شاعر، اخبار و آثار و اشعار کا راوی اور صحیح المذاق تھا، خواص اور عوام سب کے دلوں میں اس کی ہیبت تھی۔ سلطنت اور بیرون سلطنت سے صاحبان فن اس کے دربار میں کھنچے چلے آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہارون کے عہد میں دنیا کا اہم ترین شہر اور علم و ادب کا مرکز بغداد ہی کہلایا۔

دنیا کی دیگر زبانوں سے ترجموں کا کام جو منصور کے زمانے میں شروع ہوا، ہارون نے اسے منظم کیا۔ یونانی، ایرانی، اور سنسکرت کی کتابوں کے تراجم کیلئے علماء اور ترجمہ کرنے والوں کو معقول تنخواہوں پر مقرر کیا گیا، جن علوم کی اشاعت پر ہارون کے عہد میں خاص توجہ دی گئی وہ طب، نجوم، ہیئت، موسیقی، تاریخ اور شعر و ادب تھے۔ علم ہیئت میں یونانیوں کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔ یونانی عالم بطلیموس کی کتاب عربی میں ترجمہ ہو کر مقبول ہوئی وہ ''مجسطی'' تھی۔ اس کتاب کا مترجم ابو حسان تھا، اس ترجمے کو مستند قرار دیا گیا، اس کے بعد مسلمانوں نے وقت کا صحیح تعین کیا اور مختلف سیاروں کے فاصلوں کو دریافت کیا۔

ہارون الرشید کے عہد کی سب سے مشہور کتاب ''الف لیلہ'' ہے جس کی بنا پر کہانی

لکھنے کا فن انتہائی عروج تک پہنچ گیا۔ فارسی میں اس کتاب کا نام ''ہزار افسانہ'' تھا۔ اسے عربی میں علامہ اصمعی نے منتقل کیا اور مزید اضافے کیے۔

علامہ اصمعی نے ہارون الرشید، جعفر برمکی اور سرور کو ''الف لیلہ'' کے کرداروں میں شامل کر دیا۔ اس طرح ہارون کے عہد کو الف لیلوی رنگ دے دیا گیا۔ کہانیوں کی دیگر کتابوں کا بھی فارسی زبان سے ترجمہ کیا گیا۔ ان کتابوں کو پڑھ کر اور افسانہ نویسی کے فن سے واقف ہو کر مسلمانوں نے طبع زاد افسانے لکھنے شروع کر دیئے جو فارسی کے ترجموں سے زیادہ اہم ثابت ہوئے۔

علم و ادب کے ساتھ ساتھ ہارون کے زمانے میں موسیقی کو بحیثیت فن کمال تک پہنچا دیا گیا۔ مسلمانوں نے یہ فن یونانیوں اور ایرانیوں سے حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے خود بھی راگ، لے اور تان میں ایجادات کی تھیں اور موسیقی کے آلات بنائے تھے۔ ابراہیم موصلی اور اس کے بیٹے اسحاق موصلی نے موسیقی کے فن میں شہرت دوام حاصل کی۔ اسحاق موصلی صرف مغنی ہی نہیں بلند پایہ عالم بھی نکلا۔ اس نے فن موسیقی پر جو کتاب لکھی وہ اس فن پر سب سے بہتر تسلیم کی گئی۔ اس میں نغمات کو ریاضی کے اصولوں پر تقسیم کیا گیا۔

اس علم پروری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہارون کی سلطنت میں جگہ جگہ کتب خانے قائم ہو گئے۔ سرکاری کتب خانوں کے علاوہ ذاتی کتب خانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ امراء بڑی بڑی قیمتوں پر کتابیں خریدتے اور اپنے کتب خانوں کی زینت بناتے۔ ہارون اور یحیٰی برمکی کے ذاتی کتب خانوں میں کتابوں کے کئی کئی نسخے ہوتے۔ یحیٰی کا کتب خانہ بھی ضبط کر لئے اور اپنے کتب خانے میں شامل کر دیئے۔

بدقسمتی سے آدم زادوں میں یہ خرابی عام ہے کہ وہ زور زبردستی بھی کر لیتے ہیں۔ سو ہارون بھی اس سے مبرا نہ تھا۔

ہر مطلق العنان حکمران جب دنیا سے جاتا ہے تو اس کے تاج و تخت پر قبضہ کرنے کیلئے زور آزمائی شروع ہو جاتی ہے۔ ہارون کے بعد بھی ایسا ہی ہوا۔ ولی عہد سلطنت محمد امین نے تو ہارون کی زندگی ہی میں یہ بیج بو دیا تھا۔

4 جمادی الثانی 193 ہجری کو لشکر میں امین کی بیعت لی جانے لگی۔

عارج اس پر مجھ سے کہنے لگا۔ ''دیکھ لیا تو نے اے دینار کہ لوگ کس کے ساتھ ہیں؟''

''ہاں دیکھ لیا، مگر تجھے حقیقت کا علم نہیں۔'' میں بولی۔ ''یہ ایک سازش ہے جس کے

تخت امین کیلئے بیعت لی جارہی ہے۔"

"سازش؟" عارج نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں سازش!" میں نے زور دے کر کہا۔ "اس سازش کی ابتدا ہارون کے جیتے جی ہوگئی تھی۔"

"اے دینار! تو مجھے بڑی پہنچی ہوئی لگتی ہے' اس کے ساتھ تھوڑی گھنی بھی ہے۔"

"تو مجھے جو چاہے کہہ لے مگر حقیقت اپنی جگہ برقرار رہے گی اے عارج!"

"وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں اے جن زادی!"

"آہستہ بول! کسی آدم زاد نے سن لیا تو بیہوش ہو جائے گا۔" میں دھیرے سے ہنس دی۔

"میری بات کو ہنسی میں نہ اڑا اور جو پوچھ رہا ہوں بتا دے۔"

"بے صبرا نہ ہو' بتا دوں گی۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بغداد میں اب کیا صورتحال ہو سکتی ہے۔"

"وہی ہو گا جو اب تک ہوتا آیا ہے۔" عارج بولا۔ "وہی مار دھاڑ اور محلاتی سازشیں۔"

"اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں سوچنے کی ہیں۔"

"مثلاً؟" عارج نے پوچھا۔

"تجھے شاید یاد ہو کہ جب ہارون نے سپاہیوں اور اپنے ملازمین میں رقم بانٹنے کا حکم دیا تھا تو کیا کہا تھا۔"

"تو ہی بتا دے اے دینار! میں ایسی فضول باتیں یاد نہیں رکھتا۔"

"اور اس پر تو مجھ سے سب کچھ پوچھ لینا چاہتا ہے!... ہم جنات کو دولت کی طلب نہیں مگر آدم زادوں کو ہے۔"

"جانتا ہوں میں۔ دولت ان کی طلب ہی نہیں ضرورت بھی ہے پھر؟" آخر میں عارج نے سوال کیا۔

"پھر یہ کہ ہارون کے ساتھ جو خزانہ بغداد سے یہاں طوس آیا' اس کیلئے ہارون نے وصیت کی تھی' یاد آیا کچھ!" میں نے جواب دیا۔

"ہاں یاد آ گیا' اس خزانے کے بارے میں ہارون کی وصیت یہ تھی کہ اسے مامون کے پاس مرو بھیج دیا جائے۔" عارج نے کہا۔

"مگر وزیر سلطنت بن ربیع نے ہارون کی اس وصیت کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اب یہ خزانہ بغداد جانے والا ہے۔"

میری تشویش پر عارج مسکرا کر بولا۔ "تو اچھا ہے نا!"

"اے عارج! تو یہی بات تو نہیں سمجھ رہا کہ یہ اچھا نہیں ہو رہا۔"

"کیسے؟"

"ایسے کہ اس سے جھگڑے کی بنیاد پڑ جائے گی۔ مامون سے یہ بات چھپی نہ رہ سکے گی کہ امین نے اس کا حق مار لیا ہے۔" میں نے بتایا۔

"میرے علم و اطلاع کے مطابق ہارون نے بیت المال میں نوے کروڑ دینار چھوڑے ہیں۔ ان میں سے کتنے مامون کو اور کتنے امین کو ملتے جائیں یہ ہمارا دردسر نہیں ہے۔ یوں بھی اصل خزانہ رقہ میں ہارون کی بیوہ زبیدہ کے پاس ہے۔ تجھے خبر ہی نہیں ہے کہ یہ سگے سوتیلے کا چکر ہے۔ وہ آدم زادی زبیدہ خاتون کبھی یہ نہ چاہے گی کہ اس کا سگا بیٹا امین تو مال و دولت کو ترسے اور سوتیلا بیٹا مامون عیش کرے۔"

عارج کی زبانی یہ باتیں سن کر میں چونک اٹھی۔ وہ بھی حالات سے بڑی حد تک واقف تھا۔

"تجھے ایک بات اور بتانی تھی اے عارج کہ آج صبح جب شہزادہ صالح اپنے باپ ہارون کی نماز جنازہ پڑھا کر واپس آیا تو مجھ سے بولا اے کلثوم! تجھے اور تیرے شوہر اسحاق کو طوس سے بغداد واپس چلنا ہے۔"

"وہ تو خیر تو بغداد چلنے کا فیصلہ کر ہی چکی ہے اے دینار!" عارج نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "مجھے تو یوں لگتا ہے کہ اسی طرح شہروں شہروں آتے جاتے اور مختلف زمانوں کا سفر کرتے ہوئے میری عمر گزر جائے گی۔"

"سبھی کی عمر گزرتی ہے' تیری عمر کیا انوکھی ہے۔" میں تڑخ کر بولی۔ "غریب آدم زادوں کو تو دیکھ کہ ادھر دنیا میں آئے ادھر گئے۔"

"مگر اس مختصر عرصے میں بھی ایک ایک آدم زاد کئی بیویاں اور کنیزیں چھوڑ جاتا ہے۔"

"تجھے کس نے روکا ہے' تو بھی آدم زادوں کی روش اپنا لے۔"

"کاش میں ایسا کر سکتا اے دینار!... مگر میں کوئی آدم زاد نہیں' ایک شریف جن زاد ہوں۔"

"دیکھ چکی ہوں میں تیری شرافت' منہ نہ کھلوا میرا۔"

"یہ تو ہمیشہ لڑاکا ڈری کیوں بنی رہتی ہے' کبھی نرمی اور محبت سے بھی بات کر لے تو کیا مضائقہ ہے۔"

عارج اور میں اس وقت محل کے ایک مخصوص حصے میں تھے۔ یہ حصہ غلاموں' خدمت گاروں' کنیزوں اور لونڈیوں کیلئے تھا۔ ہم کیونکہ خلیفہ ہارون کے خاص خدمت گاروں میں تھے اس لئے ہماری سکونت الگ تھی۔ اسی بنا پر ہم آزادانہ گفتگو کر رہے تھے۔ جس خلیفہ کی خدمت پر ہمیں مامور کیا گیا تھا وہ نہیں رہا تھا۔ وفادار غلاموں اور خدمت گاروں کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ انہیں بھی گویا سرمایہ تصور کیا جاتا۔ ہماری حیثیت بھی ایسی ہی تھی۔ یہ خدمت گار و غلام کسی فرد سے زیادہ خاندان کے وفادار ہوتے۔

اب دن کے وقت بھی ہمارے واسطے کوئی کام نہیں تھا سوائے اقامتی حصے میں آ گئے تھے۔ ہم نے دانستہ محل میں غیر ضروری نقل و حرکت سے گریز کیا۔ مجھے معلوم تھا اور عارج کو بھی احساس تھا کہ اس طرح کے حالات میں کیا ہوتا ہے۔ بلاوجہ آدم زاد ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ خدمت گاروں اور غلاموں پر تو خاص نظر رکھی جاتی ہے۔ حکمران خاندان کے کسی فرد یا اس کے کسی قریبی منصب دار کو کسی خدمت گار یا غلام پر شک ہو جائے کہ وہ بے وفائی کر سکتا ہے تو اس کا سر قلم کرنے میں دیر نہیں کی جاتی۔ خود وہ بے وفائی کا حق "محفوظ" رکھتے تھے۔

"یہ تو کہاں کھو گئی اے دینار! بات کیوں نہیں کرتی؟" عارج نے مجھے ٹوکا۔

☆......☆......☆

"کیا بات کروں تجھ سے، گھڑی بھر میں پٹڑی سے اتر جاتا ہے۔"

"اچھا اب پٹڑی ہی پہ رہوں گا، یہ بتا دے کہ وہ سازش کیا ہے جس کا تو ابھی ذکر کر رہی تھی؟" عارج نے مجھ سے پوچھا۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ عارج کو سازش کا علم نہیں، میں اسی لئے جواب میں بولی۔ "تجھے وہ رات تو یاد ہوگی جب خلیفہ زادے امین کے قاصد بکر المعتمر کو ہم نے لشکر گاہ میں دیکھا تھا؟"

"ہاں اے دینار!" عارج نے جواب دیا۔ "میں یہ بھی نہیں بھولا کہ بکر، وزیر سلطنت فضل بن ربیع کے لئے کوئی پیغام لایا تھا۔"

"اب میں تجھے بتاتی ہوں کہ فضل، امین کے چھوٹے بھائی صالح اور لشکر و حکومت

کے دیگر سرداروں و امراء کو امین نے ہارون ہی کی زندگی میں اپنی بیعت لینے کے لئے لکھا تھا۔" میں بتانے لگی۔ "بکر تین خط لے کر آیا تھا، ان میں سے پہلے خط کا تعلق بیعت عام سے تھا، امین نے بکر کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ فوج کے سرداروں اور امرائے سلطنت سے امین کی بیعت لے۔ دوسرا خط اس نے صالح کو لکھا تھا کہ لشکر، خزانے اور مال و اسباب کے ساتھ حتی الامکان طور پر جلد بغداد چلے آؤ اس کے لئے امین نے اسے فضل سے مشورے کا پابند کیا تھا۔ امین کا تیسرا خط فضل کے نام تھا جو میں نے تیری ہی موجودگی میں پڑھا تھا تو اس وقت دور کھڑا تھا۔ یہ خط مال و اسباب اور خزانے کی حفاظت سے متعلق تھا اس خط میں بھی فضل کو ترغیب دی گئی تھی کہ وہ بغداد پہنچے......"

عارج نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور بولا۔ "اے دینار! میری ایک بات سن۔"

"نہیں سنوں گی۔" میں نے زور دے کر کہا پھر بولی۔ "افسوسناک امر یہ ہے کہ ان خطوط میں امین نے اپنے باپ ہارون الرشید سے متعلق کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ کیا ایک بیٹے کو یہ زیب دیتا ہے؟"

"میں یہی تو وضاحت کرنے والا تھا۔" عارج بول اٹھا۔ "ممکن ہے امین کا مقصد کچھ اور ہو۔ طوس اور بغداد میں خاصہ فاصلہ ہے نا؟"

"ہاں ہے، پھر؟"

"پھر یہ کہ قاصد کو بھیجتے وقت امین کو یقین ہو کہ تب تک اس کا باپ مر چکا ہوگا۔"

"بات تو یہی ہوئی نا کہ امین اقتدار کا بھوکا ہے۔" میں نے جرح کی۔ "اور وقتی طور پر ہی سہی اسے اقتدار مل گیا ہے۔"

"خواہ ابھی وہ اس سے آگاہ نہ ہو۔" عارج کہنے لگا۔ "تیری یہ بات بہرحال حقیقت پر مبنی ہے کہ اسے خودغرضی اور سازش ہی کہا جائے گا۔" عارج سنجیدہ لگ رہا تھا۔ "اس کے علاوہ تو نے جن خدشات کا اظہار کیا ہے، وہ بھی درست معلوم ہوتے ہیں۔ خیر...... بغداد پہنچیں گے تو دیکھیں گے کہ کیا صورت رہتی ہے، وقت سے پہلے حتمی طور پر کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"وقت کی بات نہ کر کہ ہم جب چاہیں وقت کی لگامیں کھینچ سکتے ہیں لیکن ابھی ماضی یا مستقبل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو حال کی فکر ہے۔ دیکھنا ہے کہ یہاں طوس میں کیا ہو رہا ہے! تو یہیں رہ، میں آتی ہوں ابھی۔"

''کہاں جائے گی، بتا کر تو جا!'' عارج نے اصرار کیا۔

میں اس عرصے میں اپنے انسانی قالب سے باہر آ چکی تھی، اپنے خاکی پیکر کو میں نے گہری نیند سلا دیا تھا۔

''تجھے میں اسی لئے یہاں چھوڑے جا رہی ہوں کہ کوئی گڑبڑ ہو تو سنبھال لے۔'' میں بولی۔

پھر عارج ''ارے ارے'' کہتا رہ گیا اور میں ''خدا حافظ'' کہہ کر وہاں سے چمپت ہو گئی۔ فوری طور پر مجھے خیال آیا تھا کہ حمویہ کی خبر لوں۔ وہ دیوان البرید (ڈاک اور خبر رسانی کا محکمہ) کا ناظم اعلیٰ تھا جس طرح فضل کا باپ ربیع، خلیفہ منصور کا آزاد کردہ غلام تھا اسی طرح مہدی کا آزاد کردہ غلام حمویہ تھا۔ ہارون الرشید جب بھی سفر کرتا تو ہر محکمے کا سربراہ اس کے ساتھ ہوتا۔ سو یوں حمویہ بھی طوس میں تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ لشکر میں حمویہ کا خیمہ کہاں ہے! میں وہاں پہنچ گئی۔ خیمے کے اندرونی حصے میں حمویہ موجود تھا، آس پاس اسی کے محکمے سے وابستہ آدم زادوں کے خیمے تھے۔ میں نے فوری طور پر اسے چھیڑنا بہتر نہ سمجھا اور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ چہروں پر بھی تو بہت کچھ لکھا ہوتا ہے! مجھے وہ کسی خیال میں کھویا ہوا لگا جب اس نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کیا تو میں جان گئی اسے کسی کی آمد کا انتظار ہے۔ کوئی جلدی تو تھی نہیں، میں اس لئے اطمینان سے ایک طرف کھڑی رہی جب تک میں نہ چاہتی، حمویہ وہاں میری موجودگی سے واقف نہ ہوتا۔

معاً مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں ادھر متوجہ ہو گئی۔

''وہ آ گیا ہے حضور!'' اندرونی خیمے کے باہر سے ایک آواز آئی جو دھیمی تھی۔

''اسے اندر بھیج دو۔'' جواب میں حمویہ بولا۔

چند لمحے بعد ہی ایک لمبے قد والا آدم زاد اندرونی خیمے میں داخل ہوا، میرے لئے وہ قطعی اجنبی تھا۔

''ادھر آ!... میرے قریب'' حمویہ نے لمبے آدمی عتاہیہ سے مزید کہا۔ ''تو اگر چاہے تو رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔''

''یہی مناسب رہے گا حضور کہ میں رات کو کسی وقت لشکر سے بغداد کے لئے روانہ ہو جاؤں۔''

''ہاں کسی کو اس کی بن گن نہیں ہونی چاہئے۔'' حمویہ نے تاکید کی۔

''ایسا ہی ہوگا حضور!'' عتاہیہ نے یقین دہانی کرائی۔

''بغداد میں تجھے یہ پیغام میرے نائب سلام ابن مسلم کو پہنچانا ہے۔'' حمویہ نے یہ بات آگے بڑھائی۔

''اور حضور وہ پیغام مجھے کب ملے گا؟'' عتاہیہ نے سوال کیا۔

''ابھی'' حمویہ نے کہا اور ایک طرف رکھی ہوئی چوکی کی طرف بڑھا اس چوکی پر قلم دان اور کاغذ بھی رکھا تھا، وہ چوکی کے سامنے بیٹھ گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں، حمویہ کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ قلم دان کھول کر حمویہ نے اپنے نائب سلام کے لئے مختصر پیغام لکھا پھر اسے ایک اور کاغذ میں لپیٹ کر اس پر اپنی مہر لگا دی اسی وقت مجھے ایک شرارت سوجھی۔

''مبارک ہو... مبارک ہو!'' میں یہ کہتی ہوئی حمویہ سے دور چلی گئی۔

میری غیر انسانی آواز سن کر حمویہ اچھل پڑا، دوات کا ڈھکنا اس نے بند نہیں کیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ سیاہی اس کے لباس پر گر پڑی۔

''تت... تو نے کوئی آواز... عجیب گھرگھراتی سی آواز سنی اے عتاہیہ؟'' حمویہ ڈر گیا۔

''جی... جی حضور! سنی'' عتاہیہ نے بتایا ''کو... کک... کوئی... مبارک ہو، مبارک ہو کہہ رہا تھا۔''

''تو یہ میرا وہم نہیں تھا۔'' حمویہ بڑبڑایا۔

''حضور نے غلام سے کچھ کہا؟'' عتاہیہ بول اٹھا۔

''نہیں!... چپ کھڑا رہ۔'' حمویہ نے اپنا غصہ عتاہیہ پر اتار دیا اس سے اسے یہ فائدہ ہوا کہ خوف پر غصہ غالب آ گیا۔

میں دور کھڑی یہ تماشہ دیکھتی رہی، دانستہ میں نے حمویہ کو اپنی آواز سنائی تھی اس کے علاوہ وہ دو الفاظ ''مبارک ہو'' بھی بے معنی نہیں تھے، وہ پیغام جو حمویہ اپنے نائب کو بھیج رہا تھا اس میں ہارون کے انتقال کی خبر کے ساتھ ہی امین کو خلافت کی مبارک باد دینے کے لئے تاکید تھی۔ حمویہ نے لکھا تھا۔ ''اے سلام! خلیفہ مرحوم کے ولی عہد کو سب سے پہلے تو جا کر مبارکباد دے! اس سلسلے میں تجھے میرا نام بھی لینا ہے کہ میں نے تجھے یہ خبر دی اور خبر رسانی کا فرض ادا کیا۔'' اس چند لفظی پیغام کے آخر میں حمویہ کی مہر اور دستخط تھے، دوسرے کاغذ میں یہ پیغام لپیٹ کر بھی اس نے پھر اپنی مہر لگائی تھی اب وہ پیغام رسانی یا خبر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کی خاطر کتنی احتیاط برتی جاتی تھی، یہ احتیاط اپنی جگہ لیکن حمویہ کا مقصد امین کی نظروں میں سرخ

رد ہونا بھی تھا۔

جو بھی کسی طرح اقتدار حاصل کرلیتا ہے اسے حمویہ جیسے لوگ مل ہی جاتے ہیں۔ یہ دوڑ شروع ہو جاتی ہے کہ حکمران وقت کا کون زیادہ وفادار ہے۔ اس آدم زاد حمویہ کی اس چاپلوسی کو محسوس کر کے میں نے اسے ''سزا'' دی اسی بنا پر جب وہ غصے کی حالت میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو لباس کی سیاہی بہہ کر نیچے بچھے ہوئے قالین پر گری۔ حمویہ اور چراغ پا ہو گیا اگر اسے رازداری کا خیال نہ ہوتا تو لازماً چیخ اٹھتا، شدید غصے کا پتہ اس کے چہرے کی سرخی سے ہو رہا تھا یہاں میں یہ بتاتی چلوں کہ بیعت کے لفظی معنی بھی وفاداری و فرماں برداری کے ہیں۔

''لے یہ پیغام اور دفع ہو جا۔'' حمویہ نے اپنے عملے کے قاصد یا خبر رساں عتاہیہ کو ایک بار پھر غصے کا نشانہ بنایا اور پیغام اسے تھما دیا۔

''اور اگر عتاہیہ والی نے عین نہ ہوتو؟'' میں پھر بول اٹھی کہ حمویہ میری غیر انسانی آواز سن لے۔

وہ تو غصے میں تھا ہی اس لئے سوچے سمجھے بغیر گویا مجھ پر برس پڑا ''کون ہے تو سامنے آ۔''

''میں اگر تیرے سامنے آ گئی تو پھر تو اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔''

''سمجھ گیا میں تو میرے کسی مخالف کی کنیز یا لونڈی ہے اور میرے خیمے کے کسی حصے میں آ کے چھپ گئی ہے۔'' حمویہ نے ہوا میں تیر چلایا۔

میں نے یہ سوچ کر کہ عتاہیہ وہاں سے چلا جائے، دانستہ خاموشی اختیار کر لی عموماً چھوٹے یا کم حیثیت آدم زادوں کو ستانے سے میں گریز کرتی تھی، تھوڑی تنخواہیں پانے والے ان غریبوں کا قصور محض یہ تھا کہ وہ کسی بڑے قصر میں پیدا نہیں ہوئے۔

''تو نے دیکھا عتاہیہ، سچ بات سن کر اس لونڈی کو کیسی چپ لگ گئی۔'' حمویہ کی باچھیں کھل گئیں۔

عتاہیہ غریب ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کیا کرتا۔ موقع غنیمت جان کر حمویہ نے اسے رخصت کر دیا جب خیمے کے اندرونی حصے میں حمویہ اکیلا رہ گیا تو اسے میں نے ایک مرتبہ اور اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

''سن اے بے عقلے آدم زاد! میں کوئی لونڈی نہیں، ایک جن زادی ہوں۔'' میرے یہ کہتے ہی حمویہ اچھل پڑا تھا۔

''جج ......جن ......جن زادی......'' حمویہ ہکلانے لگا اس کی ساری اکڑفوں ختم ہو گئی۔

میں نے اس خیال سے کہ وہ دہشت کھا کے بے ہوش نہ ہو جائے وہاں مزید رکنا مناسب نہ سمجھا۔ میں جس وجہ سے یہاں آئی تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ اب وہاں نہ رکوں۔ یوں بھی حمویہ ''چھوٹی چڑیا'' تھا اور میں ایک بڑے ''مردار خور پرندے'' کی تلاش میں تھی۔ سو میں نے لشکر گاہ سے واپس محل کا رخ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق فضل کو صالح کے پاس ہی ہونا چاہئے تھا۔

اسی روز صبح خلیفہ ہارون الرشید کی تدفین ہوئی تھی لیکن محل میں مجھے کوئی آدم زاد سوگوار نہ لگا۔ انہوں نے اپنے چہروں پر منافقانہ اداسی کو بھی ضروری نہیں جانا۔ گویا رات گئی بات گئی۔ یہی حال صالح اور فضل کا تھا۔ میں پہنچی تو وہ راز و نیاز میں مصروف تھے۔

''اے محترم خلیفہ زادے! بکر کو اب رہا کر دینا چاہئے۔'' فضل بولا۔ اس کے چہرے سے ریاکاری جھلک رہی تھی۔

لاکھ ضبط کرنے کے باوجود مجھے فضل پر غصہ آ گیا، میں نے اس کے باپ ربیع کو بھی دیکھا تھا مگر وہ عیار نہیں تھا۔

وہاں کیوں کہ صالح بھی موجود تھا اس لئے میں نے فضل کے دماغ میں سرگوشی کی۔

''کیا بکر کی جگہ تجھے قید خانے میں ڈلوا دیا جائے؟''

''بالکل نہیں ...... بالکل نہیں!'' فضل بے اختیار بول اٹھا۔ ''لیکن ابھی تو تم بکر کو رہا کر دینے کی بات کر رہے تھے؟'' صالح نے فضل کو مخاطب کیا۔

''جی ......جی ہاں خلیفہ زادے!'' فضل نے سنبھل کر کہا مگر میں اسے کیسے سنبھلنے دیتی۔

''تم جو مناسب سمجھو، کرو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' صالح بولا۔

''تو آپ کی طرف سے مجھے بکر کو رہا کرنے کا اختیار ہے؟'' فضل نے اپنی دانست میں صالح پر ذمہ داری ڈال دی۔

''ہاں!'' صالح نے اقرار میں سر ہلایا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے فضل کو دوبارہ ''پکڑیا'' دیا۔

''صالح تو شریف بچہ ہے، تیری بات مان گیا مگر میں نہیں مانوں گی۔''

''تو ہے کون؟'' فضل کے منہ سے نکل گیا، اسے بوکھلاہٹ میں یاد ہی نہیں رہا کس کے روبرو بیٹھا ہے! ''یہ تم نے کیا کہا اے فضل!'' صالح نے جواب طلبی کی۔

فضل بغلیں جھانکنے لگا، کسی خلیفہ زادے کو ''تو'' کہہ دینے کی جسارت بے جا کے

انجام سے یقیناً وہ آگاہ تھا۔ اس نے فوراً سپر ڈال دی اور بولا۔ ''میں معافی کا خواست گار ہوں اے خلیفہ زادے!''

جواباً صالح کچھ دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا۔ ''اصل بات کرو! بردار بزرگ کا خط مل گیا تمہیں؟''

''جی خلیفہ زادے!''

''یہ بتاؤ یہاں سے بغداد کے لئے لشکر کب تک روانہ ہوسکتا ہے؟''

''اس کا تعین فی الحال مشکل ہے۔'' فضل نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' صالح نے پوچھا۔

''آپ کے والد محترم نے اس لشکر اور خزانے کے لئے جو حکم دیا تھا، غالباً آپ کو یاد ہوگا۔ فضل کہنے لگا۔

''یہی نا کہ لشکر اور اس کے ساتھ جو خزانہ ہے، اسے مرو جانا تھا...... لیکن اب تو وہ بات ختم ہوگئی۔''

''بات اس وقت ختم ہوگی خلیفہ زادے کہ امرائے سلطنت اور فوج کے سردار بھی ہم سے متفق ہو جائیں۔''

''تو ان سے کہو متفق ہونے کے لئے!'' صالح نے کہا۔

''بہتر ہوگا کہ آج بعد مغرب امراء اور فوج کے بڑے عہدے داروں کو یہیں محل میں طلب کرلیا جائے۔'' فضل نے تجویز دی۔

''نہیں!'' صالح نے انکار کردیا اور بولا ''تم خود ہی ان سے بات کرلو، ایک جگہ جمع ہوکر لوگ طرح طرح کی بولیاں بولنے لگتے ہیں، تم الگ الگ سب سے بات کرو اس طرح انہیں ہموار کرنا آسان ہوگا۔

''اگر خلیفہ زادے کا حکم یہی ہے تو......''

''اسے حکم نہیں، میری رائے تصور کرا!'' صالح نے فضل کی بات کاٹ دی۔ ''بس اتنا سمجھ لو کہ اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔''

''میں آج...... بلکہ ابھی لشکر گاہ میں جاکر باری باری انہیں اپنے خیمے میں بلواتا ہوں، ممکن ہے اس میں دیر لگ جائے سو اگر میں آج رات حاضر خدمت نہ ہوسکا تو کل صبح ضرور آؤں گا۔'' فضل نے یہ کہہ کر رخصت کی اجازت چاہی۔

''تم جاسکتے ہو مگر خیال رکھنا کہ انہیں بہر حال راضی کرنا ہے۔'' صالح نے تاکید کی۔

''میں پوری کوشش کروں گا، خلیفہ زادے!'' فضل نے یقین دہانی کرائی۔ ''مجھے امید ہے میری بات ٹالی نہیں جائے گی۔'' فضل نے جب محل کے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے تو میں بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ یہ موقع اچھا تھا کہ میں اس عیار آدم زاد کی درگت بناسکتی۔ امین نے اپنے بھائی مامون کے خلاف جو سازش کی تھی، اس کا مرکزی کردار فضل ہی تھا، وہ عرب کی نسل سے تھا اسی لئے امین کو برسر اقتدار لانا چاہتا تھا۔ میرے نزدیک فضل نے ہارون الرشید کا حکم نہ مان کر گویا غداری کی تھی، کچھ اور نہیں تو اس آدم زاد کو میں وقتی طور پر ''نیچا'' دکھا سکتی تھی اور میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ تیز تیز چلا جارہا تھا کہ پیچھے سے میں نے دھکا دے دیا۔ غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ محل میں موجود محافظ ادھر دوڑ پڑے، وہ ''بدبخت'' گرتے گرتے سنبھل گیا، کوئی کوئی آدمی بڑا ہی ڈھیٹ ہوتا ہے۔ فضل بھی بڑی ''ڈھیٹ ہڈی'' تھا اسے اس نوع کے جتنے بھی القاب دیئے جائیں کم ہیں۔ محافظ اس کے قریب پہنچے تو ٹھٹک گئے۔

''کیوں آئے ہو ادھر؟'' فضل نے ان سے گویا جواب طلب کیا۔

''حضور! ہم نے ادھر سے کسی کے چیخنے کی آواز سنی تھی۔'' ایک محافظ ہمت کر کے بولا۔

''تیرے کان بجے ہوں گے!'' فضل کہنے لگا۔ ''چلو جاؤ یہاں سے۔''

وہ کوئی معمولی شخص نہیں، وزیر سلطنت تھا، سو محافظ اپنی جان بچانے کی فکر کرنے لگے۔

''چیخنا تو پڑے گا تجھے۔'' میں نے فضل کے قریب جاکر سرگوشی کی پھر ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔

محافظ حیرت سے منہ پھاڑے کھڑے رہ گئے۔ انہوں نے فضل کو چیختے اور طمانچہ کھانے کے بعد خوف زدہ ہوتے دیکھا تھا۔

فضل کو ذلیل کرنے کے لئے فی الحال اتنا ہی کافی تھا، وہ محافظوں کے سامنے ''چور'' سا بن کے کھڑا تھا۔ اس نے ایک نظر محافظوں پر ڈالی اور ان سے مزید کچھ کہے بغیر چل دیا۔ میں نے اس کے دماغ کو ٹٹولا، وہ سوچ رہا تھا، آخر یہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے؟ کہیں کسی نے میرے خلاف کوئی ''عمل'' تو نہیں کرادیا؟

''ہاں اے فضل، یہی بات ہے۔ تم پر جادو کیا گیا ہے۔'' میں نے اسی کی آواز میں اس سے کہا۔

''تو یہ بات ہے۔'' وہ چونک کر بولا۔

''اور کیا! ورنہ تم تو وزیر سلطنت اور با اختیار ہو، تمہیں بھلا کون نیچا دکھا سکتا ہے۔''

''مگر وہ ہے کون جس نے مجھ پر جادو کرایا ہے؟'' اس نے گویا خود سے سوال کیا۔

مجھے کیا پڑی تھی کہ جواب دیتی! میرا مقصد پورا ہو گیا۔ اسے میں نے اس وہم میں مبتلا کر دیا کہ اس پر کسی نے جادو کرا دیا ہے۔ آدم زاد بڑی جلدی ایسی باتیں قبول کر لیتے ہیں جن کا ''سر پیر'' نہیں ہوتا۔

لشکر گاہ میں پہنچتے ہی فضل نے باری باری امرائے سلطنت اور فوج کے سرداروں کو اپنے خیمے میں بلانا شروع کیا تو میں خاموشی کے ساتھ سارا تماشا دیکھتی رہی۔

''تم اہل بغداد ہو اور تمہیں اسی طرف لوٹنا ہے۔'' فضل اپنے خیمے کے بیرون حصے میں فوج کے دو سرداروں سے مخاطب تھا۔

''کیا تمہیں اپنے وطن جانے کی تمنا نہیں؟''

''کیوں..... کیوں نہیں!..... ہم..... مگر خلیفہ مرحوم.....''

فضل نے اس فوجی سردار کی بات کاٹ دی۔ ''خلیفہ مرحوم اب اپنی قبر سے اٹھ کر جواب طلبی کو نہیں آئیں گے۔''

''درست..... حضور کا فرمانا قطعی درست ہے۔''

''حضور'' تو یہی سننا چاہتے تھے، سو دانت نکال دیئے۔ پلٹو کہیں کے! میں نے سوچا، ہارون الرشید کی آنکھیں بند ہوتے ہی انہوں نے اس کے حکم کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

یہاں میں چند باتیں مزید بیان کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔ ان باتوں کا تعلق اس دور کے معاشی حالات سے ہے۔

حکومت کی آمدنی کا اندازہ چند مثالوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ کچھ علاقوں سے خراج وصول کیے جانے کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سندھ سے وصول کیا جانے والا خراج ایک کروڑ پندرہ لاکھ درہم تھا۔ عود ہندی ڈیڑھ سو رطل، مکران چار لاکھ درہم، کرمان بیالیس لاکھ درہم، یمن کے تھان پانچ سو، کھجوریں بیس ہزار رطل، فارس (ایران) دو کروڑ ستر لاکھ درہم، گلاب تیس ہزار بوتل، زیرہ سیاہ بیس ہزار رطل، خراسان دو کروڑ اسی (80) لاکھ درہم، چار ہزار گھوڑے ایک ہزار غلام، بیس ہزار تھان، تیس ہزار رطل، بصرہ: ایک کروڑ سات لاکھ درہم، موصل دو کروڑ چالیس لاکھ درہم، شہد سفید دو کروڑ رطل، جزیرہ: تین کروڑ چالیس لاکھ درہم، غلام ایک ہزار، شہد بارہ ہزار مشک، دمشق: چار لاکھ بیس ہزار دینار، اردن: ستانوے ہزار دینار، فلسطین تین لاکھ دس ہزار دینار، زیت

تین لاکھ رطل، مصر: انیس لاکھ بیس ہزار دینار، افریقا: ایک کروڑ تیس لاکھ درہم، یمن: تین لاکھ ستر ہزار دینار، حجاز تین لاکھ دینار (عربی زبان میں رطل آدھے سیر وزن کے پیمانے کو کہتے ہیں۔ مصنف)

خراج کی مد سے وصول ہونے والی یہ چند مثالیں ہیں۔ بیت المال یعنی خزانے میں داخل کی جانے والی آمدنی کی چار قسمیں تھیں: خراج، عشر، جزیہ، زکوٰۃ۔

زمین کے محصول کو خراج کہا جاتا۔ عشر صرف زرعی زمین پر تھا۔ (اس کا مطلب کسی چیز میں سے دسواں حصہ لینا ہے) جزیہ محصول کی ایک متعین مقدار جو ہر سال کافر ذمی سے لیجاتی۔ (ذمی: اہل کتاب جن کو مسلمانوں کے ملک میں پناہ دی گئی ہو) جزیہ دینے والوں کا تعلق غیر مذاہب کے آدم زادوں سے تھا۔ زکوٰۃ سے محتاج، اپاہج، نادار، مسافروں اور اسی قبیل کے درماندہ لوگوں کی اعانت کی جاتی تھی۔ زکوٰۃ میں یہ قید تھی کہ صرف مسلمانوں پر صرف ہو، لیکن اور کسی قسم کے صدقات میں جو مسلمانوں سے لیے جاتے تھے، کوئی تخصیص نہ تھی۔ ان سے غیر مذاہب والے بھی بہرہ مند ہوتے تھے۔

صدقات محض مسکینوں کے لئے تھے۔ (مساکین سے مراد عیسائی اور یہودی ہیں)

خراج، عشر اور جزیہ عوامی کاموں یعنی سڑک، پل، چوکیداری، تعلیم وغیرہ کے لئے خاص تھے۔ فوج کا صرفہ بھی اسی آمدنی سے دیا جاتا تھا۔ سلطنت کے ہر حصے میں معذور، محتاج، بیواؤں اور یتیموں سب کے روزینے مقرر تھے جو بیت المال (خزانے) سے معین وقت پر انہیں ملا کرتے تھے۔

یہ بات سلطنت کے ضروری قوانین میں داخل تھی کہ جو شخص نقر و فاقے کا شاکی ہو، مراد غریب آدمی سے ہے، اس مقام کا حاکم اسے کوئی کام دے یا بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دے۔ یوں گویا روزی روٹی کی ذمہ داری حکومت پر عائد تھی جو بھی بے روزگار ہوتا اسے روزگار فراہم کیا جاتا۔

ہارون الرشید کے اس زمانے کو اس اعتبار سے مثالی کہا جائے تو غلط نہیں کہ اسے تھوڑی سی مدت ملی اور اس نے زیادہ بہتری کے اقدامات کیے۔ ان اقدامات کو فضل جیسے آدم زادوں نے نسلی تعصب کی بھینٹ چڑھا دیا۔ فضل کے پاس سے لوٹ کر میں جب محل میں عارج کے پاس پہنچی تو شمع دان روشن کیے جا چکے تھے۔

''اے دینار! تو نے بہت دیر لگا دی، کہاں گئی تھی؟'' عارج نے پوچھا۔

''لشکر گاہ سے آ رہی ہوں۔'' میں نے بتایا۔

"کچھ پتا چلا کہ بغداد کے لئے کب روانگی ہو گی؟"

"مجھے تو لگتا ہے کہ فصل گھڑی کی چوتھائی میں بغداد پہنچ جانا چاہتا ہے۔" میں یہ کہہ کر اپنے انسانی قالب میں داخل ہو گئی واپس آنے کے بعد کلثوم کو میں نے محو خواب ہی پایا تھا۔ کلثوم کے بدن میں اترتے ہی میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ "اے عارج! ایک بات بتا، کیا ضروری ہے کہ ہم دونوں بھی لشکر کے ساتھ ہی بغداد پہنچیں!"

"پھر!" عارج نے حیرت کا اظہار کیا۔

"سن! جب ہمارے انسانی پیکر لشکر کے ساتھ بغداد پہنچیں گے تو ہم ان میں داخل ہو جائیں گے۔"

"تیری تجویز تو ٹھیک ہے اے دینار! یہاں طوس پر پڑے پڑے ہم کیا کریں گے!" عارج خوش ہو گیا۔ "ایسا کرتے ہیں کہ ہم آج رات یہاں سے نکل لیتے ہیں۔"

"اور آج رات ہی کو عتابیہ بھی بغداد کے لئے روانہ ہو گا۔"

"یہ عتابیہ کون ہے؟" عارج نے چونک کر پوچھا۔

"اگر تو اس طرح چونک کر مجھ سے عتابیہ کے بارے میں نہ پوچھتا تو شاید بتا بھی دیتی مگر اب ہرگز نہیں بتاؤں گی۔ تو آخر خود کو سمجھتا کیا ہے؟ ..... مجھے تو اپنی پابند بنا کے رکھنا چاہتا ہے؟"

"لے تو باقاعدہ لڑنے لگی مجھ سے!"

"بے قاعدہ لڑنا کیا ہوتا ہے؟" میں بول اٹھی۔

"ہو گا کچھ، مجھے نہیں معلوم اور نہ معلوم کرنے کا شوق ہے۔" عارج نے بیزاری کا اظہار کیا۔

"تو پھر میں تجھے اپنے ساتھ بغداد نہیں لے جاؤں گی۔" میں نے اسے چڑایا۔

"تو مجھے اپنے ساتھ بغداد لے جا رہی ہے یا میرے ساتھ بغداد چل رہی ہے؟ دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔"

"اور یہ فرق تو ہی مجھے بتائے گا۔ مجھے تو جیسے کچھ خبر ہی نہیں۔"

"بات یہ ہے کہ تجھے تو لڑنے کا شوق ہے اے دینار!"

"یہ تو آج شوق کی جان کو کیوں آ گیا؟"

"اس لئے اے دینار کہ اسی نے تو مجھے دربدر کر رکھا ہے۔"

"بڑا ہی مظلوم ہے تو اے عارج!" میں آہستہ سے ہنس دی۔

"اور بڑی ہی ظالم ہے تو اے دینار!" عارج بھی ترکی بہ ترکی بولا۔

انسانی قالبوں میں رہ کر عموماً ہم جنات وقت اور فاصلوں کے قیدی بن کر رہ جاتے ہیں۔ میں نے اسی لئے یہ تجویز رکھی تھی کہ بغداد چلا جائے۔ ہمارے درمیان ہونے والی پیار بھری نوک جھونک سے قطع نظر ذہنی ہم آہنگی بہرحال تھی۔ ہم دونوں ہی کے مزاج میں تغیر تھا نہ ہم زیادہ عرصے تک انسانی پیکروں میں رہتے نہ دیگر جنات کی طرح آزاد پھرتے۔ کبھی ہجر کبھی وصال کبھی غم اور کبھی خوشی، ہم دونوں اسے پسند کرتے۔ ملنا بچھڑنا ہمارے نزدیک کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

ہم نے اسی رات اسحاق اور کلثوم کے انسانی پیکروں کو چھوڑ دیا جو کچھ گزر چکا تھا، ان دونوں کے ذہنوں میں ہم نے بٹھا دیا تھا۔

نصف شب سے زیادہ ہو چکی تھی جب عارج کو ساتھ لئے ہوئے میں طوس سے چلی اور بغداد پہنچ گئی۔ شہر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہم دریائے دجلہ کے کنارے ایک جگہ اتر گئے۔ اس شہر کے باسیوں کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ ان کا خلیفہ ہارون الرشید مر چکا ہے۔

"اے عارج! تو نے اس بات پر غور کیا کہ بغداد اب کتنا بدل گیا ہے!" میں نے قصر خلافت اور اس کے اردگرد بننے والی نئی عمارتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں اے دینار، تیرا کہنا غلط نہیں۔" عارج نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔

وہ رات ہم نے بغداد اور اس کے گردونواح میں گھومتے پھرتے گزار دی۔ پھر بابل کے کھنڈرات کا رخ کیا۔ میں اپنے ماں باپ اور بھائی سے ملی۔ وہ خوش ہو گئے۔ میں عالم سوما کے پاس پہنچی تو وہ بھی پہلے کی نسبت صحت مند و تندرست نظر آیا۔ اس عرصے میں عارج طبیب ہامہ بن ہیم اور دیگر جنات سے مل آیا۔

عالم سوما کو میں نے اب تک پیش آنے والے واقعات سے مختصراً آگاہ کر دیا۔

"اے میری بچی، اے دینار! تو آدم زادوں کے معاملات میں زیادہ ..... میرا مطلب حد سے زیادہ دلچسپی نہ لیا کر!" سوما نے نصیحت کی۔

"اے میرے باپ کے دوست، اے عالم سوما! میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ حد سے تجاوز نہ کروں۔ یوں تو آدم زاد ہیں جو حد سے گزر جاتے ہیں اور اپنی اس غلطی کو تسلیم بھی نہیں کرتے۔"

"ہاں آدم زادوں میں یہ خرابی ہے کہ وہ اپنی غلطی نہیں مانتے۔" عالم سوما نے تسلیم

کیا' پھر مجھ سے پوچھا۔ ''تیرا ارادہ خراسان جانے کا ہے یا یہیں بغداد میں رہے گی؟''۔

''فی الحال تو بغداد ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے''۔ عارج بول اٹھا' میں چپ رہی۔

عالم سوما نے مزید کوئی سوال نہ کیا اور ہم اس کے پاس سے اٹھ آئے کیونکہ یہ اس کی عبادت کا وقت تھا۔

تقریباً دو ہفتے ہم نے سیر سپاٹے اور حالات کا جائزہ لینے میں گزار دیئے۔ عارج کے ساتھ اس میں میری مرضی بھی شامل تھی۔ کسی ایک سے موسم اور ایک ہی فضا میں رہنا خود مجھے بھی پسند نہ تھا۔ اسی دوران میں ایک روز عتاہیہ بغداد پہنچ گیا۔ اس نے فوری طور پر قصر خلد کا رخ کیا۔ شام کا وقت تھا اور میں اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ مجھے یہ دیکھنا تھا کہ اپنے باپ ہارون کے انتقال کی خبر سن کر امین پر کیا ردعمل ہوتا ہے! اس علاقے کا نام ''خلد'' رکھ دیا گیا تھا۔ جہاں نئی عمارتیں بنائی گئی تھیں۔ اسی بنا پر جو قصر امین کے تصرف میں تھا۔ اس کا نام قصر خلد پڑ گیا تھا۔

عارج اس وقت میرے ساتھ نہ تھا اور نہ میں کسی انسانی قالب میں تھی۔

قصر خلد میں نے پہلی بار دیکھا' مگر قصر خلافت کی شان ہی اور تھی۔ قاصد کے آنے کی خبر پاتے ہی امین نے اسے اپنی خلوت میں بلوا لیا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ قاصد طوس سے آیا ہے عتاہیہ تنہا نہیں تھا' نہ اس کی یہ جسارت تھی کہ وہ براہ راست امین سے مل سکتا۔ سلام ابن مسلم اسے اپنے ساتھ بطور گواہ لے گیا تھا۔

محکمۂ ڈاک اور خبر رسانی کے سربراہ حمویہ نے بغداد میں موجود اپنے نائب سلام کو عتاہیہ کے ذریعے وہ پیغام بھیجا تھا جس کا ذکر آ چکا ہے۔ امین نے پہلے قاصد پر اور پھر سلام پر نگاہ ڈالی۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ موزوں اندام' کشیدہ قامت' خوبرو اور قوی تن امین کی پریشانی پر بل دیکھ کر سلام فوراً بول اٹھا۔ ''یہ غلام اس قاصد کو اپنے ساتھ لایا ہے۔ اے امیر المومنین! آپ کے قابل احترام والد بزرگوار خلیفہ ہارون الرشید کا انتقال ہو چکا ہے اور.....''

''اے سلام! کیا تیرے پاس اس خبر کا کوئی ثبوت ہے؟''

امین نے سلام کی بات کاٹ دی۔ اس کے سرخ و سفید چہرے سے دبے دبے سے جوش کا اظہار ہو رہا تھا۔ مجھے یہی توقع بھی تھی۔ اس پر مجھے بہرحال افسوس ضرور ہوا۔

''جی ہاں اے امیر المومنین!'' سلام نے فوراً جواب دیا۔

''حضور اس قاصد سے تصدیق کر سکتے ہیں''۔

قاصد عتاہیہ کی طرف امین کی نظریں اٹھیں۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے ہارون کی موت کا منظر گویا لفظوں میں کھینچ دیا۔ اس عرصے میں عتاہیہ کی نظریں جھکی رہی تھیں۔

جب عتاہیہ بول چکا تو سلام نے امین کی اجازت سے کہنا شروع کیا۔ وہی سب کچھ جس کی ہدایت اسے حمویہ نے کی تھی۔ امین کو خلافت کی مبارکباد دینے والا پہلا آدم زاد اسلام ابن مسلم ہی تھا۔

''تجھے ہمارے بھائی صالح کے حال کی بھی کچھ خبر ہے؟''

امین نے سلام سے دریافت کیا۔

اس پر سلام بغلیں جھانکنے لگا اور فوری طور پر کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے بجائے وہ بولا ''اے امیر المومنین! میرے افسر محترم حمویہ نے مجھے وہ خبر دی ہے جو میں نے بیان کی''۔

کچھ کہنے کے بجائے امین نے ہاتھ سے رخصت کا اشارہ کر دیا۔

ادھر قصر خلد سے سلام اور عتاہیہ نکلے' ادھر امین کے ایک غلام نے طوس سے صالح کے خادم رجاء کی آمد سے مطلع کیا۔

میں ابھی وہیں موجود تھی۔ اس غلام کا نام کوثر تھا۔

''اسے جلد ہمارے پاس لے کر آ!'' امین نے کہا۔

''جی میرے آقا!'' غلام نے جھک کر امین کو تعظیم دی اور چلا گیا۔

ذرا ہی دیر بعد اوسط قد رکھنے والا ایک آدم زاد غلام کے ساتھ حاضر ہوا۔ وہ خالی ہاتھ نہ تھا۔

''اے رجاء! جلد بتا' کیا خبر لایا ہے؟'' امین نے اوسط قد والے آدم زاد رجاء کو مخاطب کیا۔

جواب میں رجاء نے امین کو پہلے ایک خط دیا۔ میں نے اس خط پر بھی ایک نظر ڈالی۔ خط میں صالح نے امین کو خلافت کی مبارکباد کے ساتھ ہی ہارون کے انتقال کی خبر دی تھی۔

''تیرے پاس ہمارے لئے کچھ اور بھی تو ہے!'' امین اپنے چھوٹے بھائی کا خط پڑھ کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''جی ہاں اے امیر المومنین!'' رجاء بولا اور پھر وہ انگوٹھی جو ہارون پہنتا تھا ایک عصا (لاٹھی) اور ایک چادر جو ہارون اوڑھتا تھا۔ امین کی خدمت میں پیش کر دی۔ یہ گویا خلافت کی نشانیاں تھیں۔

غلام ابھی تک ہاتھ باندھے اپنی جگہ کھڑا تھا۔ امین اس سے مخاطب ہوا۔ ''کل کیا دن

ہے اے کوثر؟''

''جمعہ ہے اے میرے آقا!'' غلام نے جواب دیا۔

''یہ دن مبارک دن ہے۔ ہم کل ہی قصرِ خلد سے قصرِ خلافت جائیں گے''۔ امین کا لہجہ بدل گیا تھا۔

میرا جی چاہا کہ اس آدم زاد امین کو اپنا کوئی ''کرتب'' دکھا دوں مگر صبر کر کے وہاں سے چلی آئی۔ میں نے اب وہاں مزید رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

دوسرے دن صبح امین، قصرِ خلد سے قصرِ خلافت میں آ گیا۔ یہ وہی قصرِ خلافت تھا جہاں میں نے خلیفہ منصور، خلیفہ مہدی، خلیفہ ہادی اور خلیفہ ہارون کو دیکھا تھا۔ اب اسی قصرِ خلافت میں ایک نااہل آدم زاد امین آیا تھا۔ ابھی صرف چند آدم زادوں کو یہ بات معلوم تھی کہ ہارون کی وفات ہو چکی ہے۔ بغداد والے اس سے واقف نہ تھے۔ روزِ اول ہی سے مجھے امین پسند نہیں آیا۔ میری پسند و ناپسند سے قطع نظر زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنے والوں کو لوگ عموماً پسند نہیں کرتے۔

قصرِ خلافت میں وہ مجھے اترا کر چلتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے ہنسی آ گئی جب کوئی قوی الجثہ آدم زاد اس طرح چلتا ہے تو شاید اسے خود یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کس قدر مضحکہ خیز لگ رہا ہے۔

ہم جنات کی طرح آدم زادوں کی بھی الگ الگ قسمیں ہیں۔ اسی طرح ان کے نشست و برخاست کے انداز بھی علیحدہ ہوتے ہیں۔ کوئی کندھے جھوڑ کر چلتا ہے تو کوئی مٹکتا ہے۔ کسی کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ جدھر کی ہوا ہے ادھر ہی کو اڑ جائے گا۔ کوئی آدم زاد اس طرح قدم جما جما کر آگے بڑھتا ہے جیسے زمین اس کے پیروں سے چپکی ہو۔ امین اسی طرح چلنے کی ناکام کوشش کرتا۔ ایسے موقعوں پر عارج نے مجھ سے پوچھا۔ ''اے دینار! تو اتنے غور سے اس آدم زاد کو کیوں دیکھ رہی ہے؟''

''میری مرضی''۔ میں کہہ دیتی اور عارج اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔

غنیمت یہ تھی کہ اس روز وہ قصرِ خلافت میں نہیں تھا۔ ورنہ مجھے ''پکا'' دیتا۔ اسے غالباً یہ اندازہ تھا کہ کسی آدم زاد کے جسم میں اتر گیا تو پھر سکنڈ سے بھرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ وہ بغداد میں ہے یا نہیں! پل بھر میں ہم جنات کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں اور دور دور کی خبر لے آتے ہیں۔

اس روز نماز جمعہ امین نے پڑھائی۔ امین نے نماز کے بعد بغداد والوں کو ہارون کی

وفات سے آگاہ کیا اور اپنی خلافت کے لئے بیعت لی۔ اس نے بغداد کی جامع مسجد میں لوگوں سے حسن سلوک کا وعدہ کیا۔ نماز پڑھ کے وہ قصرِ خلافت میں چلا آیا۔ یہاں آ کر اس نے خاندان والوں سے بیعت لینے کے بعد سلیمان بن المنصور کو بلوایا۔ خلیفہ منصور کا بیٹا سلیمان، مامون اور امین کی ماں زبیدہ کا چچا تھا۔ اس رشتے سے وہ گویا امین کا دادا ہوا۔

جب امین جامع مسجد میں بیعت لے رہا تھا تو اسی کے ایک درباری نے سرگوشی کی تھی۔ ''اے امیر المومنین! ابھی مامون کا خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ ایسے میں آپ اس طرح مجمع عام میں بیعت نہ لیں''۔

چند ہی لوگ بیعت کر پائے تھے یعنی امین کو اپنی فرماں برداری کا یقین دلا پائے تھے کہ خطرہ محسوس کر کے وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے محافظ دستے نے حلقہ بنا لیا تھا۔ وہ اسی حلقے میں جامع مسجد سے نکل کر قصرِ خلافت میں پہنچا۔

یہ ساری باتیں میں نے اس لئے بتائیں کہ امین کی بزدلی کا اندازہ ہو سکے۔ ظالم عام طور پر بزدل ہی ہوتے ہیں! میری مراد ظالم آدم زادوں سے ہے۔ جنات سے ہرگز نہیں۔

منصور کا بیٹا سلیمان قصرِ خلافت میں آیا تو امین نے اس کی بزرگی کا خیال بھی نہ کیا اور گردن اکڑائے اپنی مسند پر سچ مچ کا خلیفہ بنا بیٹھا رہا۔ وہ اپنے دادا سے کہنے لگا۔ ''اے سلیمان! آپ کو فوج کے سرداروں اور عوام سے میری بیعت لینی ہے۔''

☆.....☆.....☆

''دادا صاحب'' بڑی بہاریں آتے جاتے دیکھ چکے تھے۔ انہیں خبر تھی کہ وہ ان کا پوتا نہیں' اقتدار بول رہا ہے جو بڑے بڑوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے۔ وہ اقرار میں سر ہلا کر چلتے بنے۔

ان دادا جی سلیمان کے جاتے ہی امین نے فوجیوں کو دو سال کی پیشگی تنخواہ دینے کا اعلان کیا۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! فوجیوں' ان کے سرداروں اور سالاروں سبھی نے پیشگی تنخواہ کا بھرپور ''خیر مقدم'' کیا۔ انہوں نے دھڑا دھڑ سلیمان کے ہاتھ پر امین کے لئے بیعت شروع کر دی۔ غرض کہ امین خلیفہ زادے سے بذات خود خلیفہ بن گیا۔ سو یوں بغداد میں خلیفہ محمد امین کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔

یہ آدم زاد بھی ڈنکا بجانے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ان سے کچھ اور بجے نہ بجے ڈنکا ضرور بجا لیتے ہیں۔ کسی کے نام کا ڈنکا بجاتے وقت یہ بالکل نہیں سوچتے کہ جس کا ڈنکا بجا رہے ہیں کبھی اس کا ڈنکا یا باجا بھی بجا سکتا ہے! میں نے تو یہی دیکھا' سنا اور محسوس کیا۔ کسی جن زاد یا جن زادی کو کوئی اور ''تجربہ'' ہو تو ہوا کرے' اس سے میری ''صحت'' پر اثر نہیں پڑتا۔

امورِ سلطنت سے بے پروائی اور تفریحی مشغلوں سے امین کی دلچسپی کا اندازہ سیانے آدم زادوں کو دوسرے ہی دن ہو گیا۔ مسندِ خلافت پر بیٹھے ابھی امین کو ایک ہی دن گزرا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ قصرِ ابوجعفر کے گرد چوگان اور دوسرے کھیل تماشوں کے لئے میدان بنایا جائے۔

ذاتی طور پر مجھے کھیل تماشے پسند ہیں مگر آدم زادوں کو اگر کھیل نہیں تو تماشے مہنگے بھی پڑ جاتے ہیں اور وہ خود تماشا بن جاتے ہیں۔ تماشائی کا سوانگ بھرنے سے کچھ نہیں ہوتا' سودائی بن جانا پڑتا ہے۔ سودائی دیوانے کو کہتے ہیں۔ شاعر آدم زاد خود کو دیوانہ یعنی پاگل کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔ میں بھلا ان دیوانوں کا کیا بگاڑ سکتی ہوں! پاگل پن کو اگر کوئی عاشقی کہتا ہے

تو مجھے کیا! یہ الگ بات کہ ان معنوں میں تھوڑی تھوڑی ''پاگل'' میں بھی تھی۔ شاید عشق اور دیوانگی ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں جیسے عارج اور میں لازم و ملزوم ہیں۔ میں سودائی سہی' لیکن خلیفہ امین ''سودائی'' نہیں تھا! نہ سودائی' نہ شاعر!

میں نے تو اسے بچپن سے دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ ناموزوں شعر ہی کہتا تھا۔ اس ضمن میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا تھا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے کہ جب ہارون زندہ تھا۔

ابونواس اس عہد کا ایک اہم شاعر تھا۔ ہارون نے اسے نوازنے کیلئے امین کا استاد مقرر کر دیا۔ ایک دفعہ ابونواس نے اپنی جان چھڑانے کے لئے ہمت کر کے امین سے کہہ دیا۔

''اے خلیفہ زادے! آپ نے ابھی جو اشعار سنائے' ناموزوں ہیں''۔

بس پھر کیا تھا' امین بھڑک اٹھا۔ اس نے ابونواس کو قید خانے میں ڈلوا دیا۔ میرے علم میں یہ واقعہ تھا' سو میں نے ہارون کو ''سنکار'' دیا۔ ہارون نے پتا کرایا تو ''خبر'' صحیح نکلی۔ اس نے خود کو ''باخبر'' ظاہر کرنے کے لئے امین کو طلب کیا' ای کے ساتھ ابونواس کو قید خانے سے نکلوا کر قصرِ خلافت میں بلوا لیا۔

''امین شعر سناؤ!'' ہارون بولا۔

تعمیلِ حکم کی غرض سے امین نے کہا ''اے امیر المومنین! ابھی شعر عرض کرتا ہوں''۔

امین نے ابھی ایک ہی ناموزوں شعر پڑھا تھا کہ ابونواس اپنی جگہ سے اٹھنے لگا۔

''کہاں چلے ابونواس؟'' ہارون نے پوچھا۔

''قید خانے''۔ ابونواس نے جواب دیا۔

یہ وہ امین تھا کہ جس کا باپ ہارون' ماں زبیدہ اور سوتیلا بھائی مامون سبھی موزوں شعر کہتے تھے۔ ان میں سے کوئی ''بے بحرا'' نہ تھا' مگر امین ''بے بحرا'' اور ''بے بہرہ'' دونوں ہی تھا۔ شعر بحر میں نہ کہتا' یوں گویا وہ شاعری سے بے بہرہ ہی تھا۔ اس کے باوجود اسے وہ سارے شوق تھے جو خلیفہ ہونے کے لئے اس وقت لازم سمجھے جاتے تھے۔ غالباً اسی ''ٹھرک'' میں امین نے مختلف علاقوں میں فرامین بھیجے کہ اربابِ نشاط جہاں جہاں ہوں ان کی تنخواہیں مقرر کر دی جائیں اور انہیں دارالخلافہ بغداد روانہ کیا جائے۔

اس پر مجھے شرارت سوجھ گئی۔ عارج سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا تو بھی اربابِ نشاط میں شامل ہو جا!''

''وہ تو میں پہلے سے ہوں اے دینار!'' عارج بولا۔

''اب تک تو کہاں ذولتا پھر رہا تھا؟ کہاں سے آ رہا ہے؟''

میں نے موضوع گفتگو بدل دیا۔

"خراسان کے دارالحکومت مرو سے سیدھا چلا آ رہا ہوں"۔ عارج نے جواب دیا۔

میں چونک اٹھی کیونکہ مامون مرو ہی میں تھا۔

اب مجھے کسی طرح عارج کو شیشے میں اتار کے مامون کا حال احوال معلوم کرنا تھا میں جانتی تھی کہ وہ سیدھے سبھاؤ کچھ نہیں بتائے گا۔ اس کو سوچ کے میں نرمی سے بولی! اے عارج! تیرے بغیر یہاں میرا جی ہی نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے بغداد سونا سونا معلوم ہوتا تھا"۔

"اے دینار! کاش تو سچ بول رہی ہوتی!"۔

"اچھا تو مجھے جھوٹا سمجھ رہا ہے!"۔ میں نے عارج کو دوسری طرح گھیرنا چاہا۔

"میں کچھ نہیں سمجھ رہا' تو گھڑی گھڑی رنگ نہ بدل"۔ عارج نے کہا۔

"ایک شرط ہے اس کی" میں نے پھر پینترا بدلا۔ "تو مجھے اپنے غائب رہنے کی پوری روداد سنا دے، ٹھیک ٹھیک بتا دے کہ مرو میں کس جن زادی کے ساتھ وقت گزارا؟"

"مجھ پر یہ الزام لگاتے ہوئے کچھ خدا کا خوف کر اے دینار! میں تو صرف اور صرف تیرا تابعدار ہوں، قسم لے لے کہ تیرے سوا کبھی کسی جن زادی کو آنکھ اٹھا کر دیکھا ہو۔ میرے مرو جانے کا مقصد تو کچھ اور ہی تھا"

"وہی تو میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"اچھا بتاتا ہوں۔" عارج راضی ہو گیا۔ ہم دونوں دریائے دجلہ کے کنارے ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں آدم زادوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد عارج کہنے لگا۔ "تجھے ایک لطیفہ سناؤں اے دینار!...... ایک فضل اگر یہاں بغداد میں ہے اور امین کا ہم نوا ہے تو وہاں مرو میں بھی مامون کے ساتھ دوسرا فضل موجود ہے۔ یہاں والے کا نام فضل بن ربیع ہے اور وہاں والا فضل بن سہل کہلاتا ہے۔"

"اے عارج! تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ لطیفے میں ہنسنے کا مقام کون سا تھا!" میں بولی۔ "عرب آدم زادوں میں بھی نسب چلتا ہے اگر ایک اللہ کا بندہ ہو، یعنی عبداللہ تو جسے دیکھو اسی پر اصرار کرے گا کہ وہ بھی اللہ کا بندہ۔ یہی سبب ہے کہ عرب عام طور پر اپنے باپ کا نام ساتھ لگاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مامون ہی کو دیکھ لے، عبداللہ ہی نام ہے نا اس کا!..... بن، ابن یا بن ال یہ سب درمیان کے پیوند ہیں تجھے تو خبر ہے کہ عرب سے باہر ہندوستان وغیرہ میں یہ شوق نہیں پایا جاتا یا یوں کہہ لے کہ آئندہ نہیں پایا جائے گا انہی بن اور ابن سے بچنے کا ایک اور طریقہ بھی عربوں ہی نے نکالا ہے، یعنی کنیت اور لقب!..... مامون بھی لقب

ہی تو ہے۔ اس حد تک تیری بات ماننے والی ہے کہ ایک سے ناموں سے الجھن ضرور ہوتی ہے۔ ابھی خبر آئی کہ گویا ایوب مارا گیا، ابھی اطلاع ملی کہ ایوب نے کسی کو مار ڈالا۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی آدم زاد قاتل اور مقتول نہیں ہو سکتا، وہ بھی بیک وقت!...... اب ان عرب آدم زادوں کو کون سمجھائے کہ اونٹنی کی عمر کے مطابق تو اس کے درجنوں نام رکھ دیں گے مگر جب اپنی باری آئے گی تو ہر پھر کے ایک سے ناموں کا گھوٹا لگاتے رہیں گے۔ خیر ہم جنات کو کیا۔ آدم زاد ٹھہرے اشرف المخلوقات اور ہم...... ہاں یہ بتا کہ مامون کا کیا حال ہے؟"

"بے حال ہے۔" عارج نے جواب دیا۔ "حکومت پر اصل قبضہ فضل بن سہل کا ہے۔ مامون نے سارے اختیارات اسی کو دے رکھے ہیں۔"

"پھر تو اس کی خیر نہیں اے عارج! ہارون کو جب خلافت ملی تھی، یاد ہے تجھے کہ اس نے یحییٰ برمکی سے بھی یہی سلوک کیا تھا۔ کیا نتیجہ نکلا اس کا تو جانتا ہی ہے...... ہاں مجھے برامکہ کے ذکر پر ایک اور فضل یاد آ گیا...... فضل برمکی، وہی جو ہارون کا دودھ شریک بھائی ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ وہ بھی اللہ کو پیارا ہو چکا ہے؟"

"کب اے دینار؟..... اس کی عمر ہی کیا تھی؟" عارج بولا۔

"عمر کو چھوڑ...... فضل برمکی، ہارون سے بھی چھ ماہ چھوٹا نکلا۔ محرم کے مہینے میں، اسی سال (193 ہجری) تو مرا ہے۔

وہ؟ یوں ہارون سے عمر میں کم ہوا، نا!..... رقہ کے قید خانے میں اس کی زندگی کے آخری ایام گزرے کہ جسے ہارون اپنا بھائی کہتا تھا۔ بھلا بھائیوں کو کوئی یوں سزا دیتا ہے!..... فضل بن سہل کی بات کر رہا تھا تو اس کا کوئی لقب بھی ہوگا۔"

"ذوالریاستین لقب ہے۔" عارج نے جواب دیا۔

"تو گھال میل سے بچنے کے لئے مامون کے وزیر سلطنت فضل کو تو آئندہ اس کے لقب ہی سے پکاریو اے عارج!"

"اور کوئی حکم اے ملکہ جنات!" عارج نے یہ الفاظ اس طرح ادا کیے کہ میں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ میں نے کہا۔ "سن اے بے خبر! ہم ملکہ وَلکہ کچھ نہیں، سردار زادی ہیں اور یہی رہنا چاہتی ہیں۔ تیرے لئے سردار اہضم کی بیٹی کا حکم اب یہ ہے کہ مرو کا حال بیان کر!"

"غلام عرض کرتا ہے اے سردار زادی!"

اس وقت عارج اور میں "آدم زاد" کھیل رہے تھے جب ہم ہنس بول چکے تو پھر

اصل موضوع پر آ گئے۔

"فارس والے مامون کو اپنا بھانجا کہنے لگے ہیں اے دینار!"

"ٹھیک تو کہتے ہیں۔ مامون کی ماں ایرانی نسل سے ہی تھی، مراجل۔ یہ بتا اے عارج کہ جب مامون کو حالات کی خبر ملی تو اس نے کیا کیا؟" میں نے معلوم کیا۔

"اس نے وہی کیا جو ایسے موقعوں پر آدم زاد کرتے ہیں، یعنی فوج کے سرداروں اور امرا کا اجلاس بلا لیا۔" عارج بتانے لگا۔ یہ وہ سرداران لشکر تھے جنہیں ہارون نے مامون کے ساتھ کیا تھا۔ مثلاً عبداللہ بن مالک، یحییٰ بن معاذ، شعیب بن حمید، علاء موالی وغیرہ۔ فضل...... میرا مطلب ہے ذوالریاستین تو وہاں تھا ہی۔"

"اس اجلاس کی کارروائی سنا۔"

"سب کچھ بتا دوں تجھے!..... ناراض نہ ہو، میں نے جو دیکھا بتاتا ہوں۔ مامون نے اس اجلاس میں جمع کیے جانے والوں سے صلاح پوچھی۔ سبھی سوائے ذوالریاستین کے ایک زبان ہو کر بولے، دو ہزار سوار ساتھ ہوں تو ہم اس فوج کو واپس لا سکتے ہیں جو طوس میں آپ کے محترم والد کے ساتھ تھی اور جس کے بارے میں پتا لگا ہے، بغداد کوچ کر رہی ہے اس پر مامون نے ذوالریاستین کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وزیر سلطنت نے ایک مخصوص اشارہ کیا۔ اس اشارے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اجلاس میں نہیں خلوت میں بات کرے گا۔ مامون نے اشارہ ملتے ہی اجلاس کسی فیصلے کے بغیر برخاست کر دیا۔ امرا و سردار چلے گئے تو تنہائی میں ذوالریاستین بولا، ابھی ہمارے لشکر اور بغداد کے لشکر کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مرحوم خلیفہ ہارون الرشید کے ساتھ بہت بڑا لشکر تھا، اسے دیکھتے ہوئے ہمارے پاس گنتی کے آدمی ہیں۔ یہ سردار جو ابھی اجلاس میں ڈینگیں مار رہے تھے، جب ان کا مقابلہ لشکر بغداد سے ہو گا تو چوکڑی بھول جائیں گے۔ جب یہ شکست کھا کر اپنی جان سے ناامید ہوں گے تو حضور کو امین کے حوالے کر دیں گے کہ اس کارگزاری کے صلے میں اپنی جانیں بچا لیں۔ اگر حضور کو یہی منظور ہے تو پہلے بغداد کی طرف کوچ کرنے والے لشکریوں کے سرداروں کا ارادہ معلوم کر لیا جائے۔ یہ سن کر مامون چپ ہو رہا اور "تم جانو" کہہ کر اندر محل میں چلا گیا۔"

عارج کے خاموش ہوتے ہی میں بول اٹھی۔ "گویا مرو سے کوئی قاصد بغداد آنے والا ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر؟" اس نے سوال کیا۔

"تو یہ بھول جاتی ہے کہ لشکر کا ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا کس قدر مشکل ہوتا ہے!"

"اچھا تو طوس سے جو لشکر بغداد کے لئے روانہ ہوا وہ کہاں ہے؟" میں کسی قدر جھلا گئی۔

""""نیشاپور پہنچنے والا ہے۔" عارج نے جواب دیا۔ "اگر تو کہے تو نیشاپور چلتے ہیں۔"

"مجھے اپنا دم چھلا نہ بنا اور ایسا کر کہ تو وہاں کی خیر خبر رکھ، میں یہاں بغداد میں رہتی ہوں۔ اس طرح تیرے شوق آوارگی کو بھی تسکین ملتی رہے گی۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"اے دینار!" تیرے بغیر آوارگی میں بھلا کیا خاک مزہ آئے گا، مگر تیرے بے حد اصرار پر......"

"اپنی طرف سے باتیں نہ جوڑ! میں نے تجویز پیش کی ہے، تجھ سے بے حد اصرار نہیں کیا۔"

"ایک ہی بات ہے۔" عارج شرارت پر آمادہ ہوتے ہوتے سنبھل گیا اور بولا۔ "میں تجھے ایک اہم بات بتانا تو بھول ہی گیا۔"

"بول!"

"مامون نے رافع اور ہرثمہ کے قصور معاف کر دیے ہیں وہ مامون کے وفادار بن گئے ہیں دیکھ لے دینار کہ وقت کا پہیہ کس طرح الٹا گھومنے لگتا ہے اور سن! علی بن عیسیٰ جسے ہارون نے معزول کر دیا تھا، وہ بھی اب مامون کے وفاداروں میں ہے اسے مامون نے دوبارہ بحال کر دیا ہے۔ یہ سارا قصہ دراصل مامون کا نہیں، اس کے بااختیار وزیر سلطنت ذوالریاستین کا ہے۔ مامون کا تو صرف نام استعمال کیا جا رہا ہے۔" عارج یہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔ اسے نیشاپور پہنچنا تھا۔

ریاست کی جمع ریاستیں اور ذوالریاستین کا مطلب دو ریاستوں والا ہے۔ وزیر سلطنت کو اس لقب سے پکارے جانے میں بھی سیاست تھی اس طرح گویا مامون، امین کی حدود مملکت پر بھی اپنا دعویٰ جتا رہا تھا یعنی اس کا وزیر سلطنت یا وزیراعظم (سب سے بڑا وزیر دو ریاستوں کا منتظم اعلیٰ تھا۔ وزارت سب سے بڑا منصب کہلاتا۔ وزیراعظم عموماً اس کوشش میں رہتا کہ خلیفہ کو اپنا آلہ کار بنا لے۔ یہی کوشش فضل بن سہل (ذوالریاستین)) کر رہا تھا۔

وزارت کے مختلف درجے تھے۔ ہر محکمے کے وزیر الگ الگ مقرر تھے، مثلاً وزیر الحرب (وزیر دفاع یا وزیر جنگ)، وزیر الخراج (وزیر خزانہ)، ان سب سے بالاتر وزارت

اعظم کا منصب تھا عموماً وزارت حرب کا قلم دان، وزیر اعظم خود اپنے پاس رکھتا تھا۔ یوں اسی کو سپہ سالار اعظم بھی کہا جاتا۔ افواج کی کمان وہی کرتا کیوں کہ فضل بن سہل کو دو ریاستوں کی وزارت کا لقب ملا تھا اس نے اسی سبب بعد میں اپنے خیمے کے سامنے نصب کئے جانے والے پرچم کی خاطر ایسا نیزہ بنوایا جس کے دو پھل تھے۔ آدم زاد خود کو دوسرے آدم زادوں سے نمایاں کرنے کے لئے سر کے بل کھڑے ہونے میں بھی کوئی عار نہیں سمجھتے۔

فضل بن سہل کے بارے میں مجھے ایک بات اور بھی معلوم ہوئی کہ وہ مجوسی تھا۔ مجوسی، مجوس کا واحد ہے۔ یہ لفظ جمع ہے۔ اس آدم زاد کو مجوسی کہتے ہیں جو آتش پرست (زردشت کا تابع، پارسی) ہو۔

ہارون کے دربار میں کیونکہ ہر مذہب و ملت کے لوگ تھے اس لئے ایک مجوسی (فضل بن سہل) کو بھی موقع مل گیا۔ مسلمان صرف صلاحیت دیکھتے تھے۔ بندہ اہل ہونا چاہئے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ خاص طور پر ہارون کے زمانے میں اس رجحان کو بڑی تقویت ملی۔

190 ہجری میں جب کہ ہارون زندہ تھا، پہلی بار اسے فضل بن سہل کی بابت بتایا گیا کہ بڑا لائق ہے۔ اسی کے ساتھ یہ تجویز بھی ہارون کو دی گئی کہ اس مجوسی کو مامون کا مصاحب بنا دیا جائے۔

بہ طور امتحان ہارون نے فضل مجوسی کو دوبار میں طلب کیا۔ اس پر ہارون الرشید کے دربار کی عظمت و جلال کا ایسا اثر ہوا کہ ہکا بکا رہ گیا۔ آداب و سلام کے معمولی الفاظ بھی اس سے ادا نہ ہوئے۔

اس پر ہارون نے اپنے وزیر سلطنت کی طرف دیکھا جو ربیع کا بیٹا فضل تھا۔

''اے امیر المومنین! غلام کی سعادت کی یہ بڑی دلیل ہے کہ آقا کی ہیبت سے اس کی زبان گنگ ہو جائے۔'' ابن ربیع نے آگے بڑھ کر ادب سے کہا۔

ہارون پھڑک اٹھا اور ابن ربیع کے انتخاب کو پسند کیا۔

یوں فضل مجوسی (ذوالریاستین)، مامون کا ندیم خاص رہا۔ اسی بنا پر مامون نے ابتدا میں اسی کو اپنا بااختیار وزیر سلطنت بنایا۔ اس سے قطع نظر کہ اس کا مذہب کیا تھا، وہ ایک لائق آدم زاد تھا۔

اس کا ذکر چھڑ گیا تو میں کچھ اور بھی بتا دوں تاکہ تصویر کے دونوں رخ سامنے آ جائیں۔

فضل (مامون کا وزیر سلطنت) علم نجوم کا بہت بڑا ماہر تھا۔ علم نجوم صحیح ہو یا غلط، مگر فضل

کی کچھ پیش گوئیاں قطعی درست ثابت ہوئیں۔ اس نے اپنی بابت بھی پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں آگ اور پانی کے درمیان اڑتالیس (48) برس کی عمر میں قتل کیا جاؤں گا۔ عجب سا لگتا ہے کہ اس آدم زاد کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ چونکہ وہ حمام میں مارا گیا تھا اس لئے اس کی یہ پیش گوئی پورے طور پر تسلیم کی گئی۔ فضل کے قتل کا واقعہ اپنے مقام پر عرض کیا جائے گا۔ ابھی تو میں 193 ہجری کے وسط سے آگے نہیں بڑھی۔

خود پرستی ذوالریاستین (فضل) کے مزاج میں داخل رہی۔ اگر اس عیب کو درگزر کر دیا جائے تو اس میں بڑی خوبیاں بھی تھیں ورنہ ہارون اسے اپنے عزیز از جان بیٹے مامون کے قریب پھٹکنے بھی نہ دیتا۔ فیاض، مدبر، فرزانہ، علم دوست یہ صفات اس آدم زاد کی ہیں جو مامون کی حدود مملکت میں سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ اس نے اپنے بھائی حسن بن سہل کو بھی ساتھ لگا رکھا تھا۔ اپنی پراسرار داستان کو میں نے فضل مجوسی کے ذکر سے پہلے جہاں چھوڑا تھا، وہیں سے جوڑتی ہوں۔

دوسرے دن عارج، نیشاپور سے بغداد لوٹ آیا۔ بغداد کی طرف کوچ کرنے والا لشکر طوس سے گزشتہ رات ہی کو نیشاپور پہنچا تھا۔ صبح ہوئی تو مرو سے روانہ کئے گئے وہ قاصد صاعد اور نوفل ربیع کے بیٹے فضل سے ملے۔ یہ دونوں قاصد، مامون کے خادموں میں شامل تھے۔ ان کا انتخاب ذوالریاستین نے کیا تھا۔

عارج نے سارا نقشہ اپنے الفاظ میں یوں کھینچا کہ مجھے لگا، خود سب کچھ دیکھا ہو۔

بہ قول عارج ہوا یہ کہ مرو سے مامون کے دونوں خادم جب فضل بن ربیع سے ملے تو وہ عیار آدم زاد کہنے لگا۔ ''میں ہی اکیلا کیا اس لشکر میں ہوں جو مامون نے مجھے خط لکھا ہے!''

فضل بن ربیع کے علاوہ فوج کے دیگر اہم سرداروں کے نام بھی مامون کے خط، صاعد اور نوفل کے پاس تھے۔ ان میں سے ایک عبدالرحمٰن تھا۔ غریب ساعد جب عبدالرحمٰن کے پاس پہنچا تو گھبرا گیا۔ عبدالرحمٰن نے ساعد کو گھسیٹ کر زمین پر گرا لیا اور نیزہ مارنے کا قصد کیا، پھر جانے کیا سوچ کر ایسا نہیں کیا۔ اس نے ساعد کے سینے پر پاؤں رکھ دیا اور نیزے کا پھل دکھا کر بولا۔ ''اگر تیرا آقا (مامون) یہاں ہوتا اور مجھ سے اپنی فرماں برداری کے لئے کہتا تو اس کے سینے پر پاؤں کے بجائے اپنا نیزہ رکھ دیتا۔'' یہ کہہ کر عبدالرحمٰن، مامون کو گالیاں بکنے لگا۔

اس پرخطر ''واردات'' کے بعد دونوں خادموں میں کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ دیگر سرداران فوج سے ملتے اور انہیں مامون کے خطوط پہنچاتے۔ وہ بہ ہزار خرابی اپنی جان بچا کر لشکر سے نکل گئے۔

جب عارج یہ سب کچھ بیان کر چکا تو مجھ سے پوچھا ''جاؤں!...... تاکہ نت نئی خبر لاؤں؟''

''جا مگر نت نئی خبر کے بہانے کہیں اور نہ کھسک لیجیو!''

''تجھے اگر مجھ پر بھروسا نہیں تو نہ بھیج! خود ہی تو کہہ رہی تھی کہ......'' اچھا بھروسا ہے بس! میں بول اٹھی۔

پھر ''خدا حافظ'' کہتے ہی عارج چمپت ہوگیا۔ میں اترا کر چلنے والے امین کے پاس جا پہنچی۔ اس نے قصر خلافت میں ادھم مچا رکھا تھا۔ گویا اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی تھی یا یوں کہہ لیں کہ بندر کے ہاتھ ادرک! اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ جانے کیا سے کیا کر بیٹھتا۔ آج رقہ سے اس کی ماں زبیدہ خاتون نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ جلد بغداد پہنچ رہی ہے۔ اس بیوہ آدم زادی زبیدہ ہی کے پاس سارا خزانہ تھا جسے ساتھ لئے وہ بغداد آنے والی تھی۔

امین کی خوشی کا اصل سبب یہ خزانہ ہی تھا۔ فوجیوں سے دو سال کی پیشگی تنخواہ کا وعدہ پورا ہو جاتا، اگر خزانہ بغداد تک حفاظت کے ساتھ پہنچ جاتا۔

ہارون کی بیوی زبیدہ بڑی ہوشیار، ذہین اور مصلحت وقت کا صحیح اندازہ لگانے والی آدم زادی تھی۔ امین کی ماں ہونے کے باوجود اس میں عقل تھی۔ وہ بھلا خزانے کی حفاظت سے کیسے غافل ہو جاتی! غرض کہ وہ سابق دارالحکومت انبار تک پہنچ گئی اور امین اس کے استقبال کو وہاں پہلے ہی پہنچ گیا۔

زبیدہ بغداد آئی تو گویا امین کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنی ''امی حضور قبلہ'' کو ساتھ لیے قصر خلافت میں یوں داخل ہوا جیسے پوری دنیا کو فتح کر کے آ رہا ہو۔ میں قصر خلافت ہی میں تھی مگر کسی آدم زادی کا جسم نہیں اپنایا تھا۔ ابھی کچھ خبر نہ تھی کہ نیشاپور سے لشکر کب تک بغداد پہنچے گا۔ عارج دو روز سے غائب تھا۔ میں اس کی تلاش میں جانے ہی والی تھی کہ وہ ''ٹپک'' پڑا۔

''اب تو کہیں نہیں جائے گا، یہیں بغداد میں میرے ساتھ رہے گا!'' میں نے غصے میں کہہ دیا۔

''آگ سے بنی ہوئی اے جن زادی! تیرے غصے سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔'' عارج شوخ آواز میں بولا۔ ''اگر تیرا یہی حکم ہے تو یہ جن زادہ اب تیرا فراق نہیں جھیلے گا۔''

اس کے بعد چند روز اور گزرے ہوں گے کہ طوس سے لشکر بغداد پہنچ گیا۔ عارج اور میرے انسانی قالب، یعنی اسحاق و کلثوم بھی بغداد آ گئے۔ چند روز کے لئے مجھے آدم زادیوں

کے جسموں میں قید ہونے سے نجات ملی تو فوری طور پر دوبارہ پابندی کو جی نہ چاہا۔ عارج تو پہلے سے تنگ تھا۔ میں نے اس سے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو کھل اٹھا۔

''اے دینار! تو بہت اچھی ہے۔''

''یہ تو مجھے کوئی اطلاع دے رہا ہے؟''

''نہیں۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ کسی آدم زاد یا آدم زادی کے بدن پر قبضہ کئے بغیر بھی ہم اپنا کام چلا سکتے ہیں۔'' عارج نے کہا۔ جواباً میں کچھ نہیں بولی کہ عارج مزید نہ ''پھیلنے'' لگے۔ ہم جب چاہتے قصر خلافت میں جا گھستے اور جب جی میں آتی وہاں سے نکل آتے۔ اب ہمیں عفریت و ہموش کی طرف سے خطرہ نہ تھا۔ عالم سوما ہماری پشت پناہی کے لئے مستور تھا۔

کسی انسانی پیکر میں ''بند'' نہ ہونے کا ایک فائدہ مجھے یہ ہوا کہ مامون کے حالات سے بھی واقف رہی۔ عارج کی جو حیثیت اس سے قبل تھی، گویا بحال ہوگئی۔ وہ اور بھی میرا ''عاشق صادق'' ہوگیا۔ اس پر میں نے ایک دن عارج کے وجود کو ''موم کی ناک'' سے تشبیہ دے دی تو ''بھڑکا'' گیا، بولا۔ ''میں موم دوم بالکل نہیں، تیری ہی طرح آگ سے بنا ہوں۔''

''میں تو یہ بات بھول ہی گئی تھی۔'' میں ہنس دی تو وہ بھی ''تھقیانے'' لگا۔

ہنسی ہنسی میں ایک دن امین کے میں نے چپت جڑ دی۔ وہ اچھل کر ادھر ادھر دیکھ کر ڈر گیا۔ اس کے پاس غلام کوثر کے سوا کوئی نہ تھا۔ امین کو اس سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اسے ''چپتیا'' دے گا، سو ہڑبڑا کے رہ گیا۔

''کیا ہوا میرے آقا؟'' کوثر بولا۔

''کچھ نہیں، چپ رہ!''

دراصل میں نے بلاوجہ امین کو نہیں ''ستایا'' تھا۔ اس نے فضل بن ربیع کو طلب کیا تھا۔ اس کے دماغ میں جو کھچڑی پک رہی تھی، مجھے معلوم تھی۔ فضل کچھ ہی دیر میں حاضر خدمت ہوگیا۔

''اے امیر المومنین! حکم فرمایئے۔'' فضل تعظیم بجالا کے کہنے لگا۔

''تمہیں خبر ہے کہ ہمیں دریا میں سیر کا بہت شوق ہے، پھر تم نے اب تک ہمارے لئے کشتیاں کیوں نہیں بنوائیں؟''

جواب طلبی پر فضل چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ ''امیر المومنین نے اس غلام کو اب تک اپنی پسند سے آگاہ نہیں کیا۔''

''پسند سے کیا مطلب ہے تمہارا؟'' امین نے سوال کیا۔

”طرح طرح کی کشتیاں بنائی جاتی ہیں اے امیر المومنین!.... حضور کس وضع......“

امین نے فضل کی بات کاٹ دی۔”معلوم ہے ہمیں...... ہاتھی، عقاب، سانپ، شیر اور گھوڑے سے ملتی ہوئی کشتیاں بنواؤ!“

فضل جھٹ سے بول اٹھا۔”امیر المومنین کے حکم کی تعمیل ہوگی۔“

امین نے اسے رخصت کا اشارہ کردیا۔ میں سوچنے لگی، امین اگر فضل سے کہتا کہ ”ہم تمہاری پیٹھ پر بیٹھ کر دریا کی سیر کریں گے“ تو شاید فضل اپنی جان بچانے کے لئے اس پر بھی آمادہ ہو جاتا۔ آدم زاد بڑی جلدی سنک جاتے ہیں، خصوصاً حکمراں! جب امین کے حکم پر مطلوبہ کشتیاں بن کر تیار ہوگئیں تو وہ ان میں بیٹھ کر پانی کی سیر کو جانے لگا۔ عموماً وہ شیر سے مشابہ کشتی میں بیٹھتا اور یہ نہ سوچتا کہ درندہ نہیں آدم زاد ہے۔ ان صحبتوں میں اسے مامون کا خیال تک نہ رہا، لیکن فضل بن ربیع چوکنا دکھائی دیتا۔ اسی نے امین کو اس بات پر آمادہ کیا کہ بحیثیت خلیفہ، مامون کو معزول کردے، مگر امین نے انکار کردیا۔

فضل کو ڈر یہ تھا کہ مامون کو اقتدار مل گیا تو اس کی خیر نہیں۔ اس نے اسی لئے امین سے کہا۔”اے امیر المومنین! جو بیعت تمام ملک سے لی گئی وہ آپ کے لئے تھی۔ ایسی صورت میں خلیفہ مرحوم ہارون الرشید کو اس میں کسی تبدیلی کا اختیار نہ تھا۔“

یہ بات امین کے دل میں اتر گئی۔ فضل سے خلوت میں ملاقات کے بعد اگلے روز اس نے دربار میں اظہار کیا۔”آج سے مامون کو معزول کرتے ہیں۔ ہمارا ولی عہد زادہ موسیٰ بن امین ہوگا۔“

دربار میں اگرچہ زیادہ تر وہی لوگ تھے جو امین کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے، پھر بھی میں نے ایک درباری عبداللہ بن حازم پر ”کام“ دکھادیا۔ وہ میرے زیر اثر دربار میں بڑی بے باکی سے بولا۔”آج تک کسی نے عہد شکنی نہیں کی اے امیر المومنین!.... آپ یاد رکھیں کہ یہ روایت آپ قائم کررہے ہیں۔“

اس پر امین خفا ہوکر بولا۔”عبدالملک تجھ سے زیادہ عقل والا تھا۔ اس کا قول ہے کہ جنگل میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔“

فضل بھی دربار میں موجود تھا، امین سے کہنے لگا۔”اے امیر المومنین! بہتر یہ ہوگا کہ فوج کے افسران کو بھی طلب کرلیا جائے۔“

امین نے اقرار میں سر ہلادیا۔

اہم افسران فوج دربار میں آ گئے تو خزیمہ کو میں نے اپنا ہدف بنایا۔ اس نے صاف

الفاظ میں کہا۔”امیر المومنین اگر مامون سے کیا گیا عہد توڑتے ہیں تو ہم فوجی افسروں سے بھی اپنی نسبت کچھ امید نہ رکھیے۔“

وقتی طور پر امین اپنے ارادے سے باز رہا، لیکن فضل کا ”جادو“ کیسے بے اثر جاتا۔

چند ہی روز بعد پوری مملکت میں احکام بھیج دیئے گئے کہ خطبوں میں مامون کے بجائے موسیٰ بن امین کا نام پڑھا جائے۔ خود کو تاریخ کس طرح دہراتی ہے، موسیٰ بن امین کی ولی عہدی کا اعلان اس کا ثبوت تھا۔ یہی کوشش ہارون کے بڑے بھائی ہادی نے بھی کی تھی۔ ہادی کا بیٹا بھی کم عمر تھا اور یہی معاملہ موسیٰ بن امین کے ساتھ تھا۔

مامون دھیرے دھیرے قوت پکڑ رہا تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اپنے وزیر مملکت فضل مجوسی کے جال سے نکل جائے۔ فضل مجوسی کے ایما پر مامون نے اعلانیہ اس کی مخالفت شروع کردی۔ خراسان والے اس کے ساتھ تھے۔

امین نے بنو عباس ہی کے ایک شہزادے کو مامون کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا کہ مامون، اس کے بیٹے کو ولی عہد تسلیم کرے۔ مامون نے صاف انکار کردیا، اس کے باوجود امین ملک گیری کی ہوس میں مبتلا رہا، اس نے بغداد سے مرو تک قاصدوں کا تانتا باندھ دیا، اپنی ماں زبیدہ کی طرف سے بھی امین کوشاں تھی۔

قاصدوں کے ذریعے بھیجے گئے پیغامات میں سے ایک پیغام میں امین نے خراسان کے بعض اضلاع طلب کئے۔ اس پیغام کو پڑھ کر مامون کو غصہ تو آیا مگر پی گیا، وقت کا یہی تقاضا تھا۔

”امین کو اس طرح کی خواہشوں سے باز آنا چاہئے۔“

میں سمجھ رہی تھی کہ یہ کارروائیاں جنگ کا دیباچہ ہیں۔

اسی بنا پر مامون نے احتیاطاً اپنی حدود مملکت میں فرامین بھیجے کہ کوئی شخص جب تک سند اجازت نہ رکھتا ہو یا مشہور تاجر نہ ہو ممالک محروسہ میں داخل نہیں ہوسکتا اس نے فوجی افسروں کو تاکید لکھی کہ سرحدی مقامات پر معمول سے زیادہ فوج اور سامان جنگ تیار رہے، طاہر بن حسنی ایک جنگ جو افسر تھا اسے حکم ملا کہ جس قدر جلد ممکن ہو فوج اپنے ساتھ لے کر دشمن کو روکے۔ آدم زاد طاہر یک چشم تھا، اس وجہ سے کبھی کبھار اپنے ساتھیوں کے مذاق کا نشانہ بھی بنتا رہتا۔

”ہمارا دوست طاہر سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے، انصاف تو ختم ہے اس پر“ کوئی کہتا، اسی بات کو دوسرا دوست دوسرے لفظوں میں کہہ دیتا اور طاہر جل بھن کر رہ جاتا۔

ایسے موقعوں پر عموماً ایک فرضی قصہ سناتا جس سے آنکھ کا ضائع ہونا اور بہادری دونوں ہی کا اظہار ہوتا۔ طاہر بن حسین کا کہنا اپنی جگہ لیکن اس فطری محرومی نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ "میں کچھ بن کے دکھاؤں گا۔" اسے بچپن ہی سے یہ "جنون" تھا۔ فضل مجوسی کو اس "جنون" کی خبر تھی۔ سو اس نے مامون کو طاہر کا نام تجویز کیا۔

امین تو کسی بہانے کی تلاش میں تھا۔ مخبروں نے جب یہ خبریں پہنچائیں کہ سرحد پر مامون کی فوج نقل و حرکت کر رہی ہے تو بھڑک اٹھا۔

"یہ تو سراسر گستاخی ہے۔ کیوں فضل؟"

ربیع کا بیٹا تو گویا اس پر تلا بیٹھا رہتا تھا کہ کب امین کی تائید کا موقع ملے، وہ مفسد بولا "جی امیر المومنین! آپ کو مامون کی گستاخیاں برداشت نہیں کرنی چاہئیں اس موقع پر یہ غلام ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہے۔"

"اجازت ہے" امین نے اکڑ کر کہا۔

جب اہل دربار متوجہ ہو گئے تو فضل بلند آواز میں بولا۔ "امیر المومنین کے اس غلام نے اپنے دیرینہ رفیق علی بن عیسیٰ کو راضی کر لیا ہے کہ وہ مامون کا ساتھ چھوڑ کر بغداد آ جائے۔"

امین بڑا بے صبرا تھا، فوراً بول اٹھا۔ "ہم علی بن عیسیٰ کو اپنی فوج کا سالار عظیم (سپہ سالار) مقرر کرتے ہیں۔"

"مرحبا.....مرحبا!..... سبحان اللہ، سبحان اللہ" سے دربار گونج اٹھا۔ یہ وہ درباری تھے جنہیں فضل نے پہلے ہی استوار کر لیا تھا۔

امین تو خیر غافل تھا اور دوسروں کو بھی خبر نہیں تھی کہ علی بن عیسیٰ ایک رات پہلے ہی فضل کے محل نما گھر میں آ چکا ہے، میں البتہ واقف تھی۔ مجھے یہ خبر دینے والا عارج تھا۔ یہ وہی محل نما گھر تھا جسے کبھی باغی فوجیوں نے جلا ڈالا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب فضل کا باپ ربیع وزیر سلطنت تھا۔ وہ فوجیوں سے تنخواہوں کی ادائیگی کا وعدہ کر کے محل کے خفیہ راستے سے مع اہل خاندان کے فرار ہو گیا تھا، ہارون ہادی کی ماں ملکہ خیزران زندہ تھی اس نے ربیع کو تلاش کر کے قصر خلافت میں بلوا لیا اور صورتحال کو مزید بگڑنے سے روک لیا، بغداد میں ہارون الرشید نہیں تھا، اس کی آمد تک باغی فوجی خاصا نقصان کر چکے تھے۔ غرض کہ جلائے جانے والے اس محل نما گھر کو فضل نے دوبارہ تعمیر کرا لیا تھا اس گھر میں علی بن عیسیٰ مرو سے آ کر ٹھہرا ہوا تھا۔

دربار ختم ہوتے ہی فضل "لپک جھپک" اپنے گھر آیا اور علی بن عیسیٰ کو یہ خوشخبری

سنائی۔

وہ علی بن عیسیٰ جو گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں ماہر تھا اور جسے امین کے باپ ہارون نے معزول کر دیا تھا اس کی دال مرو میں نہ گلی تو بغداد آ گیا، مرو میں "دال گلانے والا" فضل مجوسی اس سے خوش نہ ہوا۔

علاقائی سازشیں عروج پر تھیں جن کا بانی مبانی ربیع کا بیٹا فضل تھا مگر خود امین بھی کم نہ تھا۔

اس عرصے میں امین نے وہ دستاویزیں جو معاہدہ بیعت کی نسبت سے لکھی گئی تھیں مکہ معظمہ سے منگوا کر چاک کر ڈالیں اس کے ساتھ ہی امین نے اپنے بیٹے موسیٰ کو ناطق بالحق کا خطاب دیا۔

فضل بن ربیع نے جب دربار میں علی بن عیسیٰ کو پیش کیا تو امین نے اس کے لئے دو لاکھ دینار انعام کا اعلان کیا، پھر امین نے سات ہزار مغرق (جگمگاتی) خلعتیں معمولی فوجی افسروں تک کو پیش کیں، مقصد فوجیوں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔

کوچ کے دن فوج اس سرو سامان سے آراستہ ہو کر نکلی کہ بغداد کے بڑے بڑے معمر اور سن رسیدہ جو فوجی جاہ و حشم کے ہزاروں تماشے دیکھ چکے تھے، حیرت زدہ رہ گئے۔

علی بن عیسیٰ روانگی کے وقت زبیدہ خاتون سے رخصت ہونے قصر خلافت میں آیا۔

مجھے وہ آدم زادی زبیدہ (امین کی ماں) اچھی نہ لگی، مامون لاکھ سوتیلا بیٹا سہی مگر ایسے سلوک کا مستحق نہ تھا جو زبیدہ نے اس کے ساتھ کیا، میں جن زادی اس پر افسوس ہی کر سکی۔

زبیدہ نے علی بن عیسیٰ کو چاندی کی ایک زنجیر منگوا کر دی اور بولی "مامون پکڑا جائے تو اسے چاندی کی اس زنجیر سے باندھ کر بغداد لانا!" پھر وہ کہنے لگی "امین اگرچہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے تاہم مامون کو بھی مجھ پر بہت کچھ حق ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ کس کا بیٹا ہے اور کس کا بھائی ہے! پاس ادب ملحوظ رکھنا، سخت سست کہے تو برداشت کرنا، راہ میں اس کے گھوڑے کی رکاب تھام کر چلنا، تب جب کہ بغداد میں داخل ہو اسے کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے، تم اچھی طرح جانتے ہو مامون کا مرتبہ کیا ہے، یاد رکھو کہ تم کسی صورت اس کے ہمسر نہیں ہو سکتے۔"

یہ وہ زبیدہ تھی کہ جس کی ایجاد پسند طبیعت نے زیب و زینت کو نئے زاویے دیئے۔ ہارون ہی نہیں دوسرے آدم زادوں نے بھی اس کی اختراعات و ایجادات پسند کیں۔ عنبر کی

شمعیں پہلے پہل اس کے شبستان عیش میں جلائی گئیں، آبنوس وصندل (آبنوس: ایک قسم کا درخت جس کی لکڑی نہایت سیاہ، وزنی ومضبوط ہوتی ہے، صندل: ایک طرح کی سفید خوشبودار لکڑی) کے تھے اسی آدم زادی نے سب سے پہلے تیار کروائے، سفید وسیاہ کا امتزاج زبیدہ کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے، وہ اپنے شوہر ہارون کو لگتی تھی، یوں بھی ہارون کے چچا جعفر کی بیٹی تھی، ان حسابوں اس نے بھی جب اس آب وگل میں آنکھ کھولی تو ہر طرف ''ہرا ہی ہرا'' تھا، کپڑوں کی تراش خراش بھی پیدائشی طور پر دولت مند اس آدم زادی نے نئے نئے انداز نکالے۔ سوتیلے بیٹے مامون کے لئے چاندی کی زنجیر بنوانا اس جیسی کے دماغ میں آ سکتا تھا۔

علی بن عیسیٰ پچاس ہزار فوج لے کر بغداد سے نکلا تو عارج مجھ سے بولا۔ ''اے دینار! ہم بھی کیوں نہ اس آدم زاد علی بن عیسیٰ کے ساتھ چلیں!''

''کس لئے؟'' میں نے کہا ''کہیں تیری یہ منشا تو نہیں کہ یہ غدار بے وفا علی بن عیسیٰ جیت جائے؟...... یہ نہ ہارون کا ہوا نہ اس نے مامون سے وفا کی، یہ تو منافق ہے۔''

''یوں زور زور سے بول کر مجھے زعب میں تو نہ لے اے دینار۔''

''میں زور سے بولوں یا آہستہ، رعب میں تو ہے تو میرے!''

''تجھے غلط فہمی ہے اور میں...... میں تیری یہ غلط فہمی دور کرنا نہیں چاہتا۔''

''ڈال دیئے نا ہتھیار!'' میں ہنسی۔

☆......☆......☆

''تیرے آگے ہتھیار ڈالنے ہی میں امن چین ہے ورنہ تو بغداد کی آدم زادیاں ہی نہیں جن زادیاں بھی میری جان کو لاگو ہو جائیں گی۔ میں اس برے وقت سے بچنا چاہتا ہوں۔''

''تو اس لیے بچ جائے گا کہ میرے ساتھ ہے مگر یہ تیرا خلیفہ وقت مسمی محمد امین مجھے بچتا ہوا نہیں لگتا۔''

''کیوں اس غریب کی جان کو پڑی ہے اے دینار!''

''وہ غریب نہیں غلیظ ہے' کبھی تو نے اسے قریب سے دیکھا ہے۔''

''میں اس موٹے کو کیوں دیکھوں! اگر دیکھنا ہی ہوگا تو کسی آدم زادی کو قریب سے دیکھوں گا۔''

''اور پٹوں گا...... یہ بھی تو کہہ۔''

''اس یک چشم آدم زاد طاہر کو تو دیکھ آنے دے جو تیرے مامون کی طرف سے لڑنے

آرہا ہے۔''

''تجھے کسی نہ کسی بہانے سے گھومنا ہے کہیں نہ کہیں' اچھا چل...... چلتے ہیں۔'' میں راضی ہوگئی۔

علی بن عیسیٰ پچاس ہزار فوج لے کر ''رے'' کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راہ میں اسے جو قافلے ملتے وہ مختلف ''کہانیاں'' سناتے۔ ان ''قصوں'' کا حاصل یہ تھا کہ طاہر مقام رے میں بڑی تیاریاں کر رہا ہے مگر علی کثرت فوج پر اتنا مغرور تھا کہ اسے مطلق پروا نہ تھی وہ آگے بڑھتا ہوا رے کی حد تک پہنچ گیا۔

طاہر کو لوگوں نے رائے دی کہ شہر میں رہ کر علی کا مقابلہ کیا جائے کیوں کہ مختصر فوج میدان میں کام نہیں دے سکتی' طاہر نے کہا اگر دشمن کی فوجیں شہر پناہ تک پہنچ گئیں تو ظاہری غلبہ دیکھ کر شہر والے ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔

صرف چار ہزار فوج لے کر طاہر باہر نکلا۔ علی بھی قریب پہنچ گیا تھا۔

دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں۔ علی کی فوج نہایت ترتیب سے آگے بڑھی سب سے آگے زرہ پوشوں کا رسالہ تھا۔ پیچھے سو سو قدم کے فاصلے پر دس علم تھے اور ہر علم کے نیچے سو (100) سوار تھے۔ علموں کے پیچھے خاص گارد (گارڈ کا بگڑا ہوا لفظ' سنتری' پہرے دار' محافظ' چوکیدار' پیش رد) تھا۔ اس کے قلب میں علی تھا اور پہلو میں بڑے بڑے تجربے کار تھے۔ طاہر کی فوج گو مختصر تھی مگر اس کی تقریروں نے سپاہیوں میں جوش بھر دیا تھا' اسے خطابت آتی تھی۔ تقریر کی اس صفت نے دشمن کی کثرت فوج کا خیال ان کے دماغ سے نکال دیا' مجھے اعتراف ہے کہ اس میں کچھ میری بھی ''کارستانی'' تھی۔ اس پر عارج نے اعتراض بھی کیا مگر میں ان سنی کر گئی۔ سننے والا اگر جان بوجھ کر سننا نہ چاہے تو اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے' میں نے بس اتنا کیا تھا کہ طاہر کی مختصر فوج کی کمان کرنے والوں کے ذہنوں سے موت کے خوف کو جھٹک دیا تھا۔

سب سے پہلے جس آدم زادے نے صف میں سے نکل کر لڑائی شروع کی' وہ علی کی فوج کا ایک نام ور بہادر تھا۔ حاتم نامی اس آدمی کا مقابلہ کرنے کی غرض سے طاہر نے یہ انتظار نہ کیا کہ اسی کے رتبے کا کوئی سوار مقابل آئے' طاہر کو صرف اپنے زور بازو پر اعتماد تھا سو خود مقابلے کو نکلا' اس نے جوش غضب میں آ کر دونوں ہاتھوں سے اپنی تلوار کا قبضہ پکڑا اور اس زور سے وار کیا کہ ایک ہی ضرب نے حاتم کا فیصلہ کر دیا۔

اب عام لڑائی شروع ہوئی۔ علی کی فوج نے طاہر کے میمنے اور میسرے پر حملہ کیا' حملہ

شدید تھا' مگر جنہیں موت کا خوف نہ ہو انہیں کون پیچھے ہٹا سکتا ہے! نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے
علم برداروں کی صفیں الٹ دیں۔

میں اس موقع کی انتظار میں تھی' طرح طرح کی دہشت ناک آوازیں نکال کر میں
نے علی کی فوج میں ابتری پھیلا دی۔ اس ہنگامے کے دوران میں ایک اور "کام" بن گیا' وہ علی
بن عیسیٰ کہ جو میرے نزدیک "گرگٹ" سے کم نہیں تھا میرے سامنے آ گیا' اس کے چہرے پر
ہوائیاں اڑ رہی تھیں' اس کا غرور خود اس کے سامنے خاک میں مل رہا تھا۔ میں نے مڑ کر یک
چشم طاہر کے ایک کماں دار کو دیکھا' علی اور اس کے کماں دار کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ تھا۔

"اپنی کمان میں تیر جوڑ اور علی بن عیسیٰ کا کام تمام کر دے۔" میں نے سرگوشی کی۔

دوسرے ہی لمحے فضا میں سنسناتا ہوا تیر' علی کی گردن میں ترازو ہو گیا۔ کماں دار نے
لپک کر علی بن عیسیٰ کا سر کاٹ لیا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا طاہر کے پاس پہنچ گیا۔

طاہر یک چشم کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔

عارج مجھ سے بولا۔ "اے دینار! بڑے رنج کی بات ہے کہ تو نے عرب ہو کر ایک
نصف عرب' یعنی مامون کا ساتھ دیا۔"

"تو رنج کرتا رہ' میں چلی۔" میں نے جواباً کہا اسی روز طاہر نے مختصر لفظوں میں
مامون کو نامہ فتح لکھا' کتابی الی امیر المومنین دراس علی بن یدی و خاتمہ فی اصبعی و جندہ مصرفون
تحت امروی' یعنی میں امیر المومنین کو خط لکھ رہا ہوں اور علی کا سر میرے سامنے ہے' اس کی
انگوٹھی میری انگلی میں ہے اور اس کی فوج میری کمان میں ہے۔

قاصدوں نے مرو سے موتک کی مسافت جو ڈھائی سو فرلانگ سے کم نہ تھی تین دن
میں طے کی اور چوتھے دن مامون کے دربار میں داخل ہوئے۔ دو دن کے بعد علی بن عیسیٰ کا
سر پہنچا' یہ نظیر عبرت تمام خراسان میں اس کی تشہیر کی گئی۔

عارج کو ساتھ لیے میں' مرو سے بغداد لوٹ آئی۔

قصر خلافت میں بنے ہوئے ایک حوض کے کنارے خلیفہ محمد امین اپنے غلام کوثر کے
ساتھ مچھلیوں کا "شکار" کھیل رہا تھا۔ حوض میں رنگ برنگ کی مچھلیاں پڑی تھیں۔ ان
مچھلیوں کو سونے کی نتھنیاں پہنائی گئی تھیں' نتھنیوں میں بیش قیمت موتی جڑے ہوئے تھے کہ
جس کے شکار میں جو مچھلی آئے موتی بھی اسی کو ملے' کنیزوں اور غلاموں کو خوش کرنے کا یہ بھی
ایک بہانہ تھا۔

امین اکثر اپنی خوبصورت لونڈیوں کے ساتھ اس حوض کے کنارے شکار کھیلا تھا' آج

بھی وہ اسی شغل میں تھا کہ دفعتہً مسرور وہاں آ پہنچا۔ ہارون کے محافظ دستے کا نگراں مسرور اب
امین کے لیے فرائض انجام دیتا تھا۔

مسرور نے فوج کی شکست اور علی بن عیسیٰ کے مارے جانے کی خبر سنائی۔

امین نے چلا کر کہا۔ "خاموش! کوثر دو مچھلیاں پکڑ چکا ہے اور مجھے صبح سے اب تک
ایک بھی نہیں ملی۔"

میرا جی چاہا کہ اس موٹے آدم زاد امین کو حوض میں دھکیل دوں' مگر عارج نے مجھے
روک لیا۔

"اے دینار! تو ان آدم زادوں کے معاملے میں اتنی جذباتی کیوں ہو جاتی ہے! عالم
سوما کی نصیحت نہ بھولا کر۔"

عارج کے سمجھانے پر امین کو میں نے کوئی سزا دیئے بغیر چھوڑ دیا۔

امین شکار سے فارغ ہوا تو فضل بن ربیع کو طلب کر لیا۔ علی بن عیسیٰ کو اسی کی سفارش
پر سپہ سالار بنایا گیا تھا۔ فضل کو بھی خبر ہو چکی تھی۔ کہ علی بن عیسیٰ "خرچ" ہو گیا' وہ اپنے مخبران
"صادق" کے ذریعے حالات سے باخبر رہتا تھا' طلبی ہوئی تو وہ سمجھ گیا کہ "ملبہ" مجھ پر گرنے
والا ہے۔ سو وہ پہلے ہی تیاری کر کے قصر خلافت میں پہنچا' امین نے اسے خلوت میں بلوا لیا جو
خلوت سے زیادہ جلوت معلوم ہوتی تھی' حسین کنیزیں' امین کو گھیرے ہوئے تھیں۔

"بولو فضل' تمہارے علی بن عیسیٰ کا کیا حشر ہوا!" امین بولا "امیر المومنین کا یہ غلام کبھی
غافل نہیں رہتا۔" فضل نے شیخی بگھاری "مجھے اطلاع مل چکی ہے۔"

"تو پھر تم نے کیا کیا؟" امین کے لہجے سے غصہ جھلکنے لگا۔

"غلام وہی عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے حضور۔"

"دے دی اجازت! کچھ کہو بھی!" امین اپنے عیش میں خلل پڑ جانے پر کبیدہ خاطر
اور جھنجھلایا ہوا تھا۔

"مامون کا وکیل بغداد میں رہتا ہے' اسے......"

امین نے فضل کی بات کاٹ دی "اس شکست کا مامون کے وکیل سے کیا تعلق؟ تم یہ
کیا بے پر کی چھوڑے جا رہے ہو' بولو کوئی تعلق ہے؟"

"حضور! براہ راست تو کوئی تعلق نہیں' لیکن......"

"پھر وہی رٹ لگا رہے ہو!...... تعلق نہیں تو اس کا ذکر کیوں کیے جا رہے ہو؟"

"غلام نے بلا سبب مامون کے وکیل کا ذکر نہیں چھیڑا۔" فضل نے ہمت کر کے کہہ ہی

دیا۔

امین نے اس پر قہر آلود نظروں سے فضل کو دیکھا۔ فضل کا چہرہ فق پڑ گیا اس کی آنکھوں میں موت ناچنے لگی۔ دراصل امین کو اتنا غصہ نہ آتا اگر میں اسے "سرکا" نہ دیتی۔

عارج نے مجھ سے کہا۔ "اے دینار! اس آدم زاد فضل کو معاف کردے۔"

"تیری سفارش مان تو لیتی ہوں میں لیکن یہ کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گا۔"

"جب یہ کوئی گل کھلائے گا تو دیکھ لیں گے اسے۔" عارج بولا میرا اندازہ درست ہی نکلا' فضل بن ربیع نے شکست کی تلافی کے لیے مامون کے وکیل کو حراست میں لے لیا۔ وہ بغداد میں ہی مقیم تھا۔ اس بے چارے آدم زاد وکیل کا مال و اسباب فضل کے حکم پر ضبط کرلیا گیا۔ اس کے علاوہ فضل نے اس سے دس لاکھ درہم بھی وصول کیے۔

امین نے ایک اور فوج تیار کی۔ اس فوج کی تعداد بیس ہزار سے کم نہ تھی' سپہ سالار عبدالرحمٰن مقرر ہوا اس زمانے میں طاہر ہمدان کے قریب ٹھہرا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن وہاں تک جا پہنچا' اس نے ہمدان کو صدر مقام قرار دیا اور اپنی دانست میں جنگ کے اعتبار سے جو اہم مقامات تھے' وہاں سوار و پیادے مقرر کیے۔ میں کیوں کہ امین سے نالاں تھی' سو طاہر کو "اشکا" دیا' اس نے گویا میری شہ پر شہر کا محاصرہ کرلیا' عارج کو میری اس کارگزاری کی خبر لگی تو "بھک" گیا' بولا۔ "اے دینار! یہ تو ناانصافی ہے تو مامون کی حمایت لے رہی ہے۔"

"میں نے کب حمایت لینے سے انکار کیا ہے!...... ویسے تجھے چپکے سے یہ بتادوں کہ آدم زاد مامون سے میری کوئی رشتہ داری نہیں ہے' میرا مقصد تو فی الحال محض یہ ہے کہ بغداد کو ایک نااہل آدم زاد امین سے نجات مل جائے' سمجھا!"

عارج نے برجستہ کہا۔ "کیا خبر مامون بھی نااہل نکلے؟"

"ہوسکتا ہے۔" میں ہنسی۔

"تو پھر تجھے امین سے اللہ واسطے کا بیر کیوں ہے؟"

"میری مرضی! تو کون قاضی کہ ملا!" میں نے مذاق میں بات اڑادی اور خود وہاں سے اڑ گئی۔

مہینوں طاہر شہر ہمدان کا محاصرہ کیے رہا' آخر عبدالرحمٰن نے طاہر سے امان طلب کرلی جس کی مدد ایک جن زادی کررہی ہو اسے دو چار عبدالرحمٰن بھی مل کر نہیں ہرا سکتے۔

امین کے سپہ سالار کو ہمدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

فتح ہمدان کے بعد طاہر کو میں نے قزدین کی راہ سمجھائی' میں قزدین پہنچی وہاں کا عامل

(گورنر) کثیر تھا۔ یہ آدم زاد ڈرپوک نکلا' اسے میں نے مزید ڈرا دیا۔ "بھاگ لے کسی پتلی گلی سے ورنہ مارا جائے گا۔"

میری آواز کو کثیر نے اپنے باطن کی آواز سمجھا اور قزدین سے "پھوٹ" لیا۔

قزدین پر تو طاہر کا قبضہ ہوگیا لیکن دوسری جانب عارج نے "کام دکھا دیا۔" عبدالرحمٰن جو ہمدان سے بھاگ چکا تھا اسے ایک مرتبہ پھر طاہر کے مقابلے پر لے آیا' اب یہ "جنگ" (سرد جنگ) میرے اور عارج کے درمیان چھڑ گئی۔

موقع ملتے ہی میں نے عارج کو آڑے ہاتھوں لیا' بولی۔ "باز آ جاؤ ورنہ تو خواہ مخواہ بھجی میں آ جائے گا تجھے آخر کیا پڑی تھی عبدالرحمٰن سے طاہر پر حملہ کرانے کی؟"

"اس کا مطلب یہ ہوا اے دینار کہ تو میری سراغ رسانی کرتی ہے۔"

"کچھ بھی مطلب نکال' مگر اتنا سن لے کہ مجھ سے جھگڑا کیا تو......"

"تجھ سے لڑ کر مجھے مرنا ہے کیا!" عارج میری "تڑی" میں آ گیا وہ گویا غیر جانبدار ہوگیا۔

عبدالرحمٰن نے اچانک حملہ کیا' طاہر کے لشکری ہتھیار بھی نہ سنبھال پائے' صرف پیادوں کی جماعت مسلح تھی' وہ نہایت ثابت قدمی سے لڑی' اگر وہ پیادہ (پیدل) فوج نہ لڑتی تو کرتی بھی کیا! میں جو اس کے عقب سے خوفناک آوازیں نکال رہی تھی اسے اپنے پیچھے اور آگے "ہرا ہی ہرا" دکھائی دیا اتنی فرصت پا کر طاہر کی گھڑسوار فوج نے بھی ہتھیار سنبھال لیے اور سخت معرکہ ہوا عارج پر میری نظر تھی کہ وہ اپنی "غیر جانبداری" سے "دست بردار" نہ ہو جائے آدمیوں کی طرح جن زادوں کو بھی "بگڑتے" دیر نہیں لگتی۔

قصہ مختصر یہ کہ عبدالرحمٰن کی فوج نے شکست کھائی "کھانے" کو اور بچا بھی کیا تھا! پھر بھی "ڈھیٹ" عبدالرحمٰن ثابت قدم رہا اس کے ساتھیوں نے کہا کہ اب لڑنا بے سود ہے' بھاگ چلیے۔

اس پر "اینٹھو" عبدالرحمٰن اور اینٹھ گیا' کہنے لگا۔ "خلیفہ معظم محمد امین کو میں اپنا ہارا ہوا چہرہ دکھانا نہیں چاہتا۔"

وہ آدم زاد عبدالرحمٰن بہت بہادری سے لڑا لیکن اکیلا چنا کب تک بھاڑ کے اندر "چرمر' چرمر" کرسکتا ہے! "غریب" "مارا گیا" اسی عبدالرحمٰن نے واقعی غریب قاصد صاعد کو پچھاڑ کر اس کے سینے پر نیزہ رکھ دیا تھا' صاعد خراسان سے بغداد آیا تھا' صاعد و نوفل یہ دونوں تو جان بچا کر بغداد سے بھاگ لیے مگر عبدالرحمٰن نے اپنا شکست کھایا ہوا چہرہ امین کو نہیں دکھایا بس یوں

چپ چپاتے ''ٹمیں'' ہوگیا کیا آدم زاد' کیا ہم بھی جنات سبھی کو ایک دن ''ٹمیں'' ہونا یعنی مٹی میں منہ چھپانا ہے' یہ سوچتے ہوئے میں بھول گئی کہ میری تخلیق آگ سے ہوئی ہے آدم زادوں کے درمیان رہ کر میرا حافظہ درست نہیں رہا۔

میں نے با آواز بلند ''لاحول'' پڑھی تو عارج بولا۔ ''کہیں تو مجھے تو شیطان نہیں سمجھ رہی ہے دینار!''

''تو کیا کسی شیطان سے کم ہے۔'' میں بولی

وہ کہنے لگا۔ ''حالانکہ میں نے کبھی تیرے ساتھ کوئی شیطانی نہیں کی ..... ہاں یہ حسرت ضرور ہے۔''

''اور تو یہی حسرت لیے اس دنیا سے چلا جائے گا اے عارج! کس قدر افسوس کی بات ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ میں قزوین میں تھی' عارج حسب معمول میرے ساتھ تھا۔ قزوین کی فتح نے دور دور تک طاہر کا سکہ بٹھا دیا جبل کے تمام علاقے اب اس کے قبضے میں تھے۔

میں نے بغداد کی راہ لی کہ دیکھوں وہاں کیا صورت ہے۔ امین تو ''بانگڑو'' تھا ہی' شکستیں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں' اس نے عبرت پکڑنے کے بجائے ایک بڑی فوج آراستہ کی اس فوج کی تعداد کم و بیش چالیس ہزار تھی۔ فوج کے دو سپہ سالار مقرر کیے گئے یہ دونوں دولت عباسیہ کے مشہور نامور افسر احمد بن زید اور عبدالرحمٰن بن حمید تھے۔

عارج مجھ سے بولا۔ ''بتا اب تو کیا کرے گی اے دینار!..... وہ یک چشم آدم زاد طاہر اس بار نہیں بچ پائے گا۔''

میں نے مصلحت کے تحت عارج کی بات کے جواب میں کہا۔

''طاہر یقیناً ان دونوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔''

''اللہ تجھے صبر دے۔'' عارج نے مجھ پر فقرہ لگایا۔

''اے عارج اب تیل دیکھ' تیل کی دھار دیکھ۔''

''یعنی؟'' اس نے وضاحت چاہی۔

''یہ میں تجھے نہیں بتاؤں گی۔''

''اچھا نہ بتا' اس سے میری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

عارج بولا۔ ''میں ہوں نا تیرے ساتھ۔''

''ہاں عارج! مجھ سے پیچھا چھڑانا تو مشکل ہے۔'' میں ہنس دی۔ میرے خیال میں

اب تلوار کے بدلے تدبیر کی ضرورت تھی' دونوں سپہ سالار بیس بیس ہزار فوج پر مقرر تھے جو آگے پیچھے بغداد سے نکلے' انہیں بغداد سے یوں جاتے دیکھ کر میں نے جو کچھ سوچا' عارج کو بتا دیا۔

''تو بڑی ہی فسادی ہے اے دینار!''

''وہ تو میں ہوں' اس ''مہم'' میں تجھے اور مجھے ساتھ رہنا ہے۔''

''اور بعد میں؟'' عارج بول اٹھا۔

''یہ وعدے وعید کا وقت نہیں' میرے میرے سنگ۔''

''کہاں لے جا رہی ہے؟''

''بس یونہی گھمانے پھرانے۔'' میں نے کہا۔

میرا مقصد بات ٹالنا تھا سو عارج کو غچہ دے دیا۔

جعلی قاصدوں اور خطوط کے ذریعے میں نے امین کے دونوں فوجی افسروں میں پھوٹ ڈال دی' نوبت یہاں تک پہنچی کہ احمد بن زید اور عبدالرحمٰن بن حمید آپس میں لڑ گئے مدت دراز تک وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں ''شجاعت جوہر'' دکھاتے رہے اور بغداد واپس آ گئے۔

طاہر کی ان ''فتوحات'' نے جو میری رہین منت تھیں مامون کی امیدوں کو وسیع کر دیا' وہ آدم زاد ہارون کا بیٹا مامون خود ہی خلیفہ بن بیٹھا اور امیرالمومنین کہلانے لگا۔ اپنے درباریوں کو اس نے بڑے بڑے عہدے دیئے' فضل مجوسی کو اس نے تمام علاقوں کا والی مقرر کیا جو طول میں ہمدان سے تبت تک اور عرض میں بحر فارس سے جرجان وغیرہ تک تھے۔ مامون نے فضل مجوسی کی ماہانہ تنخواہ تیس لاکھ درم مقرر کی' اس طرح فضل مجوسی کے بھائی حسن بن سہل کو اس نے وزیرالخراج بنایا۔

اہواز' بصرہ' بحرین' عمان وغیرہ طاہر فتح کرتا چلا گیا' کوفہ' موصل اور دیگر کئی علاقوں کے عمال نے طاہر کے پاس اطاعت کے خطوط بھیجے۔ اس اطاعت کے پیچھے بھی میرا ہی ہاتھ تھا ورنہ تو وہ یک چشم کسی نہ کسی معرکے میں مارا جاتا۔ کوئی اس کا نام لیوا بھی نہ ہوتا' آدم زاد اسی طرح مرنے والوں کو بھلا دیتے ہیں۔

ان فتوحات کی شہری ہوتی جاتی تھی اور مامون کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا۔ 182 ہجری تک طاہر کی معرکہ آرائیوں سے بغداد اور اس کے متعلقات بچ رہے تھے۔

حرمین میں بھی مامون کا سکہ و خطبہ جاری ہوگیا' داؤد جو مکہ معظمہ کا حاکم تھا اس نے

تمام داعیان عرب کو جمع کیا اور مجمع عام میں ایک پراثر تقریر کی۔ "سنو! یہ وہی امین ہے جس نے حرمت حرم کا بھی خیال نہ کیا جن معاہدوں کی تصدیق صحن کعبہ میں ہوئی تھی انہیں چاک کر کے آگ میں جلا دیا۔" تقریر کرتے ہوئے داؤد ممبر پر چڑھ گیا اور سر سے ٹوپی اتار کر پھینک دی' بولا۔ "اسی طرح میں امین کو خاک پر پھینکتا ہوں۔"

سب نے غائبانہ مامون کے لیے بیعت کی۔

مامون کو جب یہ خبر پہنچی تو بطور نذر کے داؤد کو پانچ لاکھ درہم بھیجے حکومت مکہ اس کے سوا تھی۔

چند روز بعد یمن وغیرہ کے عمال نے بھی طاہر کی اطاعت قبول کر لی' امین کی حکومت بغداد کی حد تک رہ گئی' اس پر ایک دن عارج مجھ سے کہنے لگا۔ "اے دینار! بس بھی کر اب۔"

"یہ بتا کہ میں نے کیا ہی کیا ہے جو بس کروں۔"

"جانتا ہوں میں کہ تو بڑی بھولی ہے۔"

"اور کیا تیری طرح چالاک ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو اگر چالاک نہ ہوتی تو پھر کسی آدم زادی کے جسم میں قید ہو جاتی اور اتنی باخبر بھی نہ ہوتی جتنی ہے۔"

"تیری ان باتوں سے مجھے ایسا لگتا ہے کہ تو مستقل طور پر جن زادی بنا رہنا چاہتا ہے۔"

"ارادہ تو یہی ہے مگر تو ٹھہری ایک جن زادی' وہ بھی غصے کی تیز! ایسی صورت میں میری مرضی کب چل سکتی ہے۔"

"اے عارج! کبھی کبھی جب تو سچ بولتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔"

"شکر کا مقام ہے اے دینار کہ تو نے کسی بہانے مجھے اچھا تو کہا۔"

"اچھا زیادہ باتیں نہ بنا' قصر خلافت میں چلتے ہیں...... امین بے چارہ پریشان ہوگا۔"

"منافقت نہیں اے دینار! مجھے خبر ہے تیرے نزدیک امین نہ مظلوم ہے' نہ بے چارہ! وہ اس حال کو تو پہنچ گیا' اب......"

میں نے عارج کی بات کاٹ دی۔ "رہنے دے بس! اس موئے آدم زاد کا زیادہ ہمدرد نہ بن۔"

"ہمدرد تو ہوں میں اس کا! وہ بھی عرب ہے اور میں بھی! فرق صرف جن اور آدمی کا ہے اگر ایک عرب دوسرے عرب کے کام نہیں آئے گا تو کیا کوئی عجمی کام آئے گا۔"

"پہلی بات تو یہ سن کہ میرے انداز میں نہ بولا کر!...... دوئم یہ کہ وقت آنے پر پتہ چل جائے گا تو امین کا کتنا بڑا ہمدرد ہے۔" میں نے کہا اور دریائے دجلہ پر پرواز کرتی ہوئی قصر خلافت کی طرف بڑھی' عارج ساتھ تھا۔

میں جب قصر خلافت میں پہنچی تو ہارون کی بیوی زبیدہ کو فکر مند دیکھا۔ یہ صبح کا وقت تھا امین بھی اپنی ماں کے سامنے تھا' زبیدہ بولی۔ "تم نے دیکھا کہ وہ غلام زادہ فضل بغداد سے خاموشی کے ساتھ فرار ہوگیا۔" زبیدہ کا اشارہ فضل بن ربیع کی طرف تھا۔

"مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ابھی ہمارے وفاداروں کی کمی نہیں' ہم نے ایوان خاص میں اجلاس طلب کیا ہے اس اجلاس میں علی بن محمد بھی آ رہا ہے۔" امین نے بتایا۔

"تمہیں یقیناً یہ احساس ہوگا کہ ہم دہرے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں ایک طرف تو یک چشم طاہر بن حسین ہماری زندگی کے درپے ہے دوسری جانب ہرثمہ بن اعین بڑھا چلا آ رہا ہے۔ ہرثمہ ہرچند کے بوڑھا ہوگیا ہے مگر اس کا دماغ ابھی بھی بہت تیز چلتا ہے۔ یہ ہرثمہ خلیفہ مرحوم یعنی تمہارے والد بزرگوار کا بھی نہایت وفادار تھا ہاں موجودہ صورتحال میں بھی وہ خبیث پلٹا کھا گیا ہے اسے مامون سے نہیں اقتدار اور مال و دولت کی طمع ہے۔" زبیدہ کہتی رہی۔ "فضل مجوسی کے مقابلے میں ہرثمہ اپنی دال گلانا چاہتا ہے یہ الگ بات ہے کہ آتش پرست فضل اسے ایسا نہ کرنے دے۔ ہرثمہ کی بابت ہم نے جو کچھ کہا درست ہے لیکن قدیم نمک خوار ہونے کی وجہ سے برے وقت میں اگر کوئی تمہارے کام آ سکتا ہے تو یہی بوڑھا ہرثمہ ہے۔"

امین نے اپنی ماں کی بات سنی ضرور مگر یوں جیسے کچھ نہ سنا ہو' اس وقت غلام کوثر نے آ کر امین کو اطلاع دی کہ طلب کردہ افراد ایوان خاص میں جمع ہو چکے ہیں۔ زبیدہ نے ہاتھ کے اشارے سے امین کو رخصت کی اجازت دیدی۔ ابھی تک زبیدہ یہ بھولی نہیں تھی کہ اس کا تعلق کس خاندان سے ہے مگر اس کے بیٹے امین کو کچھ یاد نہ تھا' وہ زبیدہ کے پاس سے اٹھ کر جب ایوان خاص کی طرف چلا تو گردن اکڑی ہوئی تھی اپنی عادت کے مطابق وہ کج کلاہ قدم جما جما کر چل رہا تھا اس کے سر پر بندھی سیاہ پگڑی کو میں نے ہلکا سا جھٹکا دیا تو وہ چلتے چلتے ایک دم رک گیا (کیوں کہ سادات کا پسندیدہ رنگ سبز تھا اس لیے بنو عباس نے اپنے لیے سیاہ رنگ کو علامت بنایا' اس سے قبل یہی سیاہ رنگ اداسی اور رنج کی نشانی تھا اور اب بھی ہے مختلف زمانوں میں آدم زاد رنگ بدلتے رہے ہیں میں اس چکر میں نہیں پڑتی' پل پل رنگ بدلنا تو یوں بھی ان آدم زادوں کی فطرت ہے) اس نے اپنی پگڑی پھر سر پہ جمائی اور ادھر ادھر چور

نظروں سے دیکھتا ہوا قصر خلافت کے ایوان خاص میں داخل ہوا تمام فوجی افسران امین کے احترام میں اٹھ کھڑے ہو گئے اور اسے تعظیم دی۔

اس اجلاس میں منتخب فوجی افسر تھے' امین بڑی سی چوکی پر جا بیٹھا جس پر دبیز قالین بچھا تھا۔

اپنی ماں زبیدہ کی نصیحت کو پس پشت ڈال کر خود سر امین نے اس اہم اجلاس میں موجود علی بن محمد کو ہرثمہ سے جنگ کرنے کا حکم دیا چار سو افسران فوج علی بن محمد کی ماتحتی میں دیئے گئے۔

امین کی یہ آخری کوشش تھی کہ کسی طرح مامون کو کہیں تو نیچا دکھا دے' ہرثمہ اور طاہر دونوں ہی مامون کی طرف سے امین کا حلقہ تنگ کر رہے تھے۔ رمضان 192 ہجری میں بہ مقام نہروان دونوں فوجیں مقابل ہوئیں ہرثمہ تجربے کار لڑاکا تھا اس نے اپنی فوج کو بڑے منظم انداز میں آگے بڑھایا' اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ علی بن محمد نے نہ صرف شکست کھائی بلکہ زندہ گرفتار ہوا۔ یہ خبر بغداد پہنچی تو امین کے چھکے اور اٹھے سب ایک ساتھ چھوٹ گئے۔

زبیدہ تو پہلے ہی اس سے خوش نہ تھی کہ ہرثمہ کو دشمن بنایا جائے۔ اس نے امین کو سخت سست کہا۔

"اے مادر محترمہ! آپ کیوں خفا ہوتی ہیں' اپنے بیٹے سے مایوس نہ ہوں۔ امین کہنے لگا۔ "ہم نے ایک تدبیر سوچی ہے وہ یہ کہ طاہر کے ساتھ جو فوجی لڑ رہے ہیں انہیں توڑ لیا جائے۔"

"کس طرح۔" زبیدہ نے پوچھا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس آدم زاد کے ماتھے پر پڑنے والے بل کم ہو گئے تھے۔

امین بولا۔ "مال و زر کا لالچ دے کر ہم نے خفیہ طور پر طاہر کے فوجی افسروں کو خطوط لکھ دیئے ہیں۔"

زبیدہ مطمئن نظر آنے لگی۔

امین کے خزانے میں ہارون کے زمانے کا اب بھی بہت اندوختہ موجود تھا جو اس موقع پر تیغ و خنجر سے زیادہ کام آیا تقریباً پانچ ہزار آدمی اس طمع میں طاہر کا ساتھ چھوڑ کر دارالخلافہ بغداد پہنچ گئے' خطوط میں امین نے جو وعدے کیے تھے اس سے بھی زیادہ ان آدمیوں کو انعام وصلہ دیا اور ان کی داڑھیاں مشک سے رنگوائیں۔

"کیا کہتا ہے اے عارج! یہ مشکی گھوڑے' امین کو بچا لیں گے؟" میں نے اس موقع پر

عارج کو چھیڑا۔

"تو ان آدم زادوں کا مذاق کیوں اڑا رہی ہے اے دینار!..... انہوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟"

"میرا تو انہوں نے کچھ نہیں بگاڑا البتہ تیرے امین کی مٹی ضرور کرکری کرا دیں گے۔ یہ بکاؤ مال ہیں آج انہیں امین نے خرید لیا تو کل کسی اور کی جھولی میں جا گریں گے۔"

میری بات سن کر عارج بولا۔ "لیکن پانچ ہزار آدم زادوں کے علاوہ بغداد کی بھی فوج ہے جو طاہر سے لڑے گی۔"

"تو لڑا کرے' نتیجہ وہ نکلے گا جو میں تجھے بتا چکی ہوں۔"

بغداد شہر کے رہنے والے عجب تذبذب کا شکار تھے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اور "اونٹ" تھا کہ بیٹھنے کو تیار ہی نہ تھا یہاں اونٹ سے میری ہرگز مراد امین سے نہیں کیونکہ اونٹ بڑا کارآمد جانور ہے۔

بکاؤ آدم زاد اور بغداد میں بچے کھچے سپاہی جب شہر سے گزرنے لگے تو ان "نمونوں" کو دیکھنے کے لیے ازدحام ہو گیا (عربی زبان میں ازدحام کا مطلب لوگوں کا انبوہ ہے' بھیڑ' آدمیوں کا ایک جگہ جمع ہونا' اژدہام لکھنا غلط ہے۔ (مصنف)

پھر وہی ہوا جو میں نے عارج سے کہا تھا۔ جو آدم زاد طاہر کے ساتھ دغا کر چکے تھے وہ امین کے وفادار کیسے رہتے غرض کہ طاہر جیت گیا بے شمار مال غنیمت اس کے ہاتھ آیا اب طاہر کو میری مدد کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں نے اس معرکے میں اس لیے طاہر کی مدد سے گریز کیا میں بغداد ہی میں رہی اور آدم زادوں کا تماشا دیکھتی رہی' اس عرصے میں امین نے ایک اور فوج تیار کر لی اس فوج میں حوالی بغداد کے عوام بھرتی تھے (حوالی بھی عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں گرداگرد کسی چیز کا' یہاں بغداد کے آس پاس رہنے والوں سے مراد ہے یہی لفظ عربی سے فارسی میں گیا' مثلاً فارسی زبان میں حوالی شہر کا مطلب شہر کا نواح یعنی شہر کے گرداگرد کی زمین ہے۔ (مصنف)

انہی حوالی بغداد میں سے فوجی افسران مقرر ہوئے کہ یہ امین کا حکم تھا' امین نے ان گنوار آدم زادوں میں سے ایک' ایک کو گراں بہا انعامات سے مالا مال کر دیا' قدیم افسران فوج جو ان "فیاضیوں" سے محروم رہے ناراض ہو گئے میں نے صرف اتنا کیا کہ یہ خبر طاہر تک پہنچا دی وہ یک چشم اس خیال کو اپنی عقل مندی سمجھا حالانکہ وہ عقل مند سے زیادہ "عقل بند" تھا۔

پھر بھی اس نے ان ناراض فوجی افسروں سے خط و کتابت شروع کر دی اس کا یہ اثر ہوا کہ وہ

اعلانیہ باغی ہو گئے۔

امین کو ابھی تک یہ غلط فہمی تھی کہ ''اصل خلیفہ'' وہی ہے۔ اس بنا پر قصر خلافت میں وہ باقاعدہ دربار لگانے کا شوق بھی کبھی کبھار پورا کرتا رہتا۔ پرانے فوجی افسر باغی ہو گئے تو درباریوں نے عرض کیا کہ انعام وصلے کا لالچ دے کر امیرالمومنین بغاوت پر کمربستہ پرانے فوجیوں کو قابو میں لا سکتے ہیں۔

اپنی نو آزمودہ فوج پر امین کو اس قدر ناز تھا کہ اس نے قدیم تجربے کار لشکر کی پروانہ کی اس نے بڑی تمکنت کے ساتھ ان نو آزمودہ کو حکم دیا' باغیوں کو گرفتار کرلاؤ!

ادھر تو امین کی پرانی اور نئی فوجیں باہم معرکہ آرا تھیں ادھر طاہر بے روک ٹوک بڑھتا چلا آیا' ذوالحجہ 192 ہجری میں طاہر نے باب الانبار پہنچ کر ایک باغ کے قریب پڑاؤ ڈال دیا' امین کے بہت سے افسر اس کے پاس حاضر ہو گئے اور انہوں نے بڑے بڑے انعام و کرام حاصل کیے۔

اگرچہ امین کی تمام قوت صرف ہو چکی تھی اور بظاہر بغداد میں کوئی آدم طاہر کا راستہ روکنے والا نہ تھا' تاہم اسے میں نے احتیاط کا مشورہ دیا۔ رات کا وقت تھا طاہر اپنے خیمے میں سو رہا تھا کہ میں نے اس کے کانوں میں اپنے لفظ انڈیلنے شروع کر دیئے' وہ میری سرگوشیوں کو ''سچا خواب'' سمجھا۔

پہلے اس کا ارادہ بغداد پر حملہ کرنے کا تھا ''سچا خواب'' دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔

بغداد ایک مدت سے خلفائے عباسیہ کا پایہ تخت اور ان کی طاقت کا اصل مرکز تھا' صرف شہر کی آبادی دس لاکھ سے کم نہ تھی' اس آبادی کی اکثریت مسلمانوں کی تھی جو سپہ گری کا فطری جوہر رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے بغداد پر قبضہ کرنا کچھ آسان کام نہ تھا میں اسی لیے طاہر کی ناک میں نکیل ڈالے رہی۔ مختصر یہ کہ وہ میرے اشاروں پر ناچتا رہا' یوں بھی آدم زادوں کو نچانا ہم جنات کی سرشت میں شامل ہے۔

میرے ایماء پر طاہر نے اپنے نامور فوجی افسروں کو خاص خاص حصوں پر متعین کیا اس نے حکم دیا کہ جو لوگ حلقہ اطاعت میں آئیں اور جنگ نہ کریں انہیں امان دی جائے۔

پھر منجنیقوں کے ذریعے بغداد پر آگ اور پتھر برسائے گئے یک چشم آدم زاد طاہر خود بھی ''عیب دار'' تھا لیکن اس سے بھی دو جوتے آگے سفاک فوجی افسران تھے عیب دار جانور کی تو قربانی بھی جائز نہیں لیکن ابھی عیب دار آدم زاد کا وقت نہیں آیا تھا۔ قدرت اسے ڈھیل دے رہی تھی۔

اپنی نو آزمودہ فوج پر امین کو اس قدر ناز تھا کہ اس نے قدیم تجربے کار لشکر کی پروانہ کی اس نے بڑی تمکنت کے ساتھ ان نو آزمودہ کو حکم دیا' باغیوں کو گرفتار کرلاؤ!

ادھر تو امین کی پرانی اور نئی فوجیں باہم معرکہ آرا تھیں ادھر طاہر بے روک ٹوک بڑھتا چلا آیا' ذوالحجہ 192 ہجری میں طاہر نے باب الانبار پہنچ کر ایک باغ کے قریب پڑاؤ ڈال دیا' امین کے بہت سے افسر اس کے پاس حاضر ہو گئے اور انہوں نے بڑے بڑے انعام و کرام حاصل کیے۔

اگرچہ امین کی تمام قوت صرف ہو چکی تھی اور بظاہر بغداد میں کوئی آدم طاہر کا راستہ روکنے والا نہ تھا' تاہم اسے میں نے احتیاط کا مشورہ دیا۔ رات کا وقت تھا طاہر اپنے خیمے میں سو رہا تھا کہ میں نے اس کے کانوں میں اپنے لفظ انڈیلنے شروع کر دیئے' وہ میری سرگوشیوں کو ''سچا خواب'' سمجھا۔

پہلے اس کا ارادہ بغداد پر حملہ کرنے کا تھا ''سچا خواب'' دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔

بغداد ایک مدت سے خلفائے عباسیہ کا پایہ تخت اور ان کی طاقت کا اصل مرکز تھا' صرف شہر کی آبادی دس لاکھ سے کم نہ تھی' اس آبادی کی اکثریت مسلمانوں کی تھی جو سپہ گری کا فطری جوہر رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے بغداد پر قبضہ کرنا کچھ آسان کام نہ تھا میں اسی لیے طاہر کی ناک میں نکیل ڈالے رہی۔ مختصر یہ کہ وہ میرے اشاروں پر ناچتا رہا' یوں بھی آدم زادوں کو نچانا ہم جنات کی سرشت میں شامل ہے۔

میرے ایماء پر طاہر نے اپنے نامور فوجی افسروں کو خاص خاص حصوں پر متعین کیا اس نے حکم دیا کہ جو لوگ حلقہ اطاعت میں آئیں اور جنگ نہ کریں انہیں امان دی جائے۔

پھر منجنیقوں کے ذریعے بغداد پر آگ اور پتھر برسائے گئے یک چشم آدم زاد طاہر خود بھی ''عیب دار'' تھا لیکن اس سے بھی دو جوتے آگے سفاک فوجی افسران تھے عیب دار جانور کی تو قربانی بھی جائز نہیں لیکن ابھی عیب دار آدم زاد کا وقت نہیں آیا تھا۔ قدرت اسے ڈھیل دے رہی تھی۔

طاہر کے حواریوں نے بغداد کو تقریباً تباہ کر ڈالا۔ انہوں نے نہایت سفاکی و بے رحمی سے طاہر کے احکام پر عمل کیا۔ ہزاروں عالی شان مکان برباد کیے گئے محلے کے محلے غارت ہو گئے امین کے کچھ وفادار بڑی دلیری سے لڑے مگر عاجز ہو کر انہوں نے امان طلب کر لی' ارکان خلافت نے بھی اطاعت میں عافیت جانی' صرف شہر کے اوباش و عیار باقی رہ گئے جو

طاہر کے سدراہ تھے انہیں زیر کرنے میں طاہر نے جو دقتیں اٹھائیں بڑے بڑے معرکوں میں نہیں اٹھائی تھیں۔

امین کے چھوٹے بھائی نے اپنے لیے الگ قصر بنوالیا تھا اس کا نام صالح تھا' اس نے خلیفہ ہارون الرشید کی نماز جنازہ پڑھائی تھی' قصر صالح اس کا تھا جس پر طاہر کے فوجیوں نے قبضہ کرلیا۔ شہر کے انہی لچے لفنگے آدم زادوں نے قصر صالح پر اس طرح حملہ کیا کہ طاہر کی بہت سی فوج ضائع ہوگئی۔ چند مشہور افسر بھی مارے گئے۔

اس شکست کے انتقام پر طاہر نے حکم دیا کہ دجلہ سے الرقیق تک اور باب الشام سے باب الکوفہ تک جس قدر آبادی ہے کلیتہً ختم کردی جائے اس پر بھی جب بغداد کے باشندے مطیع نہ ہوئے تو گزرگاہوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے تاکہ باہر سے خوراک یا ہتھیار شہر میں نہ آئیں' بغداد والوں کی مدد کو کوئی نہ آسکے' اس پر بھی عیار آدم زاد زیر نہ ہوئے ان کا مسئلہ صرف لوٹ مار تھا وہ اپنوں ہی کو مار رہے تھے' سو میں تماشائی نہ بنی رہتی تو کیا کرتی! ہاں یہ ضرور ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا سو ایسا ہوتا ہے جنگوں میں بے گناہ بھی مارے جاتے ہیں۔

قصر شماسہ پر طاہر نے اپنے ایک فوجی افسر عبداللہ کو متعین کیا تھا ''عیاروں'' نے اسے شکست دی جب طاہر کی طرف سے ہرثمہ مدد کو آیا تو عیاروں نے اسے بھی زندہ پکڑنا چاہا مگر ناکام رہے۔

قصہ مختصر یہ کہ بغداد ایک ویرانے سے بدتر ہوگیا' امین کے عالی شان قصر جو تقریباً دو کروڑ درہم کے صرف سے تیار ہوئے تھے ان کے محض کھنڈر باقی رہ گئے' شہر والوں پر جو سختیاں گزریں ان کا اندازہ کون کرسکتا ہے! یہ سب کچھ ایک بے وقوف آدم زاد امین کی وجہ سے ہوا جسے اقتدار کی ہوس تھی' سینکڑوں گھرانے برباد ہوئے ہزاروں بچے یتیم ہوگئے' ہر گلی کوچے سے دردناک آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ابن رومی کا ایک مرثیہ جو ایک سو پندرہ اشعار پر مشتمل ہے اس قیامت انگیز واقعے کی پوری تصویر ہے۔ بغداد اس قدر تباہ ہو چکا تھا تاہم طاہر کو شہر میں داخل ہونے کی ہمت نہ تھی۔

☆......☆......☆

خزیمہ جو امین کے درباریوں میں سے ایک تھا' وہ بااثر آدم زاد اگر طاہر کا ساتھ نہ دیتا تو بغداد کی فتح میں شاید بہت زیادہ دیر لگتی' 22 محرم 198 ہجری کو خزیمہ مشرقی دروازے سے بغداد میں داخل ہوا' اس نے دریائے دجلہ کے کنارے علم نصب کر کے اعلان کیا کہ خلیفہ امین معزول کر دیا گیا۔ اس اعلان کے بعد شہر کا مشرقی حصہ گویا پوری طرح فتح ہوگیا۔

دوسرے دن طاہر نے مغربی حصے پر حملہ کیا' بازار کرخ کے متصل سخت معرکہ ہوا طاہر نے قصر الوضاع پر تھوڑی سی فوج تعینات کی اور بذات خود مدینہ المنصور' قصر زبیدہ اور قصر خلد کا محاصرہ کیا' یہ عالی شان ایوانات جو خلفائے عباسیہ کی یادگار تھے بجائے خود ایک شہر تھے اور ان کے گرد جدا جدا شہر پناہ تھی۔

اس محاصرے کے دوران میں ابراہیم بن المہدی جو ہارون الرشید کا بھائی اور فن موسیقی میں یگانہ روزگار تھا امین کے ساتھ تھا' خارج اور میں ان دونوں سے زیادہ دور نہیں تھے یہ رات کا وقت تھا۔

امین دل بہلانے کے لیے قصر خلافت کے اس حصے سے باہر آیا جہاں اس کی سکونت تھی (رہنے سے ہندی والوں نے فارسی قواعد کے مطابق رہائش یا رہائش بنالیا ہے جو غلط ہے اس کی جگہ سکونت' مسکن' قیام' بود و باش وغیرہ الفاظ موجود ہیں' لفظ رہائش' عوام کی زبانوں پر چڑھ گیا اس لیے پڑھے لکھے نام نہاد ادیب و شعراء بھی یہ لفظ لکھنے لگے ہیں۔ (مصنف)

وہ اپنے چچا ابراہیم سے مخاطب ہوا۔ ''کیا سہانی رات ہے' چاند کیسا صاف اور روشن ہے' دجلہ پر اس کا عکس پڑتا ہے جو کیسا خوش نما معلوم ہوتا ہے بتایئے ایسے پرلطف وقت میں کیا چیز ضروری ہے؟''

''شراب؟'' ابراہیم نے جواب دیا۔

قصر خلافت میں وہ جگہ بڑی پرفضا تھی۔ وہاں سے دور دور تک کا نظارہ ممکن تھا۔ امین و ابراہیم کے غلاموں نے مسندیں لگا دیں غرض شراب آ گئی امین نے ابراہیم کی طرف پیالہ

بڑھایا۔

نشہ مئے سے سرشار ہو کر ابراہیم نے چند اشعار گائے۔

امین بولا۔ ''نغمہ ہے تو ساز بھی ہونا چاہیے۔''

حسب الطلب ایک کنیز کو امین کے سامنے پیش کیا گیا جو گانا بھی جانتی تھی۔ اس سے پہلے کہ عارج مجھے روکتا میں بہ وجوہ اس کنیز کے جسم میں اتر گئی' اس کا جسم لطیف تھا' سو مجھے قرار آ گیا۔

معاً مجھے امین کی تیز اور غصیلی آواز سنائی دی۔ ''بولتی کیوں نہیں' کیا نام ہے تیرا؟''

''ضعف'' میں دانستہ صرف ایک ہی لفظ بولی' بظاہر وہ توانا آدم زاد اندر سے بہت کمزور تھا اس لیے میں نے ضعف کا لفظ استعمال کیا یہ کسی آدم زادی کا نام نہیں ہو سکتا' امین کو یہ خیال بھی نہ آیا' میری توجہ اس کے ذہن پر تھی وہ وحشت زدہ سا نظر آ رہا تھا۔

''ہمیں کچھ شعر سنا!'' امین نے مجھ سے فرمائش کی۔

میں نے جو پہلا شعر پڑھا' اس کے ساتھ ہی ساز بجانے لگی شعر کے معنی یہ تھے۔ ''اپنی عمر کی قسم' کلیب کے مددگار زیادہ تھے اور وہ تجھ سے زیادہ مدبر و عاقل بھی تھا تاہم خون میں نہلایا گیا۔''

امین اور بھی مکدر ہوا' اس نے مجھ سے کہا'' رُک جا...... اور اچھے شعر گا کہ ہمارا جی بہلے۔''

میں نے عربی ہی کا ایک اور شعر گایا' اس کا مطلب یہ تھا۔ ''ان لوگوں کے فراق نے میری آنکھوں کو رلایا اور نیند کھو دی' جدائی دوستوں کو سخت رلانے والی چیز ہے۔''

اس پر امین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ چیخ اٹھا۔ ''کم بخت تجھے ایسے شعر کے سوا اور بھی کچھ گانا آتا ہے؟''

میں بولی۔ ''کنیز نے وہی شعر گائے کہ حضور جن کو سن کر خوش ہوں۔'' پھر میں نے اور چند شعر گائے۔

امین غصے میں آ گیا اور کہا۔ ''ملعونہ! دور ہو۔''

اپنا کام دکھا کر میں اس کنیز کے جسم سے باہر آ گئی' میرا مقصد اس بے ہوش غافل آدم زاد کو آنے والے وقت کا اشارہ دینا تھا۔ امین نے ایک مرتبہ پھر کنیز کو ڈانٹا' وہ یہ نہ جانتا کہ اس کنیز کے جسم میں داخل ہو کر ایک جن زادی یعنی میں باہر آ چکی ہوں' وہ کنیز بھی نہ سمجھی کہ امین کس لیے اس پر خفا ہو رہا ہے۔

''اٹھ جا یہاں سے۔'' امین بنکارا۔

کنیز ہڑبڑا کر اٹھی تو بلور کے ایک خوبصورت پیالے سے ٹکرا کے گری' امین اس پیالے کو زب زباج کہا کرتا تھا۔

پیالہ ٹوٹ گیا اور کنیز بھی چلی گئی تو امین نے اپنے چچا ابراہیم کو مخاطب کیا۔ ''آپ دیکھتے ہیں' آج کیا کیا باتیں پیش آ رہی ہیں' غالباً میرا وقت پورا ہو گیا۔''

ابراہیم اسے دلاسے دینے لگا' نشے میں امین اسی پر مصر تھا کہ اب زندہ نہیں بچے گا۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ میں نے امین سے سرگوشی کی۔ ''قضی الامر الذی فیہ تستفتیان'' یعنی جس امر میں تم دونوں بحث کرتے ہو طے ہو گیا۔

سرگوشی پر امین نے ابراہیم سے پوچھا۔ ''کچھ سنا بھی؟''

''مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا۔'' ابراہیم نے جواب دیا۔

ہمت کر کے وہ بھاری تن و توش والا آدم زاد امین اپنی جگہ سے اٹھا اور آس پاس کا جائزہ لیا اس کے بعد وہ ابراہیم سے باتوں میں مشغول ہو گیا دوبارہ دور ساغر چلنے لگا۔

میں تو اس محفل عیش میں بھڑنگ پھیلانا چاہتی تھی سو ایک مرتبہ پھر امین کو موت کی یاد دلا دی۔

اب امین کی قوت برداشت جواب دے گئی وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا۔

عارج مجھ سے کہنے لگا۔ ''اے دینار! تو خلاف ورزی کر رہی ہے۔''

''کیسی خلاف ورزی؟''

''تو اس کنیز کے قالب میں کیوں اتری؟''

''تو مجھ سے یہ جواب طلب کرنے والا کون؟...... تیرا بھی جب جی چاہے کسی آدم زاد کے قالب میں گھس جائیو۔''

میرا جواب سن کر گویا عارج اپنا سا منہ لے کے رہ گیا۔ اس یاس و ناامیدی پر امین کو اپنے سوتیلے بھائی مامون کی یاد آئی جس کے بھیجے ہوئے ایک فوجی افسر نے اس کا ناطقہ بند کر دیا تھا سو اس نے یک چشم طاہر کو ایک خط لکھا۔ اس خط کی دلچسپ عبارت یہ تھی۔ ''آپس کی خانہ جنگیوں سے یہ نوبت پہنچی کہ اب عزت اور ناموس کی طرف سے بھی اندیشہ ہے' مجھ کو ڈر ہے کہ یہ موقع دیکھ کر غیروں کو خلافت کی ہوس نہ ہو بہرنو میں اس پر راضی ہوں کہ تو مجھ کو امان دے' میں چاہتا ہوں کہ اپنے بھائی مامون کے پاس چلا جاؤں' اگر اس نے عنایت کی تو اس کے رحم اور فیاض دلی سے مجھے بڑی توقع ہے۔ اگر اس نے مجھے قتل کرا دیا تو ایک ذور نے

دوسرے زور کو توڑا اور تلوار نے تلوار کو کاٹا' اگر شیر پھاڑ ڈالے' اس سے اچھا ہے مجھ کو کتا نوچ کھائے۔"

امین کے خط کا آخری فقرہ بڑا معنی خیز تھا' اس نے اپنے سوتیلے بھائی مامون کو شیر اور طاہر کو کتا کہا تھا۔

ممکن ہے کہ امین اگر مامون تک پہنچ جاتا تو شاید اس کو امان مل جاتی اگر اسے تخت خلافت کی عزت نہ ملتی تو کم سے کم جان ضرور بچ جاتی میں نے صرف اتنا کیا کہ سرگوشیوں میں طاہر کو خط کے آخری فقرے کا مطلب اچھی طرح پڑھا دیا اور پھر اس نے امان کی درخواست مسترد کر دی۔

طاہر کے پیہم حملوں نے امین کے طرفداروں کو یقین دلا دیا کہ ان حملوں کو روکنے کی کوشش تقریباً بے سود ہے محمد بن حاطم اور محمد ابن اغلب افریقی کی پامردی سے طاہر اب تک امین پر دسترس نہیں پا سکا تھا' انہی دونوں کے مشورے پر ایک شب خاموشی سے امین' قصر خلافت سے دوبارہ قصر خلد میں اٹھ آیا تھا' زبیدہ بھی اسی رات قصر خلافت چھوڑ کر اپنے قصر (قصر زبیدہ) میں چلی گئی تھی' روز بہ روز بگڑتی ہوئی صورتحال دیکھ کر ابن حاتم اور ابن اغلب دونوں ہی ہمت ہار گئے "عقل سے پیدل" ایک آدم زاد حکمران کو وہ کب تک بچاتے انہوں نے آخری کوشش کے طور پر امین سے جا کر بات کی۔

"اے امیر المومنین! نمک خواروں نے حق نمک ادا نہیں کیا۔" ابن حاتم بولا۔

ابن اغلب نے بتایا۔ "میرے علم و اطلاع کے مطابق قصر خلافت کا محاصرہ کر لیا گیا ہے۔ حضور عالی مرتبت!"

"تو پھر بتاؤ کہ ہم کیا کریں؟" امین نے سوال کیا

میرا جی چاہا کہ کہہ دوں' ڈوب مر! مگر خاموش رہی۔ امین کے دونوں وفاداروں نے یہ تجویز دی کہ اب ایک ہی تدبیر ہے' رفیقوں میں سے سات ہزار جاں نثار منتخب کر لیے جائیں' اصطبل میں گھوڑوں کی اتنی ہی تعداد ہے انہی سات ہزار سواروں کی حفاظت میں حضور عراق سے شام کا قصد کریں' وہاں اس قدر خزانہ و مال موجود ہے کہ ہم اپنی قوت کافی حد تک بڑھا سکتے ہیں' پھر دشمن کے حملوں کا بھی خوف نہیں ہوگا۔ امین نے یہ تجویز قبول کر لی وہ بغداد چھوڑ کر کسی بھی طرف جانے کو آمادہ ہو گیا۔

میں نے طاہر کو یہ خبر پہنچا دی' اس نے سلیمان بن منصور (وہی جس نے امین کی طرف سے بیعت لی تھی) محمد بن عیسیٰ وغیرہ کو بلا بھیجا' یہ آدم زاد ظاہر میں امین کے ساتھ تھے اور اس

کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے لیکن جان کے خوف سے طاہر کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتے تھے وہ آ گئے تو طاہر نے ان سے کہا۔ "اگر امین بچ کر نکل گیا تو تم لوگ زندہ نہیں بچو گے' جس طرح بنے امین کو بغداد سے فرار ہونے کے ارادے سے باز رکھو۔"

مجبوراً یہ لوگ امین کے پاس حاضر ہو گئے اور بولے کہ جن لوگوں نے حضور کو بغداد سے فرار ہونے کی رائے دی وہ خود غرض ہیں۔

"وہ کیسے؟ ہمیں بتایا جائے!" امین نے یہ کہتے ہوئے مسند پر پہلو بدلا۔

"طاہر کے مقابلے میں ابن حاتم اور بن اغلب افریقی ہی نے زیادہ سرگرمی دکھائی" سلیمان بن منصور کہنے لگا۔ "انہیں یقین ہے کہ طاہر نے فتح پائی تو پہلے انہی کی خبر لے گا وہ اسی لیے یہ چاہتے ہیں کہ جب آپ عراق سے شام کی طرف روانہ ہوں تو گرفتار کر لیے جائیں وہ خود ہی آپ کو حراست میں لے کر طاہر کے حوالے کر دیں گے' اس کارگزاری کے صلے میں وہ خود کو مرنے سے بچا لیں گے' بہتر یہ ہے کہ آپ تخت خلافت سے الگ ہو جائیں اور خود کو طاہر کے حوالے کر دیں وہ آپ کا ادب ملحوظ رکھے گا اور مامون سے تو پوری امید ہے کہ برادرانہ سلوک کرے گا۔"

امین تو تھا ہی گھامڑ آدم زاد اس نے یہ رائے مان لی اور بات کی تہ کو نہ پہنچ سکا' اس نے بس اتنا کہا۔ "طاہر کے بجائے ہم ہرثمہ کو اس معاملے میں ترجیح دیں گے" یوں شاید وہ بے اختیار ہو کر بھی خود کو با اختیار ثابت کر رہا تھا۔

ابن حاتم اور ابن اغلب کو جب امین کے ارادے کا علم ہوا تو وہ امین کے پاس آئے' وہ بولے کہ حضور نے ہم خیر خواہوں کا کہنا نہ مانا اور خود غرضوں کی رائے قبول کی' اس سے تو بہتر یہ ہے کہ طاہر سے براہ راست معاملہ کیا جائے۔

اس پر امین نے ایک اور "سچا خواب" سنانا شروع کیا "یہ سچا خواب" میں نے ہی اسے اپنے اثر میں لے کر دکھایا تھا' مقصد اسے طاہر سے ڈرانا اور بغداد سے بھگانا تھا مگر اس کا "حمق" قدم قدم پر نئے رنگ میں ظاہر ہو رہا تھا۔

"میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔" امین کہنے لگا۔ "اس وقت سے طاہر کا نام سن کر مجھے وحشت ہوتی ہے' میں نے دیکھا کہ ایک بڑی لمبی چوڑی دیوار ہے جو بہت بلند ہے میں اس دیوار پر لباس فاخرہ پہنے تلوار کمر سے باندھے کھڑا ہوں' دیوار کے بالکل نیچے طاہر موجود ہے وہ دیوار کی بنیادیں کھود رہا ہے' آخر کار طاہر نے وہ دیوار گرا دی دیوار کے ساتھ میں بھی نیچے آیا اور تاج خلافت میرے سر سے گر گیا' تب سے میں طاہر کی طرف سے چوکنا ہوں' اس

کے برعکس ہرثمہ ہمارے خاندان کا قدیم پروردہ ہے' میں اس کو خلیفہ مرحوم ہارون الرشید کے برابر سمجھتا ہوں۔''

میں نے سنا ہے اور شاید ٹھیک ہی سنا ہے کہ وقت پڑنے پر آدم زاد گدھے تک کو اپنے باپ کے برابر درجہ دینے پر ''آمادہ'' ہو جاتے ہیں' کم عقل امین یہ بھول گیا تھا کہ اس ہرثمہ کو ایک بار ہارون نے معزول کر دیا تھا' امین کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہارون کی موت کے بعد ہرثمہ اس کے بجائے مامون کا طرف دار بن گیا تھا۔

دراصل آدم زادوں کو سب کچھ یاد رہتا ہے البتہ ان کی خود غرضی حافظے کو ''کمزور'' کر دیتی ہے یہی معاملہ امین کے ساتھ تھا' وہ اتنا بھولا اور مظلوم نہیں بلکہ چالاک اور ظالم تھا' جس قدر نظر آتا تھا اس کی گردن پر ہزاروں بے گناہوں کا خون تھا' مطلق العنان حکمرانوں کے دامن پر لہو کے دھبے صاف دکھائی دیتے ہیں' کچھ ایسے آدم زاد حکمرانوں کو اسی دنیا میں سزا مل جاتی ہے اور کچھ کا حساب کتاب آخرت پر ٹل جاتا ہے' بہر صورت وہ سزا سے نہیں بچتے۔

امین کو آخرت کی نہیں دنیا کی سزا کا خوف تھا۔ اس نے اسی لیے ہرثمہ سے امان طلب کی' مقام عبرت ہی تو ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید کا بیٹا امان طلب کر رہا تھا۔

جواب میں ہرثمہ نے خفیہ پیغام میں لکھا۔ ''آپ مطمئن رہیں' کوئی بھی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتا' خود مامون نے بھی اگر کچھ برا ارادہ کیا تو میں سینہ سپر ہوں گا اور جب تک دم میں دم ہے ساتھ دوں گا۔''

ظاہر ہے یہ خفیہ پیغام مجھ جن زادی سے کس طرح ''خفیہ'' رہ جاتا۔

اپنی لگائی بجھائی کی عادت یا مصلحت کے مطابق میں نے یہ ''خفیہ پیغام'' بھی طاہر تک پہنچا دیا' وہ یک چشم آدم زاد اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ گویا ہونے والی بات اسے پہلے سے پتا لگ جاتی ہے۔

وہ طیش میں آ گیا اور کہا۔ ''یہ کبھی نہیں ہو سکتا! آج تک میں نے تمام معرکوں میں اپنی جان کی بازی لگائی' اب امین کا ہاتھ آنا جو خاتمہ فتح ہے ہرثمہ کو کیسے نصیب ہو سکتی ہے!...... ہرگز نہیں۔ میں کسی قیمت پر ایسا نہیں ہونے دوں گا۔'' اس کا لہجہ قطعی تھا۔

''امین کا سر انشاء اللہ میں ہی امیر المومنین مامون کی خدمت میں پیش کروں گا۔''

ادھر تو یک چشم آدم زاد طاہر یہ منصوبے بنا رہا تھا' ادھر عمائدین بنی ہاشم سر جوڑ کے بیٹھے تھے۔ انہیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ہارون الرشید کے بیٹے امین کو کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ امین بذات خود ہرثمہ کے پاس چلا جائے' عصا' چادر اور انگشتری جو خلافت کی

نشانیاں ہیں طاہر کے پاس بھیج دی جائیں۔

آدم زاد اپنے لیے جو فیصلے کرتے ہیں عموماً ان میں اپنے مفاد کو نظر انداز نہیں کرتے' امین کے معاملے میں سب اپنی اپنی حشر بھنانے کو تیار تھے۔ ہرثمہ نسباً ہاشمی تھا اس لیے بنی ہاشم نے خیال کیا کہ وہ دغا نہ کرے گا۔ ہارون کی بیوی زبیدہ بھی ہرثمہ کے حق میں تھی۔ خود امین بھی اس سے زیادہ مانوس تھا۔

ان حقائق سے قطع نظر اب تک کی بیشتر فتوحات کا سہرا طاہر کے سر تھا۔ اسے خفا کرنا حماقت ہوتی لیکن امین تو گویا حماقت کا پتلا تھا۔ اس نے بنی ہاشم کے پورے فیصلے کو قبول نہیں کیا۔

وہ لوگ جو پہلے امین کے دست راست تھے اب طاہر سے مل گئے تھے۔ انہوں نے اپنا تقرب بڑھانے کے لیے طاہر سے کہا کہ آپ کو دھوکہ دیا گیا ہے۔ مخالفین نے بندوبست کر لیا ہے کہ امین کے ساتھ علامات خلافت بھی ہرثمہ کے ہاتھ آ جائیں۔

مجھے اب زیادہ سرگرمی دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ امین نے خود اپنے لیے کانٹے بو لیے تھے۔ اگر وہ ایسا نہ بھی کرتا تو طاہر اسے مشکل ہی سے زندہ چھوڑتا۔ میں خاموش تماشائی بنی رہی مگر ایک حد تک! جہاں ضرورت پڑتی مداخلت ''جا دیے جا'' کرنے سے باز نہ آتی۔ ایک بار کوئی چسکا لگ جائے تو چھوٹنا محال ہوتا ہے۔

عارج اور میں قصر خلد سے گزر رہے تھے کہ میں رک گئی۔

''کیا ہوا تجھے اے دینار؟'' عارج نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں۔ میرے ساتھ آ!'' میں یہ کہنے کے بعد آگے بڑھ گئی۔

''ایک تو تیرے ساتھ یہ مصیبت ہے کہ بتاتی نہیں بات کیا ہے!''

عارج کی بات کو میں نے کی ان سنی کر دیا۔ وہ تیر اندازوں کا ایک دستہ تھا جو قصر خلد کی نگرانی کر رہا تھا۔ طاہر نے اس دستے کے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ امین نکل کر نہ جانے پائے۔

25 محرم 198 ہجری کو بروز ہفتہ بہ وقت رات بعد نماز عشاء (تقریباً دس بجے) امین نے ہرثمہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ ہرثمہ نے کہلوایا کہ دریائے دجلہ پر طاہر نے فوج متعین کر دی ہے۔ آج کی رات حضور اور توقف فرمائیں تو کل میں فوج و حشم سے تیار ہوں۔ اگر طاہر سے مقابلے کی نوبت آئی تو سینہ سپر ہو کر لڑوں گا۔

امین ایسے اضطراب و خوف کی حالت میں تھا کہ بغداد میں ایک لحظ بھی ٹھہرنا اس کو

گراں تھا۔ اس نے ہرثمہ کے قاصد سے کہا! اس اضطراب میں کس طرح سے رات کٹ سکتی ہے۔ بلائے یا نہ بلائے میں تو اسی وقت ہرثمہ کے پاس جاتا ہوں۔

یہ امین کا آخری "دربار" تھا۔ وہ قصر خلد سے رخصت ہوتے وقت صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا' چند خدام اس کے سر پر گز لیے کھڑے ہوئے اس نے اپنے دونوں بیٹوں موسیٰ و عبداللہ کو بلایا اور سینے سے لپٹا کر پیار کیا۔ ان کی پیشانی اور گالوں پر بوسے دیئے۔ پھر انہیں گلے سے لگا کر خوب رویا اور نہایت حسرت کے ساتھ یہ کہہ کر رخصت کیا کہ جاؤ خدا کو سونپا۔ اپنی بیوی اور پسندیدہ کنیزوں سے وہ پہلے ہی مل چکا تھا۔ جب وہ قصر خلافت سے قصر خلد میں آیا تو اپنے "حرم" کو بھی ساتھ لایا' (حرم عربی زبان کا لفظ ہے اس کے کئی معنی ہیں۔ (1) کعبے کی چار دیواری (احاطہ)' (2) اندرون خانہ' اشراف کے گھر کی عورتیں (3) منکوحہ' گھر میں ڈالی ہوئی باندی' وہ کنیز جس سے صحبت کی ہو (4) لونڈی' خادمہ۔

اس سے قبل امین جب کبھی سفر کرتا تو ہزاروں زریں کمر غلام ہوتے' ان غلاموں کی زرق برق پوشاکیں' چمکتے ہوئے مرصع ہتھیار دور سے دکھائی دیتے۔ آج وہ اس حال میں چلا کہ خادم کے ہاتھ میں صرف ایک شمع تھی جو راستہ دکھانے کو قصر خلد سے ساتھ لی گئی تھی۔

امین قصر خلد سے نکلا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ تیر اندازوں کا وہ دستہ محو خواب تھا جو قصر خلد کی نگرانی پر مامور تھا۔

اس موقع پر میں نے اچانک امین کے جسم کو جھٹکا کھاتے دیکھا' میں سمجھ گئی کہ کیا واقعہ ہوا ہے! عارج میرے ساتھ نہیں تھا۔

اس آدم زاد امین پر رحم مجھے بھی آیا مگر اب عارج چاہتا بھی تو اسے شاید نہ بچا پاتا۔ امین کے جسم میں عارج کے گھس جانے سے صورتحال میں کوئی تبدیلی نہ آتی' پھر مجھے ایک اور تماشا دکھائی دیا۔ عارج کو امین کے قالب میں قرار نہ آیا' یقیناً اس آدمی امین کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا۔ گھٹن سے عارج گھبرا گیا۔ میں نے فوراً اندھیرے کی چادر اوڑھ لی کہ عارج کو نظر نہ آؤں' چلتے چلتے امین پھر لہرایا' اس وقت ایک طرف سے کوئی امین کی جانب لپکا' اس نے امین کو زمین پر نہ گرنے دیا۔

"کون ہے تو؟" اس عالم میں بھی امین کی بھرائی ہوئی آواز سخت تھی۔

"حضور کا نمک خوار غلام' احمد بن سالم' ناظم فوج داری تھا کبھی' اب کچھ بھی نہیں' غلام کو اندازہ تھا کہ حضور پر برا وقت پڑا ہے اسے میں نمک حلال ہی..." وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا اس کی وجہ عارج تھا۔ امین کے قالب سے نکل کر اب وہ احمد کے انسانی پیکر میں داخل ہو گیا

تھا' میں احمد پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔

"چل..... آ جا! ہمیں واقعی اس وقت اپنے وفاداروں کی ضرورت ہے۔" امین بولا میں ان دونوں آدمیوں کو شمع اٹھانے والے خادم کے قریب ہی تھی۔ مجھے یہ دیکھنا تھا کہ عارج کو احمد کے پیکر میں قرار آتا ہے یا نہیں! اس مرتبہ عارج کامیاب رہا' اسے احمد کا جسم نہیں چھوڑنا پڑا۔

امین کو سنبھالے عارج آگے بڑھا' وہ دجلہ کے کنارے پہنچا تو ہرثمہ اسے لینے کو موجود تھا۔ دریا کنارے حراقہ کھڑی تھی۔ (حراقہ اس جنگی کشتی کو کہتے تھے جس میں آتش باری کا سامان ہوتا تھا۔ اس کے ذریعے دشمنوں پر آگ برسائی جاتی تھی۔ (مصنف)

ہرثمہ اور اس کے سپاہی کشتی (حراقہ) پر سوار تھے' امین نے شمع بردار خادم کو واپس بھیج دیا۔ عارج کے انسانی قالب نے امین کو کشتی پر سوار کرایا۔ سب سپاہیوں نے امین کو تعظیم دی۔ ہرثمہ کو کیوں کہ نقرس کی شکایت تھی اس لیے امین کے احترام میں اٹھ نہ سکا۔ (نقرس ایک درد شدید کا نام ہے جو پیروں کی انگلیوں سے اٹھتا ہے) یہ بیماری صرف آدمیوں کو ہوتی ہے۔ درد کے باوجود ہرثمہ کوشش کر کے گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "اے امیر المومنین! یہ غلام سو عباس معافی مانگتا ہے کہ حضور کے احترام میں اٹھ کر کھڑا نہ ہو سکا' بیماری کی وجہ سے غلام معذور ہے۔"

"اے ہرثمہ بن اعین! تم ہرگز غلا..... غلام نن... نہیں۔" امین ہکلانے لگا مگر اس نے سچ ہی کہا۔ "تم امرائے عرب میں..... میں سے ہو... ہمیں... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

ہرثمہ نے امین کو اپنی آغوش میں لے لیا' اس کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسے دیئے۔

"میرے آقا..... میرے مالک..... میرے سردار!" ہرثمہ جیسے ہارون کے اس نااہل بیٹے پر محض اس لیے قربان ہوا جا رہا تھا کہ وہ اہل عرب میں سے تھا۔ خود کو عرب (زبان والے) اور دوسروں کو عجمی (بے زبان' گونگے) کہنے والے ناجائز فخر میں مبتلا تھے۔ وہ یہ بھول گئے تھے یہ سبق انہیں یاد نہیں رہا تھا کہ کسی عرب کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر فوقیت حاصل نہیں' حضور سرور کائنات رسول آخر الزمان نے اپنے آخری خطبہ حج میں یہی تو کہا تھا۔ اپنے باپ اعتصم سے میں نے یہی سنا تھا۔

پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ طاہر نے دہرا بندوبست کیا تھا' ایک طرف تو اس نے قصر خلد کی نگرانی پر تیر اندازوں کا ایک دستہ تعینات کیا' دوسری جانب دریائے دجلہ پر خفیہ پہرا بٹھا دیا۔ ادھر ہرثمہ نے حراقہ کے ناخدا کو آگے بڑھنے کا حکم دیا' ادھر طاہر کے سپاہیوں نے حراقہ کو

گھیرے میں لے لیا۔ ان میں غوطہ خور بھی تھے۔ طاہر کے سپاہی جنگی کشتیوں میں سوار تھے۔ حراقہ کا محاصرہ کر کے طاہر کے فوجیوں نے لڑائی شروع کر دی، جنگی کشتیوں کے بیڑے سے لڑنا بھلا کیسے ممکن تھا! ہرثمہ گھبرا گیا' عارج کے انسانی قالب احمد کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میرا یہ اندازہ غلط نکلا کہ عارج اب احمد کے جسم سے باہر آ جائے گا۔

حراقہ پر اتنے تیر اور پتھر برسائے گئے کہ اس کے تختے سلامت نہ رہے' غوطہ زنوں نے حراقہ کے پیندے میں سوراخ کر دیا تھوڑی دیر میں حراقہ پانی سے لبریز ہو کر ڈوب گئی۔

مجھے عارج کی طرف سے فکر ہوئی کہ کہیں وہ احمد کے قالب میں رہ کر نہ مارا جائے میں سطح آب پر نظر رکھے ہوئے تھی' حراقہ کا ناخدا بھی تیرنا جانتا تھا وہ ہرثمہ کو نکال لے گیا۔ میں نے عارج کو کنارے کی طرف تیرتے دیکھ لیا تو قدرے میرا اضطراب کم ہوا۔ عارج سے ایک حماقت اور سرزد ہوئی وہ امین کو سہارا دیئے رہا کہ ڈوب نہ پائے۔ بہرصورت عارج اور امین دونوں ہی کنارے تک پہنچ گئے۔ حراقہ پر ہرثمہ کے جو سپاہی سوار تھے ان میں سے چند ہی مارے گئے' باقی کو طاہر کے بحری بیڑے نے دریا سے نکال کر حراست میں لے لیا' انہی میں ہارون کا نالائق بیٹا امین بھی تھا۔ اسے کوئی نہ پہچانا' اس نے ہوشیاری یہ کی کہ پانی ہی میں تیرتے ہوئے جو کچھ پاس پلے تھا دریا میں پھینک دیا' تیرتے ہوئے بوجھ کم سے کم ہونا چاہیے امین کو اپنے استادوں کی یہ تاکید یاد تھی۔

میرے لیے امین کے بجائے عارج اہم تھا۔ میں چاہتی تو اسے رہا کرا لیتی مگر ابھی نوبت یہاں تک نہیں آئی تھی۔

طاہر کا قیام اب تک باب الانبار کے قریب تھا' پاس ہی باغ میں اس کے محافظ چوکنا رہتے وہ اس امید پر جاگ رہا تھا کہ کوئی "خوش خبری" سن لے تو اطمینان سے پاؤں پھیلا کر سوئے۔

اپنی کارکردگی دکھانے کی غرض سے سپاہی' عارج کو پکڑ کر طاہر کے پاس لے گئے انہوں نے طاہر کو ساری روداد سنا دی۔

"وہ امین کہاں ہے۔" طاہر گویا گرجا۔

"ان...... اس...... کی تلاش جاری ہے۔" سالار دستہ فوج نے سٹپٹا کر جواب دیا۔

"اور تو کون ہے؟" طاہر نے عارج سے کڑک کر پوچھا عارج نے اپنے انسانی قالب احمد بن سالم کا حسب نسب بتا دیا۔ لازماً موقع ملتے ہی عارج نے یہ ضروری معلومات حاصل کی ہوں گی پھر طاہر نے امین کا حال معلوم کیا۔

"وہ دریا میں گرتے ہی ڈوب گیا تھا۔" عارج نے غلط جواب دیا۔

جھوٹا کہیں کا! میں نے سوچا' یہ سمجھ رہا ہے کہ اس طرح "کرینٹ" آدم زاد طاہر کو دھوکا دے سکتا ہے اسے جھوٹ بولنے اور امین کو بچانے کی تھوڑی بہت سزا تو ملنی ہی چاہیے۔

طاہر کے حکم سے عارج کو بغداد شہر کے ایک بوسیدہ مکان میں قید کر دیا گیا۔ وہ بھی ایک ہی ضدی جن زاد تھا' ہمت نہ ہارا۔ ادھر طاہر اس لالچ میں تھا کہ ناظم فوج داری سے منال "اینٹھ" لے۔ اس نے دباؤ ڈالنے کے لیے عارج سے کہلوایا کہ اسے قتل کیا جانے والا ہے' کچھ دیر کو عارج چکرایا کہ اب کیا کرے! "بھاگ" لے کہ احمد کے قالب میں ٹکے۔

آخر عارج نے ایک مناسب فیصلہ کر ہی لیا' احمد بن سالم کے سارے مال و اسباب کے بدلے عارج نے اپنی جان بچالی' طاہر کو "زرتاوان" مل گیا تو فی الفور اسی رات کو ایک اور حکم دیا اس حکم کے تحت بھی عارج نے قید سے رہائی نہ پائی۔ عارج کو اس بوسیدہ مکان سے نکال کر قصر خلافت کے زنداں میں لے جایا گیا' اسی زمین دوز قید خانے میں ان تمام آدمیوں کو رکھا گیا تھا جو زندہ ہاتھ آ گئے تھے۔ انہی میں امین بھی تھا۔

امین کی حالت قابل رحم تھی۔ عمامہ اب بھی اس کے سر پر تھا' اسی عمامے کے کپڑے سے امین اپنا نصف چہرہ چھپائے ہوئے تھا اس کے علاوہ امین صرف ایک پاجامہ پہنے تھا' قمیص یا جسم پر کوئی اور کپڑا مجھے نظر نہ آیا (صحیح لفظ قمیص ہی ہے' ص سے)

قید خانے میں موجود آدم زاد ڈرے ڈرے اور سہمے ہوئے تھے اس وقت تک کسی کو خبر نہ تھی کہ امین زندہ ہے' مرا نہیں۔ اسی سبب عارج کو قید خانے کے اسی حجرے میں بند کیا گیا جہاں امین پہلے سے موجود تھا۔

دور جلتی ہوئی مشعل کی روشنی اس حجرے کے اندر تک آ رہی تھی دروازے کے باہر ذرا فاصلے پر مسلح دربان موجود تھے' اس زمین دوز قید خانے میں اتنی روشنی تھی کہ سوئی بھی گر جائے تو نظر آ جائے انہیں تاکید کی گئی تھی کہ احتیاط رکھیں۔

امین نے عارج کے انسانی قالب احمد کو پہچان لیا اور بے ساختہ رو پڑا اور چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔

"خود پر قابو رکھیں حضور ورنہ۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون" امین بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اے احمد بن سالم تمہیں میں نے پہچان لیا ہے۔"

"جی ہاں میں حضور کا غلام ہوں۔" عارج نے کہا

"بھائی غلامی کیسی! اس وقت تم میرے قوت بازو ہو مجھے ذرا اپنے سے لگا لو سخت وحشت ہو رہی ہے۔"

عارج نے اسے لپٹا لیا تو کانپنا کسی قدر کم ہوا۔

"تمہیں مامون کا کچھ حال معلوم ہے۔" امین نے دھیمی آواز میں عارج سے سوال کیا۔

"وہ زندہ ہے۔"

"خدا پرچہ نویسوں کا برا کرے' کم بختوں نے خبر دی تھی کہ مامون مر گیا۔" امین بھولا بن گیا۔

"خدا آپ کے وزیروں کا برا کرے۔"

"وزیروں کو کچھ نہ کہو احمد! ان کا کیا گناہ ایک میں ہی پہلا شخص نہیں ہوں جو اپنے ارادے پورے نہ کر سکا۔" امین کہنے لگا پھر کچھ توقف سے پوچھا۔ "کیوں احمد' لوگ مجھے قتل کر ڈالیں گے یا اپنے عہد پر قائم رہیں گے؟"

عارج نے اسے جھوٹی تسلی دی۔ "وہ سارے آپ کے امرائے دولت جو طاہر سے جا ملے ہیں دراصل آپ ہی کے وفادار ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے عہد کی پاس داری کریں گے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔"

یہ سن کر امین کے چہرے پر اطمینان دکھائی دیا۔

ان دنوں بغداد میں شدت کی سردی پڑ رہی تھی' امین پانی میں بھیگا ہوا تھا عارج نے اسے اپنا شلوکہ اتار کر دیا اور بولا۔ "آپ اسے پہن لیجئے' سردی لگ رہی ہوگی۔"

امین نے شکر گزاری کا اظہار کیا اور کہا۔ "ہر چند کہ اس شلوکے سے تمہارے بدن کی بو آتی ہے مگر بھائی! اس موقع پر تو یہ بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔"

عارج نے امین کو سونے کا مشورہ دیا۔ کچھ کہے بغیر امین حجرے کے فرش پر "تکی" بن کر پڑ رہا۔ خود عارج نے بھی دروازے کی طرف پیٹھ کی اور آنکھیں بند کر لیں۔

صبح ہونے والی تھی' مجھے معلوم تھا کہ "تاوان" وصول کر کے طاہر وعدہ خلافی نہ کرے گا۔ اگر عارج کے انسانی قالب احمد بن سالم کو مارنا ہی ہوتا تو شہر کے ایک تباہ حال ادھ جلے مکان سے قصر خلافت کے تہ خانے میں نہ رکھا جاتا۔

واقعہ یہ تھا کہ جب تک امین کا سراغ نہ لگ جاتا وہ زندہ ہے یا مردہ؟ کسی قیدی کو رہا کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

کچھ ہاتھ پیر خود طاہر کو بھی مارنے چاہئیں' میں نے یہ سوچ کر مزید مداخلت نہیں کی۔ قصر خلافت کے اس زنداں سے میں نکل آئی۔

دوسرے دن طاہر کے حکم پر صبح ہی سے بغداد کی ناکہ بندی کر دی گئی' ہرثمہ اپنے سپاہیوں سے جا ملا جو بغداد کے باہر موجود تھے۔

امین اگر جلد بازی سے کام نہ لیتا' ہرثمہ کا کہنا مان کے مزید ایک رات رک جاتا تو غالباً دشمن کی قید میں نہ ہوتا۔ یہ الگ بات کہ "بغل میں بچہ' شہر میں ڈھونڈورا" کے مصداق طاہر کو پتا نہ تھا' امین کو پکڑا جا چکا ہے اور اسی کی قید میں ہے۔

صورتحال سے میں لطف اندوز ہو رہی تھی۔ طاہر جھنجھلایا ہوا اپنی ایک آنکھ کو بار بار مل رہا تھا' نیند پوری نہ ہونے کے سبب آنکھ میں پانی آ جاتا اور کھجلی بھی ہوتی' اسی عالم میں دن بھر وہ "اونگے بونگے" احکام جاری کرتا رہا۔

آدھی رات کا وقت ہوگا کہ محمد بن حمید طاہری مجھے سرگرم نظر آیا' قصر خلافت میں داخل ہوا اور پھر زمین دوز قید خانے میں جا پہنچا۔ قیدیوں کے حجروں میں جھانکتا ہوا آخرکار وہ عارج وامین کے حجرے تک پہنچ گیا۔ دور سے اس نے امین کو پہچان لیا' امین اس اطمینان میں تھا کہ بچ گیا ہے۔ عارج کی تاکید کے باوجود اس نے چہرہ نہ چھپایا۔ وہ بے وقوف تو اس صورتحال سے مزہ لے رہا تھا' اسے خبر بھی نہ تھی کہ کوئی اسے شناخت کر کے جا چکا ہے۔

امین اب تک نہ خود سویا نہ عارج کو سونے دیا۔ اس نے عارج سے بالکل بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔ "تم دیکھنا احمد کہ طاہر مجھے نہ ڈھونڈ پائے گا جس طرح کل کی رات سکون سے گزر گئی آج بھی صبح ہو جائے گی یہ بھی ممکن ہے کہ نئے دن کا سورج میرے وفاداروں کی غیرت کو جگا دے۔"

عارج نے گویا جان چھڑانے کو کہہ دیا۔ "ہاں حضور' انشاء اللہ تعالیٰ۔"

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ بھاری قدموں کی چاپ گونجی۔ امین اچھل پڑا' عارج تاڑ گیا کہ کیا ماجرا پیش آنے والا ہے' وہ احمد بن سالم کے جسم کو چھوڑ کر باہر آنے لگا تو میں اندھیرے کی چادر میں چھپ گئی۔

احمد پر عارج نے گہری نیند مسلط کر دی کہ اس ہنگامہ مرگ میں کہیں وہ کام نہ آ جائے پھر عارج وہاں رکا نہیں اور تیزی کے ساتھ زنداں سے نکل گیا ذرا سی دیر ہوئی تھی کہ "بھاری قدم" حجرہ امین کے سامنے رک گئے' اشارہ ملتے ہی دربانوں نے حجرے کا دروازہ کھول دیا۔ عجمیوں کا وہ گروہ دروازے پر آ کے ٹھہر گیا۔ انہوں نے احمد کو سوتے پایا تو پلٹ کر دربانوں

سے اسے اٹھا کر لے جانے کو کہا' اب حجرے میں امین اکیلا کھڑا کانپ رہا تھا۔ آنے والے عجمیوں کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلواریں تھیں۔

کاٹنے والے امین کی خودغرضی کے سبب بغداد پر تباہی آ گئی تھی۔ سو مجھے اس پر رحم نہ آیا اس نے خود اپنے آپ پر رحم نہ کیا تو کوئی اور اس پہ رحم کیوں کھاتا! عوام مر رہے ہوں اور حکمران عیش و عشرت میں مبتلا ہو تو اسے سفلا پن اور خود پر رحم نہ کرنا ہی کہا جائے گا۔ معلوم نہیں کیوں آدمی اپنی موت کو بھول جاتا ہے۔

امین کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا نتیجہ یہ کہ اب تھر تھر کانپتے ہوئے اپنے ممکنہ قاتلوں سے مخاطب تھا۔ ''م...... میں...... ہارون الرشید کا...... فرزند ہوں...... ما...... مامون کا بھا...... بھائی ہوں...... میرا خون کسی طرح حلال نہیں۔''

اس کی ہکلاہٹ نام و نسب اور فریاد کچھ کام نہ آیا۔ دفعتہً آنے والے عجمیوں کا گروہ اس پر ٹوٹ پڑا۔ (دفعتہً کو الف سے لکھنا درست نہیں۔ (مصنف) ایک شخص نے کمر پر تلوار ماری' پھر سب نے مل کر اسے پچھاڑا' اس کا منہ زمین کی طرف تھا' اسے اسی حالت میں الٹی طرف سے ذبح کیا گیا۔ تلوار کی تیز دھار نے چند لمحوں میں سر کو تن سے جدا کر دیا۔

امین کا کٹا ہوا سر تصدیق قتل کی خاطر طاہر کے پاس لے جایا گیا۔

''اسے قصر خلافت کے کسی برج پر لٹکا دیا جائے۔'' طاہر نے حکم دیا۔

صبح ہوئی تو زمین دوز قید خانے سے امین کی سر بریدہ لاش بھی اٹھوالی گئی جسے بازار کرخ میں لٹکوا دیا گیا۔

عوام کو یہ نظارہ طاہر نے اپنی دانست میں اس لیے کرایا کہ داد پائے' لوگ عبرت پکڑیں کہ معزول خلیفہ کی بیعت نہیں کرنی چاہیے۔ امین کی ماں' ہارون کی بیوہ زبیدہ اپنے قصر میں تھی۔ اسے ایک خواص نے آ کر بتایا۔ ''امیرالمومنین قتل کر دیے گئے۔'' زبیدہ اس پر کچھ نہ بولی' ایسے میں بھلا تاب گویائی کہاں ہوتی ہے۔

کسی ماں کو جوان بیٹے کے مرنے کی خبر ملے تو اس کے دل پر جو گزر سکتی ہے وہی زبیدہ پر گزری وہ آدم زادی گم صم بیٹھی رہی (گم صم کو عموماً گم سم لکھ دیا جاتا ہے جو غلط ہے۔ صم کا مطلب نہ سننا جبکہ سم گھوڑے' گدھے وغیرہ کے کھروں کو کہتے ہیں۔ (مصنف) زبیدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ امین کا خون کر دیا گیا اور وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ اس نے اگر کیا تو یہ کہ امین کے قتل کی راہ نادانستگی اور دانستہ سوتیلے پن سے ہموار کر دی۔

زبیدہ خاتون پر جو گزری اس نے اشعار کی صورت میں مامون کو لکھ بھیجا۔ ان عربی

اشعار کا مطلب شعر بہ شعر یہ ہے:

ام جعفر کی طرف سے خلیفہ مامون کے نام جو کہ اگلوں کے علم و فہم کا وارث ہے۔

اے ابن عم! میں تجھ کو لکھ رہی ہوں اور میری آنکھیں پلکوں سے خون برسا رہی ہیں۔

مجھ کو ذلت اور اذیت و رنج پہنچا اور فکر نے میری آنکھوں کو بے خواب کر دیا۔

یہ طاہر کو کیا ہوا ہے جس کو خدا طاہر (پاک) نہ کرے اور جو کچھ اس نے کیا اس کے الزام سے پاک نہیں ہو سکتا۔

☆......☆......☆

زبیدہ کے آخری اشعار یہ تھے۔ اس نے مجھ کو برہنہ سر اور بے پردہ کیا' گھر (قصر زبیدہ) سے نکالا اور میرا مال لوٹ لیا اور مکانات برباد کیے۔ اس ایک چشم ناقص الخلقت کے ہاتھ سے جو مجھ پر گزرا ہارون ہوتا تو اس پر بھی گراں گزرتا۔

طاہر نے جو کچھ کیا' اگر تیرے حکم سے کیا تو خدا کی طرف سے مقدر سمجھ کر قبول کرتی ہوں۔

مجھے عارج نے بتایا کہ مامون اپنی سوتیلی ماں زبیدہ کے اشعار پڑھ کر رویا اور کہا۔ ''واللہ میں خود اپنے بھائی کے خون کا عوض لوں گا۔'' تصویر کا دوسرا رخ یہ تھا کہ جب مو میں تشہیر بغداد کے بعد امین کا سر پہنچا تو اس غیر متوقع فتح کی خوشی منائی گئی۔ مامون نے سجدہ شکر ادا کیا۔ یہ واقعہ ذرا تفصیل کا تقاضا کرتا ہے۔

طاہر نے مامون کو ان دلچسپ اور مختصر الفاظ میں نامہ فتح لکھا۔ ''میں امیرالمومنین کے حضور میں دنیا اور دین' دونوں پیشکش بھیجتا ہوں۔'' دنیا سے امین کا سر مراد تھا اور دین سے لاٹھی' اور خلافت کی انگوٹھی' حقیقت یہ ہے کہ بنو عباس نے اپنی مطلق العنانی برقرار رکھنے کیلئے دین کو ڈھال بنا رکھا تھا ورنہ تو دین (مذہب) سے آمریت کا کیا تعلق۔ یہ آدم زاد اپنے ظلم پر کس کس طرح پردے ڈالتے ہیں۔

امین کا سر' فضل مجوسی نے ایک سپر میں رکھ کر مامون کے سامنے پیش کیا تھا۔

مامون نے قاصد کو مژدہ فتح کے صلے میں دس لاکھ درہم انعام دیے۔ اسی تقریب میں ایک بڑا دربار منعقد کیا گیا۔ تمام اراکین دولت و افسران فوج مبارک باد دینے کو حاضر ہوئے۔ فضل مجوسی نے دربار عام میں نامہ فتح پڑھا اور ہر طرف سے ''مبارک مبارک'' کا غل اٹھا۔

اگرچہ اس وقت اتنی خوشی منائی گئی مگر اس خمار کے اترتے ہی مامون کو جیسے ہوش آ

گیا۔ امین و مامون کی مائیں الگ سہی' باپ تو ایک ہی تھا۔ وہ دونوں ہی ہارون الرشید کے بیٹے تھے۔ خون تو جوش مارتا ہی ہے۔ مامون کو اس فتح کا نہایت افسوس ہوا۔ طاہر کی تمام کوششیں اس کی نظر میں بے توقیر ہو گئیں۔ وہ مامون کے نزدیک امین کا قاتل ٹھہرا۔

امین کا قتل 25 محرم الحرام کو ہوا۔ اس کی عمر 28 برس تھی۔ 4 برس 7 مہینے 18 دن اس نے خلافت کی۔

24 محرم 198 ہجری بروز ہفتہ اہل بغداد نے عموماً مامون کیلئے بیعت کی۔ اس کی مستقل خلافت اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ بنو عباس میں امین پہلا خلیفہ تھا جسے معزولی کے بعد قتل کیا گیا۔

طاہر نے امین کو قتل کرا کے امان کی منادی کرا دی۔ (یہ 25 محرم جمعہ کا دن تھا) بغداد شہر میں طاہر اپنی فتح کا پرچم لہراتا ہوا داخل ہوا۔ جامع مسجد میں اس نے نماز جمعہ ادا کی۔ مامون کے نام کا خطبہ پڑھا اور امین کی برائیاں بیان کیں۔

بغداد میں جس قدر بھی بڑے بڑے قصر تھے طاہر کے آدمیوں نے سب کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس موقع پر زبیدہ امین کے اہل حرم اور دونوں بیٹوں موسیٰ و عبداللہ کو شہر بدر کر دیا گیا۔ طاہر نے انہیں بالائی زاب کے شہروں کی طرف بھیجا۔ چند دنوں کے بعد موسیٰ و عبداللہ کو مامون کے پاس طاہر ہی نے روانہ کیا۔

قتل امین کے بعد بغداد میں موجود سپاہیان قدیم نیز طاہر کی فوج کو اپنے کئے پر پشیمانی ہوئی مگر اب اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ فوجیوں نے طاہر سے روزینہ طلب کیا' وہاں کیا تھا' حیلے سے فوجوں کو ٹال دیا۔ لشکریوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ اشتعال اس قدر بڑھا کہ قتل امین کے پانچویں روز لشکریوں نے بلوہ کر دیا۔ طاہر اپنے وفادار سالاروں کے ساتھ بغداد سے ایک جگہ عرقر بتوبا کی طرف بھاگ لیا۔

بغداد کے علاوہ عراق کے دوسرے شہروں میں بھی باغی سر اٹھانے لگے۔

ایک دن عارج مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''اب کیا ہوگا اے دینارا!''

''اے عارج اس بات کا جواب تجھے آنے والا وقت دے گا۔''

''تو پھر تو کس مرض کی دوا ہے؟'' عارج جھنجھلا گیا۔

''اپنے حواسوں میں رہ۔'' میں سخت آواز میں بولی۔ ''جن زادیوں سے گفتگو کا سلیقہ سیکھ۔''

''تیرے ساتھ رہا تو نے مجھے اپنے قریب رہنے دیا تو بات کرنی بھی آ جائے گی۔

بول قریب آنے دے گی مجھے؟''

''قریب تو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس سے آگے حد ادب لازم ہے۔''

''اس غلام کو ملکہ جنات سے یہی توقع تھی۔''

''غلام کو حکم دیا جاتا ہے کہ پھوٹ لے۔''

''پھوٹ لیا اے ملکہ' اے دینارا!'' یہ کہتے ہی عارج غائب ہو گیا۔

میں سمجھ گئی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عارج مرو میں مامون کی خیر خبر لینے گیا ہے۔

ایک حکمراں کی حیثیت سے امین کی ناکامی اور قتل کوئی منفرد واقعہ نہیں لیکن اہم ضرور ہے۔ تاریخ آدم زاد میں ایسے متعدد واقعات پیش آتے رہتے ہیں' میں جو واقعات بیان کر رہی ہوں ان سے عرب اور عجم کی کشمکش کے نقطۂ عروج کا پتہ چلتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شخصی حکومت کے سامنے کسی اصول' کسی مذہبی معاہدے اور کسی خونی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

امین کے پاس دولت اور فوج کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن شعور بہرحال برائے نام تھا۔ اگر وہ کم عقل نہ ہوتا تو طاہر کی فتوحات کے سیلاب کو روکنا آسان تھا۔ میں ایک جن زادی بھی اس کے خلاف نہ ہوتی۔

ان دو عوامل کے علاوہ امین کی ناکامی کے اور بھی اسباب تھے۔ پہلا سبب خود اس کی معاہدہ شکنی تھا۔ اس کی وجہ سے سپاہیوں اور افسروں کا اعتبار اس پر سے اٹھ گیا تھا۔ وہ امین کی پریشانی سے ہر ممکن فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ تنخواہوں اور مدد معاش میں اضافے کے مطالبات برابر بڑھتے رہتے تھے۔ اس کے برخلاف خراسانی فوجوں کے سامنے عربوں کا فوجی اقتدار ختم کرنا مقصد تھا۔ وہ اسی لئے جنگ میں بڑی مستعدی سے لڑتی تھیں۔ طاہر کی کامیابی دراصل اسی مقصد کی کامیابی تھی۔

یہ بات بہت عجیب سہی مگر سچ ہے کہ بحیثیت خلیفہ امین خود کو قطعی محفوظ سمجھتا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ کسی عباسی خلیفہ کو جان کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ جو قوم حضرت عثمانؓ' حضرت علیؓ' اور امام حسینؓ کو شہید کر سکتی ہے اس کے افراد عباسی خلیفہ کی حرمت کو بھی خاک میں ملا سکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ باغیوں کو اپنے مفادات سے مطلب تھا۔ انہیں نہ امین سے دلچسپی کہ وہ مارا گیا اور نہ مامون سے۔ انہی باغیوں میں سے ایک آدم زاد ابوعبداللہ محمد تھا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے علم بغاوت بلند کیا۔ اس کا نسب اور القدس عوام کی توجہ حاصل کرنے کو کافی تھا مگر

ملکی نظم و نسق کیلئے ایک مدبر کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت ایک مجہول النسب دیو السرایا نے پوری کی۔ ابو عبداللہ محمدؒ ابن طباطبا کے نام سے مشہور تھا۔ ابو السرایا کی شرکت سے سیاسی بازو بھی قوی ہو گیا۔

یہ شخص ابو السرایا اگرچہ ابتداء میں نہایت ذلت و خواری سے گزر بسر کرتا تھا اور کرائے پر گدھے چلاتا تھا لیکن اس میں شجاعت تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا۔ امین قتل کر دیا گیا تو ایک مدت تک یہ غارت گری کرتا رہا۔ اس نے عمال کو شکستیں دیں اور خزانے لوٹ لئے۔

یہی ابو السرایا رقہ پہنچا تو امین طباطبا سے ملاقات ہوئی جو خلافت کا دعوے دار بن کے اٹھا تھا۔ وہ السرایا کو بھی مشغلہ ہاتھ آیا اس نے ابن طباطبا کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اس سے کہا۔ ”آپ دریا کی راہ سے شہر کوفہ کی طرف بڑھیے میں بھی خشکی کی راہ سے آتا ہوں۔“

کوفہ پہنچ کر پہلے ابو السرایا نے قصر العباس لوٹا‘ یہ والیان کوفہ کا صدر مقام تھا۔ تمام مال و خزانہ دفتر یہیں رہتا تھا۔ اس لوٹ میں بے شمار نقد و اسباب ہاتھ آیا جو ایک مدت سے جمع ہوتا آیا تھا۔ شہر پر پورا قبضہ ہو گیا۔

اطراف سے بھی جوق در جوق لوگ آئے اور ابن طباطبا کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حسین بن سہیل یعنی فضل مجوسی کے بھائی نے زبیر کو دس ہزار کی جمعیت سے ابن طباطبا کے مقابلے پر بھیجا۔

دونوں فوجیں معرکہ آرا ہو گئیں۔ زبیر کو شکست ہوئی۔ ابو السرایا کے حکم سے جس قدر مال و اسباب زبیر کی فوج میں تھا لوٹ لیا گیا۔ ابن طباطبا نے اس لوٹ مار کو ناپسند کیا اور لوگوں کو بے رحمی سے منع کیا۔

ابو السرایا نے یہ دیکھ کر ابن طباطبا کے سبب میری آزادی میں فرق آتا ہے دوسرے ہی دن اسے زہر دلوا دیا۔ اس نے ایک کم سن لڑکے کو جو آل ہاشم ہونے کی حیثیت سے ابن طباطبا کا ہم پلہ تھا خلیفہ قرار دیا۔ اس خلیفہ کا نام محمد محمد بن زید تھا۔

اب حسن بن سہیل نے عبدالقدوس نامی ایک سالار کو چار ہزار سوار کے ساتھ اس مہم پر بھیجا مگر وہ بھی ناکام رہا۔ سالار عبدالقدوس قتل ہوا اور باقی اہل لشکر کچھ لڑائی میں مارے گئے کچھ زندہ گرفتار ہوئے۔

اس نمایاں فتح کے بعد بو السرایا نے کوفے میں اپنا سکہ و خطبہ جاری کیا اور بصرہ و واسط‘ اہواز‘ یمن‘ فارس و مدائن پر فوج و افسر بھیجے جو اکثر کامیاب ہوئے۔

حسن بن سہیل کو اب سخت مشکل کا سامنا تھا۔ جتنے نامور افسر تھے سب نے ابو السرایا کے مقابلے میں شکست کھائی یا عین معرکہ جنگ میں لڑ کر مارے گئے۔ طاہر و ہرثمہ دو ایسے لڑاکا تھے جو ابو السرایا کا زور توڑ سکتے تھے۔ طاہر اس وقت رقہ میں گویا محصور تھا۔ ہرثمہ خود حسن بن سہیل سے ناراض ہو کر خراسان کو روانہ ہو چکا تھا۔ حسن کو ہرثمہ سے طالب اعانت ہونا موجب عار تھا‘ پھر بھی مجبوری ایسی آن پڑی کہ ہرثمہ سے اعانت مانگتے ہی بنی۔ خراسان کی طرف جاتے جاتے ہرثمہ واپس پھرا اور کوفے کو روانہ ہوا۔ قصر بن مہیرہ کے قریب ابو السرایا سے ہرثمہ کا مقابلہ ہوا۔ اس معرکے میں ہرثمہ نے مکمل فتح پائی۔ ابو السرایا بھاگتا ہوا شہر کوفہ پہنچا جو لوگ اس کے ساتھ تھے ہرثمہ سے شکست کھا کر انتقام کے جوش میں تھے۔

شہر کوفہ میں جس قدر آل عباس اور ان کے حامی تھے سب کے مکانات آگ لگا کر برباد کر دیئے گئے۔ جاگیریں لوٹ لی گئیں اور دل کھول کر غارت گری کی گئی (ہامی اور حامی دو زبانوں ہندی اور عربی کے الفاظ ہیں‘ ہامی کا مطلب ہاں کہنے والا‘ اقرار کرنے والا مثلاً ہامی بھرنا‘ اقرار کرنا جبکہ حامی: عربی لفظ ہے جس کے معنی محافظ اور نگہبان کے ہیں۔) (مصنف)

ہرثمہ نے ایک عرصے تک کوفے کا محاصرہ کیا۔ یہاں تک کہ ابو السرایا کوفہ چھوڑ کر بھاگ لیا۔ وہ خورستان میں جا کے رکا۔ خبر سن کر ہرثمہ خورستان واپس آیا‘ چونکہ ہرثمہ خونریزی سے گریز کرنا چاہتا تھا اس لئے ابو السرایا کے پاس پیغام بھیجا کہ ہمارا علاقہ چھوڑ کر جدھر چاہو چلے جاؤ‘ ابو السرایا نے اس پیغام کو دلیل عجز قرار دیا اور کہلا بھیجا کہ میں نے جس حق سے اس مقام پر قبضہ کیا ہے اس کا ثبوت تلوار دے سکتی ہے۔

جب لڑائی کی نوبت آئی تو جنگ کا فیصلہ ابو السرایا کے خلاف ہوا۔ اس کی تمام فوج غارت گئی۔ وہ خود بھی زخمی حالت میں میدان جنگ سے فرار ہوا۔ اس کا تعاقب کیا گیا‘ گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔ یہ فتنہ یوں فرو ہوا۔

ابو السرایا کے علاوہ اور بھی باغی تہ تیغ ہوئے لیکن حدود مملکت میں عام ناراضگی روز بروز بڑھتی گئی۔ عرب کا گروہ جو حکومت کا شریک غالب تھا۔ خراسان کا دارالخلافہ ہونا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے زیادہ یہ کہ وزارت عظمیٰ اور دیگر معزز منصبوں پر فضل و حسن ممتاز تھے جو عجمی النسل تھے۔ اہل عرب کو صاف نظر آ رہا تھا کہ تمام اسلامی دنیا اور خود سرزمین عرب انہی دونوں کے ہاتھوں میں ہے۔ مامون اس وقت تک ایک با اختیار حکمران کی حیثیت سے بالکل گویا معطل تھا۔ سیاہ و سفید کا مالک فضل آتش پرست (مجوسی) تھا۔ اس نے دانستہ خراسان کو

بغداد پر ترجیح دی تھی کیوں کہ کسی غیر عرب کو عرب والوں کا تسلیم کر لینا آسان کام نہ تھا۔ مملکت میں یہ برہمی پھیلی ہوئی تھی لیکن فضل نے مامون کو ان حالات کی خبر تک نہ ہونے دی۔

افسران فوج میں ہرثمہ ایک نامور اور مشہور افسر تھا۔ پُرزور بغاوتوں کا جس نے خاتمہ کر دیا وہ بھی ہرثمہ تھا۔ خلافت عباسیہ پر اس کے اور بہت سے حقوق تھے اسی بنا اور اعتماد پر اس نے یہ جرأت کی کہ مامون کے پاس حاضر ہو کر فضل کی سازشوں کا طلسم توڑ دے۔ اس نے خراسان جانے کا ارادہ کیا۔

فضل نے جب یہ خبر سنی تو مامون کے کئی فرمان اس کے نام بھجوائے کہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ شام و حجاز انتظام طلب ہیں ادھر کا قصد کرو۔ ہرثمہ جسے اپنے حقوق خدمت پر ناز تھا ان احکام کا کچھ لحاظ نہ کیا اور سیدھا خراسان کو چلا۔

اس پر فضل نے مامون سے کہا۔ ''حضور امیر المومنین نے دیکھا' ہرثمہ کو احکام کا مطلق پاس نہیں ہے۔ امیر المومنین خود خیال فرمائیں مملکت کے دیگر نمک خواروں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔''

''اے فضل! ہم بات سمجھتے ہیں۔'' مامون بولا۔ ''تم دیکھو گے کہ ہم اس نافرمان کے ساتھ کس طرح پیش آتے ہیں۔''

عارج کی ضد پر میں بھی بغداد سے مرو آ گئی تھی اور مامون کے بہت قریب تھی۔ جب چاہتی میں بغداد چلی جاتی۔

مامون کا رنگ سرخی مائل سفید تھا' آنکھیں بڑی' داڑھی لمبی مگر پتلی تھی۔ پیشانی تنگ اور چہرے پر ایک نمایاں تل تھا۔ وہ موزوں اندام و خوش رو تھا۔

آخر ہرثمہ خراسان کے دارالحکومت مرو پہنچ ہی گیا۔ اس نے یہ خیال کر کے شاید اس کے آنے کی خبر مامون سے مخفی رکھی جائے نقارہ بجانے کا حکم دیا۔

اس وقت مامون دربار سجائے بیٹھا تھا۔ اس نے درباریوں سے پوچھا۔ ''یہ کیسا غل ہے؟''

جواب فضل نے دیا۔ ''اے امیر المومنین! نافرمان ہرثمہ گرجتا ہوا آ رہا ہے۔''

''ہم حکم دیتے ہیں کہ ہرثمہ کو دربار میں فوراً پیش کیا جائے۔'' مامون کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔

مامون کے حکم کی تعمیل میں ہرکارے دوڑ گئے۔

ہرثمہ نے مامون کو تعظیم دی' پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا مامون اس پر برس پڑا۔

آخر میں بولا۔ '' کچھ کہنا ہے؟''

''اے امیر المومنین! کہوں تو کیا کہوں آپ نے اس مجوسی کو سر چڑھا رکھا ہے۔ یہ بھلا کب مجھے حقیقت سے پردہ اٹھانے دے گا۔'' ہرثمہ نے فضل کی طرف انگلی اٹھائی۔

''یہ نہ بھول اے ہرثمہ کہ خود ہم نے فضل کو اس عہدے پر رکھا ہے۔ تجھے حفظ و مراتب کا بھی خیال نہ رہا۔'' مامون نے یہ کہہ کر بڑی ذلت کے ساتھ ہرثمہ کو دربار سے نکلوا دیا اور حکم دیا کہ اسے قید رکھا جائے۔

میں بغداد آ گئی تو چند روز کے بعد عارج نے بتایا۔ ''اے دینار! ہرثمہ اس دنیا سے چلا گیا۔''

''مگر مامون نے تو اسے قید رکھنے کا حکم دیا تھا۔''

عارج نے جواب دیا۔ ''ہرثمہ کو قید ہی کے دوران میں فضل آتش پرست نے قتل کروا دیا۔''

''اور اس پر مامون نے فضل سے جواب طلبی نہیں کی اے عارج؟''

''فضل نے پہلے ہی مامون سے کہہ دیا کہ ہرثمہ اپنی موت مر گیا۔''

ہرثمہ کے قتل کی خبر سے بغداد میں جب کہرام مچ گیا' لوگ پہلے سے بھرے بیٹھے تھے اس سوزش انگیز اطلاع نے سارے شہر میں ایک نئی ہلچل ڈال دی۔ محمد بن ابی خالد ہرثمہ کا جانشین بنا۔ بغداد والوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ حسن بن سہیل جو بغداد کا عامل (گورنر) تھا۔ واسط میں مقیم تھا۔ اسے معلوم ہوا تو دیر ہو چکی تھی۔ مامون کے حکام برطرف کر دیئے اور محمد بن ابی خالد حسن سے مقابلے کیلئے بغداد سے روانہ ہوا۔ قصہ مختصر یہ کہ کئی معرکے ہوئے کچھ میں محمد کا پلہ بھاری رہا مگر آخری مقابلے میں محمد شدید زخمی ہو گیا۔ مجبوراً وہ بغداد کی طرف پلٹا۔ حسن برابر اس کا تعاقب کرتا رہا۔ محمد کے زخم شدت پکڑتے گئے آخر بغداد پہنچ کر اس نے انتقال کیا۔

محمد کا بیٹا عیسیٰ اپنے باپ کا جانشین بنا اور اہل بغداد سے کہا۔ ''اگر میرا باپ نہیں رہا تو میں اس کا نعم البدل موجود ہوں' اگر خدا نے چاہا تو میں بغداد کو حسن کی حکومت سے آزاد کرا دوں گا۔''

بغداد والوں نے نہایت خوشی سے اس کی حکومت کو قبول کیا۔ اگرچہ حسن کی قاہر فوجوں نے عیسیٰ اور اس کے بھائی ابو زنبیل کو فاش شکستیں دیں مگر یہ صدا بار بار عوام بلند کرتے رہے کہ ایک آتش پرست ہم پر حکومت نہیں کر سکتا۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ بالعموم اہل عراق اور بالخصوص بغداد کے باشندوں نے اپنی مرضی کیخلاف کسی قوت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ خراسان کے حالات کی وجہ سے اب اہل بغداد نے ایک نئے خلیفہ کی تلاش شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاص آل عباس نے خفیہ طور پر ابراہیم بن المہدی کے ہاتھ بیعت کی جو مامون الرشید کا چچا تھا۔

اس پر غارج مجھ سے کہنے لگا۔ ''مزہ تو جب آئے اے دینار کہ یہ معاملہ خفیہ نہ رہے اور تمام بغداد والے برسر عام اس عرب آدم زاد ابراہیم کے ہاتھ پر بیعت کریں۔''

''تو شاید مزے میں موت تک کو بھول رہا ہے' آخر تجھے ابراہیم کو مروا کے کیا مل جائے گا۔''

''کوئی ضروری تو نہیں کہ ابراہیم ہی مارا جائے۔'' غارج نے بحث کی۔

''اس مملکت کا خلیفہ ہونا اس قدر آسان نہیں جتنا تو نے سمجھ رکھا ہے۔ صرف بغداد والے اگر کسی کو حکمران وقت مان بھی لیں تو بات نہیں بنے گی۔'' میں نے غارج کو سمجھایا۔

''تیری مرضی کیا ہے' میں خوب جانتا ہوں اے دینار!''

''اگر جانتا ہے تو پھر اڑی کیوں کرتا ہے۔''

''یہ میری مرضی ہے' کیا مجھے تو اتنا حق بھی نہیں دے گی کہ تجھ سے اختلاف کر سکوں۔''

''کر اختلاف! بنوا دے ابراہیم کو بغداد کا خلیفہ۔''

''طنز نہ کر... ...تو نے مجھے چڑایا تو پھر ابراہیم ہی کے ہاتھ پر بغداد والے بیعت کریں گے۔ اس میں آخر خرابی کیا ہے؟ وہ بھی تو ہارون الرشید کا بھائی ہے۔''

میں کچھ نہ بولی۔ حالات پر بہر حال نظر رکھی۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ نماز سے پہلے ایک شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا بولا۔ ''اے لوگو! ہم مامون کے بعد ابراہیم کو ولی عہد خلافت قرار دینا چاہتے ہیں۔''

پہلے آدمی کے برابر ہی سے دوسرا اٹھا اس نے کہا۔ ''مامون تو معزول ہو چکا ہے' خلیفہ وقت ابراہیم ہے۔''

اس پر جامع مسجد میں ایک دم شور ہونے لگا۔ میں سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ایک جن زادی کی پراسرار داستان ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات کے لئے جلد سوئم (آخری) مطالعہ کریں